بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری | ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۵ | بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

تلاش حق کے چند اوراق

مضمون ذیل مہاتما گاندھی کی آپ بیتی کے اردو ترجمہ (مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی) کا کچھ حصہ ہے۔ یہ ترجمہ عنقریب "تلاش حق" کے نام سے مکتبہ جامعہ شائع ہوگا۔
(اڈیٹر)

۱۸ یا ۱۹ دسمبر کو جہاز ڈربن میں لنگر انداز ہوا۔ "نلدیری" جہاز بھی اسی دن پہنچا۔ مگر اصلی طوفان اب آنے والا تھا۔

طوفان

میں پہلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ ۱۸ دسمبر کو دونوں جہاز ڈربن کی بندرگاہ میں لنگرانداز ہوئے۔ جنوبی افریقہ کی بندرگاہوں میں جہازوں کو بغیر طبی معائنے کے ساحل پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی مسافر کو کوئی لگ جانے والی بیماری ہو تو اسے قرنطینے میں رہنا پڑتا ہے جب ہم بمبئی چلے تھے تو وہاں طاعون تھا اس لئے ہمیں یہ ڈر تھا کہیں ہم لوگ بھی کچھ دن قرنطینے میں نہ رکھے جائیں معائنے سے پہلے ہر جہاز پر ایک زرد جھنڈا نصب کیا جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں اتارا جا سکتا جبتک ڈاکٹر مسافروں کی صحت کی تصدیق نہ کردے۔ مسافروں کے عزیزوں اور دوستوں کو زرد جھنڈے کے اتارے جانے کے بعد جہاز پر آنے کی اجازت ملتی ہے۔

چنانچہ ہمارے جہاز پر بھی زرد جھنڈا نصب کیا گیا اور ڈاکٹر معائنے کے لئے آیا۔ اس نے پانچ دن کے قرنطینے کا حکم دیا کیونکہ اس کا یہ خیال تھا کہ طاعون کے جراثیم کی نشوونما زیادہ سے زیادہ ۲۳ دن میں ہوتی ہے۔ ہمارے جہاز کو حکم سنایا گیا کہ جس دن بمبئی سے چلا تھا اس کے تیئیسویں دن تک قرنطینے میں رہے۔ لیکن اس حکم میں حفظان صحت کے علاوہ دوسری مصلحتیں بھی تھیں۔

ڈربن کے یورپی باشندوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لوگ یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ

[illegible] کو لوٹا دیے جائیں اور قرنطینے کی ایک وجہ یہ جدوجہد بھی تھی۔ دادا عبداللہ کے دی گئی برابر شہر کی خبریں پہنچاتے تھے۔ یورپی روز بڑے بڑے جلسے کرتے تھے۔ یہ لوگ دادا عبداللہ کمپنی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیتے تھے اور کبھی کبھی لالچ بھی دلاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر دونوں جہاز واپس کر دیے جائیں تو ہم ہرجانہ دینے کو تیار ہیں۔ لیکن دادا عبداللہ کمپنی ان دھمکیوں میں آنے والی نہ تھی۔ اس زمانے میں سیٹھ عبدالکریم آدم کمپنی کے شریک منتظم تھے۔ وہ اس پر ڈٹے ہوئے تھے کہ جہاز [illegible]زوں کو گودی پر لائیں گے اور مسافروں کو اتاریں گے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں [illegible] بھی موجود تھے کے ارادے سے [illegible] آئے ہوئے تھے۔ یہ بڑے قابل اور جری بھی تھے [illegible] ہندوستانیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ انکے وکیل مسٹر لاٹن بھی جرأت میں کچھ کم نہ تھے۔ وہ یورپین [illegible]زمل کو برا سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کو صرف محنتانے کی خاطر نہیں بلکہ سچے دوست کی طرح مشورہ دیتے تھے۔

اس طرح ڈربن ایک زبردست اور ایک کمزور فریق کی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک طرف تو تھوڑے سے ہندوستانی اور انکے معدودے چند انگریز دوست تھے اور دوسری طرف یورپیوں کی صف تھی جو تعداد میں، قوت میں، تعلیم اور دولت میں ان سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ نٹال کی حکومت بھی کھلم کھلا ان کی مدد کر رہی تھی۔ مسٹر ہیری ایسکومب جو مجلس وزرا کے سب سے بااثر رکن تھے، بے تکلف انکے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

غرض قرنطینے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ کمپنی کے ایجنٹوں کو یا مسافروں کو دھمکا کر جہاز ہندوستان واپس کر دیے جائیں۔ اب ہمارے پاس بھی تہدید آمیز پیام پہنچنے لگے "اگر تم واپس نہیں جاؤ گے تو ہم تمہیں سمندر میں ڈبو دیں گے۔ لیکن اگر تم جانے پر راضی ہو جاؤ تو ممکن ہے تمہارا کرایہ تک واپس مل جائے" میں برابر اپنے جہاز کے مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا اور ان کی دلدہی کرتا تھا۔ نادری کے مسافروں کو بھی تسلی آمیز پیام بھیجتا تھا۔ انکے سکون اور ہمت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

Managing Partner

ہم نے مسافروں کی تفریح کے لئے جہاز پر طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کیا۔ کرسمس کے دن کپتان نے اول درجے کے مسافروں کو ڈنر پر بلایا۔ علاوہ دوسرے اور میرے خاندان کے چند لوگ اور ... ڈنر کے بعد تقریریں ہوئیں۔ اور میں نے مغربی تہذیب پر تقریر کی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سنجیدہ تقریر کا موقعہ نہیں ہے لیکن اپنی طبیعت سے مجبور تھا۔ میں خوشی منانے میں شریک تھا لیکن میرا دل اس لڑائی میں لگا ہوا تھا جو ڈربن میں ہو رہی تھی کیونکہ یہ لڑائی اصل میں میرے ہی خلاف تھی۔ مجھ پر دو الزام تھے:۔

ایک یہ کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کو بیجا مطعون کیا۔

دوسرے یہ کہ میں خاص کر کے دو جہاز بھر ہندوستانی لایا ہوں کہ نٹال کو ہندوستانیوں سے بھر دوں۔

مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے دادا عبداللہ کمپنی بہت بڑے خطرے میں مبتلا ہے، مسافروں کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور اپنے خاندان کو بھی میں نے لاکر مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔

مگر میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے کسی کو نٹال آنے کی ترغیب نہیں دی تھی۔ جب مسافر جہاز پر آئے تھے تو میں انہیں جانتا تک نہ تھا۔ اور اب بھی بجز اپنے دو رشتے داروں کے میں جہاز کے سیکڑوں مسافروں میں کسی کے نام و نشان سے واقف نہیں تھا۔

اس لئے میں نے اپنی تقریر میں کہا افسوس ہے اس تہذیب پر جس کا نمونہ نٹال کے یورپی پیش کرتے ہیں اور جس کی حمایت کا انہیں دعویٰ ہے۔ کچھ عرصے سے میرے دل میں یہی خیال رہا ہوا تھا اس لئے میں نے اس چھوٹے سے مجمع کے سامنے اپنی تقریر میں اسی مسئلے پر بحث کی۔ کپتان نے اور دوسرے دوستوں نے بڑی توجہ سے میری تقریر سنی اور ان پر میرے خیالات کا اثر ہوا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس سے انکی زندگی میں اس سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی مگر اس کے بعد کئی بار کپتان اور جہاز کے دوسرے افسروں نے مجھ سے مغربی تہذیب کے متعلق طویل گفتگو کی۔ میں نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ مغربی تہذیب زیادہ تر تشدد پر مبنی ہے مگر مشرقی تہذیب میں یہ بات نہیں ہے۔ سوال کرنے والوں نے میری یہ بات پکڑ لی اور ان میں سے ایک نے غالباً کپتان نے مجھ سے پوچھا۔

[illegible] چاہیے کہ یورپی اپنی دھمکیوں پر عمل کریں۔ پھر آپ اپنے عدم تشدد کے اصول پر کیونکر قائم رہیں

میں نے جواب دیا "مجھے امید ہے خدا مجھے اتنی ہمت اور سمجھ دیگا کہ میں عفو سے کام لوں اور ان پر مقدمہ نہ چلاؤں۔ مجھے تو محض ان کی جہالت اور تنگدلی پر افسوس آتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اچھا اور مناسب سمجھ کر کر رہے ہیں۔ پھر مجھے ان پر غصہ آنے کی کیا وجہ ہے؟"

سوال کرنیوالا مسکرایا۔ شاید اسے یہ بات یقین نہیں آئی۔

اسی طرح جوں توں دن گذرتے رہے۔ ابھی تک ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ قرنطینہ کب ختم ہوگا قرنطینے کے افسر نے کہا کہ اب معاملہ میرے اختیار میں نہیں رہا جب حکومت کی طرف سے احکام آئیں گے میں آپ کو جہاز سے اترنے کی اجازت دے دوں گا۔

آخرکار ایک دن میرے اور دوسرے مسافروں کے پاس یہ اعلان جنگ پہنچا کہ اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو جو ہم کہتے ہیں اسے چپ چاپ مان لو۔ اس کے جواب میں میں نے اور دوسرے مسافروں نے کہلا بھیجا کہ ہمیں نٹال کی بندرگاہ میں اترنے کا پورا حق ہے اور ہم نے جی میں ٹھان لی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نٹال میں ضرور داخل ہوں گے۔

۲۳ دن پورے ہونے پر جہازوں کو گودی میں آنے کی اور مسافروں کو اترنے کی اجازت مل گئی۔

آزمائش

جہاز گودی پر لائے گئے اور مسافر اترنے لگے۔ مگر مسٹر ایسکومب کے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو یورپی تم سے سخت بیزار ہیں۔ تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ جھٹپٹے وقت جہاز سے اترو اور گودی کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹیٹم کی حفاظت میں گھر جاؤ۔ کپتان نے یہ پیام مجھ سے کہا اور میں اس پر عملدرآمد کرنے پر تیار ہوگیا۔ مگر اسے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مسٹر لاٹن کپتان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر مسٹر گاندھی راضی ہوں تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ میں کمپنی کے مشیر قانونی کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ آپ پر مسٹر ایسکومب کے مشورے کی پابندی

لازمی نہیں ہے؟" اس کے بعد انہوں نے مجھ سے بھی کہا، "اگر آپ ڈرتے نہ ہوں تو میری رائے ہے کہ آپ کی بیوی اور بچے گاڑی میں رستم جی کے یہاں چلے جائیں اور ہم آپ پیدل چلیں۔ مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ چوروں کی طرح رات کو شہر میں داخل ہوں۔ میرے خیال میں اب آپ پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں شہر میں ہر طرف سکون ہے۔ یورپی منتشر ہو چکے ہیں۔ بہرحال میرے نزدیک آپ کو شہر میں چھپ کر ہرگز نہ جانا چاہئے۔" میں فوراً راضی ہوگیا۔ میری بیوی اور بچے گاڑی میں سوار ہو کر حفاظت کے ساتھ رستم جی کے یہاں پہنچ گئے۔ میں کپتان کی اجازت سے مسٹر لاٹن کے ہمراہ روانہ ہوا۔ مسٹر رستم جی کا مکان گودی سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔

جب ہم کنارے پر پہنچے چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور "گاندھی" "گاندھی" پکارنے لگے۔ پانچ چھ آدمی اور دوڑے آئے اور انہوں نے لڑکوں کے ساتھ مل کر چلانا شروع کیا۔ مسٹر لاٹن ڈرے کہ کہیں مجمع زیادہ نہ ہو جائے اور انہوں نے ایک رکشا[1] والے کو پکارا۔ مجھے رکشا پر بیٹھنا پسند نہ تھا۔ آج پہلی بار اس کا اتفاق ہوتا مگر لڑکوں نے مجھے بیٹھنے نہ دیا۔ انہوں نے رکشا والے کو ایسا دھمکایا کہ وہ اپنی جان لے کر بھاگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ رستہ بالکل رک گیا۔ پہلے انہوں نے مسٹر لاٹن کو پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد مجھ پر اینٹ پتھر اور گندے انڈوں کی بوچھار کر دی۔ ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے۔ مجھے غش آنے لگا اور میں ایک مکان کے جنگلے کے سہارے کھڑا ہو گیا کہ ذرا دم لے لوں۔ مگر لوگوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ انہوں نے پہنچ کر گھونسے اور مکے مارنا شروع کئے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی مجھ سے واقف تھیں ادھر سے گذر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لئے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ اس سے لوگوں کا حملہ کچھ کم ہوا کیونکہ اگر مجھے مارتے تو مسز الگزینڈر کے بھی چوٹ آتی۔

---

(۱) ایک ہلکی سی گاڑی جسے آدمی کھینچتا ہے۔

اس دوڑ میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا دوڑکر کوتوالی پہنچ گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر اگز نیڈر نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا کہ مجھے حلقے میں لے کر گھر پہنچا دے۔ یہ سپاہی عین وقت پر پہنچے۔ کوتوالی [illegible] ہم وہاں پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم یہیں کوتوالی میں پناہ لو مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا جب ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو آپ بھی [illegible] جائینگے۔ مجھے انکی انصاف پسندی پر اعتماد ہے۔" پولیس کی حفاظت میں بغیر کسی مزید دقت کے رستم جی کے یہاں پہنچ گیا۔ میرا بدن جابجا سے چھل گیا تھا مگر سوائے ایک جگہ کے کہیں زخم نہیں آیا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر دادی بارجور صاحب وہیں موجود تھے اور انہوں نے بہت توجہ سے میری مرہم پٹی کی۔

گھر کے اندر سکون تھا مگر باہر یورپین مکان کو گھیرے ہوئے تھے۔ رات ہونے والی تھی اور مجمع گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا "گاندھی کو ہمارے حوالے کر دو"۔ بیدار مغز سپرنٹنڈنٹ پولیس موقع پر پہنچ گئے تھے اور مجمع کو دھمکا کر نہیں بلکہ پرچا کر قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دل میں وہ بھی پریشان تھے انہوں نے مجھے کہلا بھیجا "اگر آپ اپنے دوست کے گھر بار کو اور اپنے خاندان کو ان لوگوں کے ہاتھ سے بچانا چاہتے ہیں تو بھیس بدل کر نکل جائیے"۔

اس طرح ایک ہی دن مجھے دو متضاد حالتوں سے سابقہ پڑا۔ جب جان کا خطرہ محض خیالی تھا اس وقت مسٹر لاٹن نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کھلے بندوں شہر میں جاؤں اور میں نے اسے قبول کیا۔ جب خطرہ سچ مچ آ پہنچا تو ایک اور دوست نے مجھے اس کے خلاف رائے دی اور میں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ اب خدا جانے میں نے یہ اس لئے کیا کہ مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آئی یا اس لئے کہ اپنے دوست کے گھر بار کو یا اپنے بیوی بچوں کو خطرے سے بچاؤں؟ کون شخص دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ میں اس وقت بھی حق بجانب تھا جب میں نے بقول دوسروں کے بہادری سے مجمع کا مقابلہ کیا اور اس وقت بھی جب میں بھیس بدل کر انکے مقابلے سے بھاگ نکلا؟

جو باتیں ہو چکیں انکی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنا فضول ہے۔ جو فائدہ ہے وہ اس میں ہے کہ انسان انہیں سمجھے اور اگر ممکن ہو تو ان سے آئندہ کے لئے سبق حاصل کرے۔ پہلے سے یہ بتانا دشوار ہے کہ

فلاں شخص فلاں موقعے پر کیا کرے گا۔ اور پھر کسی کے ظاہری افعال سے اسکی نیت پر حکم لگانا بھی گویا ناکافی شہادت کی بنا پر فیصلہ کرنا ہے۔

بہرحال بھاگنے کی تیاری میں میں اپنی چوٹوں کی تکلیف بھول گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کے مشورے کے مطابق میں نے ایک ہندوستانی کانسٹبل کی وردی پہن لی اور سر پر دھات کی ایک طشتری رکھ کر اس پر ذرا سی صافا لپیٹ لیا کہ خود کا کام دے سکے۔ میرے ساتھ دو سراغ رساں تھے جن میں سے ایک نے ہندوستانی تاجر کا بھیس بدلا اور چہرے کو رنگ کر ہندوستانیوں کی سی شکل بنا لی تھی۔ دوسرے کا بھیس مجھ یاد نہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی گلی سے ہوکر قریب کی دکان پر پہنچے اور بوروں کے ڈھیر میں سے جو گودام میں لگا ہوا تھا گزر کر دکان کے دروازے سے نکل گئے۔ یہاں مجمع میں گھس بیٹھ کر گلی کے نکڑ پر اس گاڑی تک پہنچے جو میرے لئے کھڑی تھی۔ اس گاڑی نے ہمیں کوتوالی تک پہنچا دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے مسٹر الگزینڈر نے مجھے پناہ لینے کو کہا تھا۔ میں نے انکا اور سراغ رسانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ادھر میں بھاگ رہا تھا اور اُدھر مسٹر الیگزینڈر یہ بول گاکر مجمع کو بہلا رہے تھے:۔

پھانسی دے دو گاندھی کو
کھٹے سیب کے پیڑ پر

جب انہیں معلوم ہوگیا کہ میں حفاظت کے ساتھ کوتوالی پہنچا دیا گیا تو انہوں نے مجمع سے مخاطب ہوکر کہا "وہ بھئی تمہارا شکار تو قریب کی دکان سے ہوکر نکل گیا۔ میری صلاح یہ ہے کہ اب تم بھی گھر کی راہ لو" بعض لوگ بگڑے بعض ہنسنے لگے اور بعض یہ بات یقین نہیں آئی۔

سپرنٹنڈنٹ نے کہا "اچھا اگر تمہیں میری بات یقین نہیں آتا تو اپنی طرف سے دو ایک نمائندے مقرر کر دو۔ میں انہیں گھر کے اندر لیجانے پر تیار ہوں۔ اگر وہ گاندھی کو ڈھونڈھ نکالیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ لیکن اگر وہ نہ ملے تو پھر تم کو منتشر ہونا پڑے گا۔ تم کوئی رستم جی کا مکان ڈھانے یا گاندھی کے بیوی بچوں کو ستانے تھوڑی آئے ہو"

مجمع نے اپنے نمائندے گھر کی تلاشی لینے کیلئے بھیجے۔ وہ تھوڑی دیر میں ناکام واپس آئے اور مجمع

خاموش رہے [illegible] پولیس کی تعریف کر رہے تھے کہ انہوں نے بڑی موقع شناسی سے کام لیا اور بعض غصے سے ہونٹ چبا رہے تھے۔

مسٹر چیمبرلین آنجہانی نے جو اس زمانے میں وزیر نوآبادیات تھے نٹال کو تار کے ذریعے ان لوگوں پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مسٹر ایسکومب نے مجھے بلایا اور کہا "مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو یہ اذیتیں اٹھانا پڑیں۔ آپ یقین کیجئے کہ مجھے آپ کی خفیف سی تکلیف بھی گوارا نہیں۔ بیشک آپ کو یہ حق تھا کہ آپ مسٹر لاٹن کے مشورے کو مانیں اور بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کریں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے پر عمل کرتے تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ اگر آپ حملہ کرنے والوں کو شناخت کر سکیں تو میں اسکے لئے تیار ہوں کہ انہیں گرفتار کرا کے ان پر مقدمہ چلاؤں۔ مسٹر چیمبرلین نے بھی مجھ سے یہی خواہش کی ہے۔"

میں نے جواب دیا، "میں کسی پر مقدمہ چلانا نہیں چاہتا۔ ممکن ہے میں ان میں سے دو ایک کو پہچان لوں۔ مگر انہیں سزا دلانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اور میرے نزدیک ان لوگوں کا کوئی قصور بھی نہیں۔ انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کیں اور انہیں بدنام کر دیا۔ ان باتوں کو سن کر انہیں طیش آگیا تو کونسی تعجب کی بات ہے؟ قصور جو کچھ ہے وہ انکے لیڈروں کا یعنی دوسرے الفاظ میں خود آپ کا ہے۔ آپ انکی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے مگر آپ نے خود رائیٹر کے بھروسے پر یہ فرض کر لیا کہ میں نے ضرور مبالغے سے کام لیا ہوگا۔ میں کسی سے مواخذہ کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب صحیح حالات معلوم ہونگے تو لوگوں کو اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہوگی۔"

تعلیم و علم مرفہ الحالی

موجودہ زمانہ کے اہم ترین مسائل میں مسئلہ تعلیم کا بھی شمار ہے۔ ایک طرف ماہرین تعلیم (Pedagogues) اس مسئلہ کی تحلیل میں کوشاں ہیں تو دوسری جانب علماء و ماہرین سیاسیات، معاشیات و عمرانیات اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اسکو حل کرنے میں مشغول ہیں۔ آخر الذکر لوگ اپنے معاصر ماہرین تعلیم پر محض اس وجہ سے بھروسہ نہیں کرتے کہ وہ ان کی باتوں کو خیالی اور ناقابل عمل تصور کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہمیں آیندہ معلوم ہوگا، یہ اندیشہ ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ اگر مسئلہ تعلیم کی تحلیل صرف ماہرین تعلیم پر چھوڑ دی جائے۔ اور اس میں دوسرے علوم کے نمایندوں کی طرف سے مداخلت نہ ہو، تو نظام معاشرت و سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

عمرانیات و مسئلہ تعلیم

عمرانیات اور مسئلہ تعلیم کا تعلق بہت قریبی ہے، اور یہ چنداں تعجب کی بات نہیں، کیونکہ نہ صرف عمرانیات اور علم تعلیم ہی قریبی تعلق رکھتے ہیں، بلکہ جملہ علوم عمرانی ایک دوسرے سے غیر منفک طریق پر ملے جلے ہیں۔ اور ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا محض مصنوعی ناقص طریقہ پر ممکن ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ عمرانیات نہ صرف معاشرت کو مطالعہ کرنیوالا مجرد علم (Abstract Science) ہے بلکہ بحیثیت علم مرفہ الحالی کے اس کے ذمہ سماجی مسائل کی تحلیل کرنا، عمرانی عیوب و جرائم کے علاج کا پتہ چلانا، اچھوں کو بہتر اور بروں کو اچھا بنانے کا طریقہ دریافت کرنا۔ نیز عمرانی نو ترتیب و تعمیر (Social reconstruction) اور اصلاح معاشرت (Social Reform) کے اصول مرتب کرنا ہے۔ لہذا عمرانیات کے محدود مگر گوناگوں فرائض میں غالباً عملی اعتبار سے سب سے زیادہ ضروری ان اصول کا دریافت یا منکشف کرنا ہے جن پر عمل کرنے سے ذاتی، خاندانی، قومی، بلکہ سارے عالم کی مرفہ الحالی میں اضافہ ہونے کی پوری توقع کی جاسکتی ہے۔

(نوٹ کے لئے لاحظہ ہو صفحہ ۱۱)

عمرانیات بحیثیت علم مرفہ الحالی سے تعلیم میں بھی دلچسپی لیتی ہے۔ کیونکہ مرفہ الحالی کا دار و مدار صحیح اصول و طریق تعلیم پر ہے جب تک انہیں کی دانست میں جو صحیح اصول و طریق تعلیم ہے واضح ہونا چاہیے۔ اس پر بحث کرنے سے قبل، ہم غلط فہمی کو دور کرتے ہیں کے لئے مفہوم تعلیم کو بھی واضح کر دیتے ہیں۔ تعلیم ظاہر ہے کہ ایک انسانی اصطلاح ہے جس کے معنی بہت ہی مختلف ہو سکتے ہیں۔ لہذا غلطی یا غلط فہمی کا بہت اندیشہ ہے۔ تعلیم کے مختلف تصورات (Conceptions) ہیں۔ اس لئے تعلیم کے مفہوم بھی مختلف ہیں۔

مفہوم تعلیم

تعلیم سے مراد وہ باضابطہ تدریس ہے جس کے ذریعے معلومات بہم پہنچائے جاتے ہوں اور ذہن انسانی کو صحیح طریق پر سوچنے اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا عادی بنایا جاتا ہو۔ علمی اصطلاحات کی کمی کی وجہ سے اردو میں "تعلیم" کا لفظ Literacy (حروف شناسی و حروف توقیعی) اور Education (تربیت) دونوں معنوں میں بے تکلف استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ لفظ "تعلیم" کے ان دو مفہوم (یعنی ابجد خوانی اور تربیت) سے واقف ہو جانے کے بعد ہمیں "تعلیم" کے مختلف تصورات کیطرف متوجہ ہونا چاہیے۔

مثالئین (Idealists) کا خیال ہے کہ تعلیم سے مراد اس قسم کی تربیت ہے۔ جو سرشت انسانی کو بہتر بناتی اور جس سے لوگوں کو علمی تحقیقات کا شوق ہوتا ہو۔ اور ان کے اخلاق درست ہوتے ہوں۔

قدامت پسند گروہ کے نزدیک تعلیم سے مراد وہ طریقہ ہے۔ جس کے ذریعہ

(نوٹ صفحہ ۲)

۱۔ اگرچہ ان اصولوں کے بیان کرنے کا یہاں کوئی موقع نہ تھا۔ تاہم چونکہ اردو داں طبقہ کو ان سے واقف کرانا ضروری ہے اس لئے سرسری طور پر ہمیں نے بیان کر دیئے

راقم کا قصد ہے کہ اپنی زیر ترتیب کتاب موسومہ "عمرانیاتی مضامین" میں ایک مضمون "قوانین و اصول ترقی" پر سپرد قلم کرے۔

وحروف نویسی سکھلائی جاتی ہے اور ساتھ ہی اسلاف کی خوبیوں اور تجربے سے فائدہ حاصل کرنے اور بزرگوں کی تہذیب کو قائم رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ گویا تعلیم سے مراد یہ ہے کہ آیندہ کی نسلیں گذشتہ نسلوں کی سی ہوجائیں۔ ان کے برخلاف طبقہ مادیین Materialists تعلیم سے مراد علمی تحقیقات نہیں لیتے بلکہ اس سے ان کی مراد وہ طریق ہے جس کے ذریعہ انسان معاشی انسان بن سکتا ہو۔ یعنی جو کمانے کھانے کے لائق ہو سکے۔ اس مضمون میں ہم نے تعلیم سے نہ صرف حرف شناسی وحروف نویسی لی ہے۔ بلکہ ذہن انسانی کی تربیت خط نویسی کی قابلیت اور مطالعہ کتب کی صلاحیت کو بھی مفہوم تعلیم میں داخل کیا ہے نیز اسکو صرف نظری تعلیم تک محدود قرار دیا ہے بلکہ نظری تعلیم کے علاوہ فنی، تجارتی، صنعتی، زراعتی، اعلیٰ وادنیٰ، تحتانیہ ووسطانیہ، فوقانیہ وجامعاتی تمام اقسام تعلیم پر مشتمل کیا ہے۔

تعلیم کا کیا مقصد ہے۔

اس سوال کا جواب ایک حد تک "مفہوم تعلیم" کے بیان میں دیا جا چکا ہے۔ بقیہ تشریح موازنہ مثالیت وافادیت سے بآسانی کیجاسکتی ہے۔ روز ازل یا یوں کہنا چاہئے جب سے کہ تعلیم کا رواج دنیا میں عام ہوا اسوقت سے دو گروہوں میں زبردست مقابلہ ہوتا رہا ہے۔ اور اب بھی ہر ملک میں ہو رہا ہے۔ اگر موجودہ زمانہ کے رجحان کو قطعی تصور کرلیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ بالآخر اس دیرپا جنگ کا نتیجہ ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست میں تو ہوا گر فتح کمل نہیں کی لہذا نہ تو فاتحین چین سے بیٹھ سکتے ہیں اور نہ مفتوحین مایوس ہو گئے ہیں۔ اور ایک طرح کی حالت نیم حربی (Quasi war) اب بھی پس پردہ، اور کہیں کہیں علانیہ قائم ہے۔ یہ تنازعہ مدت سے فلسفہ تعلیم کے دو اسکولوں میں ہوتا رہا ہے یعنی مثالیت (Idealism) اور عقلیت (Rationalism) ہیں۔

مثالیت اور عقلیت کا موازنہ

مثالیت	عقلیت
مثالیت کی تلقین ہے کہ انسان کا مطمح نظر	عقلیت کی تلقین ہے کہ انسان کا مطمح نظر

ہمیشہ ایک بلند خیال رہنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ قابل حصول ہو بھی یا نہیں۔ اور اگر چہ اس کے حصول کے لئے کسقدر دشواریاں اور قربانیاں گوارہ کرنی پڑیں گی شالیت اس ذہنیت کو کہتے ہیں جو انسان کو ایک بہتر اور بالاتر خیالی نمونہ کو پیش نظر رکھکر یہ باور کراتی ہے کہ اس طرح عملی زندگی میں بھی ایک نمونہ قائم کرنا ممکن ہے۔ شالیت کے زیر اثر انسان بیشتر بے غرضانہ اور محض اصول کی خاطر کام کرتا ہے۔ اور بسا اوقات جبکہ ذاتی اغراض شالیاتی فلسفہ سے پورے نہ بھی ہوتے ہوں تب بھی وہ دھڑک اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔ اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو دنیا میں بغیر شالیت کے کام نہیں چل سکتا۔ شالیت Idealism انسان کی روح کو قوت پہنچاتی ہے۔ جب انسان کا دل مایوس ہو جاتا ہے۔ اور اسکی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ تو ایسے مواقع پر انسان کے دل کو تر و تازہ کرنیوالی اور اسے از سر نو کام کے لئے مستعد بنانے والی یہی شالیت ہے۔ بغیر شالیت کے قائل ہونے [illegible] روسو (Rousseau) کو مدت العمر

ہمیشہ مصلحت افادہ اور استفادہ ہونا چاہیے قطع نظر اس کے کہ وہ جائز ہو یا ناجائز عقلیت اس ذہنیت کا نام ہے۔ جس سے انسان فوری جذبات یا دلی رجحانات کی خاطر کام نہیں کرتا ہے۔ بلکہ موقع محل کے تقاضے اور ماحول کے حالات پر پوری نظر کرتے ہوئے اپنا کام انجام دیتا ہے۔ عقلیت کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے قربانیوں اور دشواریوں کو نظر انداز نہیں کرتی بلکہ انہیں عین شی تصور کرتی ہے اس کی نظر میں فتح صحیح فتح اسوقت ہے جبکہ فتح کی قیمت بہت زیادہ نہ ہو۔ برخلاف شالیت کے عقلیت "اصول" کا اسقدر پاس نہیں کرتی۔ جس قدر کہ وہ مصلحت کا لحاظ کرتی ہے۔ نیکی کرو مگر ایسوں کے ساتھ جو نیکی کا بدلہ نیکی سے دیں یا کم از کم احسان شناس ہوں نہ کہ ان لوگوں کے ساتھ جو نیکی کے بجائے تمہارے ساتھ بدی سے پیش آئیں۔ مار آستین کو دیدہ و دانستہ پالنا رحم نہیں ہے بلکہ ظلم، دانشمندی نہیں ہے بلکہ نادانی، پرورش نہیں ہے، بلکہ خودکشی۔ عقلیت سچائی، راست گوئی اور پاکیزہ اخلاق برتنے کی تاکید محض اس وجہ سے کرتی ہے کہ سچائی، راست

گوشاں و سرگرداں رہنے کی استطاعت
ہوتی اور وہ سرسید اپنے ہم مذہب لوگوں
کے لئے اسقدر جانفشانی کر سکتے تھے۔ تاہم
مثالیت کی بعض نمایاں کمزوریاں ایسی بھی
ہیں جن کی وجہ سے رفتار ترقی پر بہت خراب
اثر پڑتا ہے۔ مثالیت کی یہ تلقین کہ کسی تخیل
کے حاصل کرنے میں دشواریوں اور قربانیوں
کا مطلق لحاظ نہ کرنا چاہئے۔ اکثر انسان کو غلط
راہ پر ڈالتی ہے۔ اور اکثر "کوہ کندن اور کاہ
برآوردن" کے قول کیمطابق نتیجہ برآمد ہوتا ہے
اور انسان کی قوت (Energy)
ضائع جاتی ہے۔ مثالیت کی دوسری کمزوری
یہ ہے کہ وہ تاثیرات کا زیادہ لحاظ نہیں کرتی
مثالیت کی تلقین ہے "نیکی کی خاطر نیکی کرو" "سچائی
کی غرض سے سچ بولو" "رحم کرو کیونکہ رحم صفت حمیدہ ہے"
"آزادی حاصل کرو چاہے آزادی کے بعد عام
کشت و خون ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اور اسی قسم
کے مثالیاتی مقولوں نے اکثر اقوام کو عرصے کیلئے
مصیبت میں گرفتار کروایا ہے۔ اور ہزارہا نوجوانوں
نے اپنی جانیں کھو دیں اور لکھو کھا آدمیوں کی
زندگی ایک ناقابل حصول شے کی تمنا میں اکارت گئی۔

گوئی اور پاکیزہ اخلاق سے علی العموم اپنے آپ کو
اور دوسروں کو فائدہ ہوتا ہے۔ مگر جب کبھی مصلحت
کا تقاضہ حق پوشی میں ہو تو انسان کو بمصداق
قول سعدیؒ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی
فتنہ انگیز" حق کو چھپانا ہی چاہئے۔ اوقات کی
پابندی اسوجہ سے ضروری ہے کہ اسپر عمل کرنے سے
اپنے آپ کو اور دوسروں کو فائدہ ہوتا ہے۔ عمدہ
اخلاق برتنا، شرافت سے پیش آنا، ادب سے ملنا محض
اسوجہ سے اچھا اور قابل پیروی ہے کہ "تمیز سے یافت
ہے" (Politeness Pays)۔

عقلیت کو امریکی اصول تجارت میں بہت
زیادہ دخل ہے۔ وہ لوگ ایماندار اور سچے زیادہ تر
اسوجہ سے ہوتے ہیں کہ انہیں مادی فائدہ ہوتا ہے۔
ان کا یہ قول ہے، اور بالکل صحیح ہے کہ "انسان ہر شخص
کو ہمیشہ دھوکا نہیں دے سکتا" لہذا راست بازی
نیک چلنی بحیثیت مجموعی سہل ترین، اور مفید ترین
طریق تجارت ہے۔ عقلیت کے کوئی مقررہ اور
معینہ اصول ایسے نہیں جو ہر جگہ اور ہر وقت اور
ہر ایک پر منطبق ہو سکیں۔ ایسی ایمانداری جس سے
خود کو نقصان ہو اور کسیکو فائدہ نہ پہونچے عقلیت
نہیں سراہ سکتی۔ ایک ریشنلسٹ (Rationalist)

اپنے کاموں میں ہمیشہ حالات کی نوعیت کا لحاظ کرتا
ہے۔ مطلب پرستی اس کا شعار، مالی مفاد اس
کا مطمح نظر، اور دلی مرادیں حاصل کرنا اس کا تنہا
مقصد ہوتا ہے۔ ماضی کا دباؤ، مستقبل کا خیال،
حال کا احساس اس کے کردار کو ایک خاص
نہج پر چلاتا ہے۔ اور اس کی عملی زندگی کو یہ تینوں
قوتیں سنبھالتی ہیں۔

مثالیت اور عقلیت کا تعلق مسئلہ تعلیم سے

مثالیت اور عقلیت کے تقابل سے ہم دونوں مذاہب کی ذہنیتوں کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ مسئلہ تعلیم پر ان دونوں کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثالیین (Idealists) علم چاہتے ہیں علم کی خاطر، وہ علم کی قدر کرتے ہیں، علم ہی کی خاطر وہ چاہتے ہیں "علم کا نور پھیلے۔ اور ہر شخص "جوہر علم سے آراستہ" کیا جائے۔ انہیں اس حقیقت سے بحث ہے نہ تعلق، کہ اس علم سے علم حاصل کرنے والوں کو کس قدر فائدہ پہونچیگا یا پہونچنے کی توقع ہے۔ "علم برائے علم" ان کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ اور فلسفہ وشاعری جغرافیہ و قدیم یونان کی تاریخ محض تعلیم کی خاطر پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ وہ "جہالت" کو مٹانا چاہتے ہیں۔

برخلاف مثالیاتی ذہنیت کے عقلیت علم کی قدر علم کی خاطر نہیں کرتی بلکہ اس کا قول ہے "علم برائے عمل، عمل برائے مہارت، مہارت برائے کارکردگی۔ اور کارکردگی برائے مرفہ الحالی"۔ عقلیت کا یقین ہے کہ علم کا مقصد علم ہی نہ ہونا چاہئے بلکہ علم کا مقصد حقیقی ہنر ہے۔ اور علم وہی اچھا جس سے ہنر آئے۔ محض معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر لوگوں کو علم پڑھانا ان کی خوشی کی زندگی کو برباد کرنا اور ان کے دماغ پر بیجا بار ڈالنا ہے۔ "علم برائے علم" اب ایک غیر اہم کلیہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور موجودہ زمانے کے افادہ پسند

صدر نے اس قول کو باطل قرار دیا ہے۔ آج سے تقریباً دو صدی پہلے پرشیا جرمنی کے زبردست حاکم فریڈرش اعظم نے کہا تھا جو اپنے زمانے کی رفتار سے صدیوں آگے بڑھا ہوا تھا کہ "ہمیں چاہیے کہ علوم کو ایسے ذرائع تصور کریں جن سے ہم میں اپنے فرائض انجام دہی کے لئے زیادہ قابلیت پیدا ہوتی ہو۔"(۱)

موجودہ زمانے کے افادہ پسند رجحان کو ثابت کرنے کے لئے صرف دو مزید اقوال کافی ہونگے آسٹریا کا نامی عالم یروسلم اپنی کتاب "مبادی عمرانیات" میں لکھتا ہے۔

"تمام علوم عملی ضرورتوں کی وجہ سے پیدا ہوئے اور جملہ علوم کا آخری منشا یہی رہے گا۔ اور رہنا چاہئے کہ ان کی مدد سے بنی نوع انسان کی زندگی زیادہ فیض بخش ہو اور زیادہ خوشی میں گذرے"(۲)

جرمانی ڈاکٹر ہونیگر دلیری سے کہتا ہے۔

"علم علم کے لئے قابل نفرین ہے"(۳)

موجودہ زمانے کا رجحان قطعی طور پر افادیت کیطرف ہے لہذا مسئلہ تعلیم کی تحلیل اسی روشنی میں دریافت کرنی چاہئے۔ مثالیت کے پھیر میں پڑنے سے مسئلہ تعلیم غیر تجزیہ شدہ رہا۔ اس کی تحلیل خاطر خواہ اسی وقت ممکن ہے جب مثالیت سے نہیں بلکہ عقلیت سے مدد لی جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف ایک ہی ہونا چاہئے یعنی یہ کہ تعلیم سے مرفہ الحالی میں اضافہ ہو۔

تعلیم یافتہ بنانا تعلیم کا حقیقی مقصد نہیں۔ حقیقی مطلوبہ چیز مرفہ الحالی ہے نہ کہ تعلیم۔ اس اہم جملہ سے جو لوگ متفق نہ ہوں یا اس کے فلسفے کو قطعی ناقابل لحاظ تصور کریں، انہیں چاہئے کہ اس مضمون کو زیادہ مطالعہ کرنے کی زحمت ہی نہ گوارا فرمائیں۔ کیونکہ یہ عمرانیات کا بنیادی اصول ہے کہ حقیقی چیز جو انسان کو

---

(۱) ماخوذ از "Meister der Politik" مرتبہ Professor Marcks' Muller مطبع Verlagsanstalt برلن ۱۹۲۳ء جلد دوم صفحہ ۲۲۱

(۲) Einfuhrung die Soziologie مصنفہ W. Jerusalem مطبع Braumuller ویانا ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۲۵ (۳) ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴

[illegible] ہے نہ تربیت بلکہ لذت جس میں مرفہ الحالی اور خوشحالی دونوں پنہاں ہیں۔ بیشک یہ سچ ہے کہ لذت حاصل کرنے کے ذرائع زر و دولت تعلیم و تربیت ہیں مگر فرق یہی [illegible] حقیقی مطلوبہ شئی جو ہر شخص ہمیشہ چاہتا ہے لذت و مرفہ الحالی ہے۔

تعلیم کی ضرورت

مضمون بالا سے تو ظاہر ہو چکا ہوگا کہ عمرانیات لذتیت کے اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کہ ہر انسان کا مقصد "طلب منفعت یا دفع مضرت" ہوتا ہے۔ اور زندگی کے اسی عالمگیر نظریہ کے تحت وہ تعلیم حاصل کرتا ہے، کیونکہ تعلیم سے انسان کو یا تو براہ راست مسرت حاصل ہوتی ہے۔ (جیسے اکثر لوگوں کو داغ، غالب وغیرہ کے دواوین کے مطالعہ یا ناولوں کے پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے) یا اس کی کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے فنی تعلیم حاصل کرنے سے پیشہ وروں کو، نظری تعلیم حاصل کرنے سے مدرسین اور معلمین کو، تجارتی تعلیم حاصل کرنے سے تاجر کو، اور زرعی تعلیم سے کسانوں کو یوں فائدہ ہوتا ہے کہ ان کی کارکردگی بڑھتی ہے، کارکردگی کے بڑھنے سے معاشی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور معاشی دولت میں اضافہ ہونے سے مرفہ الحالی بڑھتی ہے۔ ان کے علاوہ تعلیم کی ضرورت بسا اوقات اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ تعلیم سے مہذب اور متمدن بننے کے مواقع زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ خود ہمارے پس ماندہ ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی اولاد کو تعلیم محض اس وجہ سے دیتے ہیں کہ تعلیم مہذب آدمی کے لئے ضروری ہے۔ اور وہ یہی چاہتے ہیں کہ لوگ انھیں "مہذب" تصور کریں یا یہ کہ ڈگری حاصل کر کے کم از کم اپنے محلے یا خاندان میں کوئی خاص امتیازی درجہ حاصل کرلیں۔ بہرطور انسان علم تین وجوہ کی خاطر حاصل کرتا ہے یعنی کارکردگی کے لئے، یا مسرت کی خاطر، یا تہذیب و تمدن

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۷

Volkswirtschaftliche Systeme der Gegenwart

طبع Braun کارلزروہے

کی وجہ سے۔ ان تینوں میں ثانی الذکر اور آخر الذکر یعنی محض مسرت یا تہذیب کی خاطر تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے جو لوگ دفاتر میں کام کرتے ہیں، سڑکوں پر پسینے ٹپکاتے ہیں، مدرسوں میں درس اور جامعات میں تعلیم دیتے ہیں وہ زیادہ تر معاشی فوائد کی خاطر یعنی محض محنت کے معاوضے کی خاطر مصروف کار ہیں۔

بہر طور مسئلہ تعلیم کو عملی اہمیت محض اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس کا نہایت قریبی تعلق مرفہ الحالی سے ہے۔ لہذا عمرانیاتی نقطۂ نظر سے تعلیم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ تعلیم سے کارکردگی بڑھتی ہے انسان کو تعلیم اسی قسم کی دینی چاہیئے جس سے اس کی کارکردگی میں اضافہ ہو۔ اور وہ زیادہ آسانی سے کسب معاش کر سکے اور اس میں پیدائش دولت کے لئے جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ موزونیت پیدا ہو جائے۔ یہی عمرانیات کی تعلیم اور اس کا نصب العین ہے۔

اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگوں سے ان کی قابلیت، لیاقت واستطاعت کے مطابق کام لیا جائے۔ دنیا میں انہیں لوگوں نے ترقی کی جن سے ان کی قابلیت کے موافق کام لیا گیا۔ دنیا کے بہترین اور مشہور ترین افراد اگر اپنی قدرتی قابلیت سے فائدہ نہ اٹھاتے تو قطعی نکمے نکلتے۔ اگر شیکسپیئر سے سنگتراشی اور مچل اینگلو (Michelangelo) سے فلسفی کا کام لیا جاتا۔ اگر بسمارک کو پروفیسر السنہ قدیمہ اور براؤن کو برطانوی سفیر بنایا جاتا۔ اگر گوتم بدھ کو سپہ سالار اور شیواجی کو رہبر مذہب بننے پر مجبور کیا جاتا۔ اگر زمانہ سرسید کو شاعر اور غالب کو مصلح قوم بناتا تو نہ انگریزی ڈرامے کی یہ شان ہوتی اور نہ مچل اینگلو کی سنگتراشیاں (جو پانچ سدیاں گذر جانے کے باوجود بھی بہترین تصور کیجاتی ہیں) دنیائے فنون لطیفہ کو محظوظ کرتیں۔ بسمارک از بر دست فولادی بسمارک بحیثیت کسی پروفیسر کے زندگی گذار دیتا اور پروفیسر براؤن خود اپنی حکومت کو نقصان پہنچاتے غرضکہ سب باعث بدتری نہ کہ بہتری ہوتے۔

لہذا تعلیم کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ تعلیم دینے سے انسان کے اصلی جوہر کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی مخفی جوہر کا انکشاف ہوتا ہے نہ صرف یہ بلکہ مختلف قابلیتوں کے صحیح اندازہ کرنے کا

موزوں مناسب ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص میں مختلف قابلیتیں ہوتی ہیں، یعنی علوم، فنون، السنہ، [illegible] کے لئے مختلف استعداد ہوتی ہے۔ لہٰذا نہ صرف ذاتی مرفہ الحالی و خوش حالی بلکہ قومی بہبودگی اور دنیاوی ترقی (World progress) کیلئے یہ ضروری ہے کہ انسان زیادہ تر وہی کام کرے جس کیلئے اس میں سب سے زیادہ اہلیت اور صلاحیت ہو۔ یہ شریفانہ اور قابل تقلید درس ہمیں ان تمام لوگوں کی سوانح عمریوں سے حاصل ہوتا ہے جنھیں دنیا (Versatile Genius)(۱) کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بالخصوص گوئٹے (Goethe) کی زندگی نہایت ہی سبق آموز ہے۔ گوئٹے نہ صرف شاعر، ناول نویس اور ڈرامہ نگار تھا۔ بلکہ اسے طبابت، ارضیات فلسفہ اور مصوری میں بھی بڑا دخل تھا۔ اگر وہ چاہتا اور اپنا وقت زیادہ تر ان میں سے کسی ایک میں صرف کرتا، تو وہ ایک قابل قدر طبیب، ماہر ارضیات، فلسفی اور مصور بن سکتا تھا۔ مگر بحیثیت ایک خود شناس آدمی کے اس نے اپنی فطرت کو خوب پہچانا۔ اور زیادہ تر ایسے ہی کام میں مصروف رہا جس کے لئے اس میں سب سے زیادہ قابلیت موجود تھی یعنی یہ کہ شاعری اور ڈرامہ نویسی میں اس نے اپنی زندگی گذار دی۔ بہر طور ایک شخص میں مختلف چیزوں کے لئے مختلف قسم کی قابلیتیں ہوتی ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ایک ہی فن یا علم یا زبان کے لئے مختلف لوگوں میں کس حد تک مختلف درجوں (Grades) کی قابلیت ہوتی ہے۔

قابلیت کے لحاظ سے انسانوں کی تقسیم

قابلیت کے اعتبار سے ہم انسانوں کی تین قسمیں قرار دے سکتے ہیں۔ پہلے طبقے میں ایسے لوگوں کا شمار ہے جن میں عقلیت اور تحصیل علم یا ہنر یا زبان کی قدرتی قابلیت اسقدر ہوتی ہے کہ انھیں خود بخود اپنی قابلیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور وہ معمولی محنت و مشقت سے اعلیٰ درجے کا علم یا ہنر یا زبان حاصل کر لیتے ہیں۔ جو محنت وہ تحصیل علم یا ہنر کے لئے کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ

(۱) یعنی گوناگوں قابلیتیں رکھنے والے لوگ

یعنی بالکل ہی غیر متناسب قابلیت یا مہارت یا زبان دانی ان میں آجاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن میں قدرتی ذہانت اور استطاعت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور جن میں تحصیل مہارت کی موزونیت اسقدر مہوتی ہو کہ انھیں کھیلتے کھیلتے علم و فن آجاتا ہے۔

دوسرے طبقے میں وہ لوگ شمار کئے جاتے ہیں جن میں اکتساب علم یا تحصیل مہارت کی مطلق صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ فطرتاً بالکل "کورے" ہوتے ہیں یعنی ان میں دلی اور دماغی قابلیت اسقدر کم ہوتی ہے کہ وہ بہزار دقت بھی اہل نہیں بن سکتے۔[1]

(۱) اس حقیقت کو کہ نااہل و نافہم انسانوں کو تعلیم و تربیت سے مطلق فائدہ نہ تو پہنچا اور نہ پہنچ سکتا ہے مشرقی شعرا نے بھی خوب پہچانا جس کی تصدیق حسب ذیل مثالوں سے خوب ہوسکتی ہے

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا — نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی — نادان کو الٹ بھی تو نادان رہا (امجد حیدرآبادی)

درختے کہ تلخ ست ویرا سرشت — گرش در نشانی بہ باغ بہشت
وراز جوئے خلدش بہنگام آب — بہ بیخ، انگبیں ریزی و شہد ناب
سرانجام جوہر بکار آورد — ہماں میوۂ تلخ بر آورد
اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت — نہی زیر طاؤس باغ بہشت (فردوسی)
بہنگام آں بیضہ پروردنش — ز انجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمۂ سلسبیل — بداں بیضہ گردم دمد جبرئیل
شود عاقبت بچہ زاغ زاغ — برد رنج بیہودہ طاؤس باغ (فردوسی)

फूलहि फलहि न बेत यद्यपि सुधा बरसहि जलद
मूरख हृदय न चेत जो गुरु मिलहि बिरंचि सम (تلسی داس)

دوہا:- پھولیں پھلیں نہ بیت، اید ہپ سدھا برسیں جلدم
مورکھ ہر دسے نہ چیت، جو گرد ملیں برنچ سو

(بقیہ بر صفحہ ۱۳)

تیسرا طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جس میں ایک گروہ کثیر ہے۔ اس گروہ کے لوگوں کی خصوصیت
... ہو نہیں سکتے۔ اور بعض کام کرنے کی ان میں اچھی خاصی صلاحیت ہے۔ شرط البتہ محنت و مشقت، تسلیم و جفاکشی ہے۔ بہت سے کاموں کے لئے ان میں متوسط درجے کی قابلیت موجود ہے۔ اور حسن اتفاق سے جب کبھی وہ اپنے فطری رجحان کے مطابق پیشہ اختیار کرتے ہیں تو انہیں خاصی کامیابی ہوتی ہے۔ ورنہ مدت العمر مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن علوم یا کاموں کے لئے ان میں متوسط درجے کی قابلیت ہوتی ہے۔ اس کو اختیار کرنے یا انجام دینے کے لئے انہیں اس علم یا فن کے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور انہیں اس کی تحصیل کے لئے باضابطہ تعلیم و تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔

غرض یہ ہے کہ لوگ قابلیت کے اعتبار سے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ درجوں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔ عبد اللہ خاں اوج[1] ہونٹ چبا چبا کر رہ گئے۔ مگر غالب کی ہمسری تو کجا ان کی گرد تک نہ پہنچ سکے۔ نیرو (قیصر روم) کو موسیقی میں کمال حاصل کرنے کی حسرت رہی۔ آخری شہنشاہ جرمانیہ میں مصور بننے کی فرسودہ دھن شاید اب بھی باقی ہے۔ اور بیتھمن ہالویگ (Bethmann-Hollweg

(۱) تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے: آب حیات مصنفہ محمد حسین آزاد، اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۷ء صفحہ ۵۱۵ تا صفحہ ۵۱۶

(بقیہ صفحہ ۱۲)

اگر سدا آب بہشت کی بارش ہوتی رہے (تب بھی) بید پھولے پھلے گا نہیں (اسی طرح) بیوقوف (سادہ لوح) کبھی ہوشیار نہ ہو سکے گا حتی کہ علم کا دیوتا ہی اس کا استاد مقرر ہو۔ نہ صرف تعلیم ہی سے انسان کی طینت نہیں بدل سکتی بلکہ غصہ و جھڑکی سے بھی کچھ فیض نہیں پہونچتا۔

ملامت کن مرا چندانکہ خواہی — کہ نتواں شستن از زنگی سیاہی
باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در بوم شور خس
شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسی — ناقص بہ تربیت نہ شود ای حکیم کس
... — در و تخم عمل ضائع گرداں

(سعدی)

تے باوجود اپنی سیاسی تعلیم اور قانونی معلومات کے جرمانیہ کو بچا سکے۔ یکھا تو درکنار تباہ کر کے رکھا۔ انسان میں تحصیل علم و فن کی قدرتی صلاحیت ہونی چاہئے۔ تب کہیں درس و مشق سے فائدہ ہوتا ہے۔ یوں عقل کے اندھوں کو پڑھانے لکھانے سے سوائے ندامت و تکلیف کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

تعلیم و تربیت سے سب سے زیادہ فائدہ طبقۂ سوم کے لوگوں کو ہوسکتا ہے جن میں محنت و مشقت کرنے علم و مشق حاصل کرنے سے اسی مناسبت سے علمیت و مہارت آتی ہے۔ لارڈ ریڈنگ کبھی وائسرائے ہند نہ بن سکتے۔ اگر انھیں معمولی تعلیم و تربیت کے علاوہ قانون دستور، سیاسیات کی تعلیم نہ دیجاتی۔ اور انھیں منصفی، حکومت مصلحت آموزی (Diplomacy) کا موقع نہ دیا جاتا۔ جسقدر طبقۂ سوم کے لوگ دنیا میں عمدہ کام کرگئے ہیں سب کو تعلیم و تربیت کے علاوہ تجربہ حاصل کرنیکا عملی موقع بھی دیا گیا تھا۔ مگر یہ شرائط صرف متوسط درجے کی ذہانت کے لوگوں پر عائد کئے جا سکتے ہیں۔ پہلا طبقہ یعنی غیر معمولی ذہانت و فراست رکھنے والوں کا طبقہ ان سے مستثنیٰ ہے اکبر اعظم اور فریڈرِش اعظم (شاہ پرشیا) کو کسی نے طرز حکومت اور آئین سلطنت کی نظری و عملی تعلیم نہیں دی تھی۔ اور اگر دی بھی گئی تھی تو وہ برائے نام تھی۔ اور جو سیاسی فتوحات انھیں حاصل ہوئے۔ وہ اس تھوڑی سی تعلیم کے مقابلے میں جو انھیں دی گئی تھی۔ بالکل ہی غیر متناسب تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بسمارک کو اپنی پراگندہ و منتشر اقوام کو یکجا کرنے میں ملک کو ہر وقت حسب ضرورت آئین و قوانین دینے کی صلاحیت صرف ان چند لکچروں کیوجہ سے پیدا ہوئی جو بحیثیت طالب علم گٹنگن (Gottingen) یونیورسٹی میں سنے تھے۔ اگر تعلیم و تربیت کی شرط حکومت کے لئے لازمی قطعی طور پر لازمی ہوتی تو حیدر علی کبھی شاہ میسور نہ بن سکتا۔ اور نہ موجودہ زمانے میں شاہ رضا خاں پہلوی تخت و تاج ایران حاصل کرتے۔ سکندر اعظم اور اس غیر معروف جزیرے کے باشندے کو جس کا نام ہمیشہ بہترین، ذہین ترین اور زبردست انسانوں میں شمار ہوگا۔ کیا محض اس فوجی تعلیم کیوجہ سے زمانے کو متحیر کرنیوالے فتوحات حاصل ہوئے؟ نپولین محض ذاتی قابلیت، ذاتی جوہر، ذاتی محنت و مشقت کے باعث

یوروپ کا سردار بنا۔ بغیر سیاسیات و معاشیات کی تعلیم حاصل کئے اس نے ہر سیاسی اور بیشتر معاشی مشکلات کو آسان کیا۔ اس میں موقع شناسی، مردم شناسی، فہم عامہ و قوت مشاہدہ جیسی نادر خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے اس نے ترقی کی۔ مگر محض اس وجہ سے کہ عقلا، ذہین و فہیم لوگ چند پیشوں میں مثلاً خانہ داری، سیاسیات، حکومت وغیرہ بغیر تعلیم حاصل کئے کامیاب زندگی بسر کرچکے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تعلیم و تربیت ذہین و فہیم لوگوں کے لئے ضروری نہیں تو معین و مفید ضرور ہے۔

فوائد تعلیم

تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ اسکے ذریعے بیشتر انسانوں کی پوشیدہ قابلیتیں ظہور میں آتی ہیں۔ بغیر تعلیم و تربیت کے نہ تو موجودہ کاروبار اس نہج پر چل سکتا۔ اور نہ یہ سہولتیں جو ہمیں سائنس و میکانیت نے بہم پہنچائی ہیں حاصل ہوتیں۔ تعلیم سے انسان کو کم از کم نظری اعتبار سے (Theory)، اصول مرفہ الحالی، حفظان صحت، طریق تجارت، اصول اصلاح معاشرت، میکانیت (Mechanism) وغیرہ سے روشناس کرایا جاسکتا ہے۔ خاطرخواہ طور پر ترقی اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان عمل کرنے سے پہلے ایک نظری خاکہ کھینچ لے اور کام شروع کرنے سے پہلے ایک نظام العمل بنالے۔ یہیں علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ بغیر نظری معلومات کے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ انسان کوئی عمدہ کام انجام دے سکے۔

مثال کے طور پر بلدۂ حیدرآباد کے مکانوں کو دیکھئے۔ محض ماہران فن تعمیر سے مشورہ لئے بغیر مکانات تعمیر کرانے کا نتیجہ ہے۔ کہ ہمارے مکانات اسقدر بے ڈھنگے، بدوضع، تکلیف دہ، مضر حفظان صحت اور بدنما ہوتے ہیں کہ لوگوں کو تکلیف کا احساس ہونے لگتا ہے اور جیسا کہ ہر محلے میں بلکہ ہر سڑک پر دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے نئے تعمیر شدہ مکانات میں بھی لوگ پھونس کے چھپر ڈال لیتے ہیں۔ یا ٹین وغیرہ سے عارضی طور پر برآمدے موٹر خانے (Garages

تیار کر لیتے ہیں۔ لوگ مکان بناتے ہیں جس میں برآمدے بھی ہوتے ہیں۔ گر موسم کا انھیں لحاظ کہاں؟ مکان تعمیر ہو جاتا ہے۔ اور گرمی یا برسات میں جبکہ کمروں میں کسیقدر حبس ہونے لگتا ہے اور وہ دالانوں میں "پناہ" لینا چاہتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دالان جو اکثر مغرب نما یا تین طرف سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے کسی کام کے نہیں، کیونکہ گرمیوں میں عین دوپہر کے وقت وہاں چلچلاتی دھوپ ہوتی ہے۔ یا جنوبی مغربی بادِ برشگال سے سب سے پہلے دالان ٹھہرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہاں کے لوگوں کو یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ ہر شخص پیدائشی ماہر تعمیرات ہے مکان نہ صرف تنگ و تاریک ہوتے ہیں بلکہ ان میں مکانیت بھی کم ہوتی ہے۔ اور اکثر ہماری تہذیب و تمدن کے اعتبار سے غیر موزوں ہوتے ہیں نتیجہ ظاہر ہے کہ جسقدر محنت و معاشی دولت بالعموم عمارت پر صرف ہوتی ہے۔ اسی نسبت سے مالکان مکان کو فائدہ نہیں پہونچتا۔ اور نہ شہر کی رونق اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے ہماری لاعلمی کا۔

یہ بدیہی بات ہے جسکے مزید ثبوت کی چنداں ضرورت نہیں۔ کہ بغیر اصولی تعلیم اور نظری واقفیت کے مشق اور عملی تجربہ اسقدر فیض رساں ہو ہی نہیں سکتا جسقدر کہ تعلیم حاصل کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور ہم بطور نظریہ کے اس عام مشاہدے کو پیش کر سکتے ہیں کہ بغیر علم کے جو کام ہوگا وہ بے ڈھنگا، بے ترتیب و غلط ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ بعض طباع (geniuses) بغیر نظری تعلیم کے عمدہ کام کر لیں۔ گر بیشتر حالات میں یہ تصور ہی بعید از قیاس ہے۔ موجودہ زمانے کی کاروباری زندگی اسقدر پیچیدہ ہو گئی ہے کہ دنیا میں بغیر علم کے کام ہی نہیں چلتا اور ہزارہا کام ایسے ہیں جہاں دنیا کا غالباً سب سے بڑا عقلمند آدمی بھی بغیر معلومات کے کسی مصرف کا نہیں ہو سکتا ۔ مثال کے طور پر کسی بڑے بنک کے ڈائرکٹر کو دیکھئے۔ کیا دنیا کا سب سے زیادہ ذہین، فہیم و عقیل کسی بڑے رقمی کاروبار کو سنبھال سکتا ہے۔ تا وقتیکہ اسے نظری تعلیم نہ دی جائے اور عملی تجربہ نہ ہو۔

موجودہ عہد کے تاریخ انگلستان کے جاننے والوں کو معلوم ہے کہ جسقدر اہمیت برطانیہ کے وزیر اعظم کو حاصل ہے تقریباً اتنی ہی حقیقی اہمیت انگلستان کے قومی بنک کے ڈائرکٹر جنرل کو حاصل ہے

یہ بات اور ہے کہ جس قدر عالم استحکام، اہمیت وزیر اعظم کو حاصل ہوتی ہے بنک کے ناظم اعلیٰ کو میسر نہیں ہو سکتی گو حقیقتاً [illegible] ہیں۔

انسان کی زندگی کا دار و مدار معاشی جد و جہد پر ہے اور معاشی جد و جہد ناممکن ہے تاوقتیکہ قدر زر میں اضافی سکون (Relative stability) پایا جائے۔ لہٰذا بیرطیکہ کہ معاشی مسائل میں اہم ترین مسئلہ زر کا ہے وہ بھی قیام قدر زر کا۔ قدر زر میں یکایک غیر معمولی تغیرات ہو جانے کی وجہ سے جو جو تکالیف ہوتی ہیں اور جو ناگفتہ بہ نقصان قوم کی معاشی دولت کو ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی بخوبی کر سکتے ہیں جنہوں نے یورپ کے وسطی ممالک کی تباہی (جو زیادہ تر قدر زر کی تباہی کی وجہ سے نمودار ہوئی تھی) اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو یا روس اور دیگر ممالک کی مصیبتوں کا تصحید بد معاشی تاریخ یورپ میں پڑھا ہو۔ مختصر یہ کہ زر کا کام سنبھالنا ایک نہایت دشوار فریضہ ہے اور اس کام کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنہوں نے نظری تعلیم یعنی اصول معاشیات و قوانین مالیات کا مطالعہ کیا ہو اور مفہوم زر اور اس کے اشغال، تبادلۂ زر، سکہ جات، نقد پذیری، نوٹ، قوامین داد و ستد اور اسی قسم کے سیکڑوں امور سے بخوبی واقف ہو۔ غرض یہ کہ تعلیم کے فوائد کا لب لباب ایک مختصر جملے میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے: تعلیم سے نیم اہل اہل اور اہل اہل تر بنتا ہے۔

تعلیم کے فوائد سے ہمیں انکار نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ تعلیم سے انسان کو جو کچھ فیض پہنچتا ہے اس کے اندازہ کرنے میں بسا اوقات سخت مبالغہ کیا جاتا ہے۔ تعلیم، مروجہ نصاب، وطرز تعلیم میں نقائص بھی موجود ہیں، کچھ ایسے جو ہر جگہ نمودار ہیں اور کچھ ایسے جو خاص ہندوستان ہی میں موجود ہیں۔ فی الحال ہم ایسے عام نقائص سے بحث کریں گے جو بالعموم ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس سے قبل ہی ہمیں تعلیم کے محدود امکانات پر غور کرنا لازمی ہے کیونکہ اس طرح نقائص تعلیم کے اسباب سے بھی واقفیت ہو جائیگی۔

تعلیم کے محدود امکانات

تعلیم سے یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ایک شخص جس میں کام کرنے یا علم سیکھنے کی صلاحیت موجود ہو اس

قابل بن جائے گا ایک مقررہ و معینہ حد تک علم یا ہنر حاصل کر سکے۔ اگر تعلیم سے اکتساب علم کی قابلیت نہیں پیدا ہوتی۔ اس کے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم تحصیل علم و ہنر کی محدود صلاحیت کے نظریہ کو بیان کریں۔

نظریۂ محدود صلاحیت تحصیل علم و ہنر تعلیمی نقطۂ نظر سے لوگوں کی قابلیت و استطاعت پر غور کرنے سے منکشف ہوتا ہے کہ ہر شخص میں ہر علم یا فن یا زبان کو حاصل کرنے کی ایک مقررہ اور معینہ صلاحیت ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ نفی میں ہوتی ہے مگر بسا اوقات ایک ایجابی خصوصیت میں۔ جس کا ہونا حد یقین تک پہنچ گیا ہے، کیونکہ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ ہر شخص ایک خاص کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہوتا ہے اور وہ ایک کام اس سے اچھے خاصے طریق پر انجام پاتے ہیں۔ بقیہ کاموں میں سے بعض کے لئے تو اُس میں بالکل ہی صلاحیت نہیں ہوتی اور بعض وہ برے بھلے طور پر انجام دے سکتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ موجودہ زمانے میں جو مشہور ہستیاں ہیں وہ کس علم و ہنر کے لئے خاص طور پر موزوں ہیں؟ جیک ڈیمپزی (Boxing Jack Dempsey یعنی گھونسے بازی کے فن کا مشہور عالم ماہر ہے۔ گاما کہ دنیا کا بہترین پہلوان ہے۔ Suzanne Lenglen جو تمام مستورات میں بہترین ٹینس کھیلنے والی ہے۔ خود ہمارے شہر کے سپوت شاہ مرزا بیگ مرحوم جو دنیا کے بہترین پولو کے کھلاڑی تھے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بھتیجے کنور دلیپ سنگھ کہ بہترین ہندوستانی کرکٹ کھیلنے والے تسلیم کئے جاتے ہیں ان سب میں مشق و محنت کی وجہ سے اس قدر مہارت نہیں پیدا ہوئی بلکہ ان میں اپنے اپنے فن کی تحصیل کی قدرتی صلاحیت موجود تھی جو کسی سبب یا اتفاق سے ظہور پذیر ہوئی اور محنت و استقلال، مشق و عادت کی وجہ سے منور ہو کر چمکی۔ اگر Tunney تبت میں، وزیر علی عرب میں، ہمس ولس اعظم گڑھ میں اور گاما آسٹریلیا میں پیدا ہوتے تو دنیا کو بلکہ خود اُن لوگوں کو اپنی قابلیت و مہارت سے واقف ہونے کا موقع نہ ملتا۔ اگرچہ انکی صلاحیتیں انکے اندر خفیہ طور پر موجود ہوتیں۔

بہر طور ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسان میں علم کے لئے تحصیل علم کی، اور فن یا زبان کے لئے

تحصیل ہر زبان کی پیدائشی صلاحیت (قدرتی طور پر) موجود ہونی چاہیے جب ہی علم و مشق کو فائدہ پہنچتا ہے ورنہ نہیں، نہ صرف یہ بلکہ الٹا نقصان ہوتا ہے محنت کرنیوالوں کی محنت سکھانے والوں کو کمال رائگاں جاتا ہے، اور نتیجہ اگر کچھ نکلتا بھی ہے تو کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہوتا ہے۔

اگر غالب مرثیہ لکھتے اور انیس عاشقانہ شاعری کرتے، داغ قومی اور فلسفیانہ نظمیں لکھتے تو اردو زبان میں غالب۔ انیس اور داغ جیسے شعرا کی وہ شان و اہمیت ہی نہ ہوتی اور نہ اردو ادب میں اس قدر اعلیٰ ذخیرہ ہوتا کیونکہ ان سب کی شاعری متوسط بلکہ ادنیٰ قسم کی ہوتی۔ اسی طرح اگر آزاد اپنی قدرتی صلاحیت کو نظر انداز کر کے اعلیٰ شاعر بننے کی ہوس کرتے اور مولانا شبلی اپنی سادگی کو چھوڑ کر رنگین بیانی کی تمنا رکھتے اور اسی کی کوشش میں سرگرم رہتے تو اردو نثر بھی تباہ ہو جاتی۔ ہر شخص میں ہر علم فن و زبان کے حاصل کرنے کی مقررہ و معینہ صلاحیت ہوتی ہے جس سے (جیسا کہ ہم آئندہ بیان کرنے کی سعی کرینگے) تجاوز کرنا بھی ممکن ہو۔ یعنی یہ کہ انسان نہ صرف اپنی قابلیت کو نہیں بدل سکتا بلکہ جسقدر قابلیت قدرتی طور پر ہوتی ہے اس میں ایک ذرہ (Atom) برابر بھی اضافہ نہیں کرسکتا۔ اسکی کیا وجہ ہے؟

تعلیمی قابلیت کا مفروضہ تجزیہ

افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے انگریزی ادب تعلیمات میں اس کا جواب نہ مل سکا۔ غالباً جیسا کہ پروفیسر بسیرل نے ایک مرتبہ دوران تقریر میں کہا تھا کہ علمائے عضویات (Physiologists) نے دماغ کے متعلق اچھی طرح اور اطمینان بخش طور پر تحقیقات نہیں کی۔ علوم عمرانی نے جب مسئلہ تعلیم کی تحلیل چاہی تو اسے لامحالہ اس سوال سے دوچار ہونا پڑا اور اس نے اپنی طرف سے ایک مفروضہ تجزیہ (Hypothetical Analysis) پیش کیا۔ ممکن ہے غلط ہو۔ ممکن ہو صحیح ہو۔ فہم عامہ کو تو کم از کم یہ تجزیہ غلط نہیں معلوم ہوتا۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص روزانہ پندرہ منٹ مشق کر کے رفتہ رفتہ سائیکل چلانا سیکھ لے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس مشق سے اس کے جسم میں کسی

قسم کے مادی تغیرات واقع ہوئے۔ سائیکل چلانے سے قبل بھی وہ معمولی طور پر محنت ومشقت کرتا تھا۔ اب اس نے چلنا پھرنا کم کرکے سائیکل چلانا سیکھ لیا اور عملی اعتبار سے اس کے جسم میں کسی قسم کا قابل لحاظ نمایاں فرق نہیں ہوا۔ پھر بھی اس کے جسم میں ایک نئی اہلیت پیدا ہوگئی جو دو پہیوں کے ڈھانچے پر توازن قائم رکھنے کی صلاحیت ہے، یعنی اب وہ سائیکل پر بیٹھ کر بھی اپنے جسم کے توازن کو قائم رکھ سکتا ہے۔

بعینہٖ یہی حال پیراکی کا ہے۔ جس شخص کو تیرنا نہیں آتا وہ پانی میں برے بھلے طور پر ہاتھ پیر مارنے کے باوجود اپنے جسم کو پانی کی سطح پر قائم نہیں رکھ سکتا اور ڈوب جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک پیراک اپنے ہاتھ پیر کو ایک خاص ڈھب سے حرکت دیتا اور تیرتا رہتا ہے۔ تقریباً اسی طرح تحصیل علم کر انسان کے دماغ میں بظاہر کوئی مادی تغیرات نہیں ہوتے بلکہ اس کا دماغ منجھ جاتا ہے اور اس میں (بشرطیکہ صلاحیت تحصیل علم موجود ہو) خیر وشر، صحیح وغلط، حق وباطل میں تمیز کرنے کی، اپنے خیالات میں توازن، اور اپنے دماغی اعصاب پر قابو رکھنے کی اہلیت پیدا ہوجاتی ہے اور یہی فیض تعلیم ہے کہ وہ ہمارے دماغ کو مشق وعادت کے ذریعے متوازن کرتی ہے۔ یہ البتہ تعلیم، اصول تعلیم، طریق تعلیم فلسفہ تعلیم اور ماہرین تعلیم کے بس سے باہر ہے کہ جو مادہ انسان کے دماغ میں موجود ہے اس میں رتی برابر بھی اضافہ کریں۔ یعنی یہ کہ تحصیل علم یا ہنر یا زبان کی صلاحیت کو اس سے زیادہ بڑھائیں جو ہر شخص میں علم یا فن یا زبان کے لئے قدرتی طور پر معین ہوتی ہے۔

افلاطون ہی سقراط کا ہم پلہ فلسفی ہوسکا، ورنہ سقراط کے شاگرد بیسیوں تھے، محض اس وجہ سے کہ اس میں تحصیل علم کی صلاحیت موجود تھی۔ سقراط کے بجائے کوئی اور اچھی ذہانت رکھنے والا بلکہ معمولی استاد ہی افلاطون کو مل جاتا تب بھی افلاطون افلاطون ہی نکلتا۔ اس حقیقت کو جرمانیہ کے مشہور نقاد (critique) لیسنگ نے چٹکلے کے طور پر یوں بیان کیا ہے: "اگر رافیل Raphael (ہالینڈ کا بہترین مصور) بغیر ہاتھوں کے پیدا ہوتا پھر بھی وہ رافیل ہی نکلتا[1]"

سقراط کا ایک مشہور قول ہے کہ "ہر پتھر میں ایک مورت ہے۔ مگر ضرورت سنگتراش کی ہے" کہ

پتھر کو کاٹ کر مورت بنائے۔" یہ قول اس معنیٰ میں کہ طبقہ سوم کے لوگ محض عمدہ تدریس و تعلیم ہی سے قابل بن سکتے ہیں صحیح ہے۔ ہم اگر لفظاً سقراط کے قول کا تجزیہ کریں تو وہ غیر صحیح ثابت ہوتا ہے۔ کیا میل انجیلو جیسا ماہرِ صورت گر حیدر آبادی پتھر سے اعلیٰ کام کے نمونے پیدا کر سکتا تھا؟ کیا تاج محل کی نقاشی و سنگتراشی شاہ آبادی پتھروں پر ممکن تھی؟ پتھر کو سنگتراش کی ضرورت ہی تو کیا سنگتراش کو اعلیٰ، عمدہ، نفیس پتھر کی احتیاج نہیں؟ سنگتراش بغیر عمدہ پتھر اور اعلیٰ اوزار کے مثل ایک روح کے ہے جو قالب کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔ بہترین اور قابل رشک صورت تو ظاہر ہے یہی ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں قابل ہوں، پھر بھی یہ مسلمات سے ہے کہ شاگرد کو عمدہ اُستاد کی اسقدر احتیاج نہیں جس قدر کہ استاد کو عمدہ شاگرد کی ہوتی ہے۔

دنیا کو نہ تو سقراط کے اُستاد کا علم ہے اور نہ کانٹ کے شاگرد کا۔ اگر اُستاد کی ضرورت قطعی ہوتی تو سقراط کا استاد بھی سقراط کا ہم پلہ فلسفی ہوتا اور کانٹ کے شاگرد کانٹ کے رتبے تک تو پہنچتے۔ غرض یہ کہ انسان میں تحصیلِ علم کی قابلیت ہونی چاہئے تب ہی تعلیم سے اسے فیض پہنچ سکتا ہے ورنہ نہیں۔

نظریۂ ظرف یا لبریزیت

جب یہ ثابت ہو گیا کہ کسی شخص میں اکتسابِ علم و کسبِ ہنر کی جتنی قدرتی صلاحیت ہوگی، اسی قدر وہ بشرطِ محنت و جانفشانی، علم و ہنر حاصل کر سکے گا، تو ظاہر ہے کہ تحصیلِ علم و ہنر کی بہت ہی محدود صلاحیت رکھنے والے کی صلاحیت میں اضافہ ناممکن ہوگا۔ اور یہی نظریۂ ظرف یا لبریزیت کا منشا ہے جس طرح ہر کوزے یا گلاس میں اسی قدر پانی سما سکتا ہے جس قدر کہ اسمیں گنجایش ہو اسی طرح ہر شخص اتنا ہی علم و ہنر حاصل کر سکتا ہے جس قدر کہ اس میں حاصل کرنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہو۔ جس طرح ایک چھوٹے کوزے میں پانی کچھ دیر متواتر بھرتے رہنے سے کوزہ بہت جلد لبریز ہو جائے گا اور پانی اُس سے بہنے لگے گا اور اس میں ہزار دقت کے باوجود زیادہ پانی نہیں سمائے گا اسی طرح ہر شخص میں محنت و مشقت کر کے علم حاصل کرنے کی جس حد تک صلاحیت ہے اُسی حد تک وہ علم سے مستفید

[illegible] کے بعد محنت و مشقت تعلیم و تدریس، مشق و عادت سے کچھ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ شعر کہتے رہتے ہیں مگر "شاعر" نہیں بنتے، تصویریں اتارتے رہتے ہیں مگر "مصور" نہیں بنتے۔ اکثر محنتی طالب علم باوجود کوشش و جانفشانی کے ایک حد پہ پہنچکر رک جاتے ہیں اور سالہا سال کی کوشش کے باوجود علمی ترقی نہیں کر سکتے۔ اس کا سبب یہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ انکا دماغ معلومات سے لبریز ہو گیا۔ جس قدر انکا ظرف تھا اس قدر علم حاصل کیا اور مزید اضافہ ناممکن ہے۔ کیا یہ ہر شخص کا تجربہ نہیں ہے کہ جب دو چار نوجوان نئی زبان سیکھتے ہیں تو باوجود مساوی محنت و یکساں تعلیم کے بعض بہت زیادہ سیکھ لیتے ہیں اور بقیہ زباں دانی کے مختلف مدارج پر اپنی اپنی بساط کے موافق زبان حاصل کر لینے کے بعد تھم جاتے ہیں اور اس کے بعد ترقی محال ہو جاتی ہے؟

عملی مشکلات

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ کسی مسئلہ کی نظری تحلیل پیش کرنا بدرجہا آسان ہے بہ نسبت اس کی عملی تحلیل کے۔ یہی حال مسئلہ تعلیم کا ہے۔ اس سوال کا جواب کہ کسی شخص میں کسی علم یا فن کی صلاحیت کو دریافت کرنا کیونکر ممکن ہے، آسان نہیں۔ بڑے بڑے لوگ اس میں دھوکا کھا چکے ہیں۔ ہیلم ہولٹز (Helmholtz) جیسے عالم طبیعات نے گراف زیپلن (Graf Zeppelin) کے متعلق یہ رائے بیان کی تھی کہ "یہ ہوائی جہاز جو زیپلن تیار کرنا چاہتا ہے نظری اعتبار سے بھی قطعی ناممکن ہے۔" جرمانیہ کے پروفیسر گراف زیپلن کا مضحکہ اڑاتے تھے اور لوگ اُسے "پاگل گراف" کہا کرتے تھے۔ بہر طور کسی شخص کی قابلیت کا صحیح اندازہ وہ بھی قطعی طور پر کرنا آسان نہیں، بڑے بڑے منتظم ہی جن میں مردم شناسی کا مادہ تھا اس مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔ دوسری مشکل یہ پیش آتی ہے کہ قابل لوگ محض موقع نہ ملنے کی وجہ سے غیر معروف زندگیاں بسر کرتے ہیں اور دنیا کو انکی قابلیت کا علم ہی نہیں ہوتا۔

یہ سب سہی پھر بھی زمانہ جانتا ہے کہ ذوق ایک خاص درجے کے شاعر رہے اور غالب کا مرتبہ نہ پا سکے اور دبیر انیس کے مرتبے تک نہ پہنچ سکے۔ کیا کوئی شبہہ کر سکتا ہے کہ ذوق و دبیر نے

اپنے حریفوں سے سبقت لیجانے کے لئے جان توڑ کوشش نہ کی ہوگی، یا یہ کہ انکے پایہ تک پہنچنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا رکھا ہوگا پھر بھی کیا وجہ کہ باوجود اس حقیقت کے کہ زمانہ موافق تھا اور انہیں اپنے جوہر دکھانیکا موقع ملا ایک بڑھ گیا اور دوسرا پیچھے رہ پڑا؟ اس کا جواب نظریۂ ظرف یہ دیتا ہے کہ ایک کا پیمانہ جلد بھر گیا اور لبریز ہو کر چھلک گیا اور دوسرے نے چونکہ اُس میں ابھی استطاعت باقی تھی، ترقی کی۔

جب انسان ان نظریوں اور فلسفۂ تعلیم کے خلاف عمل کرتا ہے تو اسے ظاہر ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہوتا! اور جب وہ اپنی بے سود کوشش جاری رکھتا ہے تو اُسے بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ تعلیمات میں اس وجہ سے بھی چند در چند برائیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

دنیا میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی چیز فی نفسہ یعنی ہر زمانے، ہر حالت اور ہر شخص کے لئے صرف اچھی یا صرف بُری نہیں ہوتی۔ ہر خوبی میں تھوڑی سی بُرائی، ہر برائی میں کچھ نہ کچھ خوبی موجود رہتی ہے ہر شے میں خیر و شر پنہاں ہیں۔ خیرِ محض یا شرِ محض نامعلوم چیزیں ہیں۔ ماحول کے بدلنے سے بسا اوقات بُری چیزیں اچھی اور اچھی چیزیں بُری ہو جاتی ہیں۔ اس کلیہ سے تعلیم بھی مستثنےٰ نہیں تعلیم میں اگر ایک طرف کثیر فضائل و خوبیاں موجود ہیں تو دوسری طرف چند عیوب و معائب بھی ہیں۔ اور ایک علمی مضمون میں اُن سے چشم پوشی نہیں کیجا سکتی۔

رسالہ مخزن اور اُردو شہ پارے

تنقید بھی ایک اعلیٰ فن کی حیثیت رکھتی ہے جس کے متعلق یورپ میں خاص تعلیم ہوتی ہے۔ افسوس ہمارے تنقید نگاروں کا بڑا حصہ اس سے ناواقف ہوتا ہے جس کے باعث وہ صرف اپنا یہ فریضہ تصور کرتے ہیں کہ زیر نظر کتاب پر چند اعتراض کر دیں اور بس اور یہ اعتراض خواہ حق بجانب ہوں یا نہ ہوں کوئی بحث نہیں۔ حالانکہ تنقید یا تبصرہ کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس سے کتاب کی پوری حالت منکشف ہو جائے بلکہ ایک حد تک نفس کتاب سے استغنیٰ ہو جائے۔

اور پھر تنقید نگاروں کو یہ بھی معلوم رہنا چاہئے کہ جو امور کسی خاص فن سے متعلق ہیں انکے متعلق بلا واقفیت کوئی اعتراض نہ کر دیں۔ مثلاً ایک تنقید نگار جو لسانیات سے واقف ہو اگر وہ اس قسم کی کسی کتاب پر اعتراض کر دے تو اہل فن کے نزدیک تو اسکی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی مگر ممکن ہو عام اصحاب تنقید نگار سے موافق ہو جائیں۔

مولنا تبسم ایم۔ اے جنہوں نے " اردو شہ پاروں " پر تنقید کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے بالکل اسی حیثیت کے نقید نگار معلوم ہوتے ہیں۔ زیر نظر تبصرہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ " اردو شہ پاروں " کا عنوان کیا ہو یا وہ کس موضوع پر لکھی گئی ہے یا اس کے بجائے چند اعتراضات کر دیئے گئے ہیں۔ گویا تنقید کا مقصد چند جھوٹ سچ اعتراضات کر دینا ہے اور بس۔

حالانکہ مولنا تبسم کا یہ اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ صداقت کے ساتھ کتاب کے مضمون اور اس کے موضوع سے واقف کراتے اور اس کی خوبیاں بیان کرتے تاکہ مولف کی محنت اور جانفشانی کا اندازہ ہو سکتا۔ اس کے برخلاف جس انداز سے صرف اعتراضات کر دیئے ہیں اور پھر جس عامیانہ طرز پر اس کو لکھا گیا ہے وہ رسالہ مخزن کے صفحات کے لئے باعث افسوس ہو۔

جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ دو قسموں پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

جو نفس مضمون سے متعلق ہیں۔
جو نفس مضمون سے متعلق نہیں ہیں یعنی جن سے نفس کتاب کی کوئی خامی ظاہر نہیں ہوتی
پہلی قسم کے اعتراضات کے متعلق ہم کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ اس لئے اولاً سرسری طور
پر دوسری قسم کے اعتراضات کو لیا جاتا ہے۔ جن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) سنہ ہجری کے بجائے سنہ عیسوی کا استعمال کیوں کیا گیا۔

(۲) بزرگان دین سے واحد کے صیغے سے کیوں تخاطب کیا گیا حالانکہ صیغہ جمع استعمال کرنا چاہئے تھا۔

(۳) مسعود سعد سلیمان کو صرف مسعود سلیمان کیوں لکھا گیا

(۴) فاضل کو ابراہیم اور ارسلان شاہ کے عہد کے شاعر کے بجائے ارسلان شاہ اور ابراہیم شاہ کے عہد کا شاعر کیوں لکھا گیا۔

(۵) ولی اورنگ آبادی کے متعلق شوخ فقرے کیوں لکھے گئے وغیرہ

جہاں تک ہمارا خیال ہے مولف "اردو شہ پارے" ڈاکٹر سید محی الدین زور نے سنہ عیسوی کو اس لئے استعمال کیا ہے کہ وہ عام طور سے یورپ اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں مروج ہے اور پھر جبکہ انکے ماخذوں کا بڑا حصہ یورپ کے کتب خانوں سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے متعلق کسی بحث کی گنجایش نہیں رہتی مگر مولف نے جہاں سنہ ہجری کی ضرورت تصور کی ہے وہاں اسکا اظہار بھی کر دیا ہے۔

تعجب ہے ڈاکٹر محی الدین تو اس لئے قابل الزام ہیں کہ انہوں نے بزرگان دین کو صیغہ واحد سے مخاطب کیا مگر مولنا حالی پر اعتراض کی جرات کسی کو نہیں ہوتی حالانکہ حیات سعدی میں انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے جب اس قسم کی سنت جاری ہو چکی ہے تو پھر صرف ڈاکٹر صاحب ہی کیوں نشانۂ ملامت بنایا جائے۔

شاعر کا اصلی نام مسعود ہے اس کے باپ کا نام سعد اور دادا کا نام سلیمان اگر اختصار کے لئے بجائے مسعود سعد سلیمان کے صرف مسعود سلیمان لکھا گیا تو کیا غلطی ہوگئی ؟

اسی طرح اس کو بجائے ابراہیم اور ارسلان کے ارسلان اور ابراہیم کے عہد کا شاعر کہدیا گیا تو ایسا کونسا ناقابل معافی جرم سرزد ہوگیا۔

ولی اورنگ آبادی کے متعلق ہر شخص کو اختیار ہے کوئی انکو اپنے اعتقاد کے لحاظ سے ولی کامل قطب وقت تصور کرے اور کوئی اپنی تحقیقات کے لحاظ سے اس کا برعکس خیال کرے۔ مولنا تبسم کو شاید معلوم نہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی کو جہاں کوئی پاک باز صوفی صافی تصور کرتا ہے وہاں انکو "رند خراباتی" تصور کرنے والے بھی موجود ہیں۔ اگر ڈاکٹر محی الدین نے اپنی تحقیقات کے لحاظ سے ولی اورنگ آبادی کو قطب کامل تصور نہیں کیا تو نہیں معلوم کیا گناہ کیا اور مولنا تبسم اس کو قطب وقت خیال کرتے ہیں تو کیا مرتبہ حاصل کر لیا۔ میرے خیال میں ہموطن ہونے کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی رائے قابل ترجیح ہوسکتی ہے۔

ان غیر ضروری امور سے قطع نظر کرکے اب نفس مضمون کے متعلق جو اعتراضات ہیں ان کی جانب توجہ کیجاتی ہے۔

(۱) سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ امیر خسرو اور انکے بعد اور بزرگ بھی تھے جنہوں نے کچھ نہ کچھ ہندی میں لکھا تھا بلکہ مشائخ کے سلسلہ میں تو ہر زمانے میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں مثلاً خواجہ فریدالدین عطار۔ شرف الدین بوعلی قلندر۔ شاہ جمال نوری وغیرہ لیکن ڈاکٹر زور نے ان میں سے کسی کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔

کتاب کے نفس مضمون سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اردو زبان کی تاریخ نہیں ہے بلکہ اردو کے قدیم "شاہ پارے" کے نمونے پیش کرنا مقصود ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے خود جو وضاحت کی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے

"یہ مقدمہ اس مقصد سے نہیں لکھا گیا ہے کہ اس دور کی ایک مکمل ادبی تاریخ پیش کیجائے

یہ اس شخص کا کام ہوگا جو ادبیات اردو کی تاریخ لکھنا چاہتے ہو

[illegible] سکتا ہے کہ کتاب کا موضوع اردو ادب کی تاریخ نہیں ہے پس جو چیز اردو ادب کی تاریخ کے زیر عنوان آنی چاہئے اسے مؤلف نے اپنی کتاب میں نہ رکھا تو کونسی غلطی کی۔ یہ امر [illegible] ہے کہ ان بزرگوں نے چند جملوں یا کلموں کے سوائے کوئی اردو تحریر یا نظم بھی لکھی تھی یا نہیں! جہاں تک تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے انکی تحریر صرف چند جملوں کی حد تک ہے۔ جو نظم انکی جانب منسوب کیجاتی ہے وہ محقق کے نزدیک "ہنوز دہلی دور" کا معاملہ ہے۔

یہ امر یقینی ہے کہ شمالی ہند میں کوئی مثنوی یا دیوان اس وقت تک مرتب نہیں ہوا جب تک دکن میں اسکی تکمیل نہ ہوگئی۔ اگر یہ صحیح نہیں تو اس کی تردید کیجاسکتی ہے اور بتایا جاسکتا ہے کہ شمالی ہند میں بھی دکن سے پہلے مثنویاں قصیدے مرثیے دیوان مرتب ہوئے ہیں۔ اس کا جواب سکوت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ شاہ میراں جی شمس العشاق کے دکنی ہونے کا ثبوت نہیں دیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انکو دکنی ہے کس نے موسوم نہیں کیا؟ جبکہ ہر محقق اردو انکو دکنی بیجاپوری تسلیم کئے ہوئے ہے تو پھر ایک مسلم امر کو ثابت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر ڈاکٹر زور نے دکنی ہونے کا ثبوت نہیں دیا تو غلطی نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر کسی نے انکو دکنی نہ لکھا ہوتا اور ڈاکٹر موصوف بلا اس تردید کے انکو دکنی کہدیتے تو بیشک غلطی کی ہوتی۔

(۳) "قطب مشتری کے بعض اشعار کی بنا پر قیاس لگایا گیا ہے کہ ان اشعار میں شاعر نے جہاں غواصی و غواصیان کا استعمال کیا ہے اس سے اس کی مراد غواصی شاعر ہے یہ قیاس ہمارے نزدیک کمزور اساس پر مبنی ہے علی ہذا انوری اعظم پوری کا ادخال دکنی شعرا کی فہرست میں خلاف حقیقت نفس الامری ہے"

اس اعتراض کے دو جزو ہیں پہلے جزو کے متعلق جو وجہی اور غواصی کے متعلق ہے میں کہونگا شاید مولانا تبسم نے مثنوی قطب مشتری اور گولکندہ کی تاریخیں ملاحظہ نہیں فرمائیں ورنہ اس اعتراض

کی نوبت نہ آئی کیونکہ تاریخوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ہمعصر تھے۔ دونوں میں چشمک ہوئی تھی
اور [illegible] مطالعہ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوائے غواصی کے کوئی اور مراد نہیں ہو سکتا۔
اس کے متعلق ہمارا ابھی یہی خیال ہے جس کو آج سے بہت پہلے ظاہر کر دیا ہے (دیکھو معارف نمبر جلد ۲۳)
نوری کے متعلق ڈاکٹر زور نے صاف طور پر کوئی رائے نہیں دی اس کو انہوں نے دکھنی نہیں
لکھا۔ بہت ممکن ہے نوری اعظم پوری جس کا ذکر مولف پنجاب میں اردو" کے حوالہ سے کیا گیا ہے، کوئی
دوسرا ہو اور دکھنی نوری دوسرا، جس طرح افضل کا حال ہے۔

(۴) بیان کیا گیا ہے "بعض غیر اہم واقعات کی نقاب کشائی میں مصروف ہو جاتے ہیں مثلاً
شیخ نصرت نصرتی کے ذکر میں گارسی دتاسی کے ایک بے بنیاد بیان کو جس میں بیان کیا گیا ہے کہ نصرتی
برہمن تھا۔ غیر ضروری اہمیت دے کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ تردید کی ہے۔ تاسی کا قول اسی قدر مضحکہ خیز ہے
جس قدر اسکا بیان کہ جان صاحب ایک طوائف تھی"

مولانا تبسم سے اس میں دو فروگذاشتیں ہوئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ اس امر کو کہ نصرتی برہمن نہیں
تھا غیر اہم قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، کسی یوروپین مورخ کی رائے کی تنقیص کرنا کوئی غیر اہم
مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ اسی غلطی کی وجہ سے ڈاکٹر بلوم ہارٹ نے بھی اس کا اتباع کیا تھا اور اپنی تالیف
میں نصرتی کو برہمن ظاہر کیا تھا جس کی ہم نے تردید اور صحت کی ہے (دیکھو سفینہ مدراس جولائی ۱۹۲۹ء)
اس غلطی کو دور کرنے کے لئے اسی قدر تفصیل کی ضرورت تھی جتنی کہ ڈاکٹر زور نے کی ہے ایک اور امر بھی
دلچسپی سے خالی نہیں کہ یوروپین مورخین کی آرا کو جو دیگر اصحاب کے مقابل خود مولانا تبسم نے دی ہے
وہ زیر بحث تنقید سے واضح ہو سکتا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۰، مخزن) جہاں اسپرنگر کی رائے کو دلیل میں
پیش کیا گیا ہے حالانکہ اسپرنگر نے ایسی متعدد غلطیاں کی ہیں جیسی کہ بقول موصوف جان صاحب کے
معاملہ میں دی تاسی نے۔

مگر طرفہ تماشا یہاں ہم یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ جان صاحب کی نسبت دتاسی نے ہرگز غلطی نہیں
کی۔ جان صاحب سے اسکی مراد لکھنؤ کے جان صاحب نہیں ہیں بلکہ کلکتہ کی جان طوائف ہے۔ اگر

مولانا تبسم اور ان کے ہم عصر اس کے حال سے ناواقف ہوں تو ہوں مگر ڈی ٹی ناسی اور دیگر اصحاب ناواقف نہیں ہیں۔

محمد افضل کے متعلق مولانا تبسم نے تفصیل سے بحث کی ہے اور ڈاکٹر محی الدین کی غلطی ثابت کر کے مولانا محمود شیرانی کی تالیف "پنجاب میں اردو" کے بیانات پیش کئے ہیں مگر نفس واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور نے افضل کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دی ہے۔

اس کے متعلق پروفیسر شیرانی کو بھی دھوکہ ہوا ہے قائم اور والہ داغستانی کے جو بیانات تائید میں پیش کئے گئے ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہیں اور طرفہ یہ کہ اس کے انتقال کا سنہ ۱۰۳۵ھ ظاہر کرتے ہیں حالانکہ یہ صداقت سے دور ہے۔ پروفیسر شیرانی نے محمد افضل کے متعلق جو صراحت کی ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"میرٹھ کے قریب جھنجانہ ایک پرانی بستی ہے محمد افضل کا شمار اسی سرزمین کے نونہالوں میں کیا جاتا ہے ہم انکے حالات سے قطعاً تاریکی میں ہیں بس اسی قدر جانتے ہیں کہ ایک دوازدہ ماہہ یا بکٹ قصہ کے اردو میں مصنف ہیں۔ انکے زمانے کو اسپرنگر نے محمد قائم چاندپوری کے تذکرہ کے حوالے سے عبداللہ قطب شاہ سے جو ۱۰۲۰ھ میں گزرا ہے پیشتر کا قرار دیا ہے۔" اس کے بعد شیرانی نے والہ داغستانی کے افضل کو بھی افضل قرار دیا ہے اور اس کے انتقال کو ۱۰۳۵ھ میں بتایا ہے

اس بیان میں کئی ایک امور صحت طلب ہیں اول تو قائم چاندپوری نے افضل کے متعلق کسی تاریخ کی تخصیص نہیں کی بلکہ وہ دکھنی شعراء کا حال ختم کرنے کے بعد افضل کا بیان شروع کرتا ہے۔

چنانچہ فضل کا حال اس بیان پر ختم ہو جاتا ہے:۔

بدیں دو سہ چار بیت کہ امی کہ بنام اساتذہ معتبر مرقوم است اغلب کہ نشائے تبعیتش بہرے بیش نباشد۔ (ص ۶ مخطوطہ انڈیا آفس)

اس کے بعد گویا دکھنی شعرا کا حال شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"اما بعد ازیں بسمت بلاد دکن در عہد عبداللہ قطب شاہ کہ با سخن و اہل آن محبت کلی داشت ریختہ گفتن بزبان دکھنی بسیار رواج گرفت پادشاہ مذکور نیز طبع موزون داشت . . . . . ." (ص ۶ و ۷ مخطوطہ انڈیا آفس)

اس سے واضح ہے کہ قائم نے افضل کا کوئی خاص زمانہ نہیں بتایا۔ اسی طرح افضل کے متعلق داغستانی کا بیان ہے کہ جس افضل کا ذکر والہ نے کیا ہے بکٹ کہانی کو اس سے موسوم نہیں کیا اور نہ اس کے ہندی گو شاعر ہونے کا ذکر کیا اگر افضل فارسی کے ساتھ اردو میں شعر کہا کرتا تو کوئی وجہ نہیں تھی جو والہ اسکا ذکر نہ کرتا۔ پس جس افضل کے ساتھ نہ تو بکٹ کہانی کا ذکر ہے اور نہ ہندی گو ہونے کا ذکر ہے تو کس طرح اسکو افضل اردو گو کہا جا سکتا ہے۔

اس کے باوجود میں افضل مصنف بکٹ کہانی کو دکھنی قرار نہیں دیتا بلکہ نارنولی قرار دیتا ہوں مگر اسکا زمانہ ۱۰۳۵ھ کا نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ بارھویں صدی ہجری کا زمانہ ہے۔ افضل کے متعلق میں نے علیحدہ تفصیل سے مضمون لکھا ہے اسلئے مزید صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی البتہ انڈیا آفس کے ایک دوسرے مخطوطے سے جو مرزا مظہر جان جاناں کے مرید قطبی کی تصنیف ہے ذیل کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

پریم قصہ ہوا آخر ہے یارو — تیرا مانا ہی اس کی ماں بچارو
بکٹ افسانہ کا ہے یہ بوبھیا — دونوں کے تان جیسا ہے دوئی میا
اوس میں افضل کہ جس کا نام گوپال — کہ تھا وہ نارنولی صاحب حال
اس میں قطبی کہ اکرم کر ہے مشہور — ز شعر و علم ہر دو ہست معذور

(ذخیرہ ثانیہ انڈیا آفس)

(۹) شاہ محبوب عالم عرف شیخ جیون کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے اختلاف کیا گیا ہے اور اپنی تائید میں اسپرنگر کی رائے ثبوتاً پیش کی گئی ہے۔

اس کے متعلق ناظرین کی توجہ مکرر "شہ پاروں" کے ملاحظہ کی طرف کروں گا ڈاکٹر زور نے

کیا لکھا ہے اور مولانا تبسم نے کیا تحریر فرمایا ہے وہ واضح ہو جائیگا۔

[illegible] کے متعلق ڈاکٹر زور کی رائے پیش کرکے اعتراض کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی رائے حسب ذیل ہے۔

"[illegible] نے حالانکہ ایک بہت بڑا کام کیا ہے لیکن وہ بڑا شاعر نہ تھا غالباً یہ خسرو کی یوسف زلیخا کا ترجمہ ہے لیکن فارسی کے اثر سے بالکل آزاد ہے اور بالکل اوریجنل معلوم ہوتی ہے اسلوب بیان بہت ہی سلیس ہے لیکن جب شاعر اپنے آپ کو ایک بہت بڑا صوفی بتلانے کی کوشش کرتا ہے تو انداز بیان پیچیدہ ہو جاتا ہے" (ص ۱۳۶)

مولانا تبسم اسکے متعلق درج کرتے ہیں "اگر ترجمہ ہے تو اوریجنل نہیں ہو سکتا اور اگر اوریجنل ہے تو ترجمہ نہیں ہو سکتا" اور پھر "ہم اس فقرہ کو خاک نہیں سمجھے۔ غریب شاعر سیدھے بہاؤ اپنی مثنوی لکھ رہا ہے آخر اس نے بڑا صوفی بننے کی کیوں کوشش کی دیباچہ اور اختتام سے یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ شاعر نہیں تھا بلکہ ایک مذہبی آدمی تھا۔ ڈاکٹر کی تبصرہ نگاری کا یہ انداز جمیل ہمارے لئے حیرت زا ہے" (ص ۹، مخزن)

افسوس ہے مولانا تبسم نے ایک صاف بات کو نہیں سمجھا ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ مثنوی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے مگر ترجمہ اس خوبی اور صفائی سے ہوا ہے کہ وہ مثنوی ترجمہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ اصلی (اوریجنل) معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے جملے کے بھی صاف معنی ہیں۔ مثنوی میں جہاں مسائل تصوف کا ذکر ہے وہاں اس کا انداز بیان بالکل پیچیدہ ہو گیا ہے ظاہر ہے جو شخص اپنے آپ کو کسی خاص فن کا ماہر خیال کرتا ہے وہ اس فن کی خاص اصطلاحات وغیرہ کا استعمال کرتا ہے تاکہ اس کے ماہر فن ہونے کا ثبوت دوسروں کو ملے اسی طرح امین کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ مثنوی میں جہاں اس نے اس امر کا اظہار کیا ہے وہاں مثنوی مشکل اور پیچیدہ ہو گئی ہے صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتی۔

مولانا تبسم کا یہ اعتراض کہ "دیباچہ اور اختتام سے یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ شاعر نہیں، بلکہ مذہبی آدمی تھا" تعجب ہے ہماری سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ ہر شخص کے کیرکٹر اور اس کے مذہب وغیرہ کا حال

اس کی تصانیف سے بہتر کسی اور سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ شاید مولنا اس کو نہ سے دور ہیں۔

(۸) امین کے اعتراض کے بعد مولانا تبسم نے مراثی کی جانب توجہ فرمائی ہے اور لکھتے ہیں " ان میں سے صرف ہاشم علی۔ رضا۔ سید۔ غلامی اور قادر کے متعلق انہوں نے کسی قدر تلاش سے کام لیا ہے اور سوائے ایک آدھ کے کسی کے متعلق کچھ نہیں بتا سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر نے ایک نہایت حیرت انگیز بات یہ کی ہے کہ ان سب شعراء کا زمانہ ۱۱۰۵ھ فرض کر لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتفاق سے پروفیسر شیرانی نے اس سال جو لیکچر دئے ہیں ان میں غلامی کا تذکرہ بھی شامل ہے، وہ غلامی کا نام غلام رسول بتاتے ہیں جو سورت میں پیدا ہوا ۔ ۔ ۔ ۱۲۱۵ھ میں اپنی مثنوی ختم کی اب جس شخص کو ہمارے ڈاکٹر ۱۱۰۵ھ میں تصور کرتے ہیں وہ ۱۲۱۵ھ کے عہد کا آدمی ہے اور صاف کہہ رہا ہے میں نے شعر و شاعری صرف ایک سال سے شروع کی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن موقعوں پر سید صاحب کو کوئی رہبر نہیں ملا ہے وہاں کس قدر بھٹکے ہوں گے "

یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہو سکتا متعدد مرثیہ گویوں کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں حالانکہ آج سے پہلے وہ سب پردہ تاریکی میں تھے ۔ ڈاکٹر صاحب ۱۱۰۵ھ تک فرض کس طرح کرتے خود ہاشم علی جس کے متعلق نہایت تفصیل سے حال لکھا ہے ۱۱۶۹ھ تک زندہ ہونے کا پتہ چلتا ہے ۔

غلامی کے متعلق مولانا تبسم نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں ہو سکتا ممکن ہے علامہ شیرانی جس غلامی کا ذکر کرتے ہیں وہ کوئی دوسرا ہو کیونکہ ڈاکٹر زور والا غلامی غلام مرتضیٰ یا غلام حیدر نام رکھتا تھا جیسا کہ خود اس کے مرثیہ سے معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کا زمانہ ۱۲۱۵ھ کا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ بقول مولانا تبسم اس نے ایک ہی سال میں شاعری کی ہے ۔ اس کی بیاض جس میں اس کے مرثیئے موجود ہیں ۱۱۹۳ھ میں لکھی گئی ہے اور خود ان مرثیوں کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصنف ایک کہنہ مشق شاعر ہے ۔

آخر پر مولانا تبسم نے جن عمدہ الفاظ میں ڈاکٹر کے متعلق ریمارک کیا ہے وہ مولانا ہی کے لئے سزاوار ہے اس کے متعلق کوئی صراحت کرنی غیر ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ان ہی لوگوں کے لائق ستائش ہے جو کسی علامہ کی شاگردی کا فخر رکھتے ہوں

آخر پر میں صرف یہ کہوں گا جب علامہ شبلی کی شعر العجم جیسی کتاب پر اعتراض درست ہوسکتے ہیں تو بیچارے غریب ڈاکٹر محی الدین کی کتاب کیا وقعت رکھتی ہے۔ اس سے بحث نہیں وہ اعتراض جھوٹ ہوں یا سچ۔

حکومت کے فرائض

مضمون ذیل سیاسیات پر جامعہ کے لائق پروفیسر مسٹر ای۔ جے کلاٹ کے لکھائے ہوئے نوٹ کے ایک حصہ کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔ اس میں اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ ان مختلف نظریوں سے بحث کی گئی ہے جو سیاسئین جدید حکومت کے فرائض کی بابت پیش کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ترجمہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اس کو پڑھنے سے انفرادیت اور اجتماعیت کے نظریے مع ان دلائل کے جو ان کی موافقت اور مخالفت میں پیش کئے جاتے ہیں، اچھی طرح ذہن نشین ہو جائینگے۔

انسان مصائب و آلام سے گھرا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ ایک عظیم الشان میراث کا وارث ہے لیکن ہزار میں ایک بھی اپنا قرار واقعی حصہ نہیں پاتا۔ جو مواقع ایک معمولی انسان کو اپنی شخصیت کو ترقی دینے (حصول مسرت) کے لئے ملتے ہیں وہ اتنے کم ہیں کہ شاذ و نادر ہی کوئی اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکتا ہے۔

ریاست کیونکر فرد کو اسکی مشکلات کے حل کرنے میں مدد دے۔ اسی سوال کے جواب میں وہ مختلف نظریے وجود میں آئے ہیں جو بتلاتے ہیں کہ حکومت یا ریاست کے فرائض کیا کیا ہونے چاہئیں انہیں ہم تین خاص نظریوں کے ماتحت لا سکتے ہیں۔ (۱) نظریہ انفرادیت۔ (۲) نظریہ اجتماعیت (۳) نظریہ مصالحت۔

نظریہ انفرادیت

اس نظریہ کے مطابق ریاست بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ محض ایک ذریعہ ہے جس سے فرد اپنی فلاح حاصل کر سکے۔

یہ ذریعہ (ریاست) بھی کوئی خوشگوار چیز نہیں ہے۔ یہ ایک برائی ہے جسے صرف اس لئے

گوارا کرنا چاہئے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ریاست انسان کو اسکی انانیت اور جہالت کے نتائج یعنی ظلم غصب سے بچانے کے لئے ہے۔ جب ایک آدمی اپنے دوسرے بھائی کی حق تلفی کرتا ہے تو ریاست پولس کے سپاہی کی طرح بیچ میں آکر مظلوم کو ظالم سے چھڑا لیتی ہے۔

لیکن ریاست کا دائرہ عمل صرف انہیں منفی فرائض تک محدود رہنا چاہئے۔ وہ ایک فرد کو دوسرے فرد کے حقوق میں دخل انداز ہونے سے روکتی رہے اور بس۔ اس کے ذمہ کوئی اثباتی فرائض نہیں کیا جا سکتا۔ اس نوع کے فرائض تمام تر فرد کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں۔ وہی اپنے مفاد کو سب سے بڑھ کر سمجھ سکتا ہے۔ ریاست کے لئے یہ ہرگز روا نہیں کہ وہ فرد کی آزادی عمل کو اس بنا پر محدود کردے کہ اس میں فرد کا فائدہ ہے۔ اسکی آزادی میں کسی قسم کی "پدرانہ" مداخلت نہیں ہونی چاہئے۔

انسانی فلاح کے حصول کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ فرد کو اپنی مسرت و خوشی کے اسباب آپ مہیا کرنیکے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اجتماعی مفاد کی خاطر بھی شخصی آزادی کو مقید نہیں کرنا چاہئے۔ بالفاظ دیگر اجتماعی اصول کے لئے مطلق گنجائش نہ رکھی جائے۔ ریاست کا دائرہ عمل جہانتک ممکن ہو تنگ رہے۔ اس کے فرائض بس اتنے ہوں کہ وہ فرد کو ظلم سے بچا سکے۔ اس سے زیادہ نہیں۔

اس نظریے کے موافق حسب ذیل دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ **فرد کے نقطۂ نظر سے** | فرد کے قویٰ ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کرکے اسکی شخصیت کو مکمل اسی حالت میں بنا سکتے ہیں جبکہ ان میں نشوونما کی کامل آزادی ہو۔ یعنی جب فرد کو اپنا مختار بنا دیا جائے۔ اگر اس کی مدد کے لئے حکومت اثباتی فرائض کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو اسکا یہ فعل فرد کے دماغ کی تخلیقی قوت، اور اس کے احساس ذمہ داری و خودداری کو زائل کردیگا۔ اس کی حالت بالکل بچوں کی مانند ہو جائے گی جو کھانا بھی دوسروں کے ہاتھ سے کھاتا ہے۔ اور کبھی اپنے پیروں پر نہیں کھڑا ہو سکیگا۔

۲۔ **جماعت کے نقطۂ نظر سے** | جماعت کی ترقی غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے اشخاص کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا شخص اپنے آپ کو جب ہی بلندی پر پہنچا سکتا ہے جب اپنا کامیابی کا اسباب خود مہیا کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ریاست کی مداخلت اس کو

عمومیت ہی کی سطح پر رو کے رہے گی۔ اوپر نہ جانے دیگی۔ بالفاظ دیگر ترقی کے لئے نظریہ انفرادیت آزاد تنازع للبقا[1] کو مسلک قرار دیتا ہے تاکہ اس تنازع میں کمزور ہلاک ہوجائیں اور توانا رہ جائیں۔ اس کے نزدیک آزاد تنازع للبقا ہی ارتقا میں معین ہوئی ہے، اور یہی آئندہ ارتقا میں معین ہوگی کیونکہ اس حالت میں قدرت کا انتخاب[2] اپنا پورا پورا عمل کرتا ہے جس سے نااہل فنا ہوجاتے ہیں اور وہی باقی رہتے ہیں جو سب سے زیادہ صلاحیت رکھنے والے ہیں[3]۔

۳۔معاشی اعتبار سے | انسان کی مادی فلاح و بہبود کے لئے انفرادیت کا اصول سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ ریاست کی مداخلت فرد اور ریاست دونوں کے لئے مضر ہوگی۔ مادی فلاح کے لئے تین باتوں میں آزادی ضروری ہے۔ تجارت، معاہدہ اور مقابلہ۔ ترقی دولت کے ان تین لوازمات میں سے کسی ایک میں بھی حکومت کا دخل انداز ہونا افراد اور جماعت دونوں کی معاشی تباہی کا باعث ہوگا۔ تاریخ کا یہی فیصلہ ہے۔ اگر ملکی پیداوار کی حفاظت کے لئے بدیسی چیزوں پر ٹیکس لگا کر ان کو مہنگا کر دیا گیا، تو اس سے قیمتیں گراں ہوجائیں گی اور غریبوں کو نقصان پہنچیگا۔ اسی طرح اگر آپس میں آزادی کے ساتھ معاہدہ کرنے کی اجازت نہ ہوئی تو مزدوروں کو حسب مرضی اپنی اجرت بڑھانے میں دقت پیش آئے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اجرت کم ملے گی، اور غریب مزدوروں کو نقصان ہوگا۔ آزادی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا اگر موقع نہ ہو تو بھی غریبوں ہی کو نقصان پہنچیگا۔ کیونکہ آزاد مقابلہ کے بغیر اجارے قائم ہوجائیں گے اور ان کا نتیجہ بھی قیمتوں کی گرانی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

۴۔سیاسی لحاظ سے | وہی حکومت فرد اور قوم کے مفاد کی بہترین محافظ ہوسکتی ہے جو انفرادیت کے اصول پر مبنی ہو۔ ریاست کو زندگی کے کاروبار کا مہتمم بنا دینا غلطی ہے۔ کیونکہ وہ نہ تو ہمہ داں ہے نہ معصوم۔

---

(۱) Struggle for Existence

(۲) Natural Selection

(۳) Survival of the fittest اس اصطلاح کا ترجمہ "بقائے اصلح" کیا جاتا ہے (مترجم)

وہ فرد کی ضروریات کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھ سکتی۔ وہ فرد کے مفاد کا جتنا خیال رکھ سکتی ہے وہ اس سے بہرصورت کم ہوگا جتنا فرد اپنے مفاد کا خود خیال رکھ سکتا ہے۔ اسکے علاوہ ریاست کو طرح طرح کے ضابطوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اسکا کام سست ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ اس کی حالت ایک قالب بیجان کی سی ہوتی ہے جب تک فرد ہی اس میں روح نہ پھونکے۔

یہی نہیں بلکہ فرائض کا بہت زیادہ بار پڑ جانے سے ریاست کا کام بھی خراب ہو جاتا ہے۔ ایک بار جب تم اس کے عادی ہو جاؤ گے کہ اپنا کام ریاست سے کرانے لگو تو تمہارے لئے اپنے ذمہ کچھ رکھنا ممکن نہ رہیگا۔ تم سارا کام ریاست ہی سے لینا چاہو گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست اور فرد دونوں ہی بھاری بوجھ سے دب جائیں گے۔ ایک کثرت کار کے بوجھ سے دوسرا ٹیکسوں کے بوجھ سے۔

۵۔ تاریخی حیثیت سے | جوں جوں ریاست اپنی ابتدائی حالت بربریت سے ترقی کر کے متمدن ہوتی گئی توں توں اس کے فرائض کم ہوتے گئے۔ عہد قدیم میں سوسائٹی کی جانب سے ہی ہر فرد کا ایک مرتبہ ہوتا تھا اور اس کو وہی کام کرنا پڑتا تھا جو اس کے مرتبہ کے لئے سوسائٹی میں مقرر ہوتا تھا۔ وہ اپنا کام آپ منتخب کرنیکا مجاز نہ تھا۔ جنگجو قوموں میں بھی فرد کی آزادی عمل کو ریاست کے مفاد کے لئے مقید کر دیا جاتا تھا لیکن جب انسان ترقی کر کے موجودہ صنعتی دور میں پہنچا تو "مرتبہ" کی جگہ اختیاری معاہدہ" نے لیا۔ فرد کو اب بہت زیادہ آزادی عمل حاصل ہے۔ وہ اپنے لئے خود ہی کام منتخب کر سکتا ہے۔ ریاست کا دائرہ عمل محدود ہو گیا۔

اعتراضات ۔ نظریہ انفرادیت کا پہلا دعوی یہ ہے کہ ریاست ایک برائی ہے۔ (کیونکہ اس سے فرد کی آزادی میں خلل پڑتا ہے) یہ دعوے تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ سیاسی نظام کے وجود میں آنے سے پہلے انسانی جماعت میں فرد کو حقیقی آزادی کبھی حاصل نہ تھی۔ وحشی انسان ایک شتر بے مہار تھا۔ وہ آزاد نہ تھا، مطلق العنان تھا۔ آزاد اسے کہتے ہیں جو بلا جبر و اکراہ اپنی خوشی سے بھلائی کرے اور برائی سے باز آئے۔ لیکن جو کسی آئین و اصول کا پابند نہ ہو اسے آزاد نہیں کہتے مطلق العنان کہتے ہیں۔

اور یہی لقب ابتدائی حالت کے وحشی انسان کے لئے زیبا ہے۔ لیکن یہ ریاست تھی جس نے وحشی انسان کو مطلق العنان سے آزاد بنایا۔ بلاشبہ ریاست کو غلط طور سے بھی استعمال کیا گیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بدی، ریاست کی سرشت میں ہے۔ ممکن ہے کہ ہم "عدم حکومت" کے تخیل کی طرف جا رہے ہوں لیکن ہم فرشتے نہیں ہیں۔ ریاست بھی اسی شاہ راہ کا ایک حصہ ہے جس پر انسان زندگی کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے گامزن ہے۔

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ریاست فرد کی آزادی میں خلل انداز ہو کر اس کی سیرت کو بگاڑ دیتی ہے کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا واقعی ریاست کی مداخلت سے فرد کے ذہنی، اخلاقی و جسمانی قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں؟ کیا ہر قسم کی پابندی و باقاعدگی فرد کے لئے مضر ہے؟

ایسا نہیں ہے۔ انفرادیین کی غلطی یہ ہے کہ وہ انسان کی فطرت بد کا خیال کئے بغیر اپنا نظریہ قائم کرتے ہیں۔ وہ اس امر کا لحاظ نہیں کرتے کہ ہم میں سے ہر ایک کی رگوں میں آدم ہی کا خون دوڑتا ہے۔

آزادی اور پابندی آئین دونوں کو ساتھ رہنا چاہئے۔ پابندی آئین کے بغیر آزادی آزادی نہیں رہ جاتی۔ یہ مطلق العنانی ہو جاتی ہے، اور ہمیں انسانیت سے گرا کر حیوانیت کے درجہ میں پہنچا دیتی ہے۔

اس کے بعد یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ فرد کو آزادی دے کر ہم تنازع للبقا کو جاری رکھتے ہیں، جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ کیونکہ تنازع للبقا ہی کے ذریعے کمزور مٹتے اور توانا باقی رہتے ہیں۔ اگر ریاست کمزوروں کی مدد کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تنازع للبقا کو پوری طرح عمل نہیں کرنے دیتی اور نکمے لوگوں کے قائم رکھنے میں معین ہوتی ہے۔ یہ طرز عمل اگر بنی نوع انسان کے لئے خطرناک نہیں تو مضر ضرور ہے۔

اس دلیل کے خلاف اولاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی جماعت کا اپنے افراد کی باہمی کشمکش سے ترقی پانے کا دعوے مشتبہ ہے۔ بلا شبہ کشمکش ترقی میں معین ہوئی۔ لیکن اسی حد تک جس حد تک کہ کشمکش

انسان نے اپنے ماحول کے خلاف کی۔ افراد کے تعلقات باہمی میں تعاون تھا نہ کہ تقابل جس نے ترقی

میں مدد [illegible]

ثانیاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر تنازع للبقا میں صرف فنا ہونے سے بچ جانا ہی اہل و توانا ہونے کی

دلیل ہے تو بہتر ہے کہ ہم اپنی تمام اخلاقی قدروں کو خیرباد کہدیں۔ مگر یقین ہے کہ ایسا کرنے میں اکثر لوگوں

کو پس و پیش ہوگا۔ کیونکہ انسان کی فلاح اخلاق پر مبنی ہے۔

ثالثاً تنازع للبقا میں حکومت کی مداخلت بذات خود کشمکش کے لئے ایک نیا سامان مہیا کر دیتی

ہے۔ یہ مداخلت خود اس ماحول کا جزو بن جاتی ہے جس کے خلاف فرد کو جد و جہد کرنا ہے۔ پس اگر فرد

یہی چاہتا ہے کہ وہ تنہا مشکلات سر کیا کرے تو کیا برا ہے اگر اُن میں ایک کا اور اضافہ ہو جائے۔ یہ تو اسکے

لئے اور اچھا ہو جائیگا۔ فرد اس نئے دشمن یعنی حکومت کی مداخلت کے خلاف جد و جہد کرے، اگر وہ

"اہل و توانا" ہوگا تو اس مداخلت کے باوجود باقی رہیگا ورنہ فنا ہو جائے گا اور اس کا فنا ہو جانا ہی دنیا

کے لئے بہتر ہی ہوگا۔ کیونکہ دنیا میں "کمزوروں" کی ضرورت نہیں ہے۔

معاشی نقطۂ نظر سے یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ اگر فرد کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ فرد اور ریاست دونوں

کی خوش حالی کا سبب ہوگا اور تین چیزوں کی آزادی کی ضمانت چاہی جاتی ہے۔ تجارت، معاہدہ، مقابلہ۔

لیکن غور کرنے سے ان تینوں پر اعتراض عاید ہوتا ہے

۱۔ آزادی تجارت اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ تمام ممالک تعلیم، تنظیم، مہارت، سرمایہ غرضکہ

ہر اعتبار سے مساوی درجہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس شرط کے بغیر آزاد تجارت کا اصول مضر ثابت ہوا ہے

اور ہوگا۔

۲۔ آزادی معاہدہ کے حامی یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مزدور اور سرمایہ دار مساوی حیثیت نہیں

رکھتے۔ معاہدہ کرنے والے فریق جب تک مساوی حیثیت نہ رکھیں اس وقت تک معاہدہ

منصفانہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مضبوط کمزور کو جہانتک ممکن ہوگا دبا کر اپنے حق میں بہتر شرائط

رکھے گا۔ مزدور اور سرمایہ دار جب معاہدہ کرتے ہیں تو آخر الذکر مزدوروں کی کمزوری سے

ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تقریباً ہر جگہ کا یہی حال ہے۔ مزدور اپنی اجرت پر بکا کرتے ہیں۔ اور اگر انہیں تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ بالکل سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ معاہدہ ہمیشہ یک طرفہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دار جو شرائط چاہے مقرر کر دیتا ہے، مزدور کے پاس انہیں ماننے یا بھوکوں مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۳۔ آزادی مقابلہ بھی آزادی معاہدہ کی طرح صرف ایک حد تک مفید ہے۔ بلا روک مقابلہ اکثر ہزاروں کی تباہی کا سبب ہوا ہے۔ یہ معاشی حالات کے بہتر بنانے میں ہمیشہ معین نہیں ہوتا۔ اور کبھی کبھی حالات کو بدتر بھی بنا دیتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات بڑی بڑی کمپنیاں اپنے حریفوں کی طاقت کو توڑ کر بازار پر اپنا اجارہ قائم کر لیتی ہیں اور من مانی قیمت پر خراب سودا بیچنے لگتی ہیں۔ نیز اپنے مزدوروں سے تھوڑی اجرت پر دیر تک کام لیتی ہیں (وغیرہ وغیرہ)

انفرادیت کی تائید میں جو عمرانی دلائل پیش کئے گئے ہیں ان میں سے پہلی دلیل یہ ہے کہ فرد اپنے مفاد کو خود سب سے اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، نیز ریاست کو فرد کے مفاد سے کوئی ذاتی لگاؤ نہیں ہے مگر سب جانتے ہیں کہ یہ امر واقعہ نہیں ہے۔ فرد بسا اوقات نہیں جانتا کہ اس کا مفاد کس بات میں ہے۔ ایسے موقعوں پر ریاست کی دخل اندازی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مثلاً وبا کی حالت میں حکومت کو کھانے پینے اور دوسرے معاملات کے لئے مخصوص جبری قوانین نافذ کرنے پڑتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر عوام اپنے آپ کو بیماری میں مبتلا کر لیتے ہیں۔

دوسری دلیل کہ "تاریخ دنیا کے عظیم الشان افراد کی سوانح کا نام ہے، فرد ہی ترقی کا سرچشمہ ہے، پس اسے سوسائٹی کے مفاد کے لئے قربان نہ کرنا چاہئے،" واقعات کے صرف ایک رخ کو ظاہر کرتی ہے۔ بلاشبہ انسانیت کی ترقی افراد کی کوششوں سے عمل میں آئی ہے لیکن فرد بھی سوسائٹی ہی کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ بڑا آدمی اس جماعت کی اعلیٰ ترین کوششوں، آرزوؤں، امیدوں اور تخیلات کا مجسمہ ہوتا ہے جس میں کہ وہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی گرد و پیش کی خواہشات کو عملی صورت بخشتا ہے۔ جماعت اپنے بڑے آدمی کی ممنون احسان ضرور ہوتی ہے، مگر بڑا آدمی خود بھی جماعت کا — اس کے نظام اور

میراث کا جو جماعت [illegible] رہین منت ہوتا ہے۔ کتنے ہی ہونہار افراد اس جماعت [illegible] کے اندر تعلیم کا انتظام معقول نہیں ہوتا۔

تاریخی اعتبار سے جو دلیل انفرادیت کی تائید میں پیش کی گئی ہے وہ بھی یکطرفہ ہے۔ حکومت کا آزادی [illegible] دخل انداز ہونا مضرت سے بیشک خالی نہیں لیکن یہ کہنا کہ قانون سے فرد کو بہتر نہیں بنایا جاسکتا صریحاً غلط ہے۔ تاریخ جہاں حد درجہ مداخلت کے بُرے نتائج پیش کرتی ہے، وہاں معتدل اور دانشمندانہ قوانین کے ترقی بخش اثرات کی بھی مقر ہے۔

علاوہ بریں انفرادیت کے حامی ان عظیم الشان نقصانات کی طرف توجہ نہیں کرتے جو فرد کو ذاتی تجربات کے لئے آزاد چھوڑ دینے میں جماعت کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے قصوروں پر پبلک کی نگاہیں اتنی نہیں پڑتیں جتنی ریاست کے قصوروں پر۔ فرد کو معاف کر دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے گناہ چھپا سکتا ہے۔ مگر وہ اسی قدر گناہ گار ہے جس قدر کہ ریاست۔ پس اگر ریاست اس کی اہل نہیں ہے کہ انسانوں کی فلاح کا کام اس کے سپرد کیا جائے تو فرد بھی اسکا اہل نہیں ہوسکتا۔

نظریہ اجتماعیت

اجتماعیت کا، جسے انگریزی میں سوشلزم کہتے ہیں، مقصد بھی فرد کی فلاح و آزادی ہے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کا راستہ اجتماعیت کے نزدیک بالکل ہی دوسرا ہے۔ وہ نظام جماعت کو اس طرح بدلنا چاہتا ہے کہ فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے بہتر سے بہتر موقع ملے۔

اس نظریہ کے نزدیک جماعت اپنی موجودہ شکل و صورت میں انسان کی ترقی میں مانع ہے اس کی تنظیم کی بنا سرمایہ داری ہے۔ زمین اور سرمایہ شخصی ملکیت ہیں۔ معاہدہ، مقابلہ اور تجارت کی آزادی جائز رکھی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فلاح کے اسباب تمام تر معدودے چند لوگوں کے ہاتھوں میں آگئے [illegible]

[illegible] حالت بڑی خرابی پیدا کر رہی ہے۔ کیونکہ لاکھوں انسان مادی فلاح کے اسباب (زمین

[illegible]سے محروم ہیں حالانکہ اسی پر اُن کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی ترقی منحصر ہے۔ افلاس کوئی نعمت نہیں ہے۔ یہ روح کو ہلاک کر دیتا ہے۔

صرف ایک ہی طرح یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔ زمین اور صنعتی کاروبار کو قومی ملکیت قرار دے کر محنت اور انسانی فلاح کی مادی مبادیات یعنی زمین و سرمایہ کے درمیان جو علیحدگی ہے وہ دور کر دی جائے۔

اس کے لئے لازم آتا ہے کہ ریاست دخل انداز ہو۔ بلکہ سارا معاشی کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ پیدائش تقسیم اور صرف تمام باتیں اسی کے اہتمام میں ہونے لگیں۔ فرد کے سر سے ذمہ داریاں بالکل اٹھ جائیں اور حکومت ہی اس کے لئے سب کچھ کر دیا کرے۔ جس طرح انفرادیین حکومت کی کم سے کم مداخلت چاہتے ہیں، اسی طرح اجتماعین زیادہ سے زیادہ۔

اجتماعیین اپنے نظریہ کی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ سرمایہ داری کی خرابیاں | سرمایہ داری دنیا کے لئے ایک لعنت ہے۔ اس سے جلد از جلد نجات حاصل کرنی چاہئے۔ یہ ایک طرف مزدوروں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی پستی کا باعث ہے اور اسے روزی کا غلام بنا دیتی ہے، دوسری طرف سرمایہ داروں کو کاہلی اور طرح طرح کی دوسری معصیتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ معاشی کارکردگی پر بھی اس کا برا اثر پڑتا ہے اور طبقہ وارانہ نزاع بھی اس سے پیدا ہوتا ہے۔ آثار ہویدا ہیں کہ مختلف طبقوں میں ایک سخت تصادم ہوگا جس سے بالآخر سوسائٹی برباد ہو جائے گی۔ ساری انسانی جماعت کے لئے بحیثیت مجموعی بھی سرمایہ داری مضر ہے کیونکہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مادی دولت سے محروم ہے، جس کے بغیر ذہنی و اخلاقی ترقی ناممکن ہے۔

۲۔ سیاسی اعتبار سے | اجتماعیت جمہوریت کا معاشی تتمہ ہے۔ اس کے بغیر جمہوریت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ موجودہ جمہوریتیں دراصل جمہوریت کے لباس میں سرمایہ داروں کا استبداد ہیں۔ کیونکہ سیاسی معاملات میں روزی کا غلام اپنے اختیار تمیزی کے استعمال کے لئے کم گنجائش اور کمتر آزادی پاتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے حقوق کو سرمایہ داروں کے برابر نہیں استعمال کر سکتا۔

۳۔ اخلاقی حیثیت سے | معاشی معاملات میں اجتماعیت بمقابلہ انفرادیت زیادہ بلند اخلاقی مرتبہ رکھتی

ہے۔ یہ ان اصولوں پر مبنی ہے جو سکھاتے ہیں کہ انسان کو دوسروں کے کام آنا چاہئے۔ اس کی قدروں کی تعیین خدمت اور ایثار کے جذبات کرتے ہیں۔ انفرادئین کی قدروں کا معیار پست ہے وہ خود غرضی پر مبنی ہیں۔ سرمایہ داری نے قدروں کو الٹ دیا ہے۔ اجتماعیت ہی اس کو درست کر سکتی ہے۔ اجتماعیت دراصل زندگی پر نظرِ ثانی کرنے اور اسکی تنظیم کو نئے سرے سے محبت کی بنیادوں پر عمل میں لانے کا مطالبہ ہے۔

۴۔ ترقی کے بہترین امکانات | بمقابلہ انفرادیت، اجتماعیت فرد کی سیرۃ کو بدرجہا بہتر بناتی ہے۔ انفرادیت کے نظام میں غریب، اور انہیں کی تعداد کثیر ہے، اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو ترقی دینے کا موقع نہیں پاتے۔ وہ قوت لایموت کی فکر سے دبے رہتے ہیں۔ دوسری باتوں کے سوچنے کی انہیں نہ تو فرصت ہوتی ہے نہ خواہش۔ وہ پاگل رہتے ہیں

۵۔ معاشی نقطۂ نظر سے | اجتماعیت بمقابلہ انفرادیت بہتر ذریعہ پیدائش ہے۔

۶۔ عملی اعتبار سے | یہ اصول ان تمام موقعوں پر قابل عمل ثابت ہوا، جن پر کہ یہ انصاف و ایمانداری سے آزمایا گیا۔ (مثلاً ریل، ڈاکخانہ و تار، لاسلکی، بجلی اور ٹیلیفون وغیرہ)

اجتماعیت کے خلاف حسب ذیل دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اجتماعیت انسانی فطرت کا صحیح مطالعہ نہ کر سکی۔ کام کا سب سے بڑا محرک ملکیت شخصی کا حق ہے۔ مشترکہ ملکیت سے سرچشمہ سعی انسانی برباد ہو جاتا ہے

۲۔ یہ اصول کمی پیدائش اور انتشار افلاس کا سبب بنے گا۔ علاوہ بریں اس کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے کہ تقسیم دولت کیونکر عمل میں آئے۔

۳۔ ترقی یافتہ قومیں وہی ہیں جنہوں نے ملکیت شخصی کا اصول اختیار کیا۔

۴۔ اجتماعیت سے خاندان کی محبت، کفایت شعاری، کام کرنے کی قوت، اولوالعزمی، دماغ کی قوت تخلیق وغیرہ جیسے اوصاف حمیدہ جو انسان کی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ کم ہو جائینگے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اجتماعیت سے قدریں ہی بالکل الٹ جائیں گی اور مذکورہ اوصاف حمیدہ

کی جگہ کام چو ی ، کاہلی ، بفکری ، کند ذہنی وغیرہ جیسے خصائل نظام اجتماعیت میں بقاء حیات کا سبب سمجھے جانے لگیں گے ، حالانکہ یہ انسان کو تباہی کی طرف لیجانے والے ہیں ۔

۵۔ یہ ریاست کی کارکردگی اور صلاحیت کا حقیقت سے بڑھ کر اندازہ لگاتی ہے ۔ اپنے فرائض اولین کے علاوہ تمام معاشی کاروبار کی نگرانی اور تقسیم وغیرہ کے کاموں کا بوجھ کوئی حکومت نہیں اٹھا سکتی خواہ وہ کیسی ہی خوش انتظام کیوں نہ ہو ۔

۶۔ اگر اجتماعی اصول پر ریاست کا قیام ممکن بھی ہوا تو اس سے استبداد ایک نئی صورت میں پھر قائم ہو جائے گا ۔ اشتراکی ریاست میں آزادی ناممکن ہے ۔ یہاں حکومت "مالک" ہوگی نہ کہ "رہنما" اس کا تمام معاملات میں بے آئین اور حد درجہ محتسب ہونا لابدی ہے ۔ اس کی نگاہوں میں کسی اصول یا ادارہ کا احترام باقی نہیں رہے گا ۔

۷۔ " مزدور کو بقدر محنت مزدوری ملنی چاہئے "، کا زرین اصول اجتماعیت سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ یہ کام چور اور محنتی دونوں میں فرق نہیں کرسکتی ۔ حالانکہ دونوں کا فرق اخلاقی ہے ۔ اور معاوضہ اخلاقی بنیاد پر ہونا چاہئے ۔

اجتماعیت کی قدر و قیمت | اجتماعیت کے محاسن و عیوب خواہ جو بھی ہوں ، یہ انسانیت ، خاصکر سیاسیئین کے لئے اپنی قدر و قیمت رکھتی ہے ۔ کیونکہ یہ حسب ذیل امور پر جنہیں کسی مدبر کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے زور دیتی ہے ۔

۱۔ انسانی فلاح کے لئے زندگی کے مادی سامانوں پر قابو حاصل کرنے کی اہمیت ۔

۲۔ یہ عقیدہ کہ بے نفسی بالآخر خود غرضی پر غالب ہوگی ۔

۳۔ وہ اہم اثر جو موافق یا ناموافق حالات میں پیدا ہونے سے فرد کے بننے یا بگڑنے پر پڑتا ہے ۔ لاکھوں میں چند ایسے ہونگے جو زندگی کے ان حالات پر جن میں کہ وہ پیدا ہوتے ہیں ، قابو حاصل کرکے ترقی کرسکیں ۔ یہی سبب ہے کہ اجتماعیین " مساوات موقع " پر اس قدر زور دیتے ہیں

۴۔ جہاں انصاف کے ساتھ دولت کی تقسیم نہو وہاں جمہوریت محض ایک فریب ہے ۔ آجکل کے ادارے

جمہوریت کے لباس میں سرمایہ داروں کا استبداد ہیں۔

۵۔ [illegible] کوششیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک عملی سیاسیات میں تعاون (دستکاری) کی قدر و قیمت کو تسلیم نہ کیا جائے۔

۶۔ انسان کی ترقی کا مدار نہ تو قدرتی (جو در اصل محض اتفاقی ہوتا ہے) انتخاب پر ہے، نہ بقائے اصلح پر بلکہ اس (دانشمندانہ مصلحت اندیشانہ) فن پر جو "اصلح" بناتا ہے۔ ترقی کمزوروں کو توانا بنانے سے ہوتی ہے نہ کہ ان کو ہلاک کرنے سے۔

نظریہ مصالحت

اصطلاح "نظریہ مصالحت" کسی قدر غلط فہمی پیدا کرنیوالی ہے۔ ہم اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حکومت کے فرائض کیا ہونے چاہئیں۔ ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اس سوال کا جواب انفرادئین اور اجتماعین کیا دیتے ہیں۔ اگرچہ انفرادیت اور اجتماعیت دونوں نظریے اپنے اپنے مؤیدین کی جماعت رکھتے ہیں، بہت سے لوگ ان کو ناقابل اطمینان سمجھتے ہیں۔ انکے نزدیک دونوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو تمام و کمال صحیح ہو۔ تاہم وہ یہ مانتے ہیں کہ ان میں سچائی کے عناصر موجود ہیں۔ اور دونوں کے بین بین رہ کر ایک نیا نظریہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انفرادئین اور اجتماعین کے درمیان مصالحت کرانا چاہتا ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی درمیانی راہ ایسی نہیں نکالی گئی ہے جسے عام طور پر لوگ صحیح تسلیم کرلیں۔ پس انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان کوئی مستقل "نظریہ" نہیں ہے۔ بلکہ مختلف قسم کی "رائیں" ہیں جن میں سے بعض کا میلان انفرادیت کی طرف ہے بعض کا اجتماعیت کی طرف۔

مذہب لاشیئت

ایک قدیم فلسفہ اسلوب جدید میں

دنیا میں جتنے علوم عقلیہ ہیں، ان میں سے کسی کے اتنے شعبے اور شاخیں نہیں ہوئیں جتنی شاخیں قدیم زمانے سے لے کر اب تک فلسفہ کی ہوتی چلی آئی ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے، اور خدا ہی جانے کہ کب تک جاری رہیگا۔ چنانچہ ہر ملک میں اس فلسفے نے کوئی نہ کوئی خاص شکل اور ایک مخصوص معیار اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ دوسرے علوم کی طرح اپنے ہر دور میں یہ فلسفہ نظریۂ نشو و ارتقاء کے تابع رہا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے اعتبارات اور خارجی اثرات وعوامل، یہانتک کہ جغرافی عوامل و اثرات تک علوم فلسفیہ کی رفتار رہیں، اور جس حد تک وہ آج پہنچا ہے اس تک پہنچانے میں اثر انداز رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو آج فلسفہ اس معراج ترقی پر نظر آ رہا ہے۔

ہماری غرض اس وقت فلسفے کے نشو و نما پر بحث کرنا نہیں ہے نہ یہ کہ اس میں جس قدر شاخیں پیدا ہوگئی ہیں انکو پھیلا کر بیان کریں۔ ہم اس صحبت میں مختصر طور پر صرف "فلسفۂ تصوریت" یا بالفاظ دیگر "لاشیئت" کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

لاشیئت کیا ہے؟

لاشیئت یا تصوریت کا مذہب، وجود مادہ کے انکار کا نام ہے۔ آج دنیا میں اس مذہب کے قائل بہت کم لوگ نظر آتے ہیں، اتنے کم کہ انکی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے مگر انکا یہ فلسفہ گزشتہ زمانے کے بہت سے دوروں میں بہت زیادہ رائج و شائع رہا ہے۔ البتہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اسکا سایہ بھی دنیا سے ناپید ہوتا چلا گیا۔ اس مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز اس کائنات اور دنیا کی زندگی میں پائی جاتی ہے وہ حقیقت میں موجود نہیں بلکہ محض ایک خیال ہے اور یہ زندگی عالم نوم سے

اُن مظاہرات سے ذرا بھی فرق نہیں رکھتی جن کو آدمی سوتے میں دیکھتا ہے اور جنہیں خواب یا رویا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فرق البتہ ہے کہ یہ بیداری کے مظاہر خواب کے مظاہر سے قدرے زیادہ واضح اور زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تمام واقعات بہمہ وجوہ ایک خواب ہیں۔

اگر آپ اس مذہب کے قائل اور اس عقیدے کے پرستار سے یہ سوال کریں کہ تم ایک چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، اپنے کانوں سے سنتے ہو، اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہو، پھر اُس کا وجود محض خیالی کیونکر ہو سکتا ہے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ کیا آپ یہ سب حرکتیں خواب میں نہیں کرتے، خواب میں بھی تو آپ یہ سب کچھ کرتے ہیں، حواس کا وجود بیداری یا حقیقت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ اس خیال کے قائل طرفہ لوگ ہیں کسی دلیل سے انہیں قائل کرنا آسان کام نہیں اس وجہ سے کہ وہ ہر چیز کا انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دلیل و برہان بجائے خود بکواس اور ہذیان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ یہ ویسا ہی ہذیان ہے جیسا انسان خواب میں بکتا رہتا ہے۔

ان لوگوں کے لئے صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب تم لوگ عالم کائنات میں کسی حقیقت کے وجود کو نہیں مانتے اور نہ اسکو واقعی جانتے ہو اور یہ اعتقاد رکھتے ہو کہ اس زندگی میں جو کچھ بھی ہے وہ ایک خواب در خواب ہے، اس سے زیادہ اسکی کوئی حقیقت نہیں تو تمہارا کلام بھی خواب ہی کے دائرے میں داخل ہے۔ اور اس بنیاد پر ہمارے لئے غیر ممکن ہے کہ ہم اسے حقیقت سے تعبیر کر سکیں۔ یہاں پہنچ کر ان کا دعوےٰ ساقط ہو جائے گا اور انہیں خاموش ہونا پڑے گا کیونکہ کوئی ایسا اصول باقی نہ رہے گا جس پر وہ اپنی اس خیالی عمارات کو قائم رکھ سکیں۔

اس گروہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان سے ذرا کم عجیب ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مادے کے وجود سے انکار کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ عالم کائنات میں فکر و خیال کے سوا حقیقت میں کچھ نہیں ہے پس وہ تمام محسوسات جو ہمارے حواس کے تحت میں آتے رہتے ہیں۔ ان کا اس سے زیادہ کوئی وجود نہیں ہے کہ وہ صرف فکر و خیال کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ پس جب خیال غائب ہوتا ہے تو یہ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ اس فریق کا سب سے

زبردست حامی علامہ برکلے ہیں جس کی شہرت اٹھارہویں صدی عیسوی میں بحیثیت ایک فلسفی کے معراج کمال پہنچی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس صدی کا کامل ترین عالم و فلسفی ہے اس کے خیالات "مکالمات برکلے" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مکالمے دو شخصوں میں ہوتے ہیں جن میں سے ایک کا نام ہیلاس ہے اور دوسرے کا نام فیلو نوس۔ ان مکالمات میں یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کی ہستی میں وہ کوئی شئے نہیں جسے تم "مادہ" کے نام سے یاد کرتے ہو اور یہ دنیا صرف ایک "مجموعۂ افکار" ہے۔

ایک مشکل حقیقت

ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے سیاہ لکڑی کا میز ہے۔ وہ رنگ میں بالکل سیاہ اور شکل میں مستطیل ہے اور اس کی سطح پالش کی ہوئی ہے اور اس کا اصل مادہ سخت لکڑی ہے، اس کے چار پائے ہیں جن کی بلندی بالکل مساوی ہے، پس جو شخص بھی اس کو دیکھے گا اس میز کی ان اوصاف سے متصف اور ان اوصاف کو اس سے متعلق پائے گا۔ یہاں تک کہ دو آدمی بھی ان صفات میں اختلاف نہیں کر سکتے لیکن اگر ہم ذرا باریک بینی سے کام لیں تو ہم کو بہت سی وجوہ اختلاف نظر آئیں گی۔ اس لئے کہ اگرچہ میز کا رنگ سیاہ ہوگا مگر یہ سیاہی میز کے تمام حصوں میں یکساں پھیلی ہوئی نہ محسوس ہوگی۔ اس لئے کہ ان میں سے بعض حصے نہایت تیز روشنی میں ہوں گے، اور کچھ حصہ کم تیز روشنی میں۔ اس وجہ سے اس حصہ کی سیاہی زیادہ ہلکی نظر آئے گی۔ ان حصوں سے جو تیز روشنی کے موقع پر نہیں ہیں۔ پس جب چند لوگ بیک وقت دیکھیں گے تو دماغوں میں رنگ کی جو صورتیں حاصل ہونگی، وہ ہر ایک کے ذہن و دماغ میں مختلف ہوں گی، یہ اختلاف میز سے مسافت کے اختلاف اور مقام روشنی کے لحاظ سے ہوگا، اور ضرور ہوگا۔ اسی طرح دوسرے اعتبارات کے لحاظ سے بھی اختلافات نظر آئینگے۔ ان اختلافات کا ادراک کرنے میں مصوروں اور نقاشوں سے زیادہ کوئی ماہر نہیں۔ اس لئے کہ وہ بدرجۂ اتم اس کے عادی ہیں کہ صورتوں کو دیکھیں، اور ہو بہو ان کی

اس طرح کہ شکل اس سے بہت ہی قریب تر ہو۔ جو بات میز کے رنگ پر صادق آتی ہے وہی میز کی شکل و صورت پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ جس مرکز پر دیکھنے والا کھڑا دیکھ رہا ہے، اس مرکز کے لحاظ سے شکل میں بھی اختلاف ہوگا۔ یہی اختلاف اس میز کی بلندی اور عرض نیز سطح کی ہمواری اور صفائی، چکناہٹ کے [illegible]

اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ میز کی یہ تمام صفات — وہ صفات جنہیں فلاسفہ "محسوسات" سے تعبیر کرتے ہیں — صرف نسبتی اعتبارات ہیں۔ جو حالات اور اشخاص کے اختلاف کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ پس ان میں سے ایک کو حقیقی سمجھنا اور باقی کو محض وہمی خیال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کل اعتبارات میں سے ہر ایک اعتبار کو اپنے حقیقی ہونے کا وہی حق ہے جو دوسرے کو ہے کہ وہ اپنے کو اعتبار حقیقی کہتا ہے۔ اور چونکہ ان اعتبارات کی کوئی حد و نہایت نہیں اور یہ باہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ تقریباً ایک دوسرے کے نقیض ہوں، لہذا حقیقت غائب، اور یہ کہنا بہت صحیح ہوگا کہ ان تمام تر اعتبارات میں سے کسی ایک اعتبار کا بھی حقیقی وجود نہیں۔ بلکہ یہ سب کے سب وہ صورتیں یا وہ اعراض ہیں جو خیال میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اعراض کا اپنے جوہروں سے مجرد ہونا ممکن نہیں ہے تو یہ حکم لگا دینا لازم آیا کہ جوہر کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، کیونکہ جوہر اور عرض دونوں متحد یا لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔ پس جب اعراض محض اوہام ٹھہرے تو جوہروں کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیے۔

اس مشکل کی ایک دوسری صورت

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے، جب وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا تو یہ بات طے شدہ سمجھئے کہ تمام تر اعراض یعنی محسوسات اور جواہر وہ ہیں کہ ان میں سے کسی کا وجود بھی خیال کے سوا کہیں اور نہیں۔ مثلاً، جب ہم کسی عمارت کو دیکھیں گے تو یہ حکم لگائیں گے کہ اس کا وجود حقیقی خیال کے سوا اور کہیں نہیں، اور وہ بھی اس طرح پر کہ اگر خیال غائب ہو گیا تو یہ عمارت بھی اس کے ساتھ غائب ہو جائے گی، اور اس پر ہم ذیل

قیاس کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر موجود کا وجود ہے، اس لئے کہ فکر اسکو پاتی ہے اور جو شے موجود نہیں وہ پائی نہیں جاتی۔ اسلئے کہ فکر اس کو نہیں پاتی۔ لہذا اس صورت میں ہر موجود کیلئے ضروری ہے کہ وہ فکر وخیال میں ہو۔ اور اگر وہ فکر وخیال میں نہیں ہے تو مطلقاً موجود ہی نہیں ہے۔

اس کی مزید وضاحت کے لئے ہم یوں کہتے ہیں کہ مثلاً درخت کا وجود ہے اس لئے کہ وہ زید کے فکر وخیال میں موجود ہے۔ اگر زید کے خیال میں اُسکا وجود نہ ہوتا تو سرے سے وہ موجود ہی نہیں ہوتا اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ اس کا وجود ہے تو یہ اسلئے ہے کہ وہ زید کے علاوہ کسی اور شخص کے فکر وخیال میں اُسکا وجود ہے اور اگر ہر فکر وخیال اس سے خالی ہے تو مطلقاً اُس کا وجود ہی نہیں ہے۔

بعض فلاسفہ نے یہ بات محسوس کی کہ اس اصول میں کچھ کمزوری اور بوالعجبی ضرور ہے، پس انہوں نے اپنے قیاس کو امد زیادہ وسعت دی ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ جو چیز خدا اور انسان کی فکر سے ماسوا ہے اُس کا حقیقت میں وجود نہیں۔ یہ قول صحت واصابت رائے سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

اس نظرئے کی غلطی

علاوہ ازیں یہ نظریہ ایک غلطی پر مبنی ہے، جس میں برکلے جیسے وسیع النظر فلسفی سے بھی بھول چوک ہوئی ہے، اور اُس کے دوسرے پیرو فلاسفہ سے بھی۔ وہ لغزش یہ ہے کہ انہوں نے فکر وخیال میں کسی چیز کے وجود مادی اور وجود نسبتی وصوری میں کوئی فرق قائم نہیں کیا۔ کیونکہ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ ایک درخت زید کے خیال میں ہے تو اُس کے معنی یہ نہیں ہونگے کہ مادی طور پر زید کی فکر وخیال میں موجود ہے، یعنی اپنی جڑوں، پتوں اور شاخوں سمیت بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی صورت زید کے خیال میں متمثل ہے۔ پس اس بنیاد پر یہ بھی بالکل جائز ہوگا کہ ایک شے کا وجود مادی ہو، بغیر اس کے کہ کسی خیال میں بھی ہو۔ ہاں البتہ مذہبی اعتقاد ایک مرد مومن کے دل میں وجود الٰہی کا یقین ضرور پیدا کرتا ہے۔ اس لئے کہ مادی دنیا میں کوئی چیز خدا کے خیال اور فکر سے باہر نہیں اور یہ مقام ایک نظرئے کے ثابت

لیکن یہ کوئی نہیں اعتقاد کا۔ اور یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ ہم جواہر کا تو انکار کرتے ہیں لیکن عوارض کے وجود سے انکار نہیں کرسکتے، اس لئے کہ یہ اعراض وہ محسوسات ہیں جن کا ادراک ہم حواس کے ذریعے کرتے ہیں لیکن جواہر کا ادراک اس طریقے پر بہت دشوار ہے، اس لئے کہ مثلاً زید میز کے وجود کا انکار کرتا ہے اور کرسکتا ہے لیکن وہ یہ نہیں کرسکتا کہ ان اعراض یعنی محسوسات سے اندھا بن جائے، جو میز سے متلازم ہیں۔ جیسے رنگ، شکل، بلندی، سختی، وغیرہ۔ ہاں کبھی ان اعراض کی حقیقت کے بارے میں انسان کو وہم ہو سکتا ہے لیکن نفس وجود اس کے خیال میں خود اس امر کی دلیل ہے کہ اسکا وجود کسی نہ کسی صورت میں حقیقی ہوگا۔ اس وجہ سے کہ ہر علت کے لئے ایک معلول کا ہونا ضروری ہے چونکہ یہ ممکن نہیں کہ لاشے سے محسوسات پیدا ہوسکیں۔ اس لئے کہ لاشے سے شے کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ صفات یا عوارض کسی ویسی حقیقت کے ساتھ بھی ہوں جسے ہم نہ جانتے ہوں کہ وہ کیا ہے۔ گو ہم ایک باطنی اعتقاد کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ وہ حقیقت مادہ ہے۔ مثلاً اگر ہم فرض کریں کہ ہم نے میز پر ایک پردہ ڈال دیا۔ جس نے میز کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تو اس حالت میں اس کے اعراض بھی جاتے رہیں گے۔ لیکن کیا خود میز بھی جاتی رہے گی؟ اگر نفس الامر میں ایسا ہے تو گویا یہ پردہ فضا میں ایک عجیب و غریب طریقے سے معلق ہوگا۔ یہ ایک محض وہم صریح ہے اور فلسفے میں ایسے اور بہت اوہام ہیں۔

مزید براں اس مسئلے کے متعلق اور بھی کئی وجوہ ہیں۔ مگر اس وقت ان میں پڑنا ہمارے لئے دشوار ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کو ہم نے چھیڑا ہے، بخوف طوالت اسے مختصر اور ختم کئے دیتے ہیں۔

ابو مسلم خراسانی

بانی خلافت عباسیہ

اگرچہ ابو مسلم خراسانی صرف ۳۰ سال زندہ رہا لیکن اسی تھوڑی سی مدت میں اس نے اپنی کوشش اور تدبر سے اموی سلطنت کا خاتمہ کر کے خلافت عباسیہ کی بنا قائم کر دی۔ اسی لئے تاریخ نے اسے "**بانی دولت بنی عباس**" کا غیر فانی خطاب عطا کیا ہے۔ حکومت عباسیہ میں مسلمانوں نے تہذیب و تمدن اور اخلاق و تمول میں جو نمایاں ترقی کی اور خصوصاً ہارون رشید و مامون رشید کے عہد حکومت میں جو عروج دنیائے اسلام کو حاصل ہوا حقیقت میں اس کا سہرا اسی ایرانی مدبر کے سر ہے۔ جبتک اسلامی تاریخ میں "بنی عباس" کا نام زندہ ہے، ابو مسلم خراسانی کے احسانات بھی سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔

لیکن یہ تلخ حقیقت نہیں بھولنی کہ ابو مسلم کو اس جانفشانی کا جو صلہ ملا وہ یہ تھا کہ خاندان عباسی کے ہی ایک خلیفہ نے اسے قتل کرا دیا۔

دعوت عباسیہ ابو مسلم کو اپنے ناظرین سے روشناس کرانے کے قبل ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ "دعوت عباسیہ" کے متعلق چند لفظ کہدیں، جس سے ابو مسلم کی شخصیت اور حیثیت متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب پر یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ خلیفہ سوم حضرت عثمان رضؓ کے انتقال کے بعد مسلمان مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور ہر فرقہ کسی بڑے صحابی کے زیر اثر ہو کر دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار یہ مختلف فرقے دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ حضرت علی رضؓ کو خلافت کا مستحق خیال کرتا اور دوسرا احباب معاویہؓ کو اس اہم ذمہ داری کا اہل تصور کرتا۔ ہر گروہ میں متعدد با اثر اور ذمہ دار صحابہ شامل تھے۔

لیکن آخر میں امیر معاویہؓ اپنی حکمت عملی اور سیاسی تدبر سے کامیاب ثابت ہوئے اور تمام ملک پر انکا قبضہ ہو گیا، اس کے بعد اسلامی حکومت متواتر انکے خاندان میں منتقل ہوتی رہی، یہ خاندان "بنی امیہ" کے نام سے مشہور ہے۔

لیکن جو لوگ حضرت علیؓ کے ہوا خواہ تھے اور ان سے بیعت کر چکے تھے وہ اس کے باوجود ہمیشہ بنی امیہ کی خلافت سے انکار کرتے رہے۔ اور حضرت علیؓ اور انکی اولاد کو مستحق خلافت سمجھتے اور انکے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ یہانتک کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جناب حسنؓ، جناب حسین علیہ السلام اور اس خاندان کے دوسرے حضرات کے ہاتھ پر یکے بعد دیگرے بیعت کرتے رہے۔ یہی سلسلہ "ائمہ اثنا عشر" (بارہ امام) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ لوگ عام طور سے "شیعہ" کہلاتے تھے اور آج بھی اس عقیدے کے اشخاص اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

بعد میں شیعوں کے بھی مختلف فرقے ہو گئے ایک فرقہ "کیسانیہ" نامی تھا جو حضرت محمد ابن حنفیہؓ کو مستحق خلافت سمجھتا تھا۔ آپ حضرت علیؓ کے صاحبزادے تھے اور آپ کی والدہ بنت جعفر قبیلہ "حنفیہ" میں سے تھیں۔ جب حضرت محمد ابن حنفیہ کا انتقال ہو گیا تو فرقہ کیسانیہ نے انکے صاحبزادے ابو ہاشم عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تاریخ میں وہ زیادہ تر اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ فرقہ کیسانیہ اس زمانے میں شیعوں کا سب سے زبردست فرقہ سمجھا جاتا تھا۔

شیعوں کا ایک فرقہ "فرقہ راوندیہ" کے نام سے مشہور تھا۔ انکا عقیدہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے چچا حضرت عباسؓ عصبہ ہونے کے سبب سے مستحق خلافت تھے۔ انکے استدلال کی بنیاد یہ آیت تھی۔

"وا ولوا الارحام بعضہم اولیٰ ببعض"

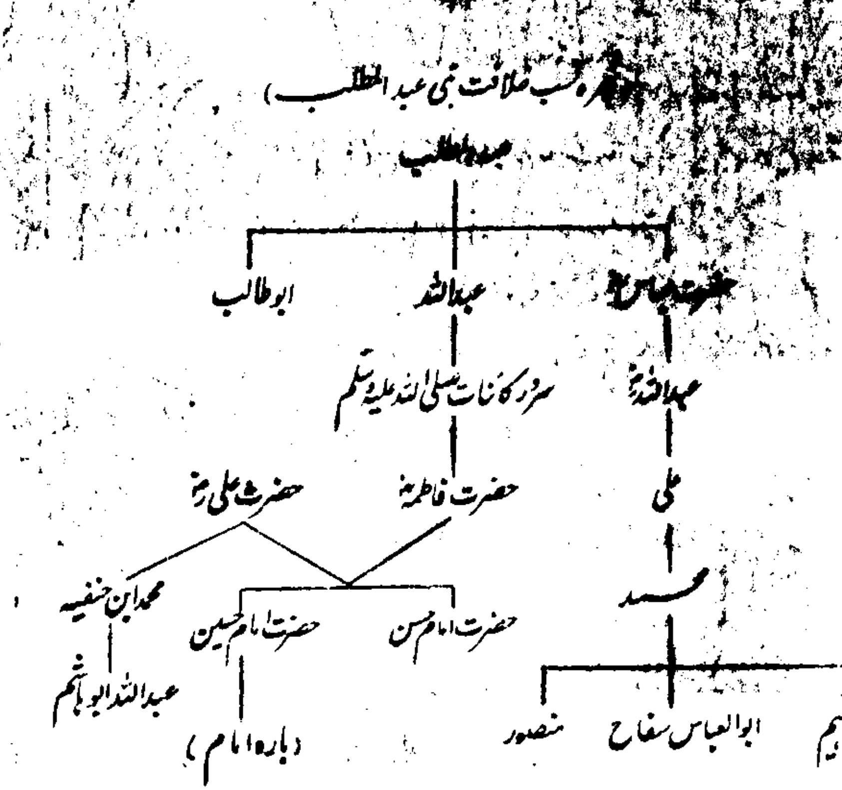
انکا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ حضرت عباسؓ کو انکا جائز حق نہیں ملا اس لئے خدا نے انکے خاندان میں امارت و خلافت قائم فرمائی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ لوگ حضرت علیؓ کی بیعت کو بھی جائز تصور کرتے تھے۔ کیونکہ حضرت عباس نے آپ سے فرمایا تھا کہ

لے۔ بھتیجے! کیا میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کروں پھر کوئی مخالفت نہیں کر سکے گا (روکتا قال) انکی رائے میں یہ جملہ کہہ کر حضرت عباس نے اپنا حق خلافت حضرت علیؑ کو ہبہ کر دیا تھا۔ اور جو شخص کوئی چیز کسی کو ہبہ کر دے پھر وہ اس کے پس ماندگان و ورثا اسے واپس نہیں لے سکتے۔

سلیمان ابن عبدالملک کے زمانہ (۹۲-۹۹ھ) میں ابو ہاشم ابن محمد ابن حنفیہ ملک شام میں سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں اتفاق سے بیمار ہو گئے اور ضلع بلقا کے ایک موضع میں محمد ابن علی ابن عبداللہ ابن عباسؓ کے مکان پر قیام کیا۔ مرض میں زیادتی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہیں انکا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت انہوں نے وصیت کی کہ انکے بعد انکے میزبان محمد ابن علی امام سمجھے جائیں۔

عراق اور خراسان میں ابو ہاشم کے کثرت سے معتقدین تھے۔ جب انہیں اطلاع ہوئی کہ آپ نے محمد ابن علی کے حق میں وصیت فرمائی ہے تو وہ لوگ محمد ابن علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خفیہ بیعت کر لی۔ اب محمد ابن علی نے حصول بیعت کے لئے اطراف ملک میں اپنے داعی روانہ کئے۔ یہ واقعہ ؁ کا ہے۔ تمام خراسان نے اس دعوت کو قبول کیا اور بہ کثرت اشخاص انکے ہوا خواہوں میں شریک ہو گئے۔ اس زمانے میں خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز دمشق کے حکمراں تھے۔ محمد ابن علی نے ایک باضابطہ نظام کے ماتحت بکثرت داعی اور نقیب مقرر کر کے تمام ملک میں انکا جال پھیلا دیا۔

لیکن ۱۲۶؁ھ میں انکا انتقال ہو گیا۔ انکے تین لڑکے تھے۔ ابراہیم، ابوالعباس (سفاح) اور منصور۔ انہوں نے ابراہیم کے حق میں وصیت کی چنانچہ انکے انتقال کے بعد ابراہیم سے لوگوں نے بیعت کی اور انکو "امام" کا لقب دیا گیا۔ ان کے بعد امامت سفاح کی منتقل ہوئی جیسا آئندہ ذکر کیا جائے گا۔



حکومت بنی امیہ امیر معاویہ کے حسن تدبیر اور اعلیٰ سیاسی قابلیت اور انکے معاونین کی کوشش و
زاری سے قائم ہوئی تھی۔ جن میں زیاد۔ عمر عاص۔ معیر بن شعبہ خاص طور سے مشہور ہیں۔
لوگوں نے امیر معاویہ کی بیعت زیادہ تر تلوار کے ڈر یا روپیہ کے لالچ سے جو انکو دیا جاتا تھا
کی۔ لیکن انکا دلی منشاء و اعتقاد یہی تھا کہ مستحق خلافت اہل بیت نبوی ہی ہیں۔
جب امیر معاویہ کا انتقال ہوگیا اور انکی یہ معاونین بھی ختم ہوگئے تو قریب تھا کہ حکومت امیر
ویہ کے خاندان سے پھر نکل جاتی جس کو عبید اللہ بن زیاد نے حضرت امام حسین اور انکے خاندان
ہور واقعہ کربلا میں شہید کرکے اپنے خیال میں بچالیا۔ یہ واقعہ ہمیشہ ہمیش اسلام میں یادگار رہے گا۔
جب یزید اور اسکا بیٹا معاویہ بھی مر گئے تو پھر قریب تھا کہ حکومت عبد اللہ بن زبیر کی طرف منتقل
ئے جو حرمین میں تھے لیکن مروان بن الحکم نے اس کو سنبھالا اور اسکی اولاد نے اپنے قبضہ میں
نی عبد الملک بن مروان اور اس کے بعد ولید اور سلیمان و یزید و ہشام وغیرہ ہوئے۔ ہشام ۱۲۵

سال میں مرگیا تو دو سال تین خلیفہ ہوئے آخر ۱۲۷ھ میں مروان بن محمد جو حمار کے لقب سے تاریخ میں مشہور ہے خلیفہ ہوا اور اس کے ہی زمانے میں بنی عباس نے حکومت حاصل کی۔ بنی امیہ کا یہ شرف تاریخ اسلام میں مسلم ہے کہ انکے زمانے میں اسلامی ممالک میں خاص طور سے توسیع ہوئی چنانچہ مشرق میں ان کی سرحد افغانستان تک اور مغرب میں اندلس و مراکو تک پھیلی ہوئی تھی۔

انہوں نے سکے جاری کئے اور اس وقت کے مناسب حال ملک کا بہترین انتظام کیا۔ لشکر مفتوحہ ممالک کی حفاظت و جدید فتوحات کے لئے تمام سلطنت میں پھیلائے۔ بہ سبب حسن انتظام دانصرام دولت و ثروت کی کثرت ہوگئی جس کی تاریخ شاہد ہے۔ لیکن آخر میں جیسا کہ عام قاعدہ ہے اس خاندان کے خلفا بھی عیش پرستی بدمستی رشک و حسد کھیل کود میں منہمک ہوکرامور سلطنت سے غافل ہو گئے۔ جس کا آخر نتیجہ جیسا کہ فطرت کا قانون ہے انکے آفتاب اقبال کا زوال تھا۔

خراسان والے بوجوہ مذکورہ بالا کثرت سے دعوت عباسیہ کے دل سے طرفدار تھے اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملک دارالحکومت سے بھی بہت فاصلہ پر تھا خلفا۔ جیسا کہ چاہئے اسکا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔

یہی اسباب عباسیوں کی کامیابی اور خاندان بنو امیہ کے تباہی کے ہوئے۔

ابو مسلم | ابو مسلم کا نام عبدالرحمن تھا۔ اس کے والدین موضع ماخوان خراسان کے علاقہ میں مرو سے ۳ کوس پر واقع ہے۔ ابو مسلم کا باپ موضع ماخوان اور قریب کے چند دیہات کا زمیندار تھا۔ وہ مویشی کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اور اس کے مویشی کوفہ کے بازار میں فروخت ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ ابو مسلم کے والد کے ذمہ جو مالگزاری واجب الادا تھی وہ ادا نہ ہو سکی۔ حاکم شہر نے چاہا کہ گرفتار کرکے حاکم اعلیٰ کے پاس بھیج دے۔ ابو مسلم کے والد کو بھی اس کی خبر لگ گئی۔ اپنی ایک لونڈی وشیکہ نامی کے ہمراہ جس سے بے انتہا مانوس تھا۔ آذربیجان کی طرف فرار ہوگیا۔ اس وقت یہ لونڈی حاملہ تھی جب یہ لوگ رستان نامی موضع پر سے گزرے تو وہاں اتفاقاً عیسیٰ ابن معقل سے جو اس کا خاص دوست تھا ملاقات ہوگئی وہاں چند دن آرام لینے کے لئے ٹھہر گئے۔ چونکہ سفر میں لونڈی کی ہمراہی سے بڑی دشواریاں

بس آئی تھیں اس لیے اسے عیسیٰ ابن معقل کے سپرد کرکے خود تنہا آذربیجان روانہ ہوگیا۔ اور وہاں پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انتقال کرگیا۔ لونڈی عیسیٰ ابن معقل کی نگرانی میں رہی اور کچھ دن بعد اس کے بطن سے ابو مسلم پیدا ہوا جس کی تربیت اور پرورش عیسیٰ ابن معقل نے اپنی اولاد کی طرح کی۔ بچپن ہی سے اس کے عادات و اطوار میں ایک غیر معمولی ذہانت اور تدبر کی جھلک نمایاں تھی جس کی وجہ سے عیسیٰ اسے بہت محبت کرتا اور اس کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا لحاظ و اہتمام رکھتا۔

لیکن زمانہ کو ابو مسلم کی یہ فارغ البالی گوارا نہیں ہوئی عیسیٰ اور اس کے بھائی ادریس پر بھی سرکاری مالگذاری کا بقایا برآمد ہوا۔ اور ان دونوں کو اس علت میں گرفتار کرکے اصفہان بھیج دیا گیا۔ وہاں سے خالد ابن عبداللہ القسری گورنر عراقین نے اطلاع ہونے پر دونوں کو طلب کرکے کوفہ میں قید کردیا۔ ان دنوں ابو مسلم عیسیٰ کے حکم سے دیہات میں وصول مالگذاری کے لئے گیا ہوا تھا جب اسے انکی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو جس قدر غلہ وصول کیا تھا اسے فروخت کرکے اور اس طریقہ سے جو کچھ جمع ہوسکا وہ لیکر کوفہ آگیا۔ اور عیسیٰ و ادریس سے جیل میں ملاقات کرتا اور انکے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔

اسی دوران میں محمد ابن علی ابن عبداللہ کے نقبا کی ایک جماعت مذکورالصدر مقاصد کی تبلیغ کے لئے کوفہ میں وارد ہوئی۔ ان میں شیعہ جماعت کی اکثر معزز اور بڑے بڑے سردار شامل تھے۔ یہ لوگ عیسیٰ وادریس سے ملاقات کے لئے جیل میں گئے۔ وہاں انکی ابو مسلم سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور انکی فراست و دانائی سے بہت متاثر ہوئے۔ ابو مسلم نے بھی انکی جانب ایک خاص کشش کی۔ اور محمد ابن علی ابن عبداللہ کی دعوت کی تفصیلات سے آگاہ ہونا چاہا۔ ان لوگوں نے اس دعوت کی تمام کیفیت بیان کی جس سے ابو مسلم نے فوراً محسوس کرلیا کہ مستقبل قریب یہ دعوت بہت زیادہ اہمیت حاصل کریگی چنانچہ وہ بھی ان لوگوں کا شریک کار ہوگیا اور انکے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ تھوڑے دن کے بعد عیسیٰ وادریس جیل سے فرار ہوگئے۔ اور اب ابو مسلم کا اس جماعت نقبا کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ کوفہ سے یہ لوگ مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوگئے اور ابو مسلم بھی انکے ہمراہ چل دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ محمد ابن علی کا انتقال ہوگیا تھا اور انہوں نے اپنے بیٹے ابراہیم کے حق میں

امامت کی وصیت کی تھی۔ یہ نقبا امام ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیس ہزار اشرفی اور دو لاکھ درہم جہاں پیش کئے وہاں ابو مسلم کو بھی انکی خدمت میں پیش کیا۔ امام ابراہیم اُسکی دانشمندی، فراست ذہانت اور قوت گویائی دیکھ کر نہایت محظوظ ہوئے اور اسے اپنی خدمت میں رکھ لیا۔ اب ابو مسلم امام ابراہیم کے کاروبار میں شریک ہوکر انکا معاون خاص بن گیا۔ اور جماعت نقبا رخصت کر دی گئی۔

کچھ برس کے بعد پھر یہی جماعت اپنے کام سے امام کی خدمت میں واپس آئی اور خراسان میں دعوت عام کے قیام و اہتمام کی غرض سے ایک ذمہ دار منتظم شخص کی ضرورت ظاہر کی۔ آپس میں مشورہ کیا گیا۔ امام ابراہیم نے کہا کہ میں نے اس خراسانی نوجوان (ابو مسلم) کو اچھی طرح آزما لیا ہے اور اس کے ظاہر و باطن کی کامل طور پر آزمائش کی ہے۔ میں اسے ایک سنجیدہ اور کوہ وقار آدمی اور پرجوش کارکن سمجھتا ہوں۔ میری رائے میں یہ اس کام کا سب سے زیادہ اہل ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ابو مسلم کو طلب کیا اور اسے اس جماعت کا منتظم اور ذمہ دار کرکے خراسان کی جانب روانہ کیا۔

اسوقت حکومت بنی امیہ کا آخری تاجدار مروان ابن محمد دمشق میں حکمران تھا۔ تمام ملک میں قتل و غارت اور فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ امرا ذاتیات کی بنا پر ایک دوسرے سے بدگمان اور رشک و حسد میں مبتلا تھے ایک ہی خاندان کے افراد آپس میں صفائی اور تعاون سے محروم تھے۔ سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں

ابو مسلم نے اس فرصت کو غنیمت سمجھا اور فوراً خراسان میں امام ابراہیم کی بیعت کا اعلان عام کر دیا۔ لوگ جو بدانتظامی اور خانہ جنگی سے عاجز آ چکے تھے۔ جوق جوق شریک دعوت ہونے لگے۔ اس وقت خراسان میں بنی امیہ کی جانب سے نصیر ابن سیار گورنر تھا جب اسے معلوم ہوا تو اس نے فوراً دمشق میں خلیفہ کو ابو مسلم اور امام ابراہیم کی دعوت کے متعلق اسکی کارروائیوں سے مطلع کیا۔

خلیفہ نے اس اطلاع پر غور کر کے لکھا کہ اس فتنہ خونخیز کو نہایت سختی اور کوشش سے جلد از جلد روکنا چاہئے اور اس کے متعلق انتہائی جد و جہد سے کام لینا چاہئے۔ دوسری طرف مروان نے امام ابراہیم کو گرفتار کرکے حران میں قید کر دیا۔ اور قید ہی میں زہر دے کر انکا کام تمام کر دیا۔ لیکن یہ تحریک کافی نشو و نما پا چکی تھی اور صرف امام ابراہیم کے خاتمہ سے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ ابو مسلم اس کے بعد بھی

...ں اپ ... سلسلہ برابر دعوت کو تقویت دیتا رہا۔
... اس نے علی الاعلان حکومت کے خلاف فوجی نقل وحرکت شروع کر دی۔ اہل خراسان اس کے
... عین وقت ... انہوں نے اس کارروائی میں نہایت دلچسپی اور انہماک کے ساتھ اس کا ہاتھ بٹایا۔
اس نے ایک مسلح اور منظم لشکر کے ساتھ اپنے مستقر سے جنبش کی۔ اور شہروں پر قبضہ کرتے اور ملکوں
کو فتح کرتے ہوئے عراق کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

اور جب ابوالعباس اور منصور کو ان کے بھائی ابراہیم کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ نہایت ہراساں
اور خوف زدہ ہوئے اور فرار ہو کر کوفہ چلے آئے۔ انکے ہمراہ اعزہ و اقربا کی ایک کافی جماعت بھی کوفہ
آگئی۔ وہاں ان کے ہواخواہوں نے تسلی تشفی کی اور انہیں پوشیدہ کر دیا۔

اب ابومسلم اپنے لشکر کے ساتھ عراق میں داخل ہو گیا۔ اور کوفہ پہنچ کر ابوالعباس و منصور کی مخفی
پناہ گاہ میں ان سے ملنے گیا۔ مکان کے اندر جا کر ابومسلم نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ تم میں حارثیہ
کا فرزند کون ہے۔ منصور نے ابوالعباس سفاح کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ یہ۔ ابوالعباس کی والدہ کا نام
حارثیہ تھا۔ ابومسلم نے سفاح کو سلام کیا اور خلافت پر ہدیہ تبریک پیش کیا۔ اب ابوالعباس ابومسلم کے
ہمراہ گھر سے باہر آیا۔ اس کی معیت میں اس کے بھائی اور تمام عزیز و اقارب تھے۔ اب ابوالعباس
نے علی الاعلان دعوت خلافت دی اور مسجد میں جا کر خطبہ پڑھا یہ واقعہ ۱۳۲ھ کا ہے۔ اور یہ خلافت
بنی امیہ کا آخری اور دولت عباسیہ کا پہلا دن شمار کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کی انتہا مروان اور سفاح
کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ پر ہوئی جس میں مروان بنی امیہ کے اکثر امراء کے ساتھ قتل ہوا اور
شاہان بنی عباس کے لئے مسند خلافت خالی کر دی۔ ہم اس واقعہ کی تفصیلات بخوف طوالت مضمون
نظر انداز کرتے ہیں۔

ابوالعباس سفاح، بنی عباس کا سب سے پہلا خلیفہ تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے ابومسلم کی
قدر و منزلت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اسے نہایت بلند مرتبہ پر پہنچایا۔ سفاح اسے اپنا زبردست
معاون اور پرخلوص مددگار سمجھتا تھا۔ اس کے کارناموں اور احسانات کا ہمیشہ مسرت اور شکرگذاری کے

ساتھ تذکرہ کیا کرتا تھا۔ قیام دولت کے متعلق اس کی جدوجہد اور گرانقدر خدمات کا کھلے دل سے معترف تھا
خود ابو مسلم بھی اپنی اہمیت سے ناواقف نہ تھا۔ اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے
بخوبی واقف ہے کہ محض اسی کی جان توڑ کوششیں اور پرخلوص کاوشیں اس غیر معمولی اور عظیم الشان
[illegible] ہیں۔

سفاح کے بعد منصور اورنگ نشین خلافت ہوا۔ منصور پہلے دن سے ہی قدرتاً ابو مسلم کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا جس کی ایک ظاہری وجہ تو یہ تھی کہ اس نے سفاح کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور منصور کی جانب جو وہیں موجود تھا ملتفت نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں غیر ارادی طور پر منصور ابو مسلم سے ایک قسم کی نفرت کا احساس کرتا تھا اور اس کے اعمال و افعال میں خلوص و دیانت کا عنصر اسے مفقود نظر آتا تھا۔ چنانچہ منصور نے ایک دو مرتبہ سفاح کو مشورہ بھی دیا کہ وہ ابو مسلم کو ختم کردے لیکن سفاح اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ اور اس نے ہر موقع پر سختی سے اس ارتکاب قتل سے انکار ہی کیا۔

جب منصور خود خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے چچا عبداللہ ابن علی کے مقابلہ کے بہانے جنہوں نے شام میں بغاوت کی تھی، ابو مسلم کو ادھر ٹال دیا۔ ابو مسلم گیا اور اس نے عبداللہ ابن علی کے ساتھ جنگ شروع کردی۔ بالآخر ابو مسلم کامیاب ہوا اور عبداللہ کے لشکر کا تمام مال و اسباب اس کے قبضہ میں آگیا۔ عبداللہ ابن علی شکست کھاکر بصرہ کی طرف پسپا ہوگئے۔ منصور کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنا ایک خاص آدمی ابو مسلم کے پاس بھیجکر کہلا بھیجا کہ تمام مال غنیمت جو اس معرکہ میں حاصل ہوا ہے تا حکم ثانی محفوظ کردیا جائے۔ ابو مسلم کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے کہا کہ خوب! میں خون پر تو امین ہوا مال پر خائن ہوں! اور اسی سلسلہ میں منصور کے متعلق کچھ سخت سست کہا اور گالیاں دیں۔ منصور کو بھی یہ گزرا۔ ابو مسلم کہنے کو تو کہہ گیا لیکن بعد میں جب اس نے غور کیا تو اسے اپنی خیریت نظر نہیں آئی۔ آخر اس نے قصد کیا کہ منصور کی خدمت میں حاضر نہ ہو اور خراسان کی جانب چلا جائے۔ منصور کو جب اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو اسے سخت تشویش ہوئی۔ اسے اچھی طرح احساس تھا کہ اگر ابو مسلم مخالفانہ خیالات کے ساتھ خراسان پہنچ گیا تو معاملہ خطرناک اہمیت اختیار کرے گا اور تمام ملک میں فتنہ و فساد کے شعلے

بڑی امیدیں ہیں گے

چنانچہ منصور نے ابو مسلم کو لکھا کہ وہ جلد دارالخلافہ میں حاضر ہو جائے۔ ابو مسلم نے جواب دیا کہ میں فی الحال خراسان کی جانب جا رہا ہوں، اگر حضور میری جانب سے اپنی طبیعت کی کدورت اور بدگمانی کو دور کر دیں کہ میں بہرصورت مطیع اور سلطنت کا خیر خواہ ہوں اور جو حکم ہوگا اس کی تعمیل کرنے کے لئے بسر و چشم حاضر ہوں، بصورت دیگر اگر حالات ایسے ہی دگرگوں رہے تو مجھے اپنے متعلق غور کرنے اور اپنی حفاظت کی تدابیر سوچنے کا حق حاصل ہے۔

منصور اس جواب سے اور بھی خوف زدہ ہوا اور اس نے ابو مسلم کو پھر ایک خط لکھا جس میں اس کی بڑی دلجوئی کی تھی اور اس نے بنی عباس پر جو احسانات کئے تھے ان کا تذکرہ کر کے لکھا تھا کہ میری جانب سے جو تمہیں بدسلوکی اور مضرت رسانی کے بے بنیاد اور فاسد خیالات پیدا ہو گئے ہیں یہ بالکل غیر معقول اور سراسر خلاف واقعہ ہیں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ سلوک و احسان ہی کا ارادہ رکھتا ہوں اور تمہاری ملاقات کا نہایت اشتیاق ہے۔

بنی ہاشم کے دوسرے معزز امراء سے بھی منصور نے ابو مسلم کو خطوط لکھوائے جن میں انہوں نے ابو مسلم کو ملامت کی کہ تم نے امیرالمومنین کی جانب سے ایسے غیر معقول خیالات کیوں قائم کر لئے؟ ہم سب تمہارے طرفدار اور احسان مند ہیں۔ تم کو فوراً بارگاہ خلافت میں حاضر ہو جانا چاہئے۔

یہ تمام خطوط ایک ہوشیار، محتاط، اور معتبر قاصد کے حوالے کئے گئے اور اسے زبانی بھی سمجھا دیا گیا کہ ابو مسلم سے بہت نرم اور مصالحانہ گفتگو کرے۔ اور جس طرح بھی ممکن ہو اسے بارگاہ خلافت میں حاضر ہونے کے لئے مجبور کرے۔ چنانچہ قاصد ان تمام ہدایات کو اچھی طرح سمجھ کر اور ذہن نشین کر کے ابو مسلم کے پاس روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر منصور کا خط دوسرے اصحاب کے خطوط کے ساتھ اسے پہنچا دئے۔
ابو مسلم نے خطوط پڑھے اور انہیں پڑھ کر اپنے نہایت معتبر دوست مالک ابن ہیثم سے اس کے متعلق مشورہ کیا۔ مالک نے کہا کہ منصور کے پاس ہرگز نہ جانا چاہئے۔ اگر تم وہاں گئے تو یقیناً قتل کر دے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تم اسی طرح آگے بڑھتے ہوئے رے پہنچ کر جہاں تمہارا لشکر موجود ہے حالات کا مطالعہ کرو

دیکھو کہ معاملہ کیا نوعیت اختیار کرتا ہے۔ اگر تمہارے خلاف کوئی خطرہ درپیش ہوا تو خراسان بہر صورت تمہاری اعانت اور پشت پناہی کرے گا۔

ابو مسلم نے اس رائے سے اتفاق کیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ اسی رائے پر عمل کرے گا۔ چنانچہ اس نے ایلچی سے کہا کہ میری جانب سے امیر المومنین سے عرض کر دو کہ میں فی الوقت دار الخلافہ میں حاضر ہونے سے معذور ہوں اور میرا جلد خراسان پہنچنا نہایت ضروری ہے۔

ایلچی نے کہا کہ ابو مسلم! تو آل محمد کا امین ہے۔ اور سب تجھ پر کامل اعتماد کرتے ہیں۔ اب تو اس اختلاف و انتشار کا باعث بن کر خود بھی گناہ گار ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی معصیت میں مبتلا کرتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں انہیں رفع کر دے اور بالفرض اگر تجھ سے کوئی فروگذاشت ہو گئی ہے تو اس کے متعلق معذرت ممکن ہے۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ امیر المومنین تجھ سے نہایت مہربانی کا برتاؤ کریں گے۔

ابو مسلم نے جواب دیا کہ اس کے متعلق زیادہ گفتگو عبث ہے میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے وہ ناقابل تغیر ہے۔

قاصد نے کہا خوب! جب بنی عباس نے کر ہم لوگوں کے پاس آیا تھا تو تو نے ہم سے کہا تھا کہ "اس کو مانو، جو اسکی مخالفت کرے گا اس کی سزا صرف موت ہو سکتی ہے،" تو نے ہمارے ساتھ مل کر آل عباس کی مدد کی، اور انکے دشمنوں کی حکومت برباد کر کے انکی سلطنت قائم کی۔ اب جبکہ ہم انکے معاون و مددگار ہو گئے تو ہمیں کیونکر چھوڑ سکتا اور انکی حکومت سے کس طرح انکار کر سکتا ہے۔

ابو مسلم نے جواب دیا یہ سب بجا ہے، تاہم میں خراسان ہی جانا چاہتا ہوں اور امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے سے مجبور ہوں۔

قاصد نے پھر کہا کہ اگر تو نے منصور کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ بہ نفس نفیس تیرے مقابلہ کے لئے فوجیں لیکر آ موجود ہوگا اس کے برخلاف اگر تو نے حکم کی تعمیل میں تامل نہ کیا اور فوراً بارگاہ خلافت میں حاضر ہو گیا تو میں امیر المومنین کی جانب سے ضامن ہوں کہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

مختصر یہ کہ بڑی بحث و تمحیص اور قیل و قال کے بعد ابو مسلم کو اس پر آمادہ ہی کر لیا کہ وہ اپنے فیصلہ پر مزید غور کرے [illegible] سے مجبور ہو کر اپنا ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ چنانچہ خلیفہ کے روبرو حاضر ہونے پر رضامند ہو گیا۔ ایلچی کو تو وہیں سے رخصت کر دیا کہ وہ جا کر خلیفہ کو یہ خبر پہنچائے اور اس کے علاوہ اپنا لشکر چند معتمد [illegible] انہیں سمجھا دیا کہ میرا جو خط آئے اگر اس پر نصف مہر لگی ہو تو اسے میری جانب سے باور کرنا اور اگر پوری مہر ہو تو سمجھنا کہ خط جعلی ہے۔ علاوہ ازیں اور ضروری ہدایات دے کر خود خلیفہ سے ملاقات کے لئے دار السلطنت کی جانب روانہ ہو گیا۔

جب منصور کو اس کے آنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے تمام امراء دولت و ارکان سلطنت کو حکم دیا کہ وہ ابو مسلم کے استقبال کو جائیں، اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کریں۔ چنانچہ ابو مسلم نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ شہر میں داخل ہو کر دربار خلافت میں حاضر ہوا اور نہایت ادب سے منصور کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ منصور نے بھی بہت آؤ بھگت کی اور اپنے قریب بٹھایا۔ تھوڑی دیر گفتگو کرکے کہا کہ تم سفر کی تکان سے مضمحل ہو رہے ہو۔ اس وقت جا کر آرام کرو۔ کل پھر آنا۔

چنانچہ دوسرے دن صبح منصور نے پھر ابو مسلم کو طلب کیا، اور دیوان خانے کے پردوں کے پیچھے ایک مسلح دستہ پوشیدہ کرکے ہدایت کر دی کہ جب میں (منصور) دستک دوں تو فوراً نکل کر ابو مسلم کا کام تمام کر دیا جائے۔ منصور یہ انتظام کرکے فارغ ہی ہوا تھا کہ ابو مسلم حاضر ہوا۔ رسمی گفتگو کے بعد منصور نے دریافت کیا کہ وہ دو تلواریں جو عبداللہ ابن علی کے معرکہ میں تمہیں دستیاب ہوئی تھیں کہاں ہیں؟ ابو مسلم نے اپنے ہاتھ کی تلوار پیش کرکے عرض کیا ان میں سے ایک تو یہ ہے! منصور نے اسے لیکر اپنی جانماز کے نیچے جس پر بیٹھا تھا رکھ لیا۔ اب منصور نے اپنا انداز کلام بدلنا شروع کیا اور ابو مسلم کی تقصیریں اسے شمار کرانا شروع کیں۔ ہر قصور پر ابو مسلم کچھ معذرت کرتا جاتا تھا اور خلیفہ ایک قصور کے بعد دوسرا گناتا جاتا تھا، یہاں تک کہ آخر میں تنگ آکر ابو مسلم نے کہا کہ "امیر المومنین معمولی فروگذاشتیں مجھ جیسے شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتیں، انکا اعادہ فضول ہے، میری کارگزاریاں اور جاں نثاریاں ان غیر اہم تقصیرات کے مقابلہ میں بدرجہا بلند تر ہیں!!"

یہ سن کر منصور بے انتہا برہم ہوا اور گالی دے کر کہا کہ بلاشبہ تونے یہ کام سرانجام دئے، لیکن اگر تیری جگہ کوئی حبشی لونڈی ہوتی تو وہ بھی یہی کرسکتی جو تونے کیا، کیا تجھے یاد نہیں کہ تیرا یہ مرتبہ اور تیری یہ دولت محض بنی عباس کی چشم کرم کا نتیجہ ہے۔

ابومسلم نے جواب دیا "امیرالمومنین! اب یہ قصے جانے دیجئے، بہرصورت میں خدا کے سوا کسی تنفس سے نہیں ڈرتا۔"

منصور نے دستک دی، مسلح جماعت کمیں گاہ سے جھپٹی، اور اس نے ابومسلم پر حملہ کر دیا۔ ابومسلم چلایا کہ "امیرالمومنین! مجھے اپنے اعداء کے مقابلے کے لئے زندہ رہنے دیجئے"، منصور نے کہا "میرا تجھ سے زیادہ کون دشمن ہوسکتا ہے۔"

اتنے عرصے میں ابومسلم زخموں سے چور ہوچکا تھا، وہ گرا اور ساتھ ہی کئی تلواریں اس کے سر و سینہ میں پیوست ہوگئیں، اب اس کا کام تمام ہوچکا تھا، منصور نے اس کی نعش کو چادر میں لپٹواکر علیحدہ رکھوا دیا۔

اس کے بعد عیسیٰ ابن موسیٰ منصور سے ملنے آیا۔ اس نے دریافت کیا "امیرالمومنین ابومسلم کہاں ہے؟" منصور نے اس چادر کی طرف جس میں ابومسلم کی نعش لپٹی ہوئی رکھی تھی اشارہ کر دیا۔ عیسیٰ نے تعجب سے پوچھا "کیا قتل ہوگیا؟" منصور نے کہا "ہاں!!!"

عیسیٰ نے اناللہ پڑھا اور منصور سے کہا "حقیقت میں آج آپ کی حکمرانی کا پہلا دن شروع ہوا ہے اور آج آپ حقیقی معنوں میں امیرالمومنین اور محکوم ممالک کے بادشاہ کہے جانے کے مستحق ہوئے، تمام دنیا میں آپ کا اس شخص سے بڑا دشمن نہ تھا۔

منصور نے عیسیٰ کو حکم دیا کہ وہ ابومسلم کے لشکر میں جاکر لوگوں کو حسب حیثیت نقد و جنس تقسیم کرے اور پھر انہیں منتشر کردے چنانچہ اسکی تعمیل ہوئی اور لشکر والے منتشر ہونے لگے۔ اس کے بعد منصور کا خراسان پر پورا پورا قبضہ ہوگیا۔ یہ واقعہ ۱۳۷ھ کا ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابومسلم کے قتل کے بعد سب سے پہلے جعفر بن حنظلہ منصور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ منصور نے اس سے دریافت کرنا چاہیے؟ اس نے کہا کہ اگر امیرالمومنین کو ایک بال کے برابر بھی اس پر قابو حاصل ہو تو فوراً اسے قتل کر ڈالنا چاہیے۔ منصور نے کہا خدا نے مجھے اس کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ یہ کہہ کر اس چادر کی طرف جس میں ابومسلم کی نعش تھی اشارہ کر دیا۔ جعفر نے کہا آج حضور کی حکومت کا پہلا دن ہو۔ مبارک ہو!

کہا جا سکتا ہے کہ منصور نے دھوکے اور ظلم سے ابومسلم کو قتل کیا لیکن منصور کی جانب سے بھی یہ جواب ممکن ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی حکومت سخت خطرہ میں مبتلا ہو جاتی۔ بہرحال یہ امر کہ منصور کا یہ طرزعمل مستحسن تھا یا غیر مستحسن؟ اور اس کی جانب سے یہ عذر قابل قبول ہے یا نہیں؟ ہمارے موضوع بحث سے غیر متعلق ہے۔

عام اخلاق و عادات | ابومسلم کا پستہ قد، گورا رنگ، سیاہ آنکھیں، چوڑے شانے، خوبصورت داڑھی گداز پنڈلیاں اور نرم آواز تھی۔ عربی و فارسی میں نہایت فصاحت سے گفتگو کرتا تھا۔ بہت خوب شعر کہتا تھا اور سخن فہمی کا خاص ملکہ رکھتا تھا۔ نہ بے محل ہنستا اور نہ کسی سے مذاق کرتا۔ خوشی، رنج، اور غصہ وغیرہ جذبات کی علامات اس کے چہرہ پر کبھی نمایاں نہیں ہوتی تھیں۔ بڑی بڑی فتوحات اور سخت رنجدہ واقعات کا اس کے سامنے تذکرہ ہوتا اور اس کے سکون و سنجیدگی میں مطلق فرق پیدا نہ ہوتا۔ نہایت پاکباز اور غیرت دار تھا۔ ایک سال میں صرف ایک بار عورتوں کی جانب ملتفت ہوتا اور کہا کرتا تھا کہ یہ بھی ایک قسم کا جنون ہے۔ اور انسان کے لئے سال میں ایک مرتبہ مجنون ہونا کافی ہے۔ اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے محل سرا میں کوئی نامحرم شخص داخل ہو سکے۔ اپنی بیگمات کے ساتھ اس کا برتاو شریفانہ اور فیاضانہ تھا اور کبھی ان سے بدسلوکی سے پیش نہیں آتا تھا۔ نہایت خوش اخلاق اور سیرچشم تھا۔ طامع

وہ ذہین تھا۔ حوصلہ مند اور مشکلات کا مقابلہ کرنے میں بے انتہا دلیر اور صاحب عزم تھا۔ مامون رشید کا قول ہے کہ

”دنیا میں تین بادشاہ بہت ذی حوصلہ اور دلیر گزرے ہیں جنہوں نے سلطنتوں میں انقلاب پیدا کر دیے۔ سکندر، اردشیر، اور ابو مسلم خراسانی!“

ابو مسلم اپنی عمر اور غیر معمولی اولوالعزمی کے لحاظ سے بڑی حد تک سکندر کے ساتھ مشابہ ہے۔

(مہتد)

شذرات

انگریزی حکومت باعث خیر ہوئی یا باعث شر، اسکا فیصلہ آئندہ نسل کے لوگ بہتر کر سکیں گے. ہم نہ تو اس کے انجام سے واقف ہیں، نہ اس زمانہ میں وقتی تعصبات کے سبب سے غالباً کوئی غیر جانبدارانہ رائے قائم کر سکیں۔ تاہم ایک امر میں اس حکومت کا مفید ہونا ہر شخص تسلیم کریگا۔ آزادی اور جمہوریت کے تخیلات کی قدر کرنا ہم اس حکومت کی ماتحتی میں حیرت انگیز سرعت و سہولت کے ساتھ سیکھتے جا رہے ہیں۔

بعض لوگ اسے انگریزی حکومت کی روشن خیالی اور نرمی پر محمول کرینگے۔ ممکن ہے اس خیال میں قدرے شائبہ صداقت کا ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک اسکی اصلی وجہ کچھ اور ہے۔ انگریز غیر ملکی ہیں، نسل، مذہب، تمدن کوئی چیز ان میں اور ہندوستانیوں میں مشترک نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی مغائرت دور کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ ان کی حکمت عملی کا تقاضہ بھی یہ نہ تھا۔ ایک منضبط دفتری اور فوجی نظام کو انہوں نے زیادہ معتبر سمجھا اور اسی پر اپنی حکومت کی بنا رکھی۔ بلاشبہ تعلیمگاہوں سے قلوب کو مسخر کرنے کا کام ایک حد تک لیا گیا لیکن انہیں بھی پوری طرح کامیابی نہ ہوئی۔ یہ دلوں میں ہیبت بٹھا سکیں۔ غلامی کی [illegible] کو بھلا سکیں۔ محبت نہ پیدا کر سکیں اور ہندوستانیوں کی وفاداری، اس وفاداری کی مانند جو اپنے قدیم اداروں سے ہوتی ہے، کسی پائدار جذبہ پر قائم نہ ہوئی۔ یہ اسکی صلاحیت نہیں رکھتی کہ حریت و جمہوریت کے دلفریب تخیلات کی راہ میں حائل ہو سکے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان تخیلات کو مقبولیت ہی اسی لئے ہو رہی ہے کہ یہ ایک اجنبی حکومت اور اجنبی سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔

اگر ہندوستان کے مستبد حاکم ہندوستانی ہوتے، اور یہاں کے مزدوروں کی تباہ حالی کے ذمہ دار ہندوستانی سرمایہ دار، تو سیاسی و اقتصادی غلامی کے خلاف تحریکیں شاید اتنی جلد نہ پھیل سکتیں۔ ملیان

آزادی کو ملک سے برسر اقتدار طبقوں کی مخالفت، بجالی بندوں کی محبت، قدیم اداروں کی عزت سب سے بڑھ کر مذہب، جو قدامت پرستوں اور مستبدوں کی مضبوط ترین پناہ گاہ ہوا کرتا ہے، جیسے اہم موانع کے خلاف مدت مدید تک جدوجہد کرنی پڑتی۔ پھر بھی جماعت کے اندر شدید تصادم اور سخت خونریزی کے بغیر کامیابی ممکن نہ ہوتی۔ لیکن وہ سہولت جو حامیان آزادی کو ہندوستان میں میسر آرہی ہے اپنے خطرات بھی رکھتی ہے جن سے آگاہ رہنا ضروری ہے۔ حریت وجمہوریت کے تخیلات ایک بالکل ہی غلط منطق سے مقبولیت عام حاصل کر رہے ہیں۔ انہیں بالعموم کامیابی اس لئے ہو رہی ہے کہ یہ ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف ہیں، جس سے لوگوں کو محبت کبھی نہ تھی، اور مسلسل مخالفانہ پروپگنڈے کے باعث سوءظن بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ دوسرے حالات میں جو خیال سمجھنے بوجھنے کے بعد ایک عرصہ میں پھیلتا وہ ہنگامی جذبات کے موافق ہونے کی وجہ سے بے سمجھے بوجھے فوراً مان لیا جاتا ہے۔ حریت وجمہوریت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ حکومت وقت کے خلاف ہیں۔ اس غلط طرز استدلال سے موجودہ تحریک کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ جس چیز پر زور دیتا ہے وہ اجنبیت ہے نہ کہ استبداد، اپنی حکومت ہے نہ کہ آزادی۔

ایک طرح کی غلامی سے نکلکر دوسری طرح کی غلامی میں اگر ہندوستان کو مبتلا نہیں ہونا ہے تو ضروری ہے کہ جمہور کو حریت وجمہوریت کے اصلی معنی اور صحیح قدروقیمت سے واقف کیا جائے۔ صرف رہنماؤں کا جاننا اور سمجھنا کافی نہ ہوگا۔ جمہوریت کی کامیابی کے لئے جمہور کی سیاسی تعلیم ہونی چاہئے۔ انہیں ابتدا سے یہ جاننا چاہیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، کیوں چاہتے ہیں، اور اگر مل جائے تو اسے کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ چوکنا رہنے کا عادی بنانا چاہئے۔ حریت جس کی حفاظت جمہور سے ہوتی ہے ایک ایسی متاع بے بہا ہے جس کے لٹنے کا خطرہ ہمہ وقت رہتا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے اپنے سوا کسی اور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ان پر بھی نہیں جنہیں ہم اپنا ہمدرد و رہنما سمجھتے ہیں۔ دنیا نے جمہور کی نادانی اور غفلت سے "رہنما" کے "مالک" بن جانے کی بیسیوں مثالیں دیکھی ہیں۔

[illegible] کے لئے جس قسم کی تعلیم عوام کو دینا ضروری ہے اس کا صرف نظریات پر مشتمل ہونا بھی کافی نہیں ہے۔ حریت و جمہوریت کے اسباق عملی بھی ہونے چاہئیں اس کے لئے مدرسوں اور سوسائٹی دونوں کی مشترکہ امداد درکار ہوگی۔ دونوں کی اس نہج پر از سر نو تنظیم ہونی چاہئے کہ ملک کے تمام افراد کی سیرتوں میں حریت و جمہوریت کی روح سرایت کر جائے اور وہ اپنی روزمرہ کی زندگی بھی اسی طرح بسر کرنے لگیں جس طرح سیاسی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ سیاسی زندگی قوم کی معاشرتی زندگی کا عکس ہوتی ہے۔ یہ اگر آزادیٔ خیال و آزادیٔ عمل روا رکھتی ہے، اختلاف و تصادم کے وقت مصالحت کے قابل بناتی ہے، خودداری اور اپنی مدد آپ کرنے کی تعلیم دیتی ہے، جرأت و مردانگی پیدا کرتی ہے، سب کو برابر کا درجہ دیتی اور بنی نوع انسان سے محبت کرنا سکھاتی ہے تو وہ بھی حریت، مساوات، اخوت اور دوسرے لوازمات جمہوریت سے متصف نظر آئے گی ورنہ جیسا کہ تاریخ میں اکثر ہوا ہے، قومی آزادیوں اور پاک آرزوؤں کے باوجود سیاسی انقلاب کسی نئی مستبد حکومت کو قائم کر دے گا، خواہ وہ اپنے ہی ہموطنوں کی کیوں نہ ہو، اور حامیان آزادی کو دلشکن مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہ خطرہ قوم کے اندر برے لوگوں کی موجودگی سے ہی نہیں ہوتا۔ اچھوں سے بھی اس معاملے میں اتنا ہی ڈرنا چاہئے۔ زندگی کی بوالعجبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سیاسی آزادی کے راہ زن صرف بدنیت نہیں ہوتے۔ اختیار پاتے ہی مطلق العنان ہو جانے والے لوگ صرف وہ نہ تھے جن کا دماغ طاقت نشہ نے بگاڑ دیا تھا یا جن کی خودغرضی ان پر غالب آگئی تھی، بلکہ وہ لوگ بھی تھے جو ابتدا سے انتہا تک خلوص و دیانتداری کے ساتھ حریت و جمہوریت کے حامی رہے۔ دنیا میں "اصول" اور "خدا" اسی قدر استبداد کے محرک ہوئے ہیں جس قدر کہ شخصی اغراض۔ لیکن یہ انہیں مقامات پر جہاں جہاں عوام نہ تو آزادی اور جمہوریت کے صحیح معنی سے واقف تھے نہ انکے لئے آنکے پاس مضبوط معاشرتی بنیادیں تھیں، جہاں رہنماؤں کو یہ غلط فہمی تھی کہ اختیارات حکومت کا ان کے ہاتھ میں

آجانا آزادی کا مرادف ہو، اور عوام کو یہ امید تھی کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں صلاح کئے بغیر سیاسی صلاح ہوجائے گی۔ تاریخ تو ہمارے لئے عبرت و بصیرت کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے، دیکھئے ہم اس سے کس قدر استفادہ کرتے ہیں۔

امان اللہ خاں سابق شاہ افغانستان کی شکست نے اگرچہ جدید تمدنی تحریک کو ایک عرصہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا، اس سے خود اہل افغانستان کی پوشیدہ صلاحیتوں کا بہت زیادہ ثبوت ملتا ہے۔ انہوں نے ایک منظر زعمل کو اختیار کرنے سے انکار کر کے اپنے آپکو اس زندگی کا جس کی طرف امان اللہ خاں لیجانا چاہتے تھے، اس سے کہیں زیادہ مستحق ثابت کیا جس قدر کہ طاقت کے آگے سر تسلیم خم کر کے وہ ہو جاتے۔ جمہوریت جو نئی تہذیب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہو، صرف مردانگی اور انفرادیت رکھنے والی قوم کا حق ہے، اور افغانستان اسکے لئے موزوں ترین جگہ ثابت ہوئی ہے۔ اسکی بغاوت جمہوریت کی صحیح ترین نشانی ہے۔ وہاں کمی صرف تعلیم و نظام کی ہے۔ لیکن دانشمندانہ رہنمائی میں یہ کمی اس سے کہیں زیادہ جلد پوری ہو سکتی ہو جس قدر کہ کوئی مردہ اور بالطبع غلام قوم اپنی زندگی اور آزادی کی کمی کو پورا کر سکتی ہو۔ جاہلوں کا روشن خیال بننا بزدلوں کے مرد بننے سے بدرجہا آسان ہے۔

افغانستان نے اپنے آپ کو تو غلامی سے بچا لیا، پر وہ نہیں جانتا کہ اس کا یہ طرز عمل دوسرے ممالک پر کس طرح اثر انداز ہوا۔ اور کیسے دوررس نتائج کا سبب بنا۔ ہندوستان و ایران وغیرہ میں جو لوگ زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے حامی تھے وہ امان اللہ خاں کی کامیابی کے منتظر تھے۔ اس سے انہیں بہت بڑا اخلاقی سہارا ملتا۔ لیکن افغانستان کے ردعمل نے ان دوسرے ممالک میں بھی قدامت پسندی کو قوی تر کر دیا۔ امان اللہ خاں کی ناکامی سے نہ صرف اسکے وطن بلکہ تقریباً سارے ایشیا میں جدید تمدنی تحریک کو ضرب شدید پہنچی۔

تاہم حالات میں۔ صرف عارضی سکون ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرکے یہ تحریک ایشیا کے کسی ملک میں پھر شروع ہوجائے گی۔ ہندوستان و ایران دو ممالک ایسے ہیں جہاں، اس تحریک کے مقابلۃً جلد سر اٹھانیکا امکان ہے۔ اگرچہ کچھ عرصہ ہوا شاہ ایران نے افغانستان کا حشر دیکھکر اعلان کر دیا کہ وہ امان اللہ خاں کی طرح یورپ کے شائق نہیں ہیں بلکہ ایران کو ایسا بنا دینگے کہ وہ دوسروں کے لئے قابل دید ہو، مگر سب جانتے ہیں کہ ایران کے "قابل دید" ہونے کی صورت کیا ہے۔ اس وقت بھی کچھ جھگڑے وہاں رسم الخط پر ہو رہے ہیں۔ کیونکہ "لاطینی رسم الخط کے حامیوں نے رسم الخط کی تبدیلی کے لئے وسیع پروپگنڈا شروع کر دیا ہے" ہندوستان میں بشرطیکہ انگریزی حکومت اور قوم پرستوں کے درمیان کوئی معقول سمجھوتہ ہوگیا، اور اتنے اختیارات حکومت مل گئے کہ سیاسی جد و جہد سے فارغ ہو کر معاشرتی اصلاحات کی طرف توجہ کیجائے، مغرب سے اٹھی ہوئی نئی تحریک کہیں زیادہ منضبط ہوگی اور کہیں زیادہ سرعت سے پھیلے گی۔ کیونکہ قدامت پسندوں کی قوتیں اس ملک میں متفق و منظم نہیں ہیں مختلف مذاہب کی قدامت پسند جماعتوں کا کسی ایک مرکز پر آکر مصلحین جدید کا مقابل ہونا موجودہ صورت حالات کو دیکھتے ہوئے بعید از امکان معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر قابل غور ہے کہ ہمارے موجودہ فرقہ وارانہ اختلافات کا سوراج ملنے پر کیا حشر ہوگا۔ کیا "ہندو کلچر" اور "مسلم کلچر" اپنے "مذہبی و تمدنی خصائص" کو قائم رکھنے کے لئے "تعلیمی آزادی" کے نظریوں سے جن کے لئے بہت کچھ قومی مفاد کو قربان کیا جارہا ہے، کوئی تعمیری نتیجہ بھی برامد ہوگا یا یہ اسی وقت تک ہمیں آپس میں لڑانے کے لئے ہیں جب تک کہ مغربیت کا بڑھتا ہوا سیلاب انہیں اپنی رو میں بہا نہ لیجائے؟ ۔ اس کا مقابلہ تو بالکل نہ کیا جاسکے گا۔ یہاں کے قدامت پسندوں میں نہ افغانستان کی سی جرأت ہے نہ ایران کا سا اتحاد۔ البتہ ایک صورت ہے جس سے نئی اصلاحی تحریک کو غیر معقول اور استبدادی رنگ اختیار کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ قدامت پسند خود بھی متشدد نہوں اور مصالحانہ طرز عمل اختیار کریں۔ منطق سیاسی و معاشرتی زندگی میں اکثر مضر ثابت ہوئی ہے، اور بہت سے فتنے

نہیں ہوئے کہ جماعتوں نے اپنی تمام باتوں کے منوالے پر زور نہیں دیا۔ سوراج ہماری کا ایک بہت بڑا امتحان ہوگا جس میں کامیابی دل اور دماغ دونوں ہی کی صحت سے ممکن

مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانحعمری کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے اردو میں "تلاش حق" کے نام سے کیا ہے۔ اس ترجمہ سے اردو ادب میں ایک نہایت ہی سبق آموز اور دلچسپ کتاب کا اضافہ ہوتا ہے۔ زبان مثل انگریزی بہت سادہ اور سلیس ہے۔ کتاب کے چند ابواب اس پرچہ میں بھی دیے گئے ہیں۔ اسکی دو جلدیں ہونگی۔ پہلی وسط اگست تک شائع ہوجائے گی اور دوسری تھوڑے ہی دنوں بعد۔ قیمت دونوں جلدوں کی دو روپیہ رکھی گئی ہے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی سے مل سکے گی۔

انتباہ

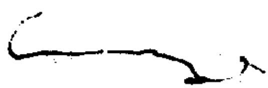
"جامعہ" جلد ۱۴ کی فہرست مضامین انشاء اللہ ماہ اگست میں شائع ہوگی

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۰ | اگست سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۲

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی



فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۶

از جنوری تا جون سنہ ۱۹۳۰ء

آرٹ

افسانہ

تعلیم

اجتماعیات

سیاسیات

معاشیات

حصہ نظم

تنقید و تبصرات

(رسائل و اخبارات)

فہرست مضمون نگاران

(۱) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی ۔ استاذ جامعہ ملیہ
(۲) ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی، استاذ جامعہ عثمانیہ
(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب بی اے (جامعہ) ڈی لٹ (پیرس)
(۴) طالب علم
(۵) حضرت اصغر گونڈوی
(۶) حضرت جگر مرادآبادی
(۷) ڈاکٹر محمد نسیم صاحب ایل ایل ڈی (لندن) بیرسٹر
(۸) اسرائیل احمد خانصاحب مدرس نیشنل اسکول رنگون
(۹) عبدالواحد صاحب متعلم جامعہ ملیہ
(۱۰) احتشام الدین صاحب ایم اے دہلوی
(۱۱) مولوی حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ
(۱۲) سجاد ظہیر صاحب متعلم آکسفورڈ یونیورسٹی
(۱۳) مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب مرحوم
(۱۴) قاضی عبدالغفار صاحب
(۱۵) عبدالجلیل صاحب ندوی
(۱۶) شفیق الرحمن صاحب بی اے (جامعہ)
(۱۷) مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاذ جامعہ ملیہ
(۱۸) محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)
(۱۹) ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی پی ایچ ڈی

(۲۰) مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی
(۲۱) عبدالقادر صاحب بی اے (جامعہ)
(۲۲) قاری سرفراز حسین صاحب
(۲۳) احسن مارہروی
(۲۴) عزیز احمد صاحب عثمان آبادی
(۲۵) محمد حسین صاحب محوی
(۲۶) محمد اشرف صاحب بی اے (علیگ) حال متعلم لندن یونیورسٹی
(۲۷) ملا رموزی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۵ | بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۰ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ   فی پرچہ ۸ر

تعلیم اور علم مرفہ الحالی

(۲)

نقائص تعلیم

اس سے قبل کسی بحث کے سلسلے میں ہم نے اس سوال کے جواب میں کہ انسان کیوں تعلیم حاصل کرتا ہے؟ یہ بیان کیا تھا کہ انسان تعلیم یا تو تحصیل لذت کی خاطر حاصل کرتا ہے یا معاشی فوائد یعنی اپنی کارکردگی بڑھانے کی غرض سے یا محض تربیت یعنی Culture کے لئے۔ اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو کل معلومات جن سے نہ تو انسان کو لذت حاصل ہو، نہ اُس میں تربیت آئے اور نہ اُس کی کارکردگی میں اضافہ ہو: انسان کے دماغ پر بارگراں ہیں چنانچہ اسی کی تشریح کرنا "نظریۂ ثقل" کا منشا ہے!

نظریۂ ثقل

جدید عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ (۱) کارآمد۔ (۲) غیر کارآمد اول الذکر سے انسان کو اُس کے پیشے میں مدد ملتی ہے، اس کے اخلاق درست ہوتے ہیں، سلیقہ آتا ہے ہنرمندی بڑھتی ہے، اور آخرالذکر سے نہ تو کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے اور نہ وہ ان معلومات سے استفادہ کرتا یا کرسکتا ہے۔

ناولوں، قصے کہانیوں، رسالوں وغیرہ اور داغ و اکبر کے دیوانوں کے مطالعے سے اکثر حضرات کو صرف حظ مطلوب ہے جس کی خاطر وہ ان کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کئی تعلیم یافتہ حضرات اس کا اعتراف کریں گے کہ وہ اکثر کتب محض تفریح طبع کے لئے یا وقت کو مزے میں گزارنے کی خاطر کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا میں ایڈگا والاس، ایل گروش کی کتب بہت کثرت سے پڑھی جاتی ہیں یا دنیا "ہیلائیں"

نیرنگ خیال ،، " چاند " (ہندی رسالہ) مقبول عام ہیں۔ راست تحصیل لذت کے علاوہ انسان اتنی توقع رکھتا ہے کہ اس کو علم سے عمل میں مدد ملے، لہذا جس حد تک کہ علمی معلومات سے عملی زندگی میں فائدہ ہو سکتا ہے اسی حد تک تعلیم مفید ہے۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ ہر شخص کا وہ حصہ معلومات جس سے انسان کو نہ تو مسرت حاصل ہوتی ہو نہ اسکی کارکردگی بڑھتی ہو اور نہ اس کی عقلیت بہتر ہوتی ہو، بالکل بیکار ہے پس اس حصہ معلومات کو علمی ثقل Intellectual Ballast سے تعبیر کرنا بالکل بجا ہے۔

اعلیٰ ریاضی سے آب کاری کے عہدے داروں کو کیا تعلق؟ منطق و فلسفے کے اصول اہلکاران بندوبست کو رٹانے سے کیا حاصل؟ گھروں میں کام کاج کرنیوالوں، سٹّے داروں کو قدیم تاریخ اور دماغ کو جنوبی امریکہ کے جغرافیہ سے کیا مطلب؟ انسان اگر ایک فہرست مرتب کر سکتا جس سے اسکا پتہ چلتا کہ اس کے معلومات عملاً اسے کتنے مواقع پر کس قدر فائدہ ہوا تو وہ جان لیتا کہ اس کے ذخیرہ معلومات میں کتنا حصہ دور از کار معلومات ہیں جس سے اس کو نہ تو کوئی فائدہ ہوا ہے اور نہ ہونے کی توقع ہے اور یہی حصہ معلومات علمی ثقل (Intellectual Ballast) ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو مختلف علوم و فنون، السنہ و مذاہب کے معلومات کا کھنڈر بنانا علم مرفہ الحالی کے اعتبار سے بیکار ہی نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔

جس قدر رہبران قوم و ملت اور جس قدر منتظمین و کارخانہ دار و تاجر وغیرہ ہیں یعنی وہ لوگ جن کے سہارے دنیا کا جملہ کاروبار چل رہا ہے اور جن پر دنیا کی مرفہ الحالی کا دار و مدار ہے، اُن میں سے کسی کو بھی اعلیٰ ریاضی، نظریات کی پیچیدگیوں، اصول فلسفہ اور قوانین زبان و السنہ قدیمہ کی صرف و نحو کے جاننے کی ضرورت نہیں۔ موجودہ عہد میں جو امتحانات کامیاب کرنے کی لت لگی ہوئی ہے اور ڈگری یافتہ ہونا باعث فخر و باعث سہولت سمجھا جاتا ہے ایک بڑی قومی غلطی اور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اعلیٰ ریاضی، اصول فلسفہ، اعلیٰ ادبیات کی صرف محدود جماعت کو ضرورت ہے اور اسی محدود التعداد طبقے کے لئے یہ علوم مفید ہیں۔ ایک کاشتکار کے لئے عمرانیات متعلقہ کا جاننا ایسا ہی فضول ہے جیسے ایک ماہر مالیات کیلئے کیمیا کے فورمولی (Formulae) اور جبر و مقابلے کے نظریوں کا جاننا بیکار ہے۔ یہ اور ا(؟)

قسم کی بیکار معلومات ہمارے دماغ کا بوجھل (Dead Weight) بنتے ہیں۔

تعلیم کے مضر اثرات

تعلیم کا پہلا نقص | یہی مروجہ طریق تعلیم کا، جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دیگر ممالک میں بھی رائج ہے بڑا نقص ہے کہ وہ انسانی دماغ کو مفید معلومات کے ساتھ ساتھ بھرتی کے معلومات سے بھی گراں بار کرتی ہے۔

دوسرا نقص | تعلیم خصوصاً موجودہ زمانے کی تعلیم کی غالباً سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ انسان کے دماغ کو تو منور کرتی ہے، اُسے قدرت کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ طاقتور بناتی ہے، اُسے زیادہ عیش و آرام پہنچاتی ہے۔ لیکن نہ تو اس کی جسمانی حالت کو بہتر بنا سکتی ہے اور نہ اُس کے قلب کو چند خسیس و ذلیل جذبات سے پاک صاف کر سکتی ہے۔ دماغ میں نور ہوتا ہے تو دل میں حسب معمول مثل سابق کے تاریکی، عقل بڑھتی ہے مگر اعصاب کمزور ہوتے جاتے ہیں عیش و راحت میں اضافہ ہو رہا ہے مگر چین و سکون کم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے جس سے انکار کرنا حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے[1]

تیسرا نقص | جیسے جیسے ملک میں تعلیم عام ہوتی جاتی ہے ویسے ہی بسا اوقات اس سے تیز تر رفتار پر عیش پرستی بھی بڑھتی جاتی ہے " ہوس حیات" موجودہ زمانے کی تعلیم ہی سے نمودار ہوتی ہے اور جب انسان کو اس ہوس کے منشا کا کوئی موقع نہیں ملتا تو وہ ناجائز یعنی خلاف قانون و خلاف اخلاق طریقے برتنے لگتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس رفتار سے تعلیم پھیلتی جا رہی ہے اُسی رفتار سے امراض خبیثہ عام ہوتے جا رہے ہیں اور شراب نوشی کی عادت، سگریٹ کی لت کے ساتھ ساتھ تنعمات و تعیشات کا شوق عام ہوتا جا رہا ہے، بد اخلاقی و بداعمالی بڑھ رہی ہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ عیوب و جرائم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے[2]

---

(۱) مزید تشریح کے لئے اسی مضمون کا آخری باب اور اسکا دوسرا حصہ دیکھئے (نوٹ نمبر ۲ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ

...نیا کے اعداد و شمار شاہد ہیں کہ جس رفتار سے تعلیم میں ترقی ہو رہی ہے کم از کم اسی رفتار سے عشرت پسندی، آرام طلبی، و نفس پرستی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم کا چرچا سب سے زیادہ امریکہ میں ہے، مگر ساتھ ہی امریکہ سب سے زیادہ عیاش نفسانی خواہشات کو پورا کرنے والا اور جرائم پسند ملک ہے۔ انہیں حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی مبصر تعلیم نے صحیح کہا ہے: "تعلیم اچھوں کو بہتر اور بروں کو بدتر بناتی ہے" بعض کو نیک دل، ملنسار اور مرفہ الحال بناتی ہے تو دوسروں کو معاشرت سے بغاوت کرنے کی ترغیب دلاتی ہے، کسی کے دل میں خدمت قوم کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو دوسرے خدمت ذات اور خود غرضی سیکھتے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر تمدن میں متضاد رجحانات موجود ہیں، اور تعلیم یافتہ جماعت متضاد خصلتوں، جبلتوں اور عادتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

---

(۲) عصمت فروش طبقے کے متعلق جامعہ برلن کے نامور عالم عمرانیات و معاشیات اپنی کتاب "تعیشات اور سرمایہ داری" Luxus und Kapitalismus مطبوعہ لائپزگ ۱۹۱۳ء صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں: "یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ عصمت فروشی کی شدت وسعت بہت زیادہ ہو گئی ہے" (Es ist eine anerkannte Tatsache, dass die Prostitution seit dem Mittelalter an Umfang und Bedeutung Zunimmt)

جرائم کے متعلق عمرانیات کا نامی امریکی ڈاکٹر ہنری فیرچائلڈ لکھتا ہے۔

"It must be confessed that the history of society's attempt to deal with crime is not very flattering. Crime seems to be on the increase rather than decrease in even the most progressive societies. Even the basic crimes, such as murder and theft, show no sign of diminution *either absolutely or in proportion* to the size of the population." (Elements of Social Science," Macmillan New York; 1925-page. 404,)

چوتھا نقص لوگوں کو ایسی تعلیم دینا جس سے اُن کی کارکردگی بڑھتی ہو بلکہ صرف پڑھنے لکھنے کی استطاعت آجاتی ہو اس لحاظ سے بری ہے کہ عوام کو ذہن ناولوں، شہوت انگیز مثنویوں، عاشقانہ اشعار، مخر اخلاق افسانوں اور جرائم کی ترغیب دینے والے جاسوسی قصوں کا شوق بڑھتا اور اعلیٰ ادبی شوق پست ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ علمی معیار کی کتابیں کوئی ذوق سے نہیں پڑھتا، لچر اور پوچ مضامین۔ اور عریاں قصے شوق اور انہماک سے پڑھے جاتے ہیں۔

بہرطور تعلیم کے فوائد بھی ہیں اور نقائص بھی۔ ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ایسے طریقے اختیار کریں اور ایسا نظام العمل ترتیب دیں، جس سے بیشترین فوائد اور کمترین نقائص کے نمودار ہونے کی توقع ہو۔

نظام تعلیم

"یوں تو زندگی کے کسی شعبے میں بھی کوئی قوم دوسری اقوام سے بے تعلق نہیں برت سکتی لیکن علم و تعلیم میں خاص طور پر قلعہ بند ہو کر رہنا ناممکن ہے، کیونکہ تحقیق حق کسی قوم و مذہب کی پابند نہیں ہے اور اس میں ہر قوم کو دوسری قوم کے کارناموں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، ورنہ اسکی تعلیم یکطرفہ و نامکمل رہے گی (۱)"۔ ماہرین تعلیم جانتے ہیں کہ جرمانیہ کا شمار بھی دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ و تعلیم یافتہ ممالک میں ہوتا ہے اور جرمانیہ ہی میں سب سے پہلے جبری تعلیم اور مفت ابتدائی تعلیم کا نفاذ ہوا تھا۔

جرمانیہ کے متعدد صدیوں کے تجربے اور جرمانی مدارس فوقانیہ و وسطانیہ کے سالہا سال کے مشاہدے کے بعد یہ پتہ چلا کہ سب سے زیادہ مفید اور سب سے کم وقت طلب طریق یہ ہے کہ تحتانیہ مدارس کی آخری جماعت تک جبری تعلیم اور وسطانیہ مدارس کی آخری جماعت تک عام تعلیم (یعنی ادب جغرافیہ تاریخ، ریاضی، مصوری، حساب، ہندسہ، جبر و مقابلہ، السنۂ قدیمہ و جدیدہ وغیرہ) رہے، اور

---

(۱) ماخوذ از رسالہ "مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ" مصنفہ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ پریس دہلی ۱۹۳۰ء صفحہ ۵

فوقانیہ مدارس، جامعاتی مدارس، (Preparatory Schools) کی حیثیت اختیار کریں اور ابتدائی تخصیص تعلیم Elementary - Specialised education شروع کر دیجائے۔

انسان کی عقلیت، فہم و فراست کو تقویت پہنچانے کے لئے اور ایک عام تعلیمی سطح قائم کرنے کے لئے تحتانیہ و وسطانیہ مدارس کی تعلیم کافی ہے۔ مدارس فوقانیہ کی دو یا تین سال کی عام تعلیم ضرورت سے زائد ہوجاتی ہے اور اس مزید عام تعلیم سے طلبا کو بحیثیت مجموعی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اُنکے وقت، دماغ، اور دولت کا خون ہوتا ہے۔ مثلاً جو طلبہ فطری علوم کا مطالعہ کر رہے ہوں یا آئندہ چل کر جراح طبیب، سوداگر، انجنیر یا برقی انجنیر بنا چاہتے ہوں اُنکے لئے مدرسہ فوقانیہ کی دو تین سال کی جغرافیہ تاریخ، ادبیات، قواعد، صرف و نحو کی تعلیم محض بیکار ہے۔ خالص ادبیات (Pure literature) انکے لئے غیر مفید اور اسکی تعلیم غیر موزوں ہے، جو کچھ تاریخی، ادبی، جغرافی زائد معلومات (Surplus Knowledge) انکے دماغ میں رہ جاتی ہیں وہ اُنکے دماغ کے لئے بار بن جاتی ہیں۔

اسی طرح ایک عالم عمرانیات، معاشیات، سیاسیات یا نفسیات کے لئے یا اُس شخص کے لئے جو ادیب، شاعر، واعظ، مصور، ایکٹر بننے والا ہو۔ حساب، علم ہندسہ اور جبر و مقابلے کے اعلیٰ اصول کا جاننا محض بھرتی (Ballast) ہے۔ بڑھئی بننے والے کو انگریزی یا مشرقی شاعری اور تجارت کرنیوالے کو اصول انشا پردازی سے کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے؟

کسی شخص کو زبان کا روزمرہ سکھانا چاہیں اور درسی کتب میں متروک الفاظ کی بھرمار ہو، یا خارج الوقت (Out of date) شعرا، انشا پرداز اور مصنفین کے کلام اور ادبی کتب میں سے انتخابات ہوں تو زبان دانی کی توقع کس طرح کیجاسکتی ہے؟ جرمانیہ کے بعض جدید مدارس میں زبان سکھانے کے لئے ہفتے میں کم از کم دو گھنٹے رسائل و اخبار بینی کے لئے مخصوص ہیں۔ جدید ترین زبان کسی شخص کو سیکھنی ہو تو اُسے چاہئے کہ حتی المقدور زندہ مصنفین کی کتابیں پڑھے، موجود

مانے کے شعرا کا کلام دیکھے اور عام زبان دانی سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے عمدہ رسائل [illegible] سنجیدہ اخبارات کا مطالعہ کیا کرے۔ کسی شخص کو انگریزی قابلیت روزانہ لندن ٹائمس اور شا Shaw ولیز (Wells) چیسٹرٹن (Chesterton) وغیرہ کی تصانیف پڑھنے سے بدرجہا بہتر ہوسکیگی بہ نسبت اس کے کہ وہ دونی محنت وجانفشانی سے شیکسپیر کا کلام دیکھے اور تھیکرے (Thackeray) وغیرہ کی کتابیں پڑھتا رہے۔ اسی طرح غالب کے دقیق کلام آتش و سودا کے دیوان دیکھنے سے اُردو اتنی نہیں آتی جتنی کہ حالی کی نیچرل اور قومی نظمیں پڑھنے، داغ و اکبر کے دیوان دیکھنے، شبلی و ڈاکٹر نذیر احمد کی کتابیں پڑھنے سے، اور دو چار مستند زندہ مصنفین کے مطبوعات، اور اُردو کے مستند اور اعلیٰ معیار کے رسالے اور اخبارات دیکھنے سے آتی ہے۔ موجودہ زمانے کے تقریباً ہر تعلیم یافتہ شخص، بالخصوص میٹرک اور گریجویٹ کا دماغ کس قدر کہنہ معلومات سے بھرا رہتا ہے، اسکا اندازہ اس نقشے سے بخوبی ہوسکے گا جو ہم نے ایک المانی رسالے کی شائع کردہ تصویر کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا ہے[1]۔ انکا دماغ نہ صرف ایک علمی عجائب خانہ ہوتا ہے بلکہ اُس سے بدتر ایک علمی کھنڈر کے مانند ہے جس سے انکی علمی زندگی پر نسبتاً کوئی عمدہ قابل تعریف اثر نہیں پڑتا۔

تعلیم کس طرح دیجانی چاہیے؟

اگر موجودہ تعلیم اور طریق تعلیم میں علم مرفہ الحالی کے اعتبار سے اس قدر کوتاہیاں، کمزوریاں اور خرابیاں موجود ہیں تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم مرفہ الحالی کے اعتبار سے تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیے اور وہ کس طرح دیجائے؟ فلسفۂ افادیت Utilitarianism کی تلقین کے مطابق تعلیم کا صحیح مفہوم مفید ذخیرۂ معلومات سے ہے۔ یعنی یہ کہ انسان بہت سی باتیں کچھ کچھ، چند باتیں زیادہ، اور دو ایک پوری پوری جانے۔ پروفیسر الیاس برنی صاحب اپنی قابل دید کتاب "علم المعیشت" میں لکھتے ہیں: "انسان کو چاہیے کہ بہت سے علوم

---

(۱) یہ تصویر برلن کے مشہور رسالے اُوہو (Uhu) بابت نومبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ نظریۂ نقل کا خیال راقم کو اسی رسالے کے ایک مضمون پڑھنے سے پیدا ہوا جو کلیر ویتھ (Clare with) نے لکھا ہے۔

سے ابتدا کرکے پڑھتے پڑھتے ایک علم پر آرہے اور اُس میں کمال حاصل کرے۔ چونکہ تمام علوم میں باہمی رشتہ و تعلق ہے اس لئے جو شخص ایک ہی علم سے ابتدا کرکے ایک ہی پر اکتفا کرے گا، وہ نہ صرف کم علم بلکہ اپنے علم میں بھی ادھورا رہے گا۔ اگر کوئی شخص سوائے طب یا قانون کے کچھ نہ پڑھے گا اور دنیا کے حالات سے باخبر نہ ہوگا، وہ نیم حکیم خطرۂ جان و نیم وکیل خطرۂ آبرو و دولت سے بھی بدتر ہوگا۔ لہٰذا تخصیص سے علت واقفیت مراد نہیں (۱)۔" ان الفاظ میں تو الیاس برنی صاحب کے قلم نے مسئلہ تعلیم کے معاشیاتی پہلو کو بخوبی واضح کر دیا۔ اب سوال کا صرف یہ جزو تشریح طلب رہ جاتا ہے کہ عام تعلیم کہاں تک رہے اور تخصیص (Specialisation) کہاں سے شروع ہونی چاہئے؟

جس طرح ہم نے اس سے قبل ہی لکھا ہے، المانی ماہرین کا ایک زبردست گروہ تعلیم وسطانیہ کے بعد عام تعلیم کو پسند نہیں کرتا چنانچہ اکثر Reformrealgymnasien درحقیقت فوقانیہ مدارس نہیں بلکہ کلیات کے لئے طلبہ کو تیار کرنے والے یعنی جامعاتی مدارس ہیں، جس میں طلبہ کی آئندہ تعلیم کو پیش نظر رکھ کر علاوہ زبان کے ابتدائی تخصیصی تعلیم دیجاتی ہے اور طلبہ کو عام طور پر اجازت ہوتی ہے کہ کسی دو زبانوں اور چار مضامین کا انتخاب کرلیں۔

نظام تخصیص اور نظریہ افادیت

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ ہر علم کے جاننے کے لئے، دوسرے علوم کی ضرورت ہوتی ہے، اور کسی ایک میں ماہر بننے کے لئے دوسرے علوم سے بھی واقفیت پیدا کرنی پڑتی ہے مثلاً کسی تمدنی مسئلے کو لیجئے۔ اس کے تجزیے سے ثابت ہوگا کہ اس مسئلے میں کم از کم چار پانچ یعنی معاشی، سیاسی، نفسانی، عمرانی، اخلاقی مسائل بھی مضمر ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی مکمل تحلیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم اس کے معاشی، سیاسی، عمرانی و اخلاقی پہلوؤں پر بھی غور نہ کرلیں۔ اسی طرح کسی جنگ کے شروع اور ختم ہونے، عالمگیر یا قومی ہونے کے اسباب کا پتہ چلایا جائے تو فوراً معاشی، سیاسی، عمرانی، مذہبی

---

(۱) دیکھئے "علم المعیشت"۔ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڑھ ۱۹۱۷ء۔

قوتیں خود بخود ظہور پذیر ہو جائینگی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ علم تمدن درحقیقت ایک اجتماعی علم ہے، سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات و عمرانیات کا۔ اسی کو ہم اصطلاحاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ سیاسیات، معاشیات نفسیات اخلاقیات و عمرانیات میں Consensus یعنی باہمی اجتماعی ربط و تسلسل ہے۔ اس حقیقت کو ہم بطور کلیے کے تسلیم کر سکتے ہیں کہ بظاہر سیاسی مسئلے میں کوئی نہ کوئی معاشی، عمرانی یا اخلاقی قوت یا ان تمام کی قوتیں پنہاں ہیں۔ سیاسی مسائل بحیثیت سیاسی مسائل نہیں ہوتے۔ لہٰذا سیاسی مسائل کی تشریح کے لئے بھی معاشیات، نفسیات، عمرانیات و اخلاقیات کا جاننا ضروری ہے۔

اسی طرح سول انجینیری، ریاضی، ملکی جغرافیہ، بیانی عمرانیات (کسی ملک کے رسوم و رواج کو بیان کرنے والا علم) میں یا طب، حیاتیات، نباتیات، طبیعات میں ربط یا Consensus ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص عمدہ حاکم یا مصلح معاشرت نہیں بن سکتا، تاوقتیکہ وہ ملک کی موجودہ معاشی، عمرانی و سیاسی حالات سے باخبر ہو بلکہ اُس کے لئے سیاسی، عمرانی و معاشی تواریخ کا جاننا بھی ضروری ہے۔ نادر شاہی حکومت کے برباد ہو جانے کا حقیقی راز عمرانیات متعلقہ کے اس مسلم الثبوت کلیے کی ناواقفیت میں مضمر ہے کہ مخفی استحصال، علانیہ استحصال سے بہت زیادہ دیرپا ہے (Masked exploitation outlasts open exploitation) اگر نادر شاہ اس حقیقت سے واقف ہوتا اور اُس پر عمل کرتا تو بجائے مار ڈالے جانے کے ایک خاندان قائم کرتا۔

بہر طور ہر شخص کے لئے انہیں علوم کا جاننا مفید بلکہ ضروری ہے جن میں ربط یعنی Consensus ہو۔ ورنہ ہر علم سے ہر ایک کو فائدہ نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اصول و قوانین کیمیا کے جاننے یا نہ جاننے یا السنہ قدیمہ سے واقف رہنے یا نہ رہنے سے ایک تاجر کو کیا سروکار؟ اُسے تو معاشی جغرافیہ، معاشی حالات تجارتی معاملات، اصول و نفسیات ترغیب، مالیات، طریق حساب کتاب وغیرہ کا جاننا جن میں Consensus ہے ضروری ہے۔ اسی لئے المانی ماہرین تعلیم کی یہ رائے نہایت درست ہے کہ وسطانیہ مدارس کے بعد ہی سے تخصیص (Specialisation) شروع ہو جانی چاہئے اور لڑکے لڑکیوں کو صرف آئندہ زندگی کے کام کو پیش نظر رکھ کر تعلیم دینی چاہئے۔

موجودہ زمانے کو ایسے عام تعلیم یافتہ حضرات کی اس قدر ضرورت نہیں، جو ہر علم کی چند معلومات رکھتے ہوں، اس عہد کو تو ایسے اشخاص کی شدید ضرورت ہے جو خاص علمی یا فنی معلومات رکھنے والے ہوں اور اپنے علم یا فن میں بخوبی ماہر ہوں۔ یہ البتہ صحیح ہے کہ ایک فن یا علم یا زبان کے ماہر بننے کے لئے دوسرے علوم و فنون و زبانوں کا جاننا ضروری ہے، مگر ایسے ہی علوم و فنون و زبانوں کا جن میں باہمی اجتماعی ربط ہو مثلاً لاطینی، فرانسیسی، انگریزی زبانوں میں ایک طرف، عربی، فارسی، اردو و ہندی میں دوسری طرف ربط یا Consensus پایا جاتا ہے۔ اسی لئے ان Groups کا سیکھنا ہر انفرادی زبان کے اعتبار سے بھی مفید بلکہ ضروری ہے۔ مگر گنتری یا تبتی زبان سیکھنے سے یہ توقع رکھنا کہ اس سے اردو زبان میں مدد ملے گی یا جاپانی زبان سے عبرانی بول چال میں آسانی ہوگی بالکل لغو ہے۔

بہرحال ابتدائی تعلیم تو ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بعد تحتانیہ و وسطانیہ مدارس میں بھی تعلیم عام ہونی چاہئے۔ اس عام تعلیم سے انسان کی عقلیت و ذہنیت ترتیب پاتی ہے۔ فہم عامہ اور وسعت نظر کے لئے خصوصیات مہیا ہوتی ہیں، اور عام معلومات کی بنیاد بھی مستحکم ہوجاتی ہے جس پر کسی علم، فن یا زبان کی تخصیصی عمارت قائم کی جاسکتی ہے لیکن ضرورت سے زائد یعنی فوقانیہ مدارس میں بھی عام تعلیم دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی ایک منزلہ مکان کی تعمیر کے لئے قد آدم پایہ کھودنے کی بجائے ہاتھی کے قد برابر پایہ کھودنا اور بجائے مٹی پتھر سے بھرنے کے سیمنٹ اور سنگ مرمر سے اس پایہ کو لبریز کرنا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ نہ صرف مطلق مفاد (Absolute Utility) کا لحاظ کرے بلکہ اس حقیقت پر بھی غور کرے کہ اس فائدے کے حاصل کرنے میں کس قدر جانفشانی اور قربانی کرنی پڑے گی اور کس قدر محنت و دولت صرف کرنی ہوگی، یعنی یہ کہ اضافی مفاد کس قدر ہے۔ ہار جیت، شکست و فتح کے دو معیار ہیں۔ ایک تو فلسفیانہ دوسرے عمرانیاتی۔ ایک شخص دوسرے کو لڑائی (مثلاً Duels وغیرہ) میں جب پچھاڑ دیتا ہے مگر خود بھی لڑائی کے دوران میں مجروح ہو کر جیت کے بعد ہی ڈھیر ہو کر گر پڑتا ہے۔ صرف فلسفیانہ نقطۂ نظر سے جیتا ہے، حالانکہ اس کی "جیت" حقیقتاً شکست کے مماثل ہے۔ بابر کی جیت حقیقی جیت تھی۔ ہمایوں کی فتح [illegible] حقیقی فتح تھی مگر جو فتح انگریزوں اور فرانسیسیوں کو جرمانیہ پر حاصل ہوئی فتح نہیں بلکہ فتح

آمیز شکست تھی۔ گو اس حقیقت سے عوام بخوبی واقف نہیں مگر یہ راز فرانس اور انگلستان کے مالیات کے جاننے والوں پر بخوبی روشن ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح اس جنگ عظیم میں بید ردی، سنگدلی اور تنگ نظری سے قومی دولت برباد اور تباہ کی گئی، سرکاری خزانے خالی ہوئے اور فتحمند قوموں نے خود کے مرفہ الحالی کے اساسی بنیاد کو غارت کر کے چند ایکڑ زمین حاصل کی گئی بحیثیت مجموعی فاتحین مفتوحین سے کچھ زیادہ فائدے میں نہ رہے(۱)"

اسی طرح قومی طاقت اور قومی دولت کو بے دریغ عام تعلیم، اعلیٰ تعلیم، جامعاتی تعلیم لٹانا جبکہ قوم کا کثیر التعداد حصہ فلاکت و ناداری، مفلسی و محتاجی، فاقہ کشی اور مصیبت زدگی میں مبتلا ہو، سیاسی معاشی اور عمرانی بدنظمی و بدانتظامی کا بدیہی ثبوت اور رہبران قوم، عہدہ داران سلطنت اور مصلحان ملت کی تنگ نظری، کوتاہ بینی، غلطی اور غلط فہمی کا بین ثبوت ہے کیونکہ وہ قوم کی شدید ترین ضروریات و احتیاجات کو نظر انداز کرتے ہوئے "عام تعلیم" کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے نسبتاً کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اگر ہمارا نظام تعلیم بھی المانیہ کے نظام تعلیم سے ملتا جلتا ہو تو ترقی اور مرفہ الحالی کی توقع زیادہ کی جا سکے گی۔ ہم اپنے خیالات کو نقشہ میں یوں ظاہر کر سکتے ہیں۔

---

(۱) چنانچہ اس حقیقت کو سربرآوردہ حضرات بھی جو جنگ عظیم میں رہبران قوم تھے کچھ کچھ جاننے لگے اور اس کا اعتراف بھی کرنے لگے ہیں۔ ایک طرف شان فتح کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف فتح کی مصیبت کا بھی انہیں احساس ہو چلا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ موسیو کلیمنسو (M. Clemenceau) کے مضامین قابل ذکر ہیں جو ان دنوں (اپریل ۱۹۳۰ء) "فتح کی عظمت و نکبت" (Grandeur and misery of victory) کے عنوان سے اخبار ٹائمز آف انڈیا میں باقساط شائع ہو رہے ہیں۔

نظام تعلیم

بستان اطفال (Kindergarten)

↓

مدارس تحتانیہ (اختتام جبری تعلیم)

↓

مدارس وسطانیہ (اختتام عام تعلیم)

↓

جامعاتی مدارس (ابتدائی تخصیصی تعلیم)

↓

کلیات (Colleges)

↓

تحقیقاتی عمل گاہیں اور ادارے

(Research laboratories and institutions)

مدارس تحتانیہ / مدارس وسطانیہ →

مدارس فنی، تجارتی، وزراعتی

↓

اعلیٰ مدارس

فنی، تجارتی وزراعتی

↓

کلیات

فنی، تجارتی وزراعتی

↓

تجرباتی درس گاہیں

(Experimental institutions)

ہے اور بہت سی مجلد کتابوں کو ازبر جاننے والے ، ارسطو کے فلسفے سے واقف اور دنیا کی مختلف زبانوں میں یکسانی کے ساتھ گفتگو کرنیوالے لوگ غیر تعلیم یافتہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ علاء الدین خلجی اور اکبر اعظم اگرچہ امی محض تھے۔ مگر جس دانائی و فراست کے ساتھ ان دونوں نے عرصہ دراز تک ہندوستان پر حکومت کی اس کے لحاظ سے یقیناً ہم انکو باوجود امی ہونے کے اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ کہیں گے۔ اس سے بھی زیادہ روشن مثالیں اس خیال کی تائید میں دنیا کی تاریخ میں ملتی ہیں کہ باوجود تعلیم حاصل نہ کرنے کے بعض افراد نے اپنی فطری ذہانت وطباعی کی بدولت ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو اپنی آپ نظیر ہیں اور عرف عام کے اعتبار سے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی کتابی تعلیم پائے ہوئے سکڑوروں اشخاص انکے سامنے کوئی درجہ نہیں رکھتے"(۱)۔

اگرچہ لاک کے اس قول سے موافقت کرنا کہ خواندہ اشخاص چاہے وہ کتنے ہی عالم و فاضل ہوں، تعلیم یافتہ نہیں کہلائے جاسکتے، مشکل ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ کسی طرح عقلمند و دانا بھی نہیں تصور کئے جاسکتے۔ تعلیم کے فوائد سے لوگ اس درجہ متاثر ہوگئے ہیں کہ وہ اس کو سراہنے کی خاطر یک طرفہ بیانات اور مبالغہ آمیز انشاپردازی، قصیدہ خوانی کرنے لگتے ہیں۔ یہ صریحاً لفاظی اور خواہ مخواہ مدارس کی مدح سرائی نہیں تو اور کیا ہے کہ "واٹرلو کی جنگ، مدرسہائے ایٹن اور ہیرو (Eton and Harrow) کی بازی گاہوں پر جیتی گئی"۔ مگر جب ڈین انج جیسے صاف گو اشخاص اسی منطق کی بنا پر لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ "کالنسو اور اسپیون کاپ Colenso, Spionkop کی زبردست شکستیں بھی تو مدرسہائے ایٹن اور ہیرو کی بازی گاہوں پر ہوئیں"، تو یہ تلخ حقیقت ناگوار گزرتی ہے۔ اور "فیض تعلیم" کے مداحوں کو سوائے بات سنبھالنے کے کچھ نہیں سوجھتا۔ برطانیہ کی بہترین علمی ہستیوں مثلاً جارج برنارڈشا اور ڈین انج ہی نے موجودہ تمدن و تہذیب اور اس کے ساتھ تعلیم و تربیت کا تنقیدی تجزیہ نہیں کیا بلکہ امریکہ، المانیہ و

---

(۱) ماخوذ از "تاریخ التعلیم" نوشتہ ڈاکٹر ضیاء الدین مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڑھ ۱۹۱۶ء صفحہ ۶۸ تا ۶۹

اطالیہ کے نامور ماہرین و علمائے سیاسیات، معاشیات، نفسیات و عمرانیات؛ مدبرین سلطنت و ارا کین حکومت، اعلیٰ عہدے داروں اور مصنفوں نے موجودہ تعلیم و تربیت کے تہذیب و تمدن پر مضر اثرات کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے۔(۱)

ترقی کی توقع

بغیر تکرار و حجت کے یہ تسلیم کر لیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہر تعلیم یافتہ انسان کا تربیت یافتہ یعنی با اخلاق، راست پسند، صحیح الدماغ، بلند خیال، غیور و ہمدرد وغیرہ ہونا ضروری نہیں، یعنی تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہونا ہم معنی نہیں اور نہ وہ لازم و ملزوم ہیں۔ اکثر خاندانوں میں اب بھی بالخصوص مشرق میں لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ تربیت سکھائی جاتی ہے۔ مغرب میں برعکس اس کے زیادہ تر مدرسے کی تعلیم پر والدین اکتفا کرتے ہیں۔ متوسط اور ادنیٰ طبقوں کے لوگ جو اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دے سکتے یا دینا نہیں چاہتے انہیں تربیت ہر حال میں دیتے ہیں۔ چونکہ انسانی کردار پر تعلیم کا اس قدر مفید اور دیرپا اثر نہیں پڑتا جس قدر کہ تربیت کا ہوتا ہے۔ اس لئے ہم عام طور پر یہ حیرت انگیز مشاہدہ خصوصاً مشرقی ممالک میں کرتے ہیں کہ جس قدر با اخلاق، شریف، راست باز، دیانت دار، معاملہ فہم، فرض شناس، سلیقہ مند، خوش مزاج اور محنتی لوگ غیر تعلیم یافتہ طبقے میں ملتے ہیں اُس سے کم ہی تعلیم یافتہ گروہ میں پائے جاتے ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ طبقے کے ہزار آدمیوں میں دو نیک دل، سچے، وفا شعار، بے غرض، مخلص و مہربان ملیں گے تو غیر تعلیم یافتہ میں تین۔ اگر تعلیم یافتہ لوگوں میں فی ہزار دس

---

(۱) طوالت کے خوف سے ظاہر ہے کہ اس مضمون میں انکے خیالات کے لب لباب کو پیش کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں۔ اُن لوگوں کی خاطر اس مسئلے میں دلچسپی لیتے ہوں میں دو چار کتب کے حوالے دینے پر اکتفا کرتا ہوں:

G. B. Shaw جملہ ڈراموں کی تمہیدیں۔

A. W. Small: "Between Eras: From Capitalism to Democracy."
Veblen: "Theory of the Leisure Class"

ہیں تو غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں فی ہزار سات یا آٹھ۔ یہی وجہ ہے کہ عملی شرافت عالی شان ایوانوں سے زیادہ کم حیثیت مکانوں اور جھونپڑیوں میں پائی جاتی ہے۔ ان ممالک میں بھی جہاں ابھی تعلیم عام نہیں ہوئی ہے اور فرداً فرداً ہی لوگ علم حاصل کر رہے ہیں اُنکی سوسائٹی کے ابتک اساسی اصول بدلنے نہیں پائے۔ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ بہت سے تعلیمیافتہ مگر غیر مہذب لوگ موجود ہیں۔

مختلف اقوام کی عمرانی زندگانی کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ تعلیم دینا بہت زیادہ آسان ہے بہ نسبت انکو تربیت دینے کے۔ تربیت کے لئے صرف دماغی برورش وذہنی قویٰ کا نشوونما کافی نہیں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی جیتی جاگتی مثال پیش نظر رکھی جائے جو پے درپے مختلف اوقات اور مختلف مواقع پر بطور رہنما ہونے کے کام آئے۔ اس طرح زندہ مثالوں سے لوگوں کو تربیت دیجاتی ہے۔

تربیت کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ تربیت کے اثرات ہمیشہ دیرپا نہیں ہوتے۔ یہ بھی ایک سطحی دھوکہ ہے کہ بچپن کے اثرات نہ مٹنے والے نقوش ہیں۔ تمام نقوش مٹتے اور مستحکم ہوتے رہتے ہیں۔ اثر سب سے زیادہ مستقل اور گہرا اس وقت ہوتا ہے جبکہ بچپن کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی وہی اثرات رہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ دس بارہ برس کے لڑکے یا لڑکی کو ایک عمرانی فضا سے لیجا کر دوسری میں منتقل کریں (خصوصاً جبکہ یہ زیادہ آرام دہ اور زیادہ خوش کن ہو) اور بچپن کے "نہ مٹنے والے نقوش" کے بقا کی امید رکھیں۔ اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نوجوانوں کا قلب نئی فضا سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اپنی پیشتر کی زندگی کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے۔

عام طور پر یہ نظریہ صحیح ہے کہ جس قدر زیادہ کسی فضا میں کوئی شخص رہے گا اسی قدر وہ اُس فضا سے زیادہ متاثر ہوگا۔ ہمیں بعض مرتبہ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ہندوستانی یورپ جاکر ہندوستان کی عمرانی زندگی پر لعنت ملامت کرتے ہیں اور پھر واپسی کے چند ماہ بعد ہی خود اسی عمرانی زندگی کو قبول کر لیتے ہیں پہلے طوعاً کرہاً، بعد ازاں مجبوراً، پھر بتدریج نیم رضامندگی سے اور بالآخر علی الاعلان اسے عمدہ سمجھکر۔ یہ ہے معاشرت کا دباؤ، جس کا شکار ہر معمولی فرد ہو جاتا ہے۔ یورپ کی معاشرت میں رہ کر یورپ کے ہم خیال ہوگئے، یہاں آنے کے بعد ہندوستانی معاشرت کے دباؤ نے پھر اپنا سا بنا لیا۔

ہندوستانی تہذیب و تمدن کے یورپ کی معاشرت میں برائیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی اور فیصلہ نہایت دشوار بلکہ قریب قریب ناممکن ہے کہ ان دونوں میں کون بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔ ہمیں صرف یہی مطلوب ہے کہ اپنی خوبیوں (مثلاً مہمان نوازی، کنبہ پروری، خلوص، مروت و انسانی ہمدردی) کو قائم رکھتے ہوئے یورپی، امریکی تہذیب و تمدن کی خوبیاں سیکھیں (مثلاً ضابطہ و باقاعدگی، اوقات کی پابندی، اور قوم و ملت کی خدمت)۔

مگر یورپ کی سچی تہذیب و عمدہ شائستگی کا نمونہ پیش کرنا ہندوستانیوں کے لئے دشوار ہے اور بغیر نمونہ قائم کئے تربیت دینا چونکہ از حد دشوار بلکہ ناممکن ہے، ہندوستان اور دیگر ممالکِ مشرق مغربی تعلیم تو حاصل کر لیتے ہیں مگر مغربی تہذیب و تمدن کی خوبیوں کو نہیں سیکھ سکتے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تعلیم بغیر تربیت کے بدتر ہے، بہ نسبت تربیت بغیر تعلیم کے اور چونکہ تربیت کے لئے خود نمونہ بنکر ہی معاشرت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے ترقی کے لئے یہ ناگزیر ہے اعلیٰ قابلیت کے لوگ قوم و ملت کی رہبری خود اصلاح کا نمونہ و مجسمہ بنکر کریں۔

اگر ہم ترقی چاہتے ہوں یعنی یہ کہ لوگوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ مہذب، شائستہ اور مرفہ الحال بنانا چاہتے ہوں تو محض نظری مدارس کی تعلیم سے ہمیں فیض نہیں پہنچ سکتا اس کے لئے لابدی ہے کہ ہم ایسی عمرانی فضا پیدا کریں جو تربیت بخش ہو اور لڑکوں، لڑکیوں، بالغوں، کم سنوں، بوڑھوں، بچوں، امیروں غریبوں، سب کو اپنی فضا سے ہر وقت اور ہر موقع پر متاثر کرتی رہے۔ ساتھ ہی حکومت کے زیر سرپرستی معاشی زندگی میں تازگی پیدا کر کے، لوگوں کی معاشی حالت سدھار کر، تہذیب و شائستگی کیلئے بنیاد قائم کریں۔

معاشی مرفہ الحالی اور تعلیم کے ساتھ جب تہذیب و تمدن کے نمونے پیش نظر ہونگے اسی وقت لوگ مہذب اور قومیں متمدن بنیں گی۔ عمرانیات و مرفہ الحالی کے یہ مسلم الثبوت کلیئے ہیں کہ ترقی اسی وقت ممکن اور اغلب ہے جب مدارس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خاندان کی تربیت، معاشرت کی فضا اور حکومت کی سرپرستی بھی موجود ہو۔ اسی وقت جبکہ مدرسہ، خاندان، معاشرت اور حکومت میں اتحادِ عمل ہوگا اور وقت واحد میں متفقہ طور پر کوشش کیجائیگی اور انکی تعلیم و تربیت میں یک رنگی و ہم آہنگی ہوگی، اسی وقت قومیں ترقی کریں گی اور تیز رفتار کے ساتھ منازلِ ترقی طے کرتی چلی جائیں گی۔

نظام شمسی

تاروں بھری رات میں جب ہم آسمان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو لاتعداد ستارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تاروں کے علاوہ جو ہم کو نظر آتے ہیں اتنے ہی یا شاید ان سے زیادہ ابھی ایسے ہونگے جو دوربین کی مدد سے ہم کو نظر آسکتے ہیں۔ یہ سب ستارے نہ ایک جسامت کے ہیں اور نہ ایک فاصلہ پر ہیں۔ نہ یہ سب تارے ہیں بلکہ ان سب کو تین قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) ثابت (جمع ثوابت) (Stars) وہ اجرام فلکی ہیں جو ایک جگہ قائم نظر آتے ہیں۔ اگر یہ متحرک ہونگے بھی تو ان کے بُعد کی وجہ سے نہ انکی چال معلوم ہوسکتی ہے اور نہ انکی جگہ میں تغیر معلوم ہوتا اس لئے انکو ستارہ یا ثابت کہتے ہیں۔

(۲) وہ اجرام فلکی جو کسی ثابت کے گرد گھومتے ہیں سیارہ کہلاتے ہیں۔

(۳) توابع یا اقمار وہ اجرام جو کسی سیارہ کے گرد گھومتے ہیں۔

اس وقت تک تقریباً پانچہزار ثوابت کو دیکھکر ان کے نام مرتب کرلئے ہیں ان سب میں سب سے چھوٹا اور زمین سے نزدیک سورج ہے۔ ثوابت میں ذاتی روشنی ہوتی ہے اور سیارہ اور قمر اس ثابت سے روشنی لیتے ہیں جس کے وہ تابع ہوتے ہیں مثلاً زمین اور ہمارا چاند سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ ان میں خود روشنی ذاتی نہیں ہے بلکہ سورج سے روشنی لیکر منور ہوتے ہیں۔ جیسے آئینے پر عکس ڈالنے سے وہ چمکنے لگے۔ بعض سیارے ایسے ہیں جن کے گرد کئی اقمار یا توابع چکر لگاتے ہیں۔

علم الکائنات Cosmology وہ علم ہے جس سے ہم کو ابتداءِ آفرینش کی تاریخ کا علم ہوتا ہے۔ اس کا ایک نظریہ یہ ہے کہ ابتدا ءِ آفرینش میں صرف ایک ہیولیٰ تھا جو دھوئیں کی شکل کا تھا جسے انگریزی میں Mebula کہتے ہیں۔ اب بھی کہکشاں میں بعض وقت نظر آتا ہے۔ اس میں فطرتی گردش

تھی۔ مگر اجرام فلکی یعنی جو اجسام بیرونی حلقوں میں ہونگے وہ زیادہ تیز حرکت کرتے ہونگے۔ اور جو مرکز کے قریب ہوں گے وہ کم اور بعض صرف محوری ہی حرکت کرتے ہونگے۔ چونکہ یہ حرکت بہت تیز تھی اس لئے قانون دفع مرکزی (Centrifugal) کے تحت میں اس میں سے کچھ اجسام تمام عالم میں منتشر ہوگئے اور پھر انکے ٹکڑے ہوکر مختلف سیارے اور انکے ٹکڑے ہوکر اقمار بن گئے۔ اس طرح بہت سے لاتعداد نظام قائم ہوئے جن میں سب سے چھوٹا سیارا سورج اور اس کا نظام ہے۔ اس کا تجربہ کرنا ہو تو ایک طشت میں پانی بھر کر ایک قطرہ تیل کا ڈالدو اور قطرہ کے بیچ میں ایک لکڑی کو اس کے محور پر تیز حرکت دو۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ حصہ تیل کے قطرہ کا پھٹ کر دور حرکت کرنے لگے گا۔ مختصراً اس ریوڑے میں سے ہزاروں نظام بنے ہونگے جن میں سے اس وقت زیر بحث صرف ایک نظام شمسی ہے۔

سورج

نظام شمسی کا مرکز ہے۔ اسکا قطر ۸ لاکھ ۶۶ ہزار میل ہے۔ اس میں ذاتی حرارت ہے کسی اور جسم کے گرد گھومنے کا علم اب تک نہیں ہوا آئندہ چل کر شاید معلوم ہو۔ اس قدر معلوم ہے کہ علاوہ حرکت محوری کے حرکت دوری بھی ہے اور نسر واقع کی طرف بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر مدار کا پوری طرح تعین نہیں ہوسکا ہے۔ اور یہ حرکت بہت ہی آہستہ ہے۔ خود اپنے محور پر ۲۶ - ۲۷ دن میں پورا دورہ کرلیتا ہے۔ زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ اس میں چونکہ حرارت اس قدر موجود ہے کہ ہر قسم کی دھات مثلاً لوہا۔ تانبا وغیرہ رقیق صورت میں ہی نہیں بلکہ گیس کی شکل میں نظر آتے ہیں اس لئے اس کی جسامت کے اعتبار سے اسکا وزن کم

(نوٹ صفحہ ۱۰۱) آج یورپ جس نظریہ پر ہزاروں کوششوں اور تجربات و مشاہدات کے بعد پہنچا ہے۔ اسے عرب کے ایک امی فداہ روحی صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو سال قبل ارشاد الٰہی کی صورت میں ہم تک پہنچا دیا تھا۔ گویا اس نظریہ کی تصویر اس آیت شریفہ میں ہے۔ ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعاً وکرھاً قالتا اتینا طائعین۔ سورۂ حم

ہے ۔ زمین سے اگرچہ تیرہ لاکھ گنا زیادہ بڑا ہے مگر وزن میں صرف تین لاکھ ۳۲ ہزار گنا ہی زیادہ ہے زمین سے اسکا اوسط فاصلہ ۹ کروڑ ۲۹ لاکھ میل ہے ۔ اس میں بڑے بڑے غار ہیں جنہیں عام طور سے داغ کہتے ہیں ۔ سورج کے استواء سے ۱۰ درجہ سے لیکر ۳۰ درجہ شمالاً و جنوباً میں ہی یہ داغ ہیں بعض دفعہ ان میں طوفان آتا ہے ۔ اور بڑے بڑے بگولے سو سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ بعض اوقات ان داغوں کے آنے سے زمین پر مقناطیسی تغیرات دیکھنے میں آئے ہیں اور بارہا اور ہوا سے انکا تعلق معلوم ہوتا ہے ۔ زمین کی طرح بہت سی دھاتیں سورج میں ہیں مگر گندھک فاسفورس پارہ ۔ سونا ۔ نائٹروجن نظر(۱) نہیں آتے ۔ سورج سے جوار بھاٹا کا بھی قریبی تعلق ہے ۔ سورج پر کشش ثقل زمین سے ۲۷ گنی زیادہ ہے ۔ ایک پاؤنڈ وزن جو زمین پر تلتا ہے جب سورج پر جاکر تولا جائے تو ۲۷ پاؤنڈ ہوگا ۔ اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو ہم سے مشکل سے اپنا ہاتھ ہلایا جا سکے ۔ سورج سے برابر حرارت خارج ہو رہی ہے اور اسی کی وجہ سے اسکا قطر یا جسم سکڑ رہا ہے ۔ ۲۵ سال میں ایک میل کے قریب یا ایک صدی میں چار میل اسکا قطر چھوٹا ہوجاتا ہے ۔ جس قدر حرارت سورج سے خارج ہوتی ہے اس کا صرف دو اربواں حصہ زمین تک پہنچتا ہے یعنی اگر دو ارب حصہ وہاں سے حرارت کے خارج ہوتے ہیں تو صرف ایک حصہ زمین کے حصہ میں آتا ہے ۔ باقی فضا اور دوسرے سیاروں میں پہنچ جاتا ہے ۔ سورج میں حرارت چودہ ہزار درجہ فارن ہائٹ ہے ۔ یعنی اس قدر کہ دن بھر میں ایک مربع فٹ پر سولہ ٹن پتھر کا کوئلہ جلانے سے جس قدر حرارت پیدا ہو ۔ اگر حساب لگاؤ تو معلوم ہوگا کہ کل کرہ زمین کے برابر وزن کے کوئلے کے روز جلائے جائیں تو اس قدر حرارت پیدا ہو جس قدر سورج سے روزانہ خارج ہوتی ہے ۔ یہ کل کوئلہ وزن میں ایک سو سات نہاسنگ بیس سنکھ ٹن ہوگا

(۱) بعض لوگوں کو حیرت ہوگی کہ یہاں سے بیٹھے بیٹھے ایسی جزئیات سورج کی کیسے معلوم ہوگئیں ۔ ایک آلہ طیف پیما Spectroscope سے تمام عناصر کا حال سورج و دیگر ستاروں کا بھی معلوم ہوگیا ہے ۔ انشاءاللہ کسی آئندہ اشاعت میں اسکا ذکر کیا جائیگا ۔

زمین پر ایک کرہ ہوا کا غلاف کی طرح چڑھا ہوا ہے اس کی وجہ سے زمین پر حرارت میں اعتدال رہتا ہے اگر یہ نہ ہوتی تو آفتاب طلوع ہوتے ہی گرمی کی تپش سے سب جاندار جھلس جاتے اور غروب ہوتے ہی برف میں جم جاتے۔ سورج میں روشنی اس قدر ہے جس قدر پانچہزار پانسو تریسٹھ موم بتیاں ایک مربع فٹ میں جلانے سے حاصل ہو۔ چونکہ روشنی کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل ہے اس لئے اسکی روشنی بعد طلوع ۸ منٹ میں زمین تک آتی ہے اور غروب کے بعد آٹھ منٹ تک دکھائی دیتا رہتا ہے۔ بعض تاروں کی روشنی زمین تک کئی کروڑ برس میں آتی ہے اس سے تاروں کی دوری کا اندازہ ہوگا۔ ایک ستارہ حال میں دریافت ہوا ہے جس کا فاصلہ زمین سے آٹھ سو دھانگ میل ہے۔ آفتاب تاروں میں سب سے چھوٹا اور سب سے نزدیک ہے۔ جتنے ثوابت ہیں وہ سب بذاتہ روشن و حرارت رکھتے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورج میں اس قدر حرارت کہاں سے آئی اس کے لئے چند اصول پہلے سمجھنے چاہئیں۔ فرض کرو ہمارے پاس ایک گولہ ہے جس میں ایک مکعب انچ گیس بھری ہے۔ اگر اس گیس کو ہم دبا کر تھوڑی جگہ میں قید کریں تو اس میں حرارت پیدا ہوگی۔ فرض کیجئے۔ گولہ کے قطر کو دبا کر نصف کر دیا تو ہر سمت سے جب یہ نصف انچ دبے گا اور کل گیس کا حجم $\frac{1}{8}$ یعنی قطر کے مکعب کا معکوس کم ہوگا۔ اور اس کا دباؤ آٹھ گنا بڑھ جائیگا۔ اور اس کا درجہ حرارت بھی آٹھ گنا بڑھے گا۔ یہ ایک عام اصول ہے جن صاحبوں نے برف خانہ دیکھا ہے وہ اس اصول کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یہانتک سمجھنے کے بعد آفتاب کو لیجئے۔ یہ ۵۰ سال میں ایک میل سکڑتا ہے۔ یعنی ایک سال میں تقریباً دو سو فٹ۔ اس میں جو گیسیں بھری ہیں وہ حجم میں ۸ تین یا اسی لاکھ مکعب فٹ دب جاتی ہیں جس کی وجہ سے اس قدر حرارت پیدا ہو جاتی ہے جو سال بھر تک کافی ہو۔ یہ بھی ایک نظریہ ہے کہ اس میں ریڈیم زیادہ ہے۔ حال میں ایک نظریہ دریافت ہوا ہے کہ اگر چار کروڑ درجہ سنٹی گریڈ حرارت حاصل کر سکیں تو ہر عنصر کے جوہر میں سے قوت حاصل کیجا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ سورج میں کسی جگہ درجہ حرارت اس قدر ہو۔ یا ریڈیم کا کافی خزانہ ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سورج کا جسم تو چھوٹا ہو جائے گا مگر اس میں حرارت بدستور عرصہ تک باقی رہے گی۔ یہ بھی ایک نظریہ ہے کہ اس میں بعض اجسام بعض وقت گرتے ہیں اور انکے گرنے کی حرارت بھی کافی ہوتی

ہے۔ نظام شمسی کا ہر ممبر اس قابل ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب لکھی جائے چہ جائیکہ ایک رسالہ کا مضمون ۔ لہذا اب مختصر حالات پر ہم اکتفا کرتے ہیں ۔

سورج مرکز میں ہے اور اس کے گرد سب سیارے اس ترتیب میں گردش کر رہے ہیں جس ترتیب میں انکے حالات آگے آتے ہیں ۔

۱۔ عطارد Mercury

سورج سے اسکا اوسط فاصلہ تین کروڑ ۶۰ لاکھ میل ہے ۔ زیادہ سے زیادہ چار کروڑ تیس لاکھ میل تک ہو جاتا ہے ۔ اس کا رنگ گلابی ہے ۔ اسکا قطر تین ہزار میل ہے ۔ اس کا سال ۸۸ دن میں ختم ہو جاتا ہے یعنی اپنے مدار پر ۸۸ دن میں گھوم لیتا ہے ۔ ۲۴ گھنٹے ۵ منٹ میں اپنے محور پر گھوم لیتا ہے ۔ اس میں کرہ ہوا ہے جو زمین کی ہوا سے زیادہ گھنی یا وزن دار ہے ۔ زمین سے نوگنی گرمی زیادہ ہے ۔ آبی بخارات بکثرت ہیں ۔ چونکہ اس کی حرکت محوری اور حرکت دوری یکساں ہیں اس لئے اس کا ایک رخ ہمیشہ آفتاب کے سامنے اور دوسرا پرے رہتا ہے جس کی وجہ سے ایک طرف انتہائی گرمی اور دوسری جانب برف موجود ہے ۔ اسکا جسم زمین سے ۲۵ گنا ہلکا ہے یعنی جو چیز یہاں ۲۴ پونڈ کی ہے وہ وہاں جاکر ایک پونڈ رہ جائیگی ۔ جس قوت سے یہاں آدمی زمین پر تین فٹ اچھل سکتا ہے عطارد پر ۹ فٹ اچھل جائیگا ۔ یہ ہمیشہ آفتاب کے ساتھ رہتا ہے ۔ زیادہ سے زیادہ ۲۷ درجہ کا فرق ہوتا ہے ۔ اس لئے آفتاب کے غروب کے بعد اور طلوع سے کچھ قبل ہی یہ نظر آتا ہے اور جلد اوجھل ہو جاتا ہے ۔ اس میں بعض پہاڑ گیارہ میل بلند ہیں ۔

۲۔ زہرا Venus

آفتاب سے اوسط فاصلہ چھ کروڑ ستر لاکھ میل ہے ۔ اسکا قطر ۷۶۶۰ میل کا ہے اس میں ہوا اور پانی کے آثار معلوم ہوتے ہیں ۔ پہاڑ بھی ہیں جو ۲۰ میل تک بلند ہیں برف اور نباتات کا بھی وجود

[illegible] سے مدار ۳ درجہ منحرف ہو۔ ۷½ ماہ میں ایک سال ہوتا ہے۔ ۲۳ گھنٹے کا دن ہوتا ہے سیاروں میں سب سے زیادہ چمکدار اور خوبصورت سیارہ ہے۔ عطارد کے مانند آفتاب کے ہمراہ اور ایک ہی جانب [illegible] سے زیادہ ۴۷ درجہ آفتاب سے الگ ہوتا ہے۔ اس لئے بمقابلہ عطارد کے طلوع سے کچھ زیادہ پہلے اور غروب کے کچھ دیر بعد تک نظر آتا رہتا ہے۔ اکثر اسے صبح یا شام کا تارہ کہتے ہیں اگر ۷ جون یا ۱۰ دسمبر کو اسکا قِران ہو تو اسے گہن لگیگا۔ یعنی سورج کے سامنے سے یہ سیارہ گزرے گا اور سورج پر ایک دھبہ کی طرح نظر آئیگا۔ پھر آٹھویں سال ایسا ہی ہوگا اور اس کے بعد ایک طویل مدت نہیں ہوگا۔ ان تاریخوں سے معلوم ہوگا کہ کب گہن لگیگا یا لگا تھا۔ ۱۷۶۱ء کے بعد ۱۷۶۹ء میں ہوا۔ ۱۸۷۴ء و ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ اب ۲۰۰۴ء اور ۲۰۱۲ء میں ہوگا۔ زمین کے مقابلہ ۷/۸ گراتی ہے۔ یعنی ایک پونڈ کی چیز وہاں ۷/۸ پونڈ کی رہ جائے گی۔

۳۔ زمین

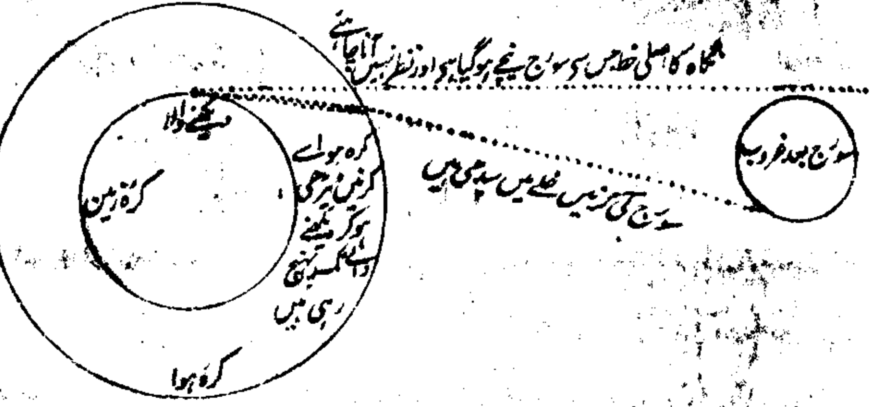
سورج سے اوسط فاصلہ ۹ کروڑ ۲۹ لاکھ میل کا ہے۔ اسکا محور ۲۳½ درجہ جھکا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے دن رات برابر نہیں ہوتے۔ اگر محور جھکا نہ ہوتا تو ہمیشہ ۱۲۔ ۱۲ گھنٹے کے دن و رات ہوتے اور موسمی تغیرات بھی ایسے نہ ہوتے۔ زمین کا قطر استوا پر ۷۹۲۷ میل اور قطبین پر ۲۷ میل کم یعنی ۷۹۰۰ میل کا [illegible] اپنے مدار پر ۱۷۔ ۱۸ میل فی سکنڈ کی رفتار سے گھومتی ہے اور ۳۶۵ دن میں یہ دور ختم کرتی ہے۔ اس میں اندرونی حرارت بہت زیادہ ہے فی پچاس ساٹھ فیٹ پر ایک درجہ ف [illegible] بڑھتی ہے۔ یہ حرارت کبھی گرم چشموں اور کبھی آتش فشاں پہاڑوں کی شکل میں نکلتی ہے۔ سورج کی طرح یہ [illegible] رہی ہے جس کا نتیجہ ایک دن یہ ہوگا کہ یہ مرکز تک سرد ہوکر رہ جائیگی۔ اور اس طرح بے جان ہو جائے گی، جیسا اس وقت چاند ہے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ اندر بوجہ زیادتی حرارت کے یہ بالکل پگھلی ہوئی حالت میں ہوگی مگر لارڈ کیلون نے تجربات سے ثابت کیا کہ اندرون زمین اگرچہ باعتبار [illegible] بہت بڑھا ہوا ہے مگر یہ ہے ٹھوس۔ اندر دباؤ کی وجہ سے ٹھوس پن زیادہ

اندر کی زمین اگر پانی سے تقریباً دوگنی زیادہ بھاری ہے تو اندرونی کئی گنا بھاری ہے اور اوسطاً زمین کا وزن نکالا جائے تو ساڑھے پانچ گنا پانی سے بھاری ہوگا۔ کل زمین کی جسامت نوسو چالیس مہاسنگ میں سنکھ ٹن وزن ہوا۔ زمین کے تولنے کے اور بھی کئی طریقہ ہیں۔ جن کا یہاں بیان کرنا ضروری نہیں۔

قدیم حکما اور اب بھی بعض حمقا انکی اندھی تقلید میں یہی مانتے ہیں کہ زمین ساکن ہے او آفتاب وغیرہ سیاروں کی طرح اس کے گرد گردش کررہے ہیں۔ یہ نظریہ کہ زمین بھی ایک سیارہ ہے درجہ یقین تک پہنچ گیا ہے۔ اور تجربات اور مشاہدات سے یہ صاف بتایا جاسکتا ہے کہ زمین متحرک ہے۔ نیوٹن نے سب سے پہلے پانسو فٹ کے ایک گہرے گڑھے میں پتھر پھینک کر یہ ثابت کیا کہ یہ پتھر تقریباً ایک انچ مشرق کی جانب گرا کیونکہ گردش محوری کی وجہ سے زمین اس قدر سرک گئی تھی۔ یہ موضوع خود ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے۔ جسے آئندہ کسی فرصت کے وقت ہم لکھیں گے۔

تقریباً پچاس میل تک کرۂ ہوا ہم کو ملتا ہے۔ کرہ ہوا سے یہاں کے موسموں میں اعتدال قائم رہتا ہے اور شفق وغیرہ ہم کو نظر آتی ہے۔ اور رات کو بھی کچھ روشنی رہتی ہے۔ ورنہ رات کو سیاہ بستہ ہو جاتی اور اس قدر شدید اندھیرا ہوتا جس کی مثال نہیں ملتی۔ بعض وقت بعض تارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ بھی ہمارے کرہ ہوا میں حرکت کا سبب ہے۔ ورنہ انکی روشنی مستقل ہے۔ اس کرہ ہوا کا اثر ہی ہے کہ ہم کو سورج طلوع اور غروب کے وقت ذرا چپٹا سا معلوم ہوتا ہے اسکی وجہ یہ ہے روشنی جب ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل ہوتی ہے تو ذرا ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اسے انعطاف نور کہتے ہیں لکڑی کو پانی میں ڈالنے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سطح آب تک تو سیدھی تھی اور سطح سے نیچے کا حصہ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ اسی طرح روشنی جب خلے میں سے کرہ ہوا میں داخل ہوتی ہے تو بجائے سیدھے رہنے کے ذرا ٹیڑھی ہو کر آنکھ تک پہنچتی ہیں۔ اسی وجہ سے آفتاب کا عمودی قطر افقی قطر کے مقابلہ میں چھوٹا نظر آتا ہے۔ جس سے آفتاب چپٹا نظر آتا ہے۔ شاید بہت کم کو یہ معلوم ہوگا کہ آفتاب جب افق سے غائب ہو چکتا ہے تو اس کے بعد بھی نظر آتا رہتا ہے۔ اول تو وہ آٹھ منٹ پہلے غائب ہو چکتا ہے اور روشنی کی آخری

کرن اس کے آٹھ منٹ بعد یہاں پہنچتی ہے۔ دوسرے یہ کہ غائب ہو چکتا ہے یعنی آخری کرن وہاں سے چلکر آٹھ منٹ کے بعد ہم کو بھی نظر نہیں آنا چاہئے گر پھر بھی انعطاف نور کی وجہ سے یہ ہم کو نظر آتا رہتا ہے۔ جو اس نقشے سے واضح ہوگا۔



اس سے یہ ثابت ہوگا کہ باوجودیکہ آفتاب افق سے نیچے بیٹھ گیا ہے اور دیکھنے والے کی آنکھ کا خط مستقیم سورج کے اوپر سے گزر جاتا ہے یعنی اُسے نظر نہیں آنا چاہئے مگر سورج کی وہ شعاعیں جو سیدھی آرہی ہیں کرہ ہوا میں داخل ہوتے ہی ٹیڑھی ہوگئیں اور ٹیڑھی ہوکر دیکھنے والے کی آنکھ تک پہنچیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ افق سے آفتاب غائب ہے مگر دکھائی دے رہا ہے یہ کیفیت بہت تھوڑی دیر تک رہتی ہے اور جب متعلقہ شعاعیں بھی اونچی ہو جاتی ہیں تو ہم اُسے غروب ہوا کہتے ہیں۔

نصف کرہ شمالی میں آفتاب سال میں ۱۸۶ دن اور جنوبی میں ۱۸۰ دن رہتا ہے جس کی وجہ سے شمالی کرہ نسبتاً گرم ہے۔ یہ آفتاب کے مدار کے بیضوی ہونے کی وجہ ہے۔

چاند

زمین کا تابع ہے زمین سے اسکا اوسط فاصلہ دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے۔ چاند کا جسم زمین سے ۴۹ گنا چھوٹا ہے۔ زمین اس سے ۸۰ گنی بھاری ہے۔ اگر ایک تھالی ایک فٹ کے قطر لیکر ۱۰۳ فٹ پر رکھیں تو پورے

چاند کو چھپانے کی بعض وقت ۱۱ فٹ اور زیادہ سے زیادہ ۱۵۵ فٹ تک یہ چھپائیگی۔ اس سے بھی اس کے فاصلہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چاند زمین کے گرد اپنے مدار پر ۲۷ دن، گھنٹے ۴۳ منٹ میں گھوم لیتا ہے اسکی گردش محوری سورج کے ساتھ رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے اسکا ہمیشہ ایک ہی طرف کا رُخ نظر آتا ہے جو داغ اس میں نظر آتے ہیں وہ پہاڑوں کا عکس گھاٹیوں اور میدانوں میں ہے۔ پورے چاند پر چونکہ سورج کی روشنی بالکل سامنے پڑتی ہے اس وجہ سے سایہ نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے ترچھی روشنی پڑے گی سایا لمبا پڑے گا۔ اور داغ نمایاں معلوم ہوں گے۔ اس کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل کا ہے۔ وہاں ہوا معلوم نہیں ہوتی اور نہ حرارت کا علم اتنک ہوا۔ اس میں بڑے بڑے میدان نظر آتے ہیں اور بعض غاروں میں سے سفید فوارہ سے نکلتے معلوم ہوتے ہیں جب کسی اور سیارہ کو چاند کے ساتھ گہن لگتا ہے تو وہ چاند کے پیچھے فوراً غائب ہوجاتا ہے اگر ذرا ٹھہر کر غائب ہو تو کرہ ہوا کا وجود ثابت ہوجائے جس طرح آفتاب ڈوبنے کے بعد نظر آتا ہے۔ یہ نظر آنا محض ہوا کا باعث ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ پوری چاند کی راتوں میں بارش کم اور اول و آخری راتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ پورا چاند جب نصف اللیل پر ہوتا ہے تو اکثر بادل پھٹ جاتے ہیں۔

چاند اور سورج کی کشش سے جوار بھاٹا ہوتا ہے۔ یہ خود ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے مگر جوار بھاٹے کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین پر ایک قسم کا بریک برابر لگ رہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی رفتار دن بدن گھٹ رہی ہے۔ ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ کئی کئی سو گھنٹے میں زمین اپنے محور پر ایک چکر لگائیگی یعنی کئی سو گھنٹے کا دن ہوگا۔ اور اسی طرح چاند بھی کئی مہینے میں ایک چکر لگائے گا یہاں تک کہ ۵۰ دن کا ایک مہینہ ہوا کریگا اور چودہ سو گھنٹے کا ایک دن اور رات ہوگا جو اب ۲۷ دن کا مہینہ اور ۲۴ گھنٹے کا دن ہوتا ہے۔ ایک زمانہ ایسا گزر گیا ہے کہ زمین اپنے محور پر جلد گھوم لیتی تھی اور تین چار گھنٹے میں ایک دن ختم ہوجاتا تھا اور چاند بھی زمین کے قریب تھا اور تین چار دن میں مہینہ یعنی ایک دور کر لیتا تھا۔ چاند پر ہر چیز زمین کے مقابلہ میں ۱/۶ گنی ہلکی ہے۔ یعنی جو وزن زمین پر سو پاؤنڈ ہے چاند پر جاکر ۱۴ پاؤنڈ رہ جائے گا۔ چاند پر ذاتی حرارت اب نہیں ہے۔ نہ ہوا ہے اور کوئی ذی رُوح وہاں رہ بھی نہیں سکتا۔

اگر رہتا ہوگا تو اس کے جسم کی ساخت ہم سے اور اُن جانوروں سے مختلف ہوگی جو زمین پر ہیں۔ فلکیات کی اصطلاح میں چاند کو مردہ کہتے ہیں۔

۴۔ مریخ Mars

زمین سے سب سے نزدیک سیارہ بعض وقت اسکا فاصلہ تین کروڑ پچاس لاکھ میل نزدیک ہوجاتا ہے خود اس کا قطر چار ہزار میل ہے۔ سورج سے اوسط فاصلہ چودہ کروڑ دس لاکھ میل ہے۔ ۶۸۶ دن میں اس کا سال ہوتا ہے۔ اور ۲۴ ½ گھنٹے میں دن۔ ہر دوسرے سال زمین کے قریب آتا ہے۔ اگر اسکا قرب اگست میں ہو تو بہت صاف نظر آتا ہے۔ بہت تیز چمکدار سرخی مائل سیارہ ہے۔ بڑی دوربین سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہت سی نہریں ہیں اور بہت خطے ہیں۔ اس میں بادل ہیں اور کرہ ہوا ہے مگر زمین سے زیادہ لطیف۔ اس وجہ سے ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں آبادی ہوگی اور یہ نہریں قدرتی نہیں بلکہ مصنوعی ہونگی۔ اس کے دو چاند ہیں ایک چاند جو چھ ہزار میل ہے، ۸ گھنٹے میں دورختم کرلیتا ہے۔ دوسرا پندرہ ہزار میل ہے اور ۳۰ گھنٹے میں دورہ کرتا ہے۔ ان چاندوں کا قطر ۱۰ میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اسکی جسامت زمین سے ۵۴ اور سو کی نسبت رکھتی ہے یعنی جو چیز زمین پر سو پاونڈ ہے وہ مریخ پر ۵۴ پاونڈ کی رہ جائیگی۔ زمین سے جسامت ¼ ہے۔

۵۔ چھوٹے سیّارے

مریخ اور مشتری کے درمیان میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ اور یہ خیال ہوا کہ ضرور انکے درمیان میں ایک سیارہ ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے ایک جرمن فلکی نے ایک نسبت معلوم کی۔ جو ہر سیارہ کو سورج سے باعتبار فاصلہ رکھنی پڑتی ہے۔ اور یہ قانون اب اس جرمن کے نام سے ہی بوڈے Bode کا قانون کہلاتا ہے۔ اس قانون کو سمجھنے کے لئے ان اعداد کو دیکھو۔

[illegible]	۰	۳	۶	۱۲	۲۴	۴۸	۹۶	۱۹۲	۳۸۴
[illegible]	۴	۷	۱۰	۱۶	۲۸	۵۲	۱۰۰	۱۹۶	۳۸۸
اصل فاصلہ سورج سے ÷ دس لاکھ میل	۳٫۹	۷٫۲	۹٫۳	۱۵٫۲	۲۷٫۷	۵۲	۹۵٫۴	۱۹۱٫۸	۳۰۰
نام سیارہ	عطارد	زہرہ	زمین	مریخ		مشتری	زحل	یورنیس	نیپچون

اس اصول کے تحت میں بوڈے Bode نے خیال کیا کہ مریخ اور مشتری کے درمیان میں کوئی سیارہ ضرور ہونا چاہئے۔ چنانچہ تلاش شروع کی۔ گرازلی کے فلکی نے دیکھا اور سیرس Ceres نام رکھا۔ اسی کے ساتھ اور ایک طالب کا نام پالرس Pallrs رکھا۔ پھر ۱۸۰۴ء میں جونو Juno پھر ویسٹا Vesta۔ غرض اٹھارہویں صدی سے اسوقت تک تقریباً چار سو چھوٹے سیارے معلوم ہو چکے ہیں۔ ان کا سال سات سے تین سال کا ہوتا ہے۔ بعض کا قطر صرف ۵ میل ہے اور بعض کا قطر ۵ میل سے ۱۵ اسل تک ہے۔ ان میں سب سے بڑا سیرس ہے جس کا قطر ۵۲۰ میل کا ہے۔ اگر ۱۷۷۲ء میں بوڈے یہ قانون فاصلہ دریافت نہ کرتا تو کسی کو خیال بھی نہ ہوتا کہ مریخ اور مشتری کے درمیان میں کوئی سیارہ یا سیارے ہیں

۶۔ مشتری Jupiter

نظام شمسی میں سب سے بڑا سیارہ۔ بعض وقت ہمارے چاند کی طرح ہلالی شکل کی بھی ہو جاتی ہے۔ دوربین سے معلوم ہوتا ہے کہ خط استوا پر پٹی سی بندھی ہوئی ہے قطبین پر زیادہ چمکدار ہے پہلے بہت سفید ہو جاتی تھی مگر اب زیادہ بہتر آلات سے خاکی سرخ۔ نارنجی وغیرہ رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ [illegible] کی طرح دھبے بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان میں تغیر بھی معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۷۸ء میں ایک دھبہ نظر آیا تھا جو ۲۷ ہزار میل لمبا ۸ ہزار میل چوڑا اور سرخ رنگ کا تھا۔ مگر چار برس کے بعد سرخی کم ہو گئی۔

سورج سے اوسط فاصلہ ۴۸ کروڑ میل ہے گردش محوری ۹ گھنٹے ۵۶ منٹ کی ہے۔ یعنی

آتا لہذا دن ورات ہیں۔ اس لئے خط استوا پر آٹھ میل فی سکنڈ کی رفتار ہے۔ مقابلہ زمین کے ۲۹ ء
میل [illegible] ہی ہے۔ حرکت دوری ۱۲ برس میں ختم کرتی ہے۔ اور ۶۲ ء ۸ میل فی سکنڈ کی رفتار سے
اپنے مدار پر حرکت کرتی ہے زمین ۰ ء ۱ میل فی سکنڈ۔ چونکہ استوا پر حرکت زیادہ ہے لہذا دفاع مرکزی
کے اصول پر استوا کا قطر زیادہ ہے اور قطبین کا قطر تقریباً ساڑھے پانچ ہزار میل کم ہے۔ زمین کا صرف
۲۷ میل کم ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس میں ذاتی حرارت بھی ہے۔ اس میں پانچ اقمار ہیں۔ ان میں سے
چار تو گیلیلو نے دریافت کرلئے تھے اور ایک ۱۸۹۲ء میں نظر آیا۔ مشتری کے اقمار کے گہن سے
روشنی کی رفتار ناپنے میں بہت مدد ملی۔ اس قانون کا بھی اچھی طرح ثبوت مل گیا کہ جب بڑے جسم کے
پاس سیارہ جاتا ہے تو اس کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اور جب کوئی سیارہ اس کے قریب آتا ہے تو اس کی
کشش سے اس کا مدار ٹیڑھا ہوجاتا ہے۔ مشتری کے اندر کا حال معلوم نہیں ہوسکتا کیونکہ گھنے
بادل اس پر چھائے رہتے ہیں

۷۔ زحل Saturn

تمام نظام شمسی میں سب سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت۔ اسے دوربین سے دیکھو تو معلوم ہوگا
کہ اس کے گرد روشنی کا ایک حلقہ گھوم رہا ہے۔ حلقہ کے اندر اس قسم کی پٹی بھی نظر آتی ہے [illegible]
مشتری کے گرد بھی پٹی بھوری سفیدی مائل ہے۔ تعجب [illegible]
علم نہیں ہوسکا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ قطبین پر برف بھی ہے یا نہیں [illegible]
[illegible] کی موٹائی کا اندازہ ۵۰ میل سے ۱۰۰ میل تک ہے۔ [illegible]
[illegible] میں ۱۰ دھبے جھلکی ہیں۔ سورج کی روشنی [illegible]
[illegible] سے ۔۔ کرتے [illegible]
[illegible] کا اوسط فاصلہ سورج سے [illegible]
مقابلہ میں قطبین کا قطر تقریباً ۹ ہزار میل کم ہے [illegible]
[illegible] استوا [illegible] کا ایک سال ہے [illegible]

[illegible] رہتا ہوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آفتاب کے

اس میں بھی کچھ حرارت ہو. زمین کے مقابلہ میں جسامت بڑا ہے۔

۸۔ یورینیس Uranus

یہ نیا سیارہ ہے اس لئے عربوں میں اسکا کوئی نام نہیں ملتا۔ عرب چونکہ سات کے ہندسے کو مکمل جانتے تھے لہذا جو جزا عداد کے اعتبار سے مکمل ہو وہ سات ہی ہوتی تھی چنانچہ ہفت آسمان ہفت سیارے وغیرہ۔ اسے سب سے پہلے سر ولیم ہرشل نے ۱۷۸۱ء میں دریافت کیا۔ اتفاق سے دوربین میں یہ سیارہ نظر آیا۔ دوربین کا چشمہ بدلکر دیکھا تو یہ بڑا معلوم ہوا۔ کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ دوربین کی قوت گھٹانے بڑھانے سے صرف سیارہ کی جسامت میں ہی فرق معلوم ہوگا۔ ستارے میں فرق نہیں آتا کیونکہ اس کا فاصلہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اسی وقت ایک فرانسیسی فلکی نے بھی دیکھا۔ اس میں ذاتی حرارت معلوم ہوتی ہے۔ اس کا قطر ۳۱ ہزار میل کا ہے۔ ۸۴ سال کا سال ہوتا ہے ایک ارب ۸۰ کروڑ دس لاکھ میل اوسط فاصلہ سورج سے ہے۔ یہ دریافت نہیں ہوسکا کہ حرکت محوری کتنے دن میں ہوتی ہے۔ اس میں ۴ قمار ہیں مگر زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہوسکتی۔

۹۔ نیپچیون Neptune

اسکی دریافت بڑے دلچسپ طریقہ سے ہوئی۔ جب یورینیس معلوم ہوگیا تو یہ دیکھا گیا کہ اس کی چال بے قاعدہ ضرور تھی اس لئے خیال ہوا کہ کوئی بڑا جسم یورینیس کو اپنی طرف کھینچ کر اس کی چال خراب کر رہا ہے۔ جب یہ فرض کرلیا کہ کوئی جسم ہے اور اسکی کشش کو نکالدیا جائے تو وہ چال ٹھیک ہو جاتی ہے چنانچہ اس مفروضہ جگہ پر جب دیکھا تو سیارہ نظر آیا۔ اس کی دریافت محض ریاضی اور علم الحرکت کے صحیح اصول کے استعمال سے ہوئی ہے۔ اور یہ کیمبرج کے طالب علم آڈمز کی تنہا کوشش تھی۔ اس غریب نے اپنا نظریہ شاہی فلکی کو بھیجا مگر اس نے اسے ردی سمجھ کر ڈالدیا۔ یہی خیال ایک فرانسیسی فلکی کو ہوا اور اس نے اپنا نظریہ جرمنی اور فرانسیسی فلکیوں کے سامنے پیش کیا۔ وہ انگریز شاہی فلکی

کی طرح لاپرواہ نہ تھے انہوں نے اسے تلاش کیا اور آخر دریافت کیا اس کا سال ۱۶۴½ سال کے برابر ہوتا ہے اس کا فاصلہ [illegible] ۹ کروڑ دس لاکھ میل ہے قطر ۳۰ ہزار میل ہے۔ اس کا ایک قمر بھی ہے جو پونے چھ دن میں اس کے گرد گھوم جاتا ہے۔ اور ۱۱ لاکھ ۲۲ ہزار کے میل فاصلہ پر ہے۔ دن سے محوری گردش کا کا علم نہیں۔

۱۰۔ نیا سیارہ

جس طرح نیپچیون کی دریافت ہوئی تھی یہ معلوم ہوا کہ نیپچیون کی چال بھی برابر نہیں ہے چنانچہ امریکی فلکی لول Lowell نے پیشین گوئی کی تھی کہ دوسرا کوئی سیارہ ضرور ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۰ء میں امریکہ میں سب سے پہلے ایک لڑکے نے اسے دیکھا۔ اس کا فاصلہ چار ارب میل ہے۔ اس میں سردی اس قدر ہوگی کہ نائٹروجن تو منجمد ہوگی۔ آکسیجن بادل کی طرح ہوگی۔ اس کا سال تین سو سے چھ سو سال تک ہوگا۔ اسکا قطر چار ہزار میل کا ہے۔ مگر چونکہ ابھی نو وارد ہیں اس نے نہ اسکا نام ابھی تجویز ہوا ہے اور نہ انکے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے علم ہے۔

۱۱۔ دمدار ستارے

یہ کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔ بعض تو شاید اب دوبارہ نہ آئیں۔ یہ کئی ہیں اور ایک نہ ایک ہمیشہ فضا میں رہتا ہے مگر اسے صرف رصدگاہ میں ہی دیکھ سکتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ بغیر دوربین کی مدد کے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی جو دم ہوتی ہے وہ گیس کے ذرے ہیں جو آفتاب میں دور تک چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں بعض ان میں ایسے ہیں جو بڑی طویل مدت کے بعد آتے ہیں مثلاً ایک ستارہ ۱۸۳۵ء میں نظر آیا تھا۔ اور اب وہ ۱۹۱۰ء میں نظر آئیگا بعض دفعہ انکی دم میں سے زمین گزر جاتی ہے چنانچہ ۱۸ جون ۱۸۶۱ء کو گذری تھی۔ لیکن کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

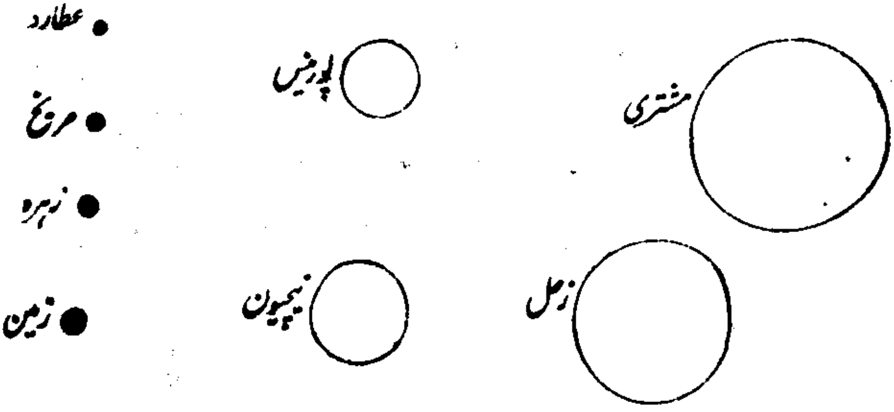
شہاب ثاقب

اکثر دس اور پندرہ اگست کے درمیان میں بکثرت ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آفتاب کے

گر بہت چھوٹے چھوٹے ذرے گردش کر رہے ہیں اور انکی رفتار دس سے چالیس میل فی سکنڈ ہوتی ہے کبھی یہ اس کے راستے میں آجاتے ہیں تو تیزی کی وجہ سے کرہ ہوا میں داخل ہوتے ہی مشتعل ہوجاتے ہیں اور جل کر فنا ہوجاتے ہیں بعض اوقات کوئی بھاری پتھر کی شکل میں گرتے بھی ہیں اور اکثر جلے ہوئے پتھر کی طرح سیاہ ہوتے ہیں۔ جب ایسا پتھر آتا ہے تو کرہ ہوا میں سے گزرنے کی آواز آتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ زیادہ تر تو راستہ میں جلکر راکھ ہوجاتے ہیں زمین جب برج اسد میں داخل ہوتی ہے جب بھی یہ اکثر زیادہ نظر آتے ہیں۔

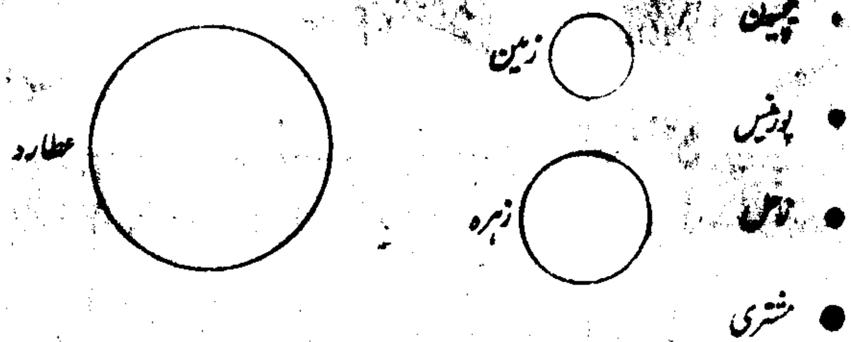
اگرچہ ہمارا مقصد اس قدر طویل مضمون کے لکھنے کا نہ تھا مگر تھوڑی معلومات کا بہم پہنچانا بھی لازمی ہے اور طوالت ہو ہی گئی۔ مگر یہ نقشہ زیادہ ضروری ہے۔ لہذا اس کے بعد ہم مضمون ختم کرتے ہیں۔

سیاروں کی نسبتی جسامت



ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۳

ہر سیارہ سے نسبتاً آفتاب اس قدر بڑا نظر آتا ہے ،



اس نقشہ سے یہ معلوم ہوگا کہ ایسے بعید سیارے جیسے نیپچون یا یورینس ہیں وہاں سے آفتاب صرف ایسا نظر آ سکتا ہے جیسا یہاں سے کوئی معمولی سیارہ۔

غزل گوئی اور نظریہ الہام

الہام کی اہمیت و اقسام | ارسطو کے نزدیک پر عظمت شاعری ہمیشہ الہام و القا کا نتیجہ ہوا کرتی ہے کوئی شعر جو بے خودی کی حالت میں نہ کہا گیا ہو جوش و انبساط، سوز و گداز اور درد و اثر سے خالی ہوتا ہے چنانچہ اس شہرہ آفاق یونانی حکیم کا قول ہے کہ "جلیل القدر شاعروں کا اثر آفریں کلام محض انکی قادر الکلامی اور فنی مہارت کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ الہام و القا کے ذریعہ سے معرض وجود میں آتا ہے۔ جس طرح ارباب نشاط پر رقص و سرود کے وقت مستی و بیخودی چھا جاتی ہے اسی طرح شعر گوئی کے وقت شاعر کے دل و دماغ پر کیف و سرور کا عالم طاری ہوتا ہے اسی حالت بیخودی کو وجد و الہام کی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بے کس (شراب و کباب کا دیوتا) کی ماہ رخ پریوں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ثبات ہوش و عقل جب کبھی وہ اپنا قدح دلنواز طلسمی نہریں ڈالتی تھیں تو انہیں صرف آب زلال میسر ہوتا تھا لیکن جس وقت وہ ساحری صفت ڈانی نوسیش کے جادو سے مسحور و بیخود ہو کر وہی قدح اسی نہر میں ڈالتی تھیں تو وہ مے و انگبیں سے لبریز ہو جاتا تھا۔ اسی طرح جب شاعر کے دل پر فیضان ربانی تجلی ریز ہوتی ہے تو اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس حالت بیخودی میں سروش سخن اسے چشمہ سرمدی تک رہبری کرتا ہے۔ جہاں سے وہ اپنا شیریں و دلپذیر نغمہ حاصل کرتا ہے۔ فی الحقیقت شاعر کی روح پر فتوح وہ طائر زریں پر ہے جو رنگ برنگ کے پھولوں پر بیٹھکر شہد جمع کرتی ہے شاعر کا کعبۂ دل جبتک مہبط الہام نہ بنے اور اس پر بیخودی طاری نہ ہو اس وقت تک وہ کوئی دلگداز نغمہ ایجاد نہیں کر سکتا"

انگلستان کے مشہور نقاد پروفیسر ایبر کرامبی نے بھی اس موضوع پر طول طویل بحث کرنے کے بعد الہام کا ایک نظریہ قائم کیا ہے جو انگریزی کے تمام اصناف پر حاوی ہے۔ یہاں ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ کسی علم یا فن کے متعلق کوئی نظریہ مستقل ہستی نہیں رکھتا۔ بلکہ عارضی و ہنگامی ہوتا ہے صرف واقعات معلومہ کی تشریح و توضیح کے لئے کوئی نظریہ قائم کیا جاتا ہے لیکن جب علم و فن کی ترقی نئے نئے

واقعات کا انکشاف کرتی ہے جو قدیم نظریہ کے حدود توڑ کر باہر نکل آتے ہیں تو ان کو گھیرنے کے لئے جدید نظریہ کا حصار تعمیر کیا جاتا ہے چونکہ انگریزی صنف غزل سے تہی دامن ہے۔ اس لئے ابرکرامبی کا پیش کردہ "نظریہ الہام" غزل پر منطبق نہیں ہوتا لیکن اس عدم انطباق کی وجہ سے غزل پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اگر پروفیسر موصوف غزل کی نوعیت و ماہیت سے واقف ہوتے تو وہ ضرور اپنے نظریہ میں مناسب اصلاح و ترمیم کرکے اسکو اس اہم صنف سخن پر حاوی کر دیتے لیکن بعض مغرب زدہ اشخاص نے پروفیسر ابرکرامبی کی علمیت و ژرف نگاری سے مرعوب ہوکر انکے نظریہ کو مستقل و غیر تغیر پذیر اصول سمجھ لیا ہے اور غزل کو اصول سے نامطابقت کے جرم میں الہامی شاعری کے دائرہ سے خارج کردینے کی کوشش کی ہے۔ انکا بیان ہے کہ "غزل مسلسل نظم نہیں ہے کیونکہ اس کے مختلف اشعار میں وحدت و ہم آہنگی کا اہم عنصر مفقود ہے۔ ابرکرامبی کے نظریہ کے مطابق پوری نظم کو ایک عضو بند پیکر ہونا چاہئے لیکن غزل بے تعلق و بے ربط ابیات کا مجموعہ ہوتی ہے اس کا ہر شعر ایک منفردہ خیال ظاہر کرتا ہے۔ مختلف اشعار کی حیثیت تسبیح کے الگ الگ دانوں کی سی ہے جن کا شیرازہ بند صرف ردیف و قافیہ کا کمزور رشتہ ہے۔ معنوی لحاظ سے ردیف و قافیہ کی کوئی قیمت نہیں۔ انکی پابندی کلام میں موسیقیت پیدا کرنیکے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتی جبتک کوئی نظم مسلسل نہ ہو اس پر الہام کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ شاعری کے الہام عناصر میں آہنگی کا پایا جانا لازمی امر ہے اور جبتک نظم کے اجزا میں بھی ویسی ہی ہم آہنگی نہ پائی جائے وہ حال الہام نہیں ہوسکتی لیکن غزل میں نہ تسلسل بیان پایا جاتا ہے نہ اس کے اجزا میں ہم آہنگی تو پھر اس کا شمار الہامی شاعری میں کیسے ہوسکتا ہے!"

اس اعتراض کی کمزوری ظاہر من الشمس ہے۔ ایک معمولی دل و دماغ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر الہام کے نظریہ کی قبا جسم غزل پر ٹھیک نہ آئے تو قبا کی کتر بیونت کرنی چاہئے نہ کہ جسم کی قطع برید۔ تاہم چونکہ شاعری میں الہام کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اردو کی کسی کتاب میں اس مسئلہ پر کافی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے اس لئے ہم اس نظریہ کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ واضح رہے کہ الہام کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ الہیات و دینیات کی اصطلاح میں الہام سے مراد

...دہ اسرار ہیں جو کسی مافوق البشری قوت کے تحت انبیاء و اولیاء کے روشن قلوب پر منکشف ہوتے ہیں عام طور پر شاعری اس علی الہام سے شرف یاب نہیں ہوتی لیکن انگلستان کے مشہور فلسفی ادیب کارلائل کی حقیقت بین نظر ایک ہی بطل کو کبھی نبی کی شکل میں اور کبھی شاعر کے روپ میں دیکھتی ہے اس کے نزدیک نبی اور شاعر کے فرائض قریب قریب یکساں ہیں قدرت کے چہرہ سے حجاب ظاہری کا اٹھانا اور ہستی کے مقدس اسرار کو دریافت کرنا دونوں کا کام ہے۔ جرمن شاعر گوئٹے اسرار عالم کو "رموز آشکارہ" کہتا ہے کیونکہ انکا ظاہری پہلو سب پر عیاں اور باطنی پہلو سب کی نظروں سے پوشیدہ ہے عرش سے فرش اور ماہ سے ماہی تک جتنی چیزیں ہم آغوش نظر ہوتی ہیں وہ سب اور خصوصًا نبی نوع انسان اسرار الٰہیہ کے مظہر ہیں تاہم حقائق اشیاء کا علم ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اسرار و معارف کی بزم تجلی میں صرف نبی اور شاعر کو باریابی نصیب ہوتی ہے دونوں محفل کائنات کے رازہائے سربستہ سے خود ہی کشف اندوز نہیں ہوتے بلکہ عامہ خلائق کو بھی حقیقت شناسی کی دعوت دیتے ہیں دونوں حسن ازل کے حریم ناز میں داخل ہوتے ہیں اور خلقت کو وہاں کی جلوہ آرائیوں کا تماشہ دیکھنے کے لئے بلاتے ہیں۔ الغرض دونوں ایک ہی پیغام لیکر اس تیرہ خاکدان کی سیر کو آتے ہیں نبی اور شاعر میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف نکتہ نگاہ کا اختلاف ہے۔ نبی یا پیغمبر کے پیش نظر اسرار عالم کا اخلاقی پہلو ہوتا ہے۔ اور شاعر کائنات کے جمالیاتی پہلو پر نگاہ ڈالتا ہے۔ نبی ہمیں حق و صداقت کی طرف مائل کرتا ہے و شاعر حسن و جمال کی جانب۔ ایک ہمارے اعمال و افعال کی اصلاح کرتا ہے دوسرا ہمارے جذبۂ الفت و محبت کو ابھارتا ہے۔ ایک ہمیں بری راہ ترک اور نیکی کا راستہ اختیار کرنیکی ہدایت کرتا ہے۔ دوسرا ہمیں معائب و قبائح سے نفرت دلاتا ہے اور مکارم و محاسن سے روشناس کراتا ہے۔ الغرض ایک نیکی کا دلدادہ ہے اور دوسرا حسن کا شیدائی لیکن یہ محض ظاہری فرق ہے۔ فی الحقیقت دونوں کے فرائض و...عمل ملے ہوئے ہیں حسن و نیکی لازم و ملزوم ہیں بلکہ گوئٹے کے نزدیک حسن کو نیکی پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ حسن میں نیکی شامل ہے علاوہ بریں شاعر جب ہمارے قلب کو گرمی محبت سے ذوق آشنا کرتا ہے تو وہ سیرت ساز کہلانے کا بھی مستحق ہے۔ اسی طرح نبی ہمارے عادات و خصائل کی اصلاح کر کے

شعر میں ہمیں باہمی الفت ومحبت کا سبق بھی دیتا ہے اور کبھی شاعر کے مانند وہ بھی ہماری توجہ حسن قدرت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسٰی کا قول ہے کہ "تم ذرا کھیتوں میں سوسن کی بہار تو دیکھو نہ وہ محنت مشقت کرتی ہے اور نہ سوت کاتتی ہے لیکن کیا سلیماں جیسے جلیل القدر بادشاہ کو بھی ایسا شاندار لباس میسر ہوا تھا!" الحاصل نبی اور شاعر ہم مرتبہ ہیں دونوں انسان کو تاریکی سے روشنی کی طرف بلاتے ہیں۔

شاعری کے متعلق یہ ہے کارلائل کا اعلٰی تخیل۔ اگر کسی عظیم المرتبت شاعر کو فیضان ربانی کی تجلی ریزیوں نے نبی کا ہم دوش بنا دیا ہو تو اس کا سینہ نور عرفاں کا گنجینہ اور اس کا قلب مہبط الہام بن سکتا ہے لیکن جس طرح نبی کا ظہور صدیوں کے بعد ہوا کرتا ہے اسی طرح ایسے بلند مرتبہ شاعر شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا عام شاعری کو اس عالی الہام سے جو نبی اور پیغمبروں کا حصہ ہے بہت کم تعلق ہے۔ اگر الہام سے مافوق البشری عنصر کو خارج کر دیا جائے تو اس کی دو قسمیں قرار دیجا سکتی ہیں ایک کو "اضطراری الہام" اور دوسرے کو "اختیاری الہام" کہتے ہیں۔ غزل میں دونوں قسم کے الہام پائے جاتے ہیں۔

اضطراری الہام بعض وقت شاعر کے دل پر ایک قسم کی بیخودی طاری ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے ماحول سے بے خبر ہوکر دوسرے ہی عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کے دماغ کے کل پرزے غیر معمولی طور پر تیز ہوجاتے ہیں۔ اسکا پائے فکر کنگرۂ عرش پر جا بیٹھتا ہے اور طائر تخیل نسر طائر کا ہم پرواز بن جاتا ہے طبیعت میں غضب کی روانی پیدا ہوجاتی ہے۔ افق دماغ پر اچھوتے مضامین غیب سے نمودار ہوتے ہیں اور بغیر کد و کاوش کے صید معانی خود بخود آکر اسیر دام ہونے لگتے ہیں ؎

کیوں وہ صیاد کی صید پر توسن ڈالے
خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

لیکن یہ مبارک گھڑی بار بار نہیں آتی۔ یہ فیضان ربی ہے جو حسن اتفاق سے کبھی کبھی تجلی ریز ہوجاتی ہے [illegible] اختیار وارادہ کو اس میں مطلق دخل نہیں ہے اس لئے اس کو "اضطراری الہام" [illegible] ہمارے قدیم شعرا صرف اسی کلام کو الہامی خیال کرتے تھے جو بغیر تلاش وتفحص کے خود بخود

بتائید غیبی شاعر کے دماغ میں صورت پذیر ہوتے تھے اور جن میں غیر معمولی طور پر اثر اور تڑپ پائی جاتی تھی۔ وہ اگر کارلائل کی طرح شاعری کو پیغمبری کا ہم رتبہ نہیں تو کم سے کم اسکا جزو ضرور خیال کرتے تھے چنانچہ فارسی مقولہ "شاعری جزویست از پیغمبری" اس پر شاہد ہے قدما کے نزدیک الہام کبھی ارادی و اختیاری نہیں ہو سکتا تھا۔ الہام کے لئے تائید غیبی کی شرط تھی لہذا وہ مغربی نقادان فن کے پیش کردہ اختیاری الہام کے نظریہ سے گوش آشنا نہ تھے۔ غزل کے اکثر اشعار جو تیر و نشتر کا حکم رکھتے ہیں اضطراری الہام کا نتیجہ ہیں بعض اشعار جو ہماری نظروں میں سادہ اور معمولی معلوم ہوتے ہیں بلاغت شناس شاعروں سے الہامی ہونیکی سند حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ مرزا غالب کی نسبت مشہور ہے کہ وہ مومن کے اس شعر پر

تم ہوتے ہو روبرو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سر دھنتے تھے اور اسے الہامی کہا کرتے تھے۔ اسی طرح ذوق کا یہ شعر بھی کہ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

خدائے سخن غالب کے دارالافتا سے الہام کا فتویٰ حاصل کر چکا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ نواب امداد امام صاحب اثر اور راجہ صاحب محمود آباد کو عظیم آباد کے جواں مرگ شاعر ضیاء کا یہ مطلع بیحد پسند ہے

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھکر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

دونوں حضرات اسے بار بار دہراتے ہیں۔ ان پر والہانہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس شعر کو الہام کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ مولانا حالی کے بیان کے مطابق آرزو۔ شیفتہ۔ مومن وغیرہ میر کے اس شعر کو کہ

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

قل ہو اللہ کی طرح الہامی خیال کرتے تھے۔ سب نے مل کر اسکا جواب لکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ بہر حال یہ اشعار اوسط درجے کے ہیں۔ ان کو کسی نے بے نظیر و بے مثال نہیں مانا ہے

بلکہ غزلیات کے [illegible] میں بے شمار جواہر پارے ان سے کہیں زیادہ تاباں و درخشاں موجود ہیں جب جوہریان سخن نے الہام کی کسوٹی پر اس گران سکوں کو کھرایا ہے تو جوان گنت اشعار قیمت و اہمیت اور دلپذیری و تاثیر میں آن سے بڑھ کر ہیں انکے الہامی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ڈاکٹر بجنوری کے حسن عقیدت نے تو پیمبر سخن غالب کے پورے منتخبہ دیوان ہی کو مقدس ویدوں کے مقابل میں الہامی قرار دیا ہے۔ الغرض ہماری شاعری کی ایک صنف سخن غزل ہی میں الہامی شاعری کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اگر دوسرے اصناف سخن اس میں شامل کر دیئے جائیں تو کسی مغربی زبان کی شاعری اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

"اضطراری الہام" کی کئی صورتیں ہیں بعض وقت شاعر کے دل پر حالت خواب یا عالم رویا میں کسی انوکھی بات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور کبھی حالت بیداری میں الہام ہوا کرتا ہے۔ الہام کا عمل صرف مضمون یا خیال ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ طرز ادا۔ اسلوب بیان۔ انتخاب الفاظ وغیرہ بھی اس کے دائرہ اثر میں داخل ہیں۔ کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعر کے دل میں کوئی لطیف خیال یا پاکیزہ جذبہ موجود ہے لیکن باوجود غور و فکر اور تلاش و تفحص کے اُسکے اظہار کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ لیکن دوسرے وقت جب وہ کسی کاروباری کام میں لگا رہتا ہے اور فکر شعر کی جانب اسکی مطلق توجہ نہیں ہوتی کہ یکایک اُس کے دماغ میں بہترین الفاظ منکشف ہو جاتے ہیں جن کی اُسے تلاش تھی۔ یہ تمام امور اضطراری الہام سے تعلق رکھتے ہیں۔ عین موقع پر کسی معجز نما مضمون یا خیال یا الفاظ یا بندش و ترکیب کی سوجھ یا فی البدیہہ و برجستہ اشعار کی تکوین بھی اسی قماش کی چیز ہے۔ لیکن اس قسم کا الہام صرف شاعری کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے علوم و فنون میں بھی اسکی کار فرمائی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر کیکیول نے ایک بار خواب میں جوہر فرد کا رقص دیکھ کر ایک ایسا مفید اور وسیع نظریہ قائم کیا جس نے کیمیائی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا اور کیکیول کے نام کو بقائے دوام بخشا۔ اسی طرح ایک مشہور ریاضی داں مسٹر پائنکار کا بیان ہے کہ ایک روز میں کئی گھنٹے تک ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرتے کرتے تھک گیا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ کئی روز کے بعد مجھے سفر در پیش

ہوا۔ منزل پر پہنچ کر میں ریل سے اترا اور اسٹیشن سے باہر جا کر گاڑی میں قدم رکھنے لگا تو یکایک اس پیچیدہ مسئلہ کا نہایت تشفی بخش حل سوجھ گیا حالانکہ اس وقت میں بالکل خالی الذہن تھا اور سفر کی دلچسپیوں نے اس مسئلہ کا خیال ہی دل سے بھلا دیا تھا۔ ہر شخص کی زندگی میں اکثر و بیشتر اس قسم کے واقعات کبھی نہ کبھی پیش آتے ہیں۔ انکی نفسیاتی تشریح مشکل ہے تاہم یہ مسلمہ امر ہے کہ یہاں انسان ارادے اور اختیار کو مطلق دخل نہیں ہے۔

اختیاری الہام پروفیسر ارکرامبی نے "اختیاری الہام" کے مسئلہ پر بڑی شد و مد کے ساتھ بحث کی ہے۔ سادہ الفاظ میں الہام سے مراد شاعر کا وہ ذہنی تجربہ ہے جسے وہ نظم کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ الہام کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک کو "مادۂ الہام" اور دوسرے کو "روح الہام" کہتے ہیں۔ اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کس نفسیاتی عمل کے تحت الہام کی تکوین و ترقی ہوتی ہے۔ ابتداً شاعر کے دماغ میں کوئی شے قائم ہوتی ہے خواہ وہ کسی منظر۔ واقعہ۔ قصہ یا فلسفیانہ مسئلہ کی طرح خارجی ہو یا خیال۔ جذبہ۔ گزشتہ تجربہ کی یاد یا تخیل کی نئی پیداوار کی طرح داخلی ہو۔ اسی شے کو "مادہ الہام" کہا جاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی بیج ہے جو شاعر کے دماغ میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اور یہیں سے شاعری کا عمل شروع ہوتا ہے شاعر کبھی کسی خارجی منظر یا واقعہ سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے کبھی ارادہ کر کے فکر شعر کے لئے بیٹھتا ہے اور غور کرنے پر کوئی خیال یا جذبہ نمودار ہوتا ہے اور کبھی وہ فرمائشی یا مقررہ عنوان پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ ان صورتوں میں وہی منظر یا واقعہ۔ خیال یا جذبہ۔ مقررہ عنوان یا طرحی مصرع جو شعر گوئی کا محرک ہوا ہے بیج یا "مادہ الہام" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ ابتدائی مادہ یا بیج شاعر کے نزدیک کوئی خاص معنی یا اہمیت ضرور رکھتا ہے ورنہ اس کی جلب توجہ کا موجب نہیں بن سکتا۔ شروع شروع اس کا ادراک نہایت سادہ ہوتا ہے۔ شاعر کی تخیل اسے اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ اور اسے دھندلا ہو کر غائب ہو جانے سے روکتی ہے۔ ابتدائی مادہ کی حیثیت کچی دھات کی سی ہے جس طرح کوئی دھات بھٹی میں گرمی اور چمک حاصل کر لیتی ہے اسی طرح ابتدائی مادہ بھی شاعر کے ذہن و دماغ میں نور و حرارت حاصل کرتا ہے جسے ہم "روح الہام" کہتے ہیں۔ ہر ذی حیات ہستی پیدائش کے وقت کمزور جسم اور ناتواں روح رکھتی ہے لیکن بمرور زمانہ جسم کی بالیدگی کے

ساتھ روح میں بھی قوت آئی جاتی ہے اور بالآخر جسم و روح دونوں پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ اسی طرح ابتداءً الہام کا مادہ سادہ اور معمولی ہوتا ہے اور اس میں اثر کم ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ مادہ ترقی کر کے شاندار اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وقت اسکی اہمیت، قیمت اور تاثیر بھی بڑھ جاتی ہے۔ فی الحقیقت اہمیت و تاثیر کی ترقی "روح الہام" کی ترقی ہے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ "مادہ" اور "روح" کی ترقی کیسے عمل میں آتی ہے۔ ابتدائی مادہ یا ہیجان میں شاعر کے لئے دلچسپی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور موجود رہتا ہے اسی لئے وہ اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔ شاعر جتنا زیادہ اس طرف رجوع کرتا ہے اتنا ہی اس کی دلکشی و دلفریبی بڑھتی جاتی ہے۔ جب شاعر کی پوری توجہ اس جانب منعطف ہو جاتی ہے۔ تو اس کی طبیعت میں ایک ارتعاشی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو آگے چل کر ہیجان و تلاطم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ شاعر کے دماغ میں مختلف خیالات، افکار، جذبات، احساسات، تعبیرات، تلمیحات و تلازمات کا ہجوم ہونے لگتا ہے گزشتہ تجربات و مشاہدات کی یاد اور تخیل کی نئی پیداوار بھی اس میں آکر شامل ہو جاتی ہے۔ یہ تمام عناصر باہم مربوط و مخلوط ہو کر ایک عظیم الشان ہیئت اختیار کر لیتے ہیں جس کے ارتسام نقش تاثر کے آگے ابتدائی ہیجان کا ادراک و اثر بالکل بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔

لیکن عمل نفسی کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ شاعر کسی نہ کسی صورت میں اپنے ذہنی تجربہ کا اظہار کرتا ہے ذہنی تجربہ ارتقار کے کئی مدارج طے کرنے کے بعد پائے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ پہلا زینہ "ہیجان" کا ہے اور دوسرا زینہ "الہام" کا۔ لیکن ابھی ایک اور زینہ باقی ہے جو اصطلاحاً "تصور" کہلاتا ہے۔ الہام کی تکوین کے بعد بھی اس کی حیثیت محض بے ترتیب و غیر منظم مجموعہ یا تودہ کی سی ہوتی ہے۔ جبتک الہام منظم و معین شکل اختیار نہ کرے اور تصور کا زینہ طے نہ ہو اس وقت تک وہ ناقص، ناتمام اور ادھورا سمجھا جائیگا۔ اس لئے تکوین الہام کے بعد بھی شاعر کا ذہن سرگرم عمل رہتا ہے۔ وہ الہام کی مناسب عضو بندی اور تنظیم و تشکیل میں مشغول رہکر اس کے مختلف اجزا و عناصر میں توازن و توافق، ترتیب و ترکیب اور وحدت و ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اور اس وقت تک آسودہ نہیں ہوتا جبتک وہ الہام کو

ایک جامع واضح اور مستقل و معین ذہنی تجربہ میں منتقل ہو کر ہے۔ الغرض شاعر کے تخیل کی کارفرمائیوں سے الہام واضح۔ روشن اور مضبوط بند بکر اختیار کر کے اپنے خاص معنی و اہمیت اور اثر آفرینی و اشتعال انگیزی کی قوت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی مرکزی معنی و اہمیت تمام تلازمات۔ تلمیحات۔ توابعات اور لحقات کا نقطہ ماسکہ ہوتی ہے اور یہی اصل "روح الہام" ہے۔ اور جن عناصر سے الہام ترکیب پاتا ہے وہ "مادہ الہام" ہیں جس طرح کسی نامیاتی و ذی حیات ہستی کے تمام اعضاء و جوارح مرکزی قوت ارادی کے حکم بردار ہوتے ہیں اسی طرح عناصر الہام کے انفرادی معنی و مفہوم "روح الہام" کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ بہر کیف جس عمل نفسیاتی کے تحت الہام ایک مستقل و ہم آہنگ ذہنی تجربہ کی شکل اختیار کرتا ہے اسے اصطلاحاً "تصویر" کہتے ہیں اور اس عمل نتیجہ "صورت" کہلاتا ہے۔ اسی صورت پذیری پر الہام کی تکمیل منحصر ہے۔

اگرچہ اضطراری الہام میں اختیاری الہام سے زیادہ تائید غیبی کا عنصر پایا جاتا ہے تاہم آخرالذکر کا درجہ بھی بہت بلند ہے۔ اس الہام کے دوران میں بھی شاعر پر ایسی محویت و استغراق کا عالم طاری ہوتا ہے کہ اسے اپنے ماحول اور گردوپیش کے واقعات کی مطلق خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنے تخیل کی پیدا کردہ مثالی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ "آب حیات" کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک بار رفاقائے ہند حضرت ذوق ملک الشعرا میر تقی میر کی ملاقات کو گئے۔ میر صاحب پر عجیب والہانہ کیفیت طاری تھی۔ وہ اپنا ایک مصرع دہرا رہے تھے کہ ؎

اب کے بھی دن گزر گئے یونہی بہار کے

اور دوسرے مصرعے کی فکر میں اس قدر محو تھے کہ ان کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ کون آیا کون گیا۔ حضرت ذوق نے سلام کیا۔ تھوڑی دیر بیٹھے۔ پھر اٹھ کر چلے گئے لیکن میر صاحب کی بیخودی کی حالت ویسی ہی قایم رہی۔

واضح رہے کہ الہام صرف شاعر کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک ناشاعر بھی حامل الہام بن سکتا ہے غروب آفتاب یا سہانی چاندنی۔ یا آبشار یا دامن کوہ یا سبزہ زار کے قدرتی دلکش مناظر اسے بھی محو حیرت

بنا سکتے ہیں۔ کوئی پر درد واقعہ اس کے دل میں بھی سوز گداز اور تڑپ پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی نشاط انگیز جذبہ اسے بھی مست و بے خود بنا سکتا ہے۔ لیکن وہ شاعر نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اپنی حیرت و استعجاب سوز و تپش اور جوش و ولولہ کو دلکش اور لطیف پیرائے میں ظاہر نہ کرے۔ اگر کوئی شخص اپنے قلبی واردات اور دلی جذبات کو ایسے موثر الفاظ میں ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے کہ سننے والے کے دل میں بھی وہی جذبات پیدا ہو جائیں جو اس کے دل میں موجزن ہیں تو وہ شخص کہلانے کا مستحق ہے غرض کہ الہام کی حد تک شاعر و ناشاعر دونوں مساوی المرتبہ ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو کیفیت کا نہیں بلکہ صرف کمیت کا کیونکہ شاعر کا دل عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ ذکی الحس ہوتا ہے۔ مگر الہام کی سرحد پار ہونے پر شاعری کے اختصاصی حدود شروع ہوتے ہیں جہاں کوئی عامی شخص قدم نہیں رکھ سکتا۔ شاعری کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ شاعر کے دماغ میں "تہیج"، "الہام" اور "تصور" کے زینے طے کرنے کے بعد تکمیل پذیر ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ پہلے حصہ کا ظاہری مرئی عکس ہے اور شاعری کی فنی خصوصیات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی انتخاب الفاظ بندش و ترکیب اور تکمیل نظم وغیرہ کے مختلف زینے ہیں۔ یہاں شاعر کو تمام عروضی و نحوی قواعد۔ علم معانی و بیان کے اصول اور فصاحت و بلاغت کے ضابطوں کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ جب شاعر اپنے الہام یا ذہنی تجربہ کو دلکش و موثر الفاظ میں ظاہر کر دیتا ہے تو نظم وجود پذیر ہوتی ہے۔ گویا نظم شاعر کے باطنی تصور کی ظاہری شبیہ ہے جس طرح ہر الہام کی خاص صورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر نظم کی خاص شکل ہوتی ہے الہام کی "صورت" اور نظم کی "شکل" میں جتنی زیادہ مشابہت و مطابقت ہوگی اسی قدر شاعر کی فنکاری اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

غزل میں الہام کی ترجمانی الہام اور اس کے مختلف مراحل و مدارج کے پرشکوہ اصطلاحی ناموں سے مرعوب ہو کر بعض لوگ دھوکا کھاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عظیم الشان الہام کا بار امانت صرف بھاری بھرکم نظمیں ہی اٹھا سکتی ہیں۔ ابر کرآبی کے نزدیک الہام کی امتیازی خصوصیت "وحدت و ہم آہنگی" (Unity and Harmony) ہے جس کی نمائندگی صرف مسلسل نظم کے مختلف اجزا کے باہمی اتحاد و ارتباط سے ہو سکتی ہے۔ غزل میں مسلسل گوئی کا عنصر کمیاب ہے۔ بالعموم اس کا ہر شعر دوسر

[illegible] ہوتا ہے اور اسکی ہر بیت خیال منفردہ کی حامل ہے۔ لہٰذا غزل الہامی عنصر سے ہی آراستہ ہوتی ہے اور صنف سخن الہام کا نتیجہ نہ ہو اسکا شمار ریت شاعری میں ہوگا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ تصوف کے اصطلاحات الہام سے بھی زیادہ شاندار، پرشکوہ اور مرعوب کن ہوتے ہیں۔ راہ سلوک و طریقت سے بیشمار مدارج قائم کئے گئے ہیں تقرب ملا، اعلیٰ یا نورعرفان کا اکتساب مختلف مراحل و منازل کے طے کرنے پر موقوف ہے جس کے لئے مدت مدید درکار ہے۔ لیکن امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے "کیمیائے سعادت" میں بیان کیا ہے کہ راہ سلوک کی تمام ادگھٹ گھاٹیاں اور دشوار گزار منزلیں بعض اوقات صرف چند لمحوں میں طے ہو جاتی ہیں۔ اسکی توضیح کے لئے انہوں نے ساحرانِ فرعون کی مثال پیش کی ہے جب عصائے موسیٰ کی سحر سوز ربانی قوت نے ساحروں کے طلسم باطل کا قلع قمع کر دیا تو وہ اسرائیلی خدائے قدوس کے آگے سربسجود ہو گئے۔ انکے لولو مثال عرق انفعال کی چمک نے انہیں قعر ضلالت کی تاریکی سے باہر نکالا یکایک انکے ظلمت آشنا سینہ میں فیضان ربی تجلی ریز ہوا۔ اور آن کی آن میں انکا مطلع قلب ایمان وایقان کے نور سے معمور ہو گیا۔ یہی حال شاعرانہ الہام کا ہے۔ غزل گو شاعر اپنی معجز بیانیوں کی بدولت الہام و افکار کے سارے مراحل بات کی بات میں طے کر لیتا ہے۔ خود پروفیسر ابرکراہی کا قول ہے کہ "طویل ڈرامائی۔ واقعاتی یا بیانیہ نظموں کا الہامی تصور لگاتار پیہم غور و فکر کا متقاضی ہے کیونکہ انکے اجزاء کی ترتیب و تنظیم دشوار کام ہے۔ لہٰذا یہ الہامی تصور بتدریج تکمیل پاتا ہے۔ برخلاف اس کے مختصر نظموں کا الہام ایک ہی لحظہ میں بغیر کسی ارادی و شعوری کوشش کے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے"۔ اسی پیرایے میں غزل کا تصور کر لینا چاہئے۔ اگرچہ عام طور پر غزل کے اشعار ایک دوسرے سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں تاہم ہر شعر ایک مستقل مضمون اور مخصوص الہام کا حامل ہوتا ہے۔ بعض چیزیں دیکھنے کو چھوٹی ہوتی ہیں لیکن انکی قدر و قیمت بھاری بھرکم چیزوں سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے چنانچہ شیرازی حکیم کا قول ہے کہ "ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر"۔ جس لم یزلی ہستی کی وسعت کو ارض و سما نہیں پاسکتے وہ قلب انسانی کے نہاں خانہ میں بہ آسانی سما سکتی ہے۔ غزل کا ایک شعر بادی النظر میں چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن بسا اوقات بڑی بڑی نظمیں اسکی گیرائی کی حریف نہیں بن سکتیں۔ طویل سے طویل مسلسل نظم ایک ہی الہام کی

ترجمانی کرتی ہے لیکن غزل کے مختلف اشعار مختلف الہاموں کے حامل ہوتے ہیں۔
اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ طویل مسلسل نظموں اور غزل کے اشعار کے الہامات کی نوعیت وماہیت میں کیا فرق ہے۔ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ ہر الہام بہ حیثیت مجموعی خاص قدر، قیمت اور اثر واہمیت رکھتا ہے جسے "روح الہام" کہتے ہیں۔ اور تمام تلازمات، تلمیحات، اشارات وملحقات جسے ایک لفظ "مواد الہام" سے نامزد کیا جاتا ہے اسی "روح" کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ نظم چونکہ الہام کا عکس ہے اس لئے اس میں ان تمام امور کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ چنانچہ مجموعی طور پر نظم بھی اپنے مختلف اجزا کے انفرادی معنی ومطلب کے علاوہ ایک خاص مرکزی معنی ومفہوم بھی رکھتی ہے۔ اور نظم کے تمام تفصیلات وجزیات کی غرض وغایت اسی مرکزی معنی ومقصد کی توضیح وتشریح ہے۔ فی الحقیقت نظم کے مرکزی معنی سے "روح الہام" کی اور اس کے تفصیلات وجزیات سے تلازمات واتیلافات الہام کی ترجمانی ہوتی ہے لیکن مختصر نظم مثلاً فرد، ثلاثی ورباعی میں یا غزل کے ایک شعر میں تمام تلازمات وملحقات کے اظہار کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے مختصر گو شاعر صرف "روح الہام" کو لے لیتا ہے اور اس سے مختصر وجامع الفاظ میں ایسے دلپذیر انداز سے بیان کردیتا ہے کہ اسکا ایجاز دراصل اعجاز بن جاتا ہے۔ عام طور پر غزل گو شاعر صرف "روح الہام" کی ترجمانی کرتا ہے لیکن بعض وقت شاعر سامری فن اپنی محیر العقول سحر کاریوں سے دریا کو کوزے میں بھی بند کردیتا ہے۔ شعر کا ایک ایک لفظ اپنے اندر گنجینہ معنی پوشیدہ رکھتا ہے جس کی تشریح کے لئے صفحے کے صفحے درکار ہوتے ہیں۔ بعض شعر ایسے ہوتے ہیں کہ انکی تشریح وتوضیح میں بسیط مضمون بلکہ مستقل کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ جامعاتی امتحانات کے پرچوں میں بسا اوقات مضمون نویسی کے لئے غزل کا کوئی شعر یا مصرع دیدیا جاتا ہے۔ علامہ جلال الدین نوری مرحوم نے غالب کے ایک شعر

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

کی تشریح تقریباً دو سو سطروں میں کی ہے۔ غرض کہ جو مطلب دس بارہ صفحوں کی طویل نظم میں بیان

کیا جا سکتا ہے اس کو استاد سخن غالب نے ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف طویل مسلسل نظمیں ہی حامل الہام نہیں ہوا کرتیں بلکہ ماہرین فن بڑے سے بڑے الہام کو نہایت کامیابی کے ساتھ صرف ایک شعر میں ظاہر کر سکتے ہیں۔

الہام اور حسن کاری | حسن کاری میں فنون لطیفہ کی تمام خوبیاں شامل ہیں۔ اور شاعری جملہ فنون لطیفہ کی سرتاج ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے عروس سخن کی آرایش و زیبایش کے لئے لفظی مینا کاریوں اور طرح طرح کے صنایعوں کے زیور تیار کئے ہیں اور گلدستہ غزل کو چمنستان فصاحت و بلاغت کے رنگ برنگ پھولوں سے سجایا ہے لیکن بعض لوگ حسن کاری کو الہام کا مخالف سمجھتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ الہام آورد نہیں بلکہ آمد ہے " برجستہ شعر فیضان الہی ہے اور فکر کیا ہوا شعر صنعت بشری ہے۔ زیادہ تدقیق کرنے سے شعر بگڑ جاتا ہے اور بندش میں گنجلک آجاتی ہے۔ الہام اور جوش طبع سے برجستگی پیدا ہوتی ہے۔ اور فکر و آورد سے تاقید "۔ آمد میں تخیل کے دباؤ اور دماغی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ غزل میں چونکہ کثیر معنی کو قلیل الفاظ میں ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے شاعر کو تلاش و انتخاب الفاظ اور حسن بندش و ترکیب کے لئے سخت جگر کاوی و عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ غالب جیسے استاد فن کو بھی حسن کاریوں کی خاطر خون جگر پینا پڑا۔ کلام میں فنی خوبیاں پیدا کرنے کے لئے ان کو جو کاوش و کاہش کرنی پڑی تھی۔ اسکا اظہار انہوں نے اس شعر میں کیا ہے ؎

بینم از گداز دل در جگر آتش چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

اس سے معترضین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ غزل کے اکثر و بیشتر اشعار جن میں بڑی صناعی و فن کاری صرف کی گئی ہے فطری و الہامی نہیں بلکہ فکر و آورد کا نتیجہ ہیں۔

یہ اعتراض الہام کی نوعیت و ماہیت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ فی الحقیقت حسن کاری الہام کو مستلزم ہے۔ الہام جتنا قوی و شاندار ہوگا اس کے اظہار کے لئے اتنی ہی زیادہ فن کاری درکار ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر شاعر کے دماغ میں جس قدر اعلیٰ وارفع خیالات ہونگے اسی قدر ان کی ترجمانی کے

لیے پُرعظمت وشاندار وسائل اختیار کرنیکی ضرورت لاحق ہوگی۔ آب کوثر کے لئے مٹی کا کوزہ اور جواہرات کے لئے ٹاٹ کا بٹوہ کتنی ناموزوں چیزیں ہیں۔ اعلیٰ الہام لطیف خیال پاکیزہ جذبہ کو بھس پھسے الفاظ میں ظاہر کرنا ایسا ہے جیسے حسن کو بدہیئتی کے آغوش میں دھکیلنا ہے۔ الہام جب سراپا نور ہے تو اس کے اظہار کا آلہ بھی نورانی ہونا چاہیئے اکثر نقادانِ فن توحسن بیان اور جدت ادائی کو شاعری کا اعلیٰ جوہر خیال کرتے ہیں کیونکہ الہامی کیفیت شاعر و ناشاعر دونوں پر طاری ہوسکتی ہے۔ اور لطیف خیالات وجذبات دونوں کے دل میں پیدا ہوسکتے ہیں لیکن بہترین نہج پر انکا اظہار صرف شاعر کا شیوہ ہے۔ ابن رشیدنے بھی معنی سے زیادہ لفظ ہی پر زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "لفظ کی خوبی میں معنی سے زیادہ اہتمام چاہیے۔ قدروقیمت کے لحاظ سے لفظ کا درجہ معنی سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ معنی خلقی طور پر سب کے ذہن میں موجود ہیں۔ اس میں جاہل اور ماہر دونوں برابر ہیں لیکن لفظ کی تازگی زبان کے حسن اسلوب اور بندش کی خوبی ادیب کا کمال ہے" واضح رہے کہ شاعر بھی اپنے الہام یا ذہنی تجربہ کو بغیر کسی تغیرو تبدل کے جوں کا توں اپنے مجلئہ دماغ سے نکال کر دوسروں کے دماغ میں منتقل نہیں کرسکتا بلکہ الفاظ وزبان کا واسطہ اختیار کرتا ہے۔ الفاظ کیا ہیں؟ خیالات وافکار جذبات واحساسات کے محض علامات ہیں۔ علامتی ذریعہ اظہار اصل ذہنی تجربہ کا ہوبہو عکس نہیں ہوسکتا۔ البتہ دونوں میں قریبی مطابقت پائی جاسکتی ہے۔ شعر کو الہام کے عین مطابق بنانے کے لئے شاعر مناسب الفاظ کی تلاش اور حسن بندش پر پورا زور طبع صرف کردیتا ہے۔ لفظی مینا کاری بچوں کا کھیل نہیں۔ ایک ایک لفظ کو جلا دینے اور چمکانے میں شاعر کو بسا اوقات "دو چراغ کا تریاکی" بننا پڑتا ہے؎

برائے پاکیٔ لفظے شب بروز آرد　　　　کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

الہام کی تکمیل کے بعد شاعر کی صناعی و فن کاری کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ الہام پر اپنی پوری توجہ مبذول کرتا ہے۔ اس کی تحلیل وتجزیہ کے بعد ایک جز لیتا ہے۔ غور کرتا ہے اور اُس کے اظہار کے لئے مناسب وموزوں الفاظ ڈھونڈھتا ہے۔ الہام کے مختلف اجزاء وعناصر میں جو ربط وتعلق ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ مختلف الفاظ میں بھی ربط وتعلق قائم کرتا ہے جس طرح الہام کے تمام اجزاء باہم متحد

ہوکر ایک عضویہ پیکر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ شعر کے مختلف اجزا کو باہم مربوط کر کے ایک مکمل جسم تیار کرتا ہے۔ بلا آخر شعر وا لہام کا مکمل آئینہ بن جاتا ہے طویل مسلسل نظم میں پورے الہام کو ظاہر کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ جتنا دو ہی مصرعوں میں تمام الہامی مضمون کو ادا کرنا بغیر انتہائی کدوکاوش کے یہ کٹھن منزل کیسے طے ہوسکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعر کو قدم قدم پر صناعی وحسن کاری سے کام لینے کی ضرورت ہو۔ غزل کے اشعار سب سے زیادہ استادی کمال کے متقاضی ہیں۔

آمد و آورد ادبی دنیا میں آمد و آورد کے الفاظ نہایت فریب دہ ہیں۔ ناواقفوں نے آمد کا مفہوم یہ سمجھ لیا ہے کہ ادھر شاعر نے ہاتھ میں قلم پکڑا اور سرچشمۂ غیب سے مضمون اور معنی کا سیلاب اس کے دماغ میں ٹھاٹھیں مارنے لگا اور وہاں سے صفحات قرطاس پر پھیل گیا۔ یہ محض طفلانہ خیال ہے۔ اگر کوئی شاعر بغیر کدوکاوش کے شعر پر شعر کہے جائے تو اسکی حیثیت قافیہ پیمائی اور تک بندی سے بڑھکر نہ ہوگی۔ ایسے کلام کا شمار ادب العالیہ میں نہیں ہوسکتا اور نہ وہ زندہ رہنے کی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات جبکہ شاعر کی طبیعت جوش پر ہو دو چار اعلیٰ درجے کے برجستہ شعر نکل آئیں لیکن انکی حقیقت دریا میں قطرہ کے سی ہو۔ بالعموم اسی کلام کو زندگی جاوید حاصل ہوتی ہے جو کسی بڑے شاعر کی جگر کاوی کا نتیجہ ہو۔ اساتذہ سخن کی بھی تمام ادبی پیداواروں کو یکساں قبول عام کی سند حاصل نہیں ہوتی۔ انکا وہی شجر کلام سرسبز وشاداب ہوکر بارآور ہوتا ہے جسے انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ شیکسپیر کو ہیملٹ (جہاں گیر)، اتھیلو (جعفر) اور "وینس کے سوداگر" کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ کیمڈی آف ایرس (بھول بھلیاں)، مڈسمر نائٹ ڈریم (جام الفت) اور ونٹرس ٹیل (مرید شک) کو میسر نہیں۔ اسپینسر کے "پرتھیلمین" کو جو اعلیٰ رتبہ ملا وہ "ملکہ پری" کے دوسرے قصوں کو نصیب نہیں ہو۔ شیلی کی نظم "صبائے مغرب" کی فرحت بخشی "بغاوت اسلام" کی اندوہناکی کی ضد ہے۔ براؤننگ کی نظم رنگ اینڈ دی بک میں جو اثر و دلکشی موجود ہے اس سے "سارڈیلو" کے صفحات خالی ہیں کولرج کے "قدیم ملاح" سے ہر شخص مصافحہ گیر ہوتا ہے لیکن اس مذہبی خیالات کی خشکی سب کو بیزار کر دیتی ہے۔ جانسن کا "تذکرہ شعرا" بیسیوں بار زیور طبع سے مزین ہوا۔ لیکن "ریسلاس" کا

نام صرف کتابوں کی فہرست میں پایا جاتا ہے۔

میر کی غزلوں میں بہتر نشتر پوشیدہ ہیں لیکن اعجز نامہ، شکار نامہ، ساقی نامہ غیرہ صرف انکی ہنرگی کی یادگاریں ہیں۔ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان نے سب کے دلوں کو مسحور کر لیا لیکن ان کی غزلوں کا جادو کسی پر نہ چل سکا۔ سودا کے قصائد کی ایک عالم میں دھوم ہے لیکن ان کی چوبیس مثنویاں ہجو یا ہزل کی پست سطح سے کبھی نہ ابھریں۔ میر انیس آسمان مرثیہ پر آفتاب بنکے چمکے لیکن انکی غزلوں میں ستاروں کی سی مشابہت بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ اسی سے وہ ناپید بھی ہوگئیں داغ جبتک رامپور میں رہے بڑے بڑے شاعروں سے معرکہ رہا۔ مقابلہ و مسابقت کے جوش میں زمین شعر پر خون جگر سے لالہ کاریاں کیں۔ داغہائے دل کی بہاریں دکھائیں اور نہایت سرسبز و شاداب "گلزار" تیار کیا۔ حیدرآباد آئے تو یہاں کی امیرانہ زندگی نے انہیں عیش پرست و سہل انگار بنا دیا۔ چنانچہ اس دور میں انھوں نے کئی چمن لگائے لیکن کوئی بھی "گلزار" کی شادابی کو نہ پہنچ سکا۔ شوق معنی آفرینی کی برکانی حدت نے غالب کے دل و جگر کو سیل آتش بنا دیا تھا۔ اس لئے انکے ہر شعر میں بجلی کی سی گرمی۔ تیزی۔ چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ امیر مینائی کا شعر ہے ؎

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

وہ اپنی قادرالکلامی اور فنی مہارت کی مدد سے ضخیم دواین تیار کرتے ہیں لیکن رنگ پھیکا رہتا ہے کیونکہ ان میں خون جگر کی آمیزش نہیں ہے۔ گوہر انتخاب اور جوہر انتخاب میں وہ میر اور درد کا رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔ کام کٹھن ہے۔ ایک ایک مصرعہ کی تیاری میں انکے بدن کا سیروں لہو خشک ہوتا ہے اس لئے ہر دو انتخابات میں اکثر موتی کی لڑیاں نظر آتی ہیں۔

الغرض ہر شاعر کا وہی کلام زندہ رہتا ہے جو کد و کاوش کے بعد سرانجام پائے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی خیال شاعر کے دل و دماغ میں فوراً پیدا ہو لیکن موثر و دلپذیر پیرائے میں اسکا اظہار و شاعرانہ شاعری میں "آمد" کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ محض ایک دل خوش کن لفظ ہے۔

بڑے سے بڑا شاعر بھی کوئی ایسا عظیم الشان کارنامہ پیش نہیں کر سکتا جس کی تکمیل کے لیے اس نے خون پانی ایک نہ کیا ہو۔ جب شاعر اپنا جگر خون کرتا ہے تو لعل اگلتا ہے چنانچہ تمام شعراء کی جانب سے آتش فرماتے ہیں ؎

رہا کرتی ہے فکر شعر گوئی
کیا کرتے ہیں ہم خون جگر خرچ

ہر ذہنی پیداوار خواہ وہ ادبی ہو یا علمی نثری ہو یا نظمی بڑی عرق ریزی و جگر سوزی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا میں کون ایسا صاحب کمال ہوگا جس نے شہرت و مقبولیت کی قربانگاہ پر خواب و آرام کی بھینٹ نہ چڑھائی ہو۔ ہر بڑا ادیب الفاظ کے انتخاب بندش کی چستی۔ جملوں کی ترکیب اور کلام کی صفائی پر اپنا پورا زور طبع صرف کرتا ہے۔ بار بار نظر ڈالتا ہے۔ کئی مرتبہ رد و بدل کرتا ہے۔ تب کہیں جا کر اسکا کلام حسن صورت سے دوچار ہوتا ہے۔ چنانچہ یکسٹن فورمین کے مطبع نے جون کیٹس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مسودہ نظم شائع کیا تھا جس میں ایک ایک لفظ کو تین تین چار چار بار کاٹکر صحیح کیا گیا تھا شیلی کے متعلق ٹریلانی لکھتا ہے کہ میں نے اس سے ناشپاتی کے باغ میں ملاقات کی وہ ستار پر کوئی نظم لکھ رہا تھا۔ وہاں ایک کاغذ کا پرزہ میرے ہاتھ لگا میں بڑی مشکلوں سے صرف دو سطریں پڑھ سکا۔ اس میں عجیب طور سے کانٹ چھانٹ کی گئی تھی۔ کوئی لفظ مٹا دیا گیا تھا کسی کو کاٹکر اس کے اوپر یا نیچے دوسرا لفظ لکھدیا گیا تھا۔ کہیں سطر کی سطر بدلدی گئی تھی۔ الغرض معلوم ہوتا تھا کہ جنگلی بطخوں کے رہنے کی گھنی جھاڑی کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔" لارڈ میکالے کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی فصیح و بلیغ عبارتیں بڑی محنت و جانفشانی سے لکھا کرتا تھا۔ کسی نشست میں اسکا اشعب قلم ایک صفحہ سے زیادہ رقبہ پر اپنی جولانی نہیں دکھاتا تھا۔ وہ بھی ایک ایک لفظ کو کئی کئی بار بدلتا تھا۔ افلاطون کے مشہور "جمہوریت" میں سے دو صفحوں کا مسودہ کسی کے ہاتھ لگا تھا۔ اس میں بھی کئی جملوں پر قطع و برید کا عمل کیا گیا تھا۔ اسٹیونسن کی عبارتیں بہت سیدھی سادھی ہوا کرتی ہیں۔ لیکن وہ خود بیان کرتا ہے کہ یہ سادگی کئی بار کی چھیل چھال و اصلاح کا نتیجہ ہے۔ ٹینیسن کے سامنے کسی شخص نے اسکا ایک سادہ شعر پڑھ کر کہا کہ یہ بالکل الہامی کلام معلوم ہوتا ہے۔ اس پر

آپ [illegible] نی نہیں پڑی ہوگی۔ شاعر نے جواب دیا کہ "آپ کا فرمانا بجا لیکن اس پر مجھے دو گھنٹے صرف کرنے پڑے تھے" شکسپیر کی نسبت مشہور ہے کہ ایک بار کوئی چیز لکھ دینے کے بعد وہ اس میں رد و بدل نہیں کرتا تھا۔ پروفیسر ٹکر کا قول ہے کہ "اگر شکسپیر اپنی سطریں کاغذ پر نہیں مٹاتا تھا تو کیا ہوا وہ صفحۂ دماغ پر بیسیوں مرتبہ مٹانے اور تبدیل کرنے کے بعد اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا تھا" لیکن جانسن کہتا ہے کہ "یہ حک و اصلاح سے محروم رہنے ہی کا نتیجہ ہے کہ شکسپیر کا کلام نحوی و عروضی اقسام سے لبریز ہے۔ ایسی غلطیاں عہد وکٹوریہ کے معمولی شاعروں سے بھی سرزد نہیں ہوتی تھیں۔ شکسپیر کی تعریف کی جاتی ہے کہ وہ ایک سطر بھی نہیں مٹاتا تھا۔ کاش وہ ہزار بار مٹاتا تو زیادہ مستحق ستائش ہوتا۔ زباندانی اور شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے شکسپیر کا مطالعہ بیکار ہے۔ البتہ جوش عمل۔ صحت واقعات، صداقت معنوی اور فطرت انسانی کی مصوری نے اس کے ادبی کارناموں پر بقائے دوام کی مہر ثبت کر دی ہے۔

اردو زبان کے اکثر و بیشتر شاعر اپنے کلام پر بار بار نظر ڈالنے اور کاٹ چھانٹ کرنے کے عادی تو تھے ہی لیکن جب تک استاد کی اصلاح نہ ہو جاتی وہ اپنا کوئی شعر دیوان میں داخل نہیں کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے ذوق کا جو دیوان مرتب کیا ہے اس میں جن غزلوں یا قصیدوں کے اشعار پست ہیں۔ انکی نسبت لکھدیا ہے کہ "نظر ثانی سے نور نہیں پایا"، کیونکہ وہ اس کے قائل تھے کہ تکرار سے کلام چمک اٹھتا ہے۔ واضح رہے کہ صرف شاعرانہ کلام ہی کو حک و اصلاح کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ نثری پیداوار بھی ترمیم و تبدل کی محتاج ہے۔ خود مولانا آزاد کی زندہ جاوید کتاب "آب حیات" کے چند صفحوں کا جو مسودہ دستیاب ہوا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کو بڑی جگر سوزی و محنت سے لکھا ہے۔ بعض بعض جملوں کو سات سات آٹھ آٹھ بار تبدیل کیا ہے تب کہیں جا کر اس میں وہ رنگینی و دلاویزی پیدا ہوئی ہے جو ہر شخص سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہتی۔ مولانا سلیمان ندوی علامہ شبلی کے متعلق فرماتے ہیں کہ "وہ اپنی تصنیف [illegible] کی حک و اصلاح تکرار نظر اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے"۔ ان تمام

مثالوں سے ظاہر ہے کہ کسی استاد فن کا کلام محض آمد نہیں ہے بلکہ آورد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ غزل کے بعض اشعار ایسے آسان اور سادہ ہوتے ہیں کہ ان پر فکر و کاوش صرف ہونیکا سان و گمان بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ میر تقی میر کے کلام میں ایسے سادے اشعار کی کثرت ہے لیکن فی الحقیقت وہ سہل ممتنع ہیں۔ شاعر کو ان پر پوری فن کاری صرف کرنی پڑی ہے۔ خود میر صاحب کا قول ہے ؎

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے

درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

سیدھے سادے الفاظ میں درد و غم جمع کر کے شعر کو نوک نشتر بنا دینا جو سننے والے کے دل میں چبھے اور وہاں بھی ویسا ہی درد و غم پیدا کر دے۔ آسان کام نہیں بلکہ انتہائی کمال ہے پروفیسر نگر کا قول ہے کہ "فن کاری کو فن کاری سے چھپا دینا سب سے بڑی فن کاری ہے۔" شاعر بڑی فکر تلاش سے اپنے لطیف خیالات کے اظہار کے لئے سیدھے سادے الفاظ منتخب کرتا ہے۔ اگر وہ مقررہ رسمی تشبیہ و استعارے سے کام لے تو خیال آسانی سے ادا ہو جائیگا۔ لیکن وہ روزمرہ کی عام بول چال میں اعلیٰ و ارفع خیال کو ادا کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو یہ عظیم الشان فتح مندی ہوگی۔ کلام کی سادگی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاعر کو اس میں ذہنی کاوش مطلق نہیں کرنی پڑی ہوگی۔ حالانکہ اس نے پوری طاقت صرف کر کے اپنی ذہنی کاوشوں پر پردہ ڈالدیا ہے۔ یہ کمال شاعری کی دلیل ہے۔ الغرض جو شعر بظاہر بالکل سادہ اور آمد معلوم ہوتا ہے وہ بھی آورد ہی کا نتیجہ ہے۔

اب دیکھنا چاہئے ادب و شاعری میں آمد و آورد کا کیا مطلب ہے اور ہر ایک کی کیا اہمیت ہے۔ بے ساختگی کے ساتھ دماغ سے اول دہلے میں جو خیالات اور قلم سے جو الفاظ نکلیں انہی پر "آمد" کا اطلاق ہوتا ہے۔ ترقی و ارتقاع کے عالمگیر اصول سے ادبی پیداوار مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی ہر شے ابتداً خام و ناقص ہوتی ہے۔ اور ارتقائی مدارج طے کرنیکے بعد پائے تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اول اول جو کلام شاعر کے دماغ سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوتا ہے اور جسے ہم آمد کہتے ہیں یقیناً ناتمام اور

جلا کا محتاج رہتا ہے۔ اس لئے ماہر فن مکرر غور و خوض کے بعد اس میں مناسب رد و بدل کاٹ چھانٹ اور حک و اصلاح کرتا ہے۔ اس پیہم عمل سے کلام میں صفائی۔ لطافت۔ پاکیزگی۔ چکساہٹ روانی پیدا ہوتی ہے۔ یوں تو ہر فنی پیداوار کو تراشنے۔ جلا دینے اور برقانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن شاعری تمام فنون لطیفہ کی سرتاج ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ ترین صناعی و حسن کاری کی متقاضی ہے۔ چنانچہ آتش کا شعر ہے ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعری کے متعلق حکیبست کا قول ہے۔ "جو خیال دل میں پیدا ہو اسکو موزوں الفاظ میں ادا کر دینا ہی شاعری نہیں ہے بلکہ شاعری کا اصول یہ ہے کہ جو مضمون باندھا جائے وہ محض ایک حالت کا اشارہ ہے جسے انگریزی میں "سجیشن" (Suggestion) کہتے ہیں اور ترکیب الفاظ ایسی ہونی چاہئے کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گزر جائیں"

کوئی خیال جن الفاظ میں اظہار کا تقاضا کرتا ہے انہی کو جمع کر دینا آمد ہے۔ لیکن شاعری کی تکمیل کے لئے شعر میں اثر آفرینی اور اشارتی قوت پیدا کرنیکی ضرورت ہے۔ اسی غرض سے الفاظ میں رد و بدل اور حک و اصلاح کیجاتی ہے۔ بہرکیف صناعیوں اور حسن کاریوں کے بعد شعر جو آخری صورت اختیار کرتا ہے۔ وہی آورد ہے۔ آمد کچی دھات ہے اور "آورد پختہ فولاد "آمد" شاعر کی دماغی بھٹی میں بار بار تپنے اور نور و حرارت حاصل کرنیکے بعد آورد بنتی ہے۔ یا یوں سمجھو کہ "آمد" بے ترشا ہوا ہیرا ہے۔ اور "آورد" اس ترشے ہوئے ہیرے کے مانند ہے جو بہ اصطلاح جگا کان مختلف پہلوؤں سے پھوٹ دیتا ہے۔ شعر سادہ ہو یا مرصع ہر حال میں اعلیٰ حسن کاری کا نمونہ ہوتا ہے اور حسن کاری کا تعلق آورد سے ہے نہ کہ آمد سے۔ شعر کی تکمیل کے لئے آورد لازمی شے ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عظیم الشان الہام کا آلہ اظہار یعنی زبان و الفاظ طرز ادا اور اسلوب بیان بھی شاندار

بھونے پاتیں۔ یہ تمام خوبیاں آورد سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے الہام کی صحیح ترجمانی میں آورد کو بہت بڑا دخل ہے۔ لفظی مینا کاری و مرصع سازی تو تمام تر آورد ہی کی کارفرمائی پر منحصر ہے۔ علاوہ بریں لفظی مرصع کاری حسن کاری کا لازمہ ہے۔ یہ بحث ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ الہام، حسن کاری اور آورد ان تینوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو لوگ آورد اور حسن کاری کو الہام کا منافی خیال کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ خود آمد اور آورد ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں بلکہ آورد آمد ہی کی ایک صورت مرتفیہ ہے۔

شریعت نامہ

یہ ایک دکھنی مثنوی عادل شاہی عہد میں لکھی گئی ہے اس کا مصنف شاہ ملک ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

بلوم ہارٹ نمبر (۳) ورق (۴۸) سائز ۸ ½ × ۵ ½ سطر ۹ خط نسخ

مصنف کیٹلاگ کی وضاحت کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"ایک مختصر مذہبی نظم دکھنی زبان میں مصنف شاہ ملک، اشعار کے نیچے سرخی سے دکھنی میں نوٹ بھی لکھے ہیں آخر پر مصنف نے اپنے نام اور تاریخ ۱۰۸۸ھ کا ذکر کیا ہے"

یہ نہ صرف مزید وضاحت کی محتاج ہے بلکہ صحت طلب بھی ہے جیسا کہ مندرجہ صدر نوٹ سے واضح ہے۔ بلوم ہارٹ نے مصنف کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی اسی طرح دیگر یورپین مورخ مثلاً اسپرنگر۔ اسٹوارٹ وغیرہ نے کوئی صراحت نہیں کی ہے کیونکہ ان کی فہرست میں یہ کتاب شامل نہیں ہے۔ البتہ شمالی ہند کے قدیم تذکرہ نویسین نے ایک دکھنی شاعر ملک کا ذکر کیا ہے چنانچہ میر تقی میر اور میر حسن نے ایک دکھنی شاعر ملک کا ذکر کر کے حسب ذیل شعر اس سے منسوب کیا ہے۔

تن من فدا کروں اس ہشیار ساقی پر ۔ ایک قطرے میں چکھیا کر جن بے خبر کیا ہے

لالہ لچھمی نراین شفیق نے بھی ملک کا ذکر کیا ہے اور کسی قدر تغیر کے ساتھ یہی شعر پیش کیا ہے غرضکہ کسی تذکرے سے ان کے حالات نہیں ملتے اور نہ کسی تاریخ میں کوئی حوالہ ملتا ہے بدقسمتی سے ان کی تصنیف بھی کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔ مصنف اردوئے قدیم نے ان کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:۔

"شاہ ملک بیجاپور کے باشندے اور علی عادل شاہ کے معاصر ہیں انہوں نے ایک رسالہ احکام الصلوٰۃ کے نام سے نظم دکھنی میں لکھا ہے اور اس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کئے گئے ہیں یہ رسالہ فارسی کا ترجمہ ہے اور ۱۰۸۸ھ میں تمام ہوا ہے" (ص ۵۵)

رسالہ احکام الصلوٰۃ اسی شریعت نامہ کا نام ہے کیونکہ جو شعر درج کئے گئے ہیں وہ شریعت نامہ ہی کے ہیں۔ مگر اس میں صرف نماز کے احکام درج نہیں ہیں بلکہ اس کو فقہ حنفی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ سرورق پر "رسالہ در فقہ در زبان ہندی دکنی تصنیف شاہ ملک" درج ہے۔

رسالہ تجلی کے ایک مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے اس کا خلاصہ بھی قابل غور ہے:۔

"شاہ ملک کی یہ مثنوی مذہبی اور متفرق مضامین کی نظم ہونے کے اعتبار سے یقیناً قابل قدر ہے۔ مولف "دکن میں اردو" نے مولانا عبداللہ کی بھی ایک کتاب احکام الصلوٰۃ کا ذکر کیا ہے جو ۱۰۲۳ھ میں لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ شاہ ملک کے شریعت نامہ میں اسی احکام الصلوٰۃ کے مضامین کو نظم کیا گیا ہو"

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔ مولانا عبداللہ کی احکام الصلوٰۃ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔

مثنوی میں اول حمد ہے اس کے بعد "بیان شریعت" کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نعت ہے۔ اسی میں منقبت آگئی ہے۔ اس کے بعد اصل مضمون شروع ہو جاتا ہے جو مختلف عنوانات کے تحت درج ہے دیگر دکنی مثنویوں کی طرح بادشاہ کی مدح یا خود اپنے حالات وغیرہ کچھ بھی نظم نہیں کئے گئے ہیں۔ عنوانات بھی اردو میں لکھے گئے ہیں بعض کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

(۱) ایمان کے احکام (۲) ایمان کے شرط (۳) ایمان کے واجبات (۴) شریعت کے فرض (۵) شریعت کے واجبات (۶) شریعت کی سنت (۷) شریعت کے حکم (۸) وضو کے فرض (۹) وضو کی سنت (۱۰) وضو کے مستحب (۱۱) وضو کے توڑنے والے (۱۲) غسل کے واجبات۔ غرض اس طرح مسح حیض۔ نماز۔ رکوع سجدہ وغیرہ کے متعلق تیئیس عنوان قائم کئے گئے ہیں۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ارکان ایمان کی تقسیم:۔

یو ارکا ایمان کے دو ا ہیں	ولی مین ایمان سو یو ا ہیں
جو اقرار اول زباں سوں کرے	بھی تصدیق دل میں سو یو کر دھرے

خدا ایک دوجا شریک سنے اسے
ہے بیش اس سکے صفت سنے کسے

احکام فرض کی صراحت :-

دو کر بولیا ہوں جو دا فسر ض
سو احکام وار کان سکے ہیں فرض
اول آپ کون پاک رکھنا مدام
جنب ہور حدث تے دیا احتلام
ہے دسرا فرض پاک کپڑے سدا
جو پہنے تونگر اچھے یا گدا
اچھی پاک جاگا سو تسرا فرض
کہتا ہوں مصلے کون یو سب فرض
بھی چوتھا فرض وقت کون بوج سب
فجر ظہر ہور عصر مغرب و شب

ایمان کی شرط :-

بھی سب طاعتاں ہیں سو ایمان پر
جو ہوتیاں ہیں ثابت مسلمان پر
حقیقت یو ایمان کا ہے سو کیا
دیا دین کیا ہے سو اسلام کیا
و کیا مسلمانی ہے سو توں بول
اسی جاب تے یوں کہتا ہوں سگول
خدا کے سو فرمان کون کر قبول
بھی کرنا ہو بولے سو خدا کے رسول
مفصل ہے ایمان اسکو توں سبک
بھی مجمل ہے ایمان تو دل میں ایک

خاتمہ مثنوی :-

سو یو شین الف ہے و میم لام کاف
شا ملک
فرض کول سو دکھنی میں بولیا ہوں صاف
سن یکہزار ہور ستر پو سات
کیا ہوں اسی سال میں یو حکایات
لڑی تھی نمو یو بعیان زیادہ میں چار
توں کوشش ستے دل بہا کو کر یادگار

اس سے سنہ تصنیف ۱۰۸۵ھ اور تعداد اشعار (۲۰۵) بھی واضح ہوتے ہیں۔

مرتب کیٹلاگ بلوم ہارٹ نے بیان کیا ہے اشعار کے درمیان سرخی سے نوٹ بھی ہیں۔ یہ دراصل ان اشعار کی دکھنی نثر میں شرح ہے جو نظم کے بہتر سال بعد ہوا ہے۔ افسوس اس کے مولف کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

" ایمان واجب ہونے کے دو شرط ہیں۔ اول عاقل ہونا دیوانے پر سنے (نہیں) ہے۔ دوسرا بالغ ہونا نا بالغ پر واجب نے ہے۔ تمام عبادت جیسا نماز ہور روزہ وغیرہ واجب ہونے کا شرط سو ایمان ہے۔ اگر مسلمان نے ہوا تو کچ عبادت اس پر واجب نے ہے۔ اگر کوئی پوچھے گا کہ ایمان کیا ہے ہور اسلام کیا ہے ہور مسلمان کسے کہتے ہیں اسے یوں جواب دے کہ خدا کے حکم کون قبول کرنے بولتے ہیں ہور ایمان ہور اسلام لفظ کے متبار فرق ہے ہور معنی میں یکساں ہیں۔ ہور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بولے سو کر تا کہ انوں خدائے تعالے کے حکم سو سچ بولے ہیں ایمان دو جنس پر ہے ایک مفصل دسرا مجمل ہے "

آخر کتاب پر حسب ذیل عبارت درج ہے :-

" یو رسالہ تیا یا اس کا ناؤں شاہ ملک ہے ہور ہجری سن یو رسالہ بناتے وقت ایک ہزار ہور ستر پر سات برس تھا اسی بنا کر ستر پر دو برس ہوے "

یہ مثنوی اور اسکی شرح کوئی ضخیم کتاب نہیں، چھوٹا سا رسالہ ہے مگر ان سے اسکا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے زمانہ قدیم میں مذہب سے کہاں تک محبت کیجاتی تھی اور مذہبی خدمت کو کس خلوص دل سے کیا جاتا تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے اس کے ایک صدی پہلے کی اسی قسم کی نثر سے اس کا مقابلہ کیا جائے تاکہ زبان کی تدریجی صفائی معلوم ہو سکے۔ یہ کتاب احکام الصلوٰۃ مصنف مولانا عبداللہ ہے جس کی تصنیف ۱۰۲۲ھ میں ہوئی ہے اس کا ذکر اور عبارت کا نمونہ ہم نے اپنی تالیف " دکن میں اردو " میں دیا ہے۔

احکام الصلوٰۃ مولف مولانا عبد اللہ
در ۱۰۳۲ھ

ایمان کے حکمان کا معرفت ہور نماز احکام
ہور ارکان پچھاننا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب
کون اس کی پچھان تے چھٹکارا ہے ہور آخرت
میں خدا کے عذابون گرفتار نا ہوے گا اگر تجھے
پوچھیں کہ ایمان کیا ہے بول تون ایمان اقرار کرنا ہے
زبان کے یمن۔ ہور استوار کرنا ہے دل میں خدائے
تعالیٰ یک ہی مقر اس یک خدا خارج دسرا نہیں ہے

شرح شریعت نامہ در ۱۱۵۰ھ

اگر کوئی پوچھے گا کہ ایمان کیا ہے ہور
مسلمانی کسے کہتے ہیں اسے یو جواب دے کہ خدا کے
حکم کون قبول کرنے کون بولتے ہیں ہور ایمان ہور
اسلام لفظ کے اعتبار فرق ہے معنی میں یکساں ہیں
ہور پیغمبر صلعم بولے سو کرنا کہ انو خدا تعالیٰ کے حکم سوں
بولے ہیں۔ ایمان دو قسم پر ہے ایک مفصل دوسرا
مجمل۔ مجمل اسے کہتے ہیں کہ ایمان لیا یا خدا سوں
ہور او جو کچ کہ چھپا ہے ہور ایمان لیا یا خدا کے
رسول سون۔

اس مقابلے سے بعض اصحاب کے اس خیال کی جو ان دونوں کو ایک تصور کرتے ہیں تنقیص بھی ہوتی ہے۔ ایک صدی کی نثر میں کوئی زیادہ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے نظم کے مقابل نثر میں کوئی ترقی نہیں ہوتی تھی۔

ہندوستانی بچے

ہمارے سست مزاج، مدہوش ملک میں باتیں زیادہ تر اپنے آپ ہی ہوا کرتی ہیں۔ شاذ و نادر ہی انکی بہمائی میں ہمارا ہاتھ ہوتا ہے۔ زندگی اسی طرح گزر رہی ہے جس طرح اس کہن سال دنیا کے پیدا ہونے کے بعد سے گزرتی آئی ہے۔ ہم اس بے فکر گاڑی بان کی طرح زندگی کی منزلیں گزار رہے ہیں جو بیلوں کو راہ پر لگا کر اطمینان سے گاڑی میں سو جاتا ہے۔ نہ سڑک پر پیش آنے والی افتادوں سے تعلق رکھتا ہے نہ بیلوں کے بہکنے کی پرواہ کرتا ہے، نہ اُن خطروں سے مطلب رکھتا ہے جو اسکی وجہ سے آمد و رفت میں پیدا ہوتے ہیں، کبھی کبھی نیند سے چونکتا بھی ہے تو بیلوں کو غلط راستے پر دیکھکر ایک جمائی لیتا ہے، اور جبراً قہراً لگام کھینچکر ایک دفعہ انکو سیدھی راہ پر لگانے کی کوشش کرتا ہے، پھر گویا کہ اتنا بھی اس کے تھکانے کو کافی تھا، پڑ کر سو رہتا ہے۔ کوئی بات ہم میں ایسی نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ ہم بھی کوئی آرزو اور تڑپ رکھتے ہیں۔ اگرچہ میں ان لوگوں کو قرار واقعی ستائش، ہمدردی اور محبت کا مستحق سمجھتا ہوں جو ہندوستان کی جنگ آزادی کو اس غیر متوقع پامردی اور استقلال سے لڑ رہے ہیں تاہم یہ ممکن نہیں ہے کہ اس زبردست تناقص کو نظر انداز کر دوں جو ہماری سیاسی آرزوؤں اور سماجی زندگی میں موجود ہے۔

میں جانتا ہوں، اور انسانی فطرت کا ہر مطالعہ کرنیوالا ضرور جانتا ہے کہ آج جو عزم صمیم اور عظیم الشان ولولۂ عمل ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہو گیا ہے، اور انہیں بے دھڑک اپنی حیثیت سے بڑھکر مشکلات کا سامنا کرنے پر آمادہ کر رہا ہے وہ سیاسی جدوجہد کے ختم ہونے کے بعد معاشرتی اصلاح کی طرف ہو جائیگا۔ پس مناسب ہوگا کہ میں چند معاشرتی مسائل اپنے نوجوانوں کے سامنے پیش کروں۔ بچوں اور تعلیم کا مسئلہ اس وقت میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کا مستحق ہے۔

یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے کہ ہندوستان میں بچے بالعموم والدین کی ازدواجی زندگی کا مقصود اصلی نہیں ہوتے۔ بہت کم لوگ ہیں جن کے دل میں شروع سے اچھی اولاد حاصل کرنیکا خیال ہوتا ہے۔

بچہ پیدا ہوتا ہے، جہالت، وہم پرستی، بیماری اور مضر صحت احول کے قوی اور مہلک اثرات کا مقابلہ کر کے بچا رہتا ہے، اگر والدین میں ہمت و استطاعت ہوئی تو مدرسہ جانے کے قابل ہونے پر اس میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

مدرسے بچوں کے لئے کشش سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ تنگ و تاریک میلے کچیلے اور دماغ کو پراگندہ کر دینے والے مقامات ہوتے ہیں جہاں استاد زور ظلم اور رعونت کا مجسمہ بنے بیٹھے رہتے ہیں ان لوگوں میں سے بیشتر وہاں اس لئے ملازم ہوتے ہیں کہ جہالت اور نالائقی کے سبب کوئی دوسرا پیشہ نہیں اختیار کر سکتے اسکول میں سستے بھاڑے کام کر سکتے ہیں۔ بچوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے ان میں نہ تو اتنی عقل ہوتی ہے کہ طفلانہ دماغوں کے ردعمل، رجحانات اور مطالبات کو سمجھ سکیں، نہ اتنی وسعت نظر کہ اپنی نگاہوں میں آنے والے ننھے ننھے بچوں کو ملک کا ہونے والا شہری تصور کر سکیں۔ فی الواقع یہ بات تعجب کی ہے کہ اتنے بچے مدرسوں میں جانا گوارا کر لیتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ گھر انکی نگاہوں میں اور بھی کم کشش رکھتا ہے کیا آپ نے کسی ننھے بچے کی مصیبت کا تماشہ دیکھا ہے جب ننھی ننھی آنکھوں میں آنسو تک خشک رہتے ہیں اور وہ اپنی جان لئے فرش پر چپ چاپ اس زبردست دیوے سہا ہوا بیٹھا رہتا ہے، جو ذرا سے چلبلے پن پر کہ تقاضائے طفولیت ہے غریب کی تمبیہ ... یا کم از کم گالیوں سے خبر لینے کیلئے خاص طور سے مقرر کیا جاتا ہے۔

... تنہا مصیبت سے قطع نظر کر کے دیکھئے کہ یہ مدارس سکھاتے کیا ہیں۔ تعلیم کی بابت ... ہیں انکا ماخذ وہ خیالات ہیں جو لندن میں آج سے ستر برس پہلے رائج تھے، جبکہ بیکار ... اور مردہ زبانوں کی رسمی تعلیم ذہنی تربیت کی تنہا سند سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے امام تو مدتگاہ سے بھی آگے نکل گئے اور ہم اسی نیند کے ماتے گاڑی بان کی طرح اپنی سست رفتار گاڑی کو تن بتقدیر ... بیٹھے ہیں۔ کوئی عملی دلچسپی ہم نہیں لیتے اور ہمیشہ متوقع رہتے ہیں کہ نیند میں کروٹ بھی بدلیں تو حکومت ... ہمارا سارا کاروبار افیونیوں کا سا ... نظم تعمیر کرنے والوں نے ... حکومت کہنے اور پولیس والے ...

طریقہ — سوچنا، تعمیری اغراض کے لئے، بہلے طریقے سے آزادی کے ساتھ سوچنا۔
جب ہم تعلیم پر گفتگو کرتے ہیں تو جان اسٹورٹ مِل، ڈاکٹر اڈمسن اور پروفیسر پرسی نن کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرتے ہیں۔ اپنے مسائل پر اپنے دماغ سے نہیں غور کرتے۔ ہم میں اعلیٰ ذہانت کے لوگ موجود ہیں، لیکن اغیار کے خوشہ چیں ہیں۔ ہم کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ کوئی انگریز جب تعلیم کی بات کچھ کہتا ہے تو انگلستان کے بچوں، انگلستان کے ماحول، اور انگلستان کے خانگی و معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھ کر کہتا ہے، اور ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ نیز اس کے مقدمات و نتائج کا اطلاق صرف انگلستان کے بچوں پر ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے بچوں کے لئے وہ کارآمد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انکے حالات پیدائش، ماحول خانگی و معاشرتی اثرات، اور مذہبی و اخلاقی عقائد انگلستان کے بچوں سے بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔
گزشتہ سو سال کے اندر کسی سے اس لئے بھی ہندوستان کے بچوں کی ٹھیک ٹھیک ذہنی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش بن نہ آئی کہ لندن کے دقیانوسی طرز تعلیم ہی میں اپنی ضروریات کے مطابق تبدیلی کرنے کی صورتیں نکالی جائیں۔

آج کل لندن میں ہر اس بچے کو جو ترقی پا کر ثانوی جماعت میں داخل ہوتا ہے، پیشوں کے ایک نفسیاتی امتحان سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ اس کی مخصوص صلاحیتوں کو معلوم کرکے اس کی زندگی کا لائحہ عمل تجویز کیا جائے۔ اس کے بعد وہ ایسی تعلیم کے لئے بھیجا جاتا ہے جو اسکو اپنی طبیعت، ذہنی استعداد اور رجحان طبع کے مناسب کام کرنے کے قابل بنا لے۔

اس کے برعکس ہمارے یہاں کے بچے۔ میری مراد ان سے ہے جو مدرسہ کی ہمت شکنی اور دل آزاری کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ابتدائی جماعت سے ثانوی، ثانوی سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے یونیورسٹی کی بی اے کی سند لینے تک، اغوں میں بیکار معلومات کا ذخیرہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ان پر کھلتا ہے کہ ڈگری کسی مرض کی دوا نہیں ہے، اور انہیں کسی قابل نہیں بناتی، دیانتداری کے ساتھ سوچنے اور اپنے نفس کا احتساب کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اور نئے سرے سے کسی ہنر یا فن کے سیکھنے کی عمر بھی باقی نہیں رہتی پینتیس روپیہ کی محرری، رنج و ملال، انسانی

ندگیوں کی خوفناک تباہی، ناکامی، زیاں، پست حوصلگی اور اخلاقی خودکشی انکی چودہ سالہ تعلیم کا حاصل ہوتی ہے۔

کیا کبھی اس پستی سے ہمارا ابھرنا بھی ممکن ہے؟ اس وقت تک تو اس کی کوئی صورت نہیں ہے جب تک کہ ہم آنے والی نسلوں کی طرف سے لاپروائی برتنے پر مصر رہیں۔ ہم بیوقوف نہیں ہیں، فقط سست، بے فکر اور کوتاہ بیں ہیں اگر ہمیں قومیت کی تعمیر کرنی ہے تو قوم کے آنیوالے افراد کی تعلیم و تربیت کا انتظام دانشمندانہ سائنٹفک اور قومی اصولوں پر ہونا ضروری ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب :

محمود اور فردوسی | از قاضی ظہور الحسن صاحب سیوہاروی۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۴ر۔ مصنف سے
مکان مولوی فیض الدین صاحب وکیل۔ محلہ عابد شاب حیدرآباد دکن سے
مل سکتا ہے۔

یہ مختصر رسالہ اس بحث پر لکھا گیا ہے کہ سلطان محمود کا فردوسی کے ساتھ وعدہ خلافی کرنیکا قصہ غلط ہو
اور فردوسی کی طرف جو ہجو سلطان محمود کی طرف منسوب کیجاتی ہے اسکی نہیں ہو۔
یہ بحث اگرچہ پہلے سے تھی اور بعض مورخین نے اس کی تغلیط بھی کی تھی مگر ایسے واضح اور قوی دلائل
سے کسی نے اسکی تردید نہیں کی تھی جیسے قاضی صاحب نے لکھے ہیں۔ انکی یہ تاریخی خدمت نہایت قابل قدر ہے۔

درر فارسی - مولوی فاضل ڈاکٹر محمد نظام الدین۔ پی ایچ۔ ڈی (کیمبرج) صدر شعبۂ فارسی درفیق جامعہ
عثمانیہ حیدرآباد دکن نے جامعہ مذکورہ کے امتحان میٹرکیولیشن و ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ و منشی جماعتوں
کے لئے قدیم و جدید نظم و نثر فارسی سے یہ کتاب مرتب کی ہے جو ضخامت و ترتیب کے لحاظ سے نہایت
موزوں اور مناسب ہو اور انتخابات بہت اچھے ہیں۔ مدارس ہند کے فارسی نصاب کے لئے ہماری رائے
میں یہ کتاب نہایت اچھی ہے۔ اور اس کے حسن ظاہر اور معنوی سے امید ہے کہ جلد یا اکثر مدارس
کے نصاب میں شامل کر لیجائیگی۔ قیمت درج نہیں ہو۔

مصطفائی کمال - یہ کتاب حاجی محمد موسیٰ خاں رئیس دتاولی ضلع علیگڈھ کی "اسلامی خلافت
کا کارنامہ" کا دوسرا حصہ ہو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ۔ ۔ ہجری تک

ے واقعات لکھے ہیں۔ جو کچھ لکھا ہے تحقیق و جستجو کے ساتھ لکھا ہے اور زیادہ تر ان اصلاحات کو دکھانیکی
طرف توجہ کی ہے جو حضرت غازی مصطفیٰ کمال کی بدولت اس زمانے میں ہوئیں۔ اور یہی تاریخ کا خاص مقصد ہے۔
طرز بیان اور سلجھا ہوا ہے۔

اس حصہ کا نام رکھنے میں مصنف نے جدت سے کام لیا ہے۔ غالباً چونکہ اس عہد میں مصطفےٰ
کمال پاشا کا نام دنیا اور خاصکر عالم اسلامی میں مشہور ہو گیا ہے اس وجہ سے انہوں نے "مصطفائی
کمال" اسکا نام رکھا۔ ورنہ مصطفوی کمال ہونا چاہئے تھا۔ قیمت فی جلد ۱۲؍ ملنے کا پتہ :
مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرولباغ دہلی۔

کائنات کا تماشہ۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب بی اے سابق سینیر ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی
نے جو حقیقت رس اور شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں اپنے جذبہ دل سے نکلی ہوئی چند نظموں کو مع ایک
دیباچہ کے مندرجہ بالا نام سے چھوٹی تقطیع کے ۹۰ صفحوں پر شائع کرایا ہے۔ دیباچہ میں اعتراض بھی ظاہر
کردیے ہیں۔ یہ نظمیں ایک خاص خوبی رکھتی ہیں یعنی یہ کہ انکے الفاظ اور انکی ترتیب میں ایسا انوکھا پن ہے کہ
اس قدر معانی میں بھی کوئی دوسرا مشکل سے پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے آخر میں
الفاظ کی ایک فرہنگ بھی لگا دی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

رسالہ تحقیق مصنفہ مرزا ابن عاشور بیگ شہید۔ سول لائن۔ علی منزل علیگڈھ۔ قیمت ۴؍
مرزا صاحب اہل قرآن ہیں۔ انہوں نے قرآن سے دس مسائل کی خاص تحقیقات اس
رسالہ میں درج کی ہیں۔ صلوٰۃ۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ پردہ اور سود وغیرہ۔ حدیث کے عدم اعتبار کے
وجوہات بھی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔
مصنف نے کوشش کی ہے کہ فرائض میں تخفیف قرآن سے ثابت کریں۔ روزوں کے متعلق
بیان ہے کہ ... کی فرضیت مہینہ بھر کے لئے ہے لیکن ایاما معدودات کا لفظ جو قرآن میں ہے اسا

سے تین دن کے بھی روزے رکھ لینے سے فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نماز اور زکوٰۃ کے ذریعہ کو بھی وہ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ اس صورت میں ہمارے نزدیک انکی کتاب کا نام بجائے تحقیقات کے اگر "تخفیفات" ہوتا تو زیادہ مقصود کو ظاہر کرتا۔ امید ہے کہ دوسری اشاعت میں وہ نام کی تبدیلی کے مسئلہ پر غور فرمائیں گے۔

کتاب الرعایہ تجوید القراءۃ - زبدۃ ترتیل القران - روح تجوید القرآن

یہ تینوں کتابیں جیسا کہ انکے ناموں سے ظاہر ہے فن تجوید قرأت میں عربی زبان میں ہیں۔ ان میں حروف کی کیفیت، احکام اور مخارج وغیرہ جو تجوید کے لئے ضروری ہیں بیان کئے گئے ہیں۔ حافظ محمد یوسف صاحب اور سپرنٹنڈنٹ محکمہ تعمیرات عامہ علیگڑھ نے جن کو اس فن سے خاص ذوق معلوم ہوتا ہے ان کو طبع کرایا ہے۔

ان میں سے پہلی کتاب علامہ محمد مکی بن ابی طالب قیروانی کی تصنیف ہے۔ اور دوسری اور تیسری دونوں قاری محمد صدیق صاحب افغانی کی جو مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے فن تجوید کی سند حاصل کر چکے ہیں اور اس فن میں مشہور ہیں۔

یہ تینوں کتابیں فن تجوید میں قابل قدر ہیں۔ ان میں سے پہلی دونوں کتابوں کی قیمت آٹھ آٹھ آنے ہے اور آخری کی ۱۲ر ملنے کا پتہ

قاری محمد صدیق صاحب معرفت ڈپٹی عبدالوحید صاحب حویلی اعظم خاں۔ دہلی

مرشد المبتدی الی اللسان العربی - مصنفہ ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ناظم مدرسہ عالیہ اسلامیہ کراچی سندھ

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک مدت تک غور و فکر کرنے کے بعد مسلمان بچوں کے لئے عربی کو آسان طریقہ سے سکھانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا ہے جس کی پہلی کڑی یہ کتاب ہے۔ ان کی یہ

[illegible] کی ترویج کے لئے ہو نہ کسی اپنی ذاتی منفعت کے لیے۔
[illegible] فرائی طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ الفاظ ہیں اور انکی مشق اور انکے ساتھ ساتھ اصول۔ میرے خیال میں یہ طریقہ ایسا ہے کہ اس سے عربی آسان ہو سکتی۔ لیکن صحیح فیصلہ تجربہ اور اس کتاب کے آخذہ مضمون پر ہو سکتا ہے۔ قیمت مندرج نہیں ہے۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

شرارہ برقی۔ شیخ عزیزالدین برقی کے فارسی کلام کا انتخاب شیخ محمد اسلم صاحب کلکٹر محکمہ انکم ٹیکس دہلی نے چھپواکر شائع کیا ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں سے فارسی کا مذاق جاتا رہا اور جو کچھ برائے نام ہے وہ بھی مٹ رہا ہے۔ حالانکہ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ اس ملک میں باہمی خط و کتابت بھی فارسی ہی زبان میں ہوتی تھی اور اس زبان کے ایسے ایسے ادیب تھے جو اصفہانی اور شیرازی ادبا کا مقابلہ کرتے تھے۔

شیخ محمد اسلم صاحب نے اپنے عم محترم کے اس ادبی ذخیرہ کو شائع کرکے درحقیقت ایک یادگار محفوظ کر دی ہے۔

برقی کا کلام سادہ۔ پختہ۔ صاف اور ہموار ہے۔ چند اشعار درج کرتا ہوں۔

اے رشک حور با تو ملک ہم طراز نیست — پاکیزہ صورتے بچنیں حسن و ناز نیست
سرمایہ دار حسن تو ئی بیشتر ز بیش — ما را سوائے زیستی خود برگ و ساز نیست
گویند رہروان طریقت کہ رفتہ اند — در راہ عشق ہیچ نشیب و فراز نیست

ہرچند کہ فارسی شاعری میں تصوف نے جس قدر دلکشی پیدا کی اسی قدر اسکو عملی زندگی سے دور ڈالدیا لیکن ادبی شیرینی اور لطافت ضرور بڑھ گئی۔

اس دیوان کی قیمت ۱ر ہے ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ساقی کھاری باولی۔ دہلی۔

رسائل

بصیرت - مولوی عبد الحق صاحب ودیارتھی اور مولوی محمد عصمت اللہ صاحب کی ادارت میں یہ ماہوار پانچ جزکا احمدیہ بلڈنگس لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ قیمت سالانہ ساڑھے چار روپیہ۔

اسکی خصوصیت خاص یہ ہو کہ ہندوستان کی دو عظیم الشان قوموں ہندو اور مسلمانوں کی باہمی غلط فہمیوں اور کوتہ اندیشیوں کو دور کرنیکی مقدر بھر کوشش کریگا۔

پہلے نمبر میں مذاہب عالم کو دعوت اتحاد اور رسام وید پر جو مضامین ہیں ان سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ رسالہ اپنی اس خصوصیت کو قائم رکھ سکیگا۔

حقیقت میں اس امر کی ضرورت ہو کہ مسلمان اہل نظر پیشوایان دین ہندؤں کے مذہب اور انکی دینی کتب کی کیفیت سے واقف ہوں جس طرح کہ خود ہندوؤں کو ضرورت ہو کہ وہ مسلمانوں کے دین اور صحیح اسلامی تعلیمات سے واقفیت حاصل کریں۔ اپنے رنگ میں یہ رسالہ قدر کے قابل ہو۔

الحافظ - یہ صوفیانہ ماہوار رسالہ جو ہر قمری مہینہ کی بارہویں تاریخ کو چھوٹی تقطیع پر دو جز کا میرٹھ سے شائع ہوتا ہے۔ سرشار شاہ وارثی اور صوفی کریم الدین احمد صاحب وارثی حافظی میرٹھی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ قیمت سالانہ عہ ہے۔

گوشہ نشینان تصوف جو ہمیشہ خدا رسیدہ اور برگزیدہ جماعت سمجھی جاتی ہے بوجہ قطع علائق کے اور دیگر جماعتوں سے الگ تھلگ رہنے کے اپنے مخصوص عقائد اور اعمال کی وجہ سے جب کبھی روشناس خلق ہوتے ہیں تو نہایت عجیب وغریب نظر آتے ہیں

یہ رسالہ حافظ گنجینہ توحید وارث خزینۂ تقریر اعلیٰ حضرت جناب حافظ پیاری صاحب قبلہ صاحب کی سرپرستی میں نکلا ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسکو حافظ پیارے صاحب پڑھیں لیکن کوئی صورت نہ بن پڑی اور اسکی انوثیت کو قائم رکھنا پڑا۔ اس خیال سے اور بھی مدد ملی کہ دہلی میں بھی ایک مولانا "دلہن" کے دلچسپ لقب سے ملقب ہیں اور وہ بھی گوشہ نشینوں کے حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

دی ہے۔ اولیت اس جامعت کے نزدیک مرداۂ تقدس کے منافی نہیں سمجھی جاتی۔ حافظ پیاری صاحب کی نسبت سے اس رسالہ کا نام الحافظ رکھا گیا ہے اور سرورق پر یہ دلچسپ فقرہ درج ہے " مزہ ہے پیاری کا اور سب جھول "

" پیاری صاحب " کی دینی خدمات جو اس رسالے نے گنائی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

" مراسم چہلم متعلقہ محرالحرام مع لنگر و مجلس وغیرہ کے بھی حافظ صاحب قبلہ ادا کرتے ہیں۔ اور کاتک کے میلہ میں ان مہمانوں کی مہمانداری کی جاتی ہے جو نشستگاہ سرکار عالم پناہ پر مقیم ہوتے ہیں۔ شب کو قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ غدائی رات بھی منائی جاتی ہے۔ غلاف و صندل وغیرہ بھی آستانۂ عالیہ پر قوالی اور باجہ کے ساتھ خود حافظ صاحب قبلہ لیجاتے ہیں " (صفحہ ۸)

یہ ہیں وہ اعمال دینی جو ہمارے صوفیوں کی خانقاہوں میں ادا کئے جاتے ہیں جن کو اسلام سے بجز منافات کے اور کوئی نسبت نہیں ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد — وائے گر در پس امروز بود فردائے

(ا - ج)

بچیوں کا قاعدہ - سید مختار احمد و مولنا ذہین صاحبان نے چھوٹی بیوں کے لئے اردو کا قاعدہ مرتب فرمایا ہے، اس میں اختصار کے ساتھ وہ تمام باتیں موجود ہیں جو بڑے بڑے قاعدوں میں ہوتی ہیں۔ اردو ابجد کو پرانی طرز سے پڑھانے کے لئے یہ قاعدہ یقیناً دوسرے قاعدوں کے مقابلہ میں مفید معلوم ہوتا ہے لیکن اس قدیم روش کو بدلنے کے لئے جس قدر اہمیت اور ضرورت کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کے لئے ایسے قاعدوں کی اشاعت کی اب ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان قاعدوں سے اردو پڑھنا بہت دیر میں آتا ہے۔ تاہم جبتک کہانی کے ذریعے اردو پڑھنا سکھانے کا رواج عام نہ ہو جائے اور جبتک اچھے مدرس دستیاب نہ ہوں اس وقت تک ایسے قاعدوں سے کام لیا جا سکتا ہے جن میں مندرجہ بالا قاعدہ یقیناً برا نہیں ہے۔ معمولی سائز کے بائیس صفحات پر اچھا چھپا ہے کاغذ بھی عمدہ ہے۔ جس رنگین اور عام فہم تصاویر سے مزین ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ لیکن ہمارا مشورہ

...سے زائد نہیں ہونی چاہئے۔

ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن

مکمل ہندسہ عملی - طلبائے ریاضی کی میٹرک جماعتوں کے لئے محمد منیر الدین صاحب بی اے مددگار ریاضی عثمانیہ سنٹرل ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد دکن نے مکمل ہندسہ عملی نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی ہے جس میں مثلثوں۔ ذو اربعۃ الاضلاع اور دائروں کی ساخت اور نیز رقبوں کے متعلق عملی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب صرف ان طلبہ کے لئے مفید ہو سکتی ہے جو غیر معمولی طور سے ریاضی میں ہوشیار ہوں۔ اوسط درجہ کے طالب علم کے لئے یہ بہت مشکل ہے کیونکہ عملی مسائل کی صرف ساخت درج کر دی گئی ہے اگر یہ ثابت کرنا ہو کہ آیا ساخت صحیح ہے یا نہیں تو اس کے لئے یہ کتاب بالکل خاموش ہے۔

ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ریاضی کے مسائل کو آسان سے آسان شکل میں پیش کیا جائے تاکہ ہندوستانی اور خصوصاً مسلمان طلبہ کو جو اس مضمون کی طرف سے نفرت سی پیدا ہو گئی ہے یا جو غیر معمولی ہیبت انکے دلوں پر طاری ہو گئی ہے اس کو رفع کیا جائے۔ اور ان میں اس کے حاصل کرنیکا شوق اور لگاؤ پیدا کیا جائے جو یقیناً اس قسم کی کتب کو درس میں داخل کرنے سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا چھپائی اور کاغذ کے اعتبار سے اگرچہ کتاب بری نہیں ہے لیکن مشقی سوالات کے عدد شمار سوالات کے ہندسوں اور عبارتوں سے نمایاں نہیں ہیں جس سے الجھن سی پیدا ہوتی ہے۔ اُستادوں اور ذہین طلبہ کے لئے یہ کتاب ضرور مفید ہے۔ عہ قیمت ہے جو درسی کتب کے لئے بہت زیادہ ہے۔ تعلیم کو سستا کرنیکے لئے ناشروں کو خاص توجہ کرنی چاہئے۔

ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ انجمن امداد باہمی۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن

جبر و مقابلہ - مڈل کی جماعتوں کے لئے جہاں سے الجبرا کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ جبر و مقابلہ کی یہ

کتاب سید انوار حسین صاحب بی سے مدرس مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ پرمنی نے مرتب فرمائی ہے۔ کتاب خاصی واضح ہے اور مبتدیوں کے لئے یقیناً اچھی ہے لیکن طباعت اچھی نہیں ہے اور ریاضی کی کتاب کے لئے جس قدر صفائی اور وضاحت کی ضرورت ہے افسوس ہے کہ اسکا خیال نہیں رکھا گیا بعض جگہ سے سوالات کی عبارت بھی تک نہیں جاتی جابجا غلطیاں پائی جاتی ہیں اگرچہ ۴ صفحے کا صحت نامہ شامل کتاب ہے لیکن ان تمام غلطیوں کا صحیح کرنا بطور خود ایک کتاب کا تیار کرنا ہے جس کی وسطی جماعتوں کے طلبہ سے بہت کم توقع کیجا سکتی ہے، اگر کتاب خوبصورت نہیں ہوسکتی تھی تو ٹائپ میں چھپنا زیادہ بہتر ہوتا۔ تعریفوں کے عنوانات کو عبارت سے زیادہ جلی ہونا چاہئے تھا اعتذار میں طبع ثانی کے بہتر ہونیکا وعدہ کیا گیا ہے لیکن جس طالبعلم نے ایک مرتبہ اسے خرید لیا ہو اس کے لئے اعتذار کیا مفید ہوسکتا ہے۔ ریاضی کی کتابوں کو اس وقت تک نہ چھاپنا چاہئے جب تک کہ کتابت وطباعت کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو۔ اس کتاب میں مساوات مفرو بھما کے قاعدے درج ہیں بعض جگہ شکلیں بناکر مثالوں کو واضح کرنا چاہئے تھا جس کا کسی جگہ بھی خیال نہیں رکھا گیا اور مربع خانہ دار کاغذ کا استعمال نہیں بتایا گیا جو آجکل بہت ضروری اور مفید خیال کیا گیا ہے ضرب کے قاعدہ میں ابھی اور مزید مشقوں اور مختلف قاعدوں کے شامل کرنیکی ضرورت تھی۔ قیمت ۱۵ ر بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی کتابوں کی اشاعت نہیں ہوتی اور یہ غریب زبان کس میرسی کی حالت میں ہے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن

(ح۔ ف۔ ا)

شذرات

حیات انسانی ایک سلسلہ ہے تمدن گردیوں کا، مشیت الہی یہی ہے کہ زندگی کے نئے نئے نمونے بنتے اور بگڑتے رہیں۔ مصر و بابل، ہندوستان و یونان، روم و عرب، ہر ایک نے باری باری اپنی معاشرت کی طرحیں ڈال کر چندے دنیا کی رہنمائی کی، پھر کسی دوسرے رہنما کے لئے جگہ خالی کر دی۔

تاریخ کا ہر مطالعہ کرنیوالا ان حالات سے واقف ہے جن کے ماتحت یہ سلسلہ تعمیر و تخریب اب تک جاری رہا ہے۔ کس طرح چین و آرام کی تلاش میں انسانی جماعتیں اپنے وطنوں کو چھوڑ کر زیادہ زرخیز مقامات پر آباد ہوئیں۔ کس طرح سکون و اطمینان کی زندگی نے ان میں تہذیب و شائستگی پیدا کی اور کس طرح عیش و عشرت سے کمزور ہو کر ان کو دوسری وحشی لیکن طاقتور جماعتوں کا شکار ہو جانا پڑا۔

متمدن قوموں کی تباہی کے اور اسباب بھی تھے اور مسائل بھی تھے جو ان قوموں کو پیش آئے۔ اور حل نہ ہو سکنے کے باعث ان کی اور انکے تمدنوں کی بربادی کا سبب بنے۔ لیکن جسمانی قوت کی کمی سب کا مشترک اور سب سے اہم مسئلہ رہا ہے۔ یہ وہ چٹان تھی جس پر بالآخر ہر ایک کا جہاز ٹکرا کر غرق ہوا۔ یونان کی فلسفیانہ موشگافیاں اس کے کچھ کام نہ آئیں جب اسے جنگجو رومیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ رومیوں کی عظمت بھی وحشی جرمنوں کے ہاتھوں میں ملنے کے لئے تھی۔ متمدن اہل فارس کے ساتھ بادیہ نشین عربوں نے جو کیا وہی بالآخران کے ساتھ جب کہ وہ متمدن ہو چکے تھے، تاتاریوں نے کیا اور ہندوستان کی روحانیت بھی پٹھانوں اور مغلوں

[illegible] جاتی۔ ایک مدت تک ترقی کرنے کے بعد، قوئ جسمانی کے انحلال کے باعث [illegible] اقوام کا طاقتور وحشی جماعتوں کے ہاتھوں زیر و زبر ہو جانا کچھ اس التزام سے وقوع [illegible] ہے کہ تمدن کو عموماً بربادی کا پیش خیمہ سمجھا جانے لگا۔

لیکن یورپ کا جدید تمدن اگلوں سے جہاں اور باتوں میں اختلاف رکھتا ہے وہاں اس امر میں بھی کہ اس نے مسئلہ حفاظت کو حل کر لیا۔ یہ نہیں کہ لذت جس کے پیچھے سب نے جان دی، تہذیب جدید کا کوئی عنصر نہیں۔ عیش و عشرت کی گرم بازاری اب پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ آرام و تفریح کا سامان جس قدر آج لوگوں کو حاصل ہے پہلے بادشاہوں کے نصیب میں بھی شاید ہی رہا ہو۔ ایسی سربفلک عمارتیں ہٹلوں نے یقیناً نہیں بنوائیں۔ رقص و سرود کے یہ تماشے سلاطین عرب کے حرموں نے بھی شاذ ہی دیکھے ہوں گے۔ غسل و شناوری کی یہ بہاریں، رومی حماموں میں بھی شاید ہی رہی ہوں جو آج یورپ کو ہر جگہ میسر ہیں۔ اگلی قوموں کی صحت جسمانی بھی عیش و نشاط سے اس درجہ خراب نہ ہوئی تھی۔ امراض کا یہ تنوع، ادویات و اطبا کا یہ انبوہ کثیر، دھوپ کا خبط عام، اور مسلک عریانی کا تصور ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ زمانہ نے ان کو جینے کے ناقابل ٹہرا دیا۔ مگر یورپ ان نتائج سے بالکل مصئون و مامون ہے جو کہیں کم آرام و آسائش اٹھانے کی پاداش میں متقدمین کو بھگتنے پڑے۔

یہ سب سائنس کی برکات ہیں۔ طرح طرح کے آلات حرب ایجاد کر کے یورپ نے جسمانی قوت کا بدل حاصل کر لیا اور وحشی جماعتوں کے لئے اب اس کی تاخت و تاراج ممکن نہیں۔

خارجی حفاظت کا مسئلہ اگرچہ سائنس کی مدد سے حل ہو گیا تھا، جسم و جان کی اندرونی حفاظت کا مسئلہ ہنوز باقی تھا، وہ زندگی جو وحشیوں کی تلوار سے مامون ہو چکی تھی، بیماری کے جراثیم سے نہ بچ سکتی تھی۔ اور ارباب فکر اس تشویش میں تھے کہ تمدن جدید، جو اسلحہ آتشیں کی پناہ میں ساری دنیا کے

اندر پھیل رہا ہے، اور اس کے ساتھ بنی نوع انسان کا کیا حشر ہونیوالا ہے۔ زمانہ سلف کی متمدن قومیں محدود جماعتیں تھیں۔ دنیا کے بہت سے خطّوں میں ایسے انسان آباد تھے جو تمدن کے بعض مہلک اور کمزور کر دینے والے ماحول سے دور رہ کر فطرت کی گود میں زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ تندرست انسانوں کے وہ اچھوتے ذخیرے تھے جن سے عیش و عشرت کی ماری جماعتوں کے کمزور جسموں میں از سر نو جان ڈال کر سلسلہ زندگی کو قائم رکھنے کا کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر تمدن جدید اپنے تمام حیات سوز تعیشات کے ساتھ ان دور دراز کے گوشوں پر بھی محیط ہو گیا جہاں سے انسان کو تازہ خون حاصل ہوتا تھا، جو سرچشمہ حیات انسانی رہے ہیں تو انجام کیا ہو گا۔ کیا اس تمدن کی ترویج کا نتیجہ یہی ہونا ہے کہ ساری انسانی جماعت کے قویٰ میں ایک ساتھ اضمحلال شروع ہو جائے حتیٰ کہ ایک دن وہ کسی کام کے قابل نہ رہے۔ اور کثیر دولت، گوناگوں سامان عیش، اور حیرت انگیز مشینوں کو باحسرت دیاس دیکھتی ہوئی ضعف و بیماری سے دم توڑ دے ــــ یا کوئی صورت اس انجام سے بچنے کی بھی ہے۔

وہ لوگ جو انسان کے مستقبل سے مایوس نہ تھے سمجھتے تھے کہ کوئی نہ کوئی حل اس مسئلہ کا ضرور مل جائیگا۔ بعضوں کا خیال تھا کہ مذہب انسان کو ہلاکت سے بچائیگا۔ وہ مذہب جس کی بنا تجربہ پر ہو گی۔ انکے خیال میں اگلے زمانے کی متمدن قوموں کو سوچنے اور تلافی مافات کا موقع نہ ملا تھا کہ وہ حملہ آور وحشیوں کا شکار ہو گئیں۔ لیکن اب کہ امن و سکون کے ساتھ سوچنے اور گزشتہ تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے، انسان آہستہ آہستہ ضبط نفس اور احتیاط سے کام لینے کا عادی بن جائے گا اور ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرے گا جو اسے تباہی کی طرف لیجاتی ہیں۔ تخیل پسندی نہ سہی عبرت اور دانشمندانہ خود غرضی اسے اس معاملے میں صحیح راستہ پر لگا دے گی۔

لیکن حال کے اکتشافات کچھ اور ہی خبر دے رہے ہیں۔ مصنوعی ذرائع سے جسم کی ہیئت بدل دینے والی جدید تدابیر اگرچہ ہنوز ابتدائی منزلوں میں ہیں تاہم ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان

سائنس پر بہت کچھ اعتماد کر سکتا ہے۔ اس نے جس طرح خارجی حفاظت کا مسئلہ حل کر دیا، اسی طرح [illegible] کا مسئلہ بھی حل کرے گی۔

سائنس کی یہ کامیابی دنیا کی اخلاقی اور معاشرتی قدروں پر جس درجہ اثرانداز ہوئی اسکا اندازہ اس وقت کم لوگ کر سکتے ہیں بحالی قوت رفتہ کی تدابیر، اگر وہ پوری طرح کامیاب ہوگئیں، انسان کے لئے ان تمام تکالیف سے، جو قدرت کی دی ہوئی نعمتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی پاداش میں بھگتنی پڑتی ہیں، نجات کا پروانہ ہوں گی ـــ ایک فتویٰ عام، کہ نفس پرستی اب سب کے لئے مباح ہے، جس قدر بھی اس کی بندگی کیجائے جائز ہے، فطرت کوئی سزا نہ دیگی ضبط نفس اور احتیاط کے وہ تمام قوانین جنہیں موجودہ سوسائٹی کی اخلاقیات صحت کے لئے ضروری دے کر فرائض میں داخل کرتی ہے۔ اس کے بعد سے بیکار سمجھے جانے لگیں گے۔ اور ایک نیا مجموعہ قوانین تیار ہوگا، جو کمتر سختی اور بیشتر آزادی پر مبنی ہوگا۔ مستقبل کا یہ انقلاب دنیا کو کہاں لیجائیگا۔ اس کے تصور میں اہل فکر طرح طرح کے جذبات کے ساتھ غلطاں و پیچاں ہیں۔

گفتگوئے مصالحت، جس کے درمیان میں گرفتاریوں کی رفتار معمول سے بھی زیادہ تیز ہوگئی تھی ـــ شاید قوم پرستوں پر مزید دباؤ ڈالنے کے لئے کہ وہ تنگ آکر صلح کرلیں۔ یا یہ جتلانے کے لئے کہ حکومت دب نہیں رہی ہے ـــ بالآخر ناکام رہی۔ اور ملک کی سیاسی فضا میں جو مزید تیرگی اس سے پیدا ہوئی وہ پنڈت موتی لال نہرو کی رہائی سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتی۔ اب کیا ہوگا، یہ سوال ہے جو اس ناکامی کی خبر سنکر ہر ایک کے دل میں پیدا ہوا ہوگا۔ جہانتک کانگریس کا تعلق ہے اسکا پروگرام صاف اور متعین ہے۔ بائیکاٹ اور قانون شکنی کے [illegible] جو لڑائی اس نے شروع کی ہے اس میں اسے بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی

اور ہو رہی ہے۔ اس کے مصالح اسی کے مقتضی ہوں گے کہ جہانتک ممکن ہو لڑائی اور بھی زیادہ سرگرمی سے جاری رکھے۔ رہی حکومت سو اس کا رد یہ خود کانگریس کے طرز عمل پر موقوف ہے۔ البتہ لبرل جماعت کو اب بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ مختلف اور متضاد قوتوں کے درمیان اس کو ایک معقول اور باعزت راہ نکالنی پڑے گی۔ اس میں کامیابی لبرل پارٹی کے خلوص اور ایمان پر منحصر ہے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی کامیابی شرکت کانگریس کے بغیر ممکن نہ ہوگی۔ صلح متحارب فریقوں میں ہوتی ہے۔ اگر حکومت نے اس جماعت کو چھوڑ کر جو ہندوستان کی طرف سے لڑ سکتی ہے یہاں کی غیر متحارب جماعتوں سے صلح کرنی چاہی تو تحصیل حاصل ہوگا۔ یہ توقع رکھنا کہ دوسری جماعتوں سے مل کر حکومت کانگریس کو دبا لے گی صریح غلطی ہے۔ جب تک اس جماعت کے پاس جس کی مدد سے حکومت کانگریس کو دبانے کی توقع رکھ سکتی ہے، کوئی ایسی شے نہ ہو جسے ملک کے سامنے پیش کرکے اس کی ہمدردی اور امداد حاصل کیجا سکے، کسی قسم کی کامیابی ممکن نہیں ہو سکتی۔ لیکن نہ تو اس وقت اس جماعت کے پاس کوئی شے ایسی ہے جس سے ملک کی سیاسی پیاس بجھائی جا سکے، نہ ہی مستقبل قریب میں ہونے کی توقع ہے۔ کیونکہ بڑے بڑے عہدوں سے جن میں اختیارات نہ ہوں یہ کام نہیں نکل سکتا۔ اگر اس کی کوئی صورت ممکن ہے تو اسی وقت جبکہ ہندوستان کو تھوڑے بہت اختیارات حکومت کا مالک بنا دیا جائے۔ لیکن حکومت برطانیہ کم سے کم جس قدر اختیارات ہندوستان کو دے سکتی ہے، وہی خود کانگریس بھی چاہتی ہے۔ پس یا تو حکومت برطانیہ اور ہندوستان کے مابین کوئی صلح نہیں ہوگی یا ہوگی تو کانگریس بھی اس میں شریک رہے گی۔

مہاتما گاندھی نے اپنی شرکت کانگریس کو جن شرائط پر منحصر قرار دیا ہے وہ ہندوستانیوں

گیے ہیں اسی قدر قابل غور ہیں جس قدر انگریزی حکومت کے لئے۔ وہ صرف اس بات کا اطمینان نہیں چاہتے کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے حق حکومت خود اختیاری کو تسلیم کرلے، اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی غرض صرف یہ رکھی جائے کہ اس حق کو بہتر سے بہتر طریق پر ہندوستانیوں کے سپرد کر دیا جائے بلکہ اس کا اطمینان بھی چاہتے ہیں کہ خود اہل ہند اپنے مطالبات میں متفق ہوں۔ اور یہ طے کرلیں کہ خواہ جو کچھ بھی ہو، جن مطالبات کو وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں متفقہ پیش کریں گے ان کے لئے بہر صورت ثابت قدم رہیں گے، اور کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گے حقیقت یہ ہے کہ ان شرائط کے پورا ہونے سے پہلے ہندوستان کے لئے کامیابی کی کوئی امید بھی نہیں۔

دہلی میں اراکین مجلس عاملہ کانگریس کی گرفتاری ہمارے لئے اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ یہاں کے اسیر ہونے والوں میں امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کی ذات گرامی بھی تھی۔ ہم ڈاکٹر صاحب کو اس عزت پر تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں جو آپ نے قید ہو کر پبلک کی نگاہوں میں حاصل کی ہے۔

اسی سلسلہ میں مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے جامعہ بھی مستحق مبارکباد ہیں جو کچھ عرصہ سے جامعہ سے الگ ہو کر قومی کام میں مصروف تھے۔ اور اب حکومت کے مہمان ہیں۔

(ع۔ ق)

رسالہ "ادب"

"ادب" ہر حیثیت سے اہم مجلّہ ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس کا شیوہ ہے اور تہذیب و متانت اس کا شعار۔ تمام معاصرین نے اس کا شمار بہترین رسالوں میں کیا ہے۔ اور آئندہ بہت کچھ ترقی کے آثار پائے ہیں۔ دل آزاری۔ دریدہ دہنی۔ لفظی نزاع۔ جماعتی تنگ نظری۔ مذہبی تعصب اور سیاسی اختلافات کے دھبوں سے ادب کا دامن پاک ہے اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی ہیں لیکن ادب کے دائرے سے خارج نہیں ہوتیں۔ ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے تمام باادب اہل ادب اس کی برادری میں شامل ہیں۔

"ادب" دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کا دامن تمام آلائشوں سے کیونکر پاک رکھا جا سکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سائے میں پروان چڑھنا تو آسان ہے لیکن ادب کا مطمح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق عام کی اصلاح اور ادبیت و ادبی خدمات کا صحیح معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے بہی خواہ ان مقدس مقاصد کے حصول میں ادب کی مدد کرینگے؟

اگر آپ کو اس رسالے کی شان، بلند نگاہی اور متانت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے چند پرچے ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم کم از کم ۲۰ صفحے چندہ سالانہ چار روپئے ایک پرچہ کی قیمت ۶ /

مینجر "ادب" متصل چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ

صاحبانِ قلم کے لئے زرین موقع

اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے

ہزاروں روپئے کے انعام

چاند اردو۔ قیمت سالانہ آٹھ روپیہ ششماہی۔ پانچ روپیہ۔ فی جلد ایک روپیہ

چاند میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے
مینجر اردو چاند چندر لوک الہ آباد

تمام ہندوستان کے مشہور اہل قلم" چاند" میں اپنے اپنے مضامین بھیج رہے ہیں۔ آپ بھی جلد روانہ فرمائیے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ چاند جس آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ ویسا اردو میں کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے۔ اسی لئے تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی اشاعت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہو گئی ہے۔ اور مشہور اہل قلم اپنے مضامین چاند میں بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چاند ایک ماہواری علمی' ادبی' اخلاقی' معاشرتی رسالہ ہے۔ اس میں مختلف قسم کی عمدہ سے عمدہ تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں۔ تصاویر کا مجموعہ کیا ہے گویا ایک مصور کا البم ہے۔ چاند سال میں کئی نمبر خاص نمبر کی حیثیت سے شائع ہوگا۔ حال ہی میں اسکا اسپیشل نمبر شائع ہونے والا ہے اسکے لئے جلد از جلد مضامین بھیجا دیں۔ مضمون نگاران کیلئے اچھا موقع ہے۔ انکو اختیار ہے کہ جس سبجکٹ پر چاہیں مضمون لکھیں۔ اس شخص کو جس کا سب سے اچھا مضمون ہوگا انعام دیا جاویگا۔ تین انعام ہونگے۔

(۱) مضمون (نثر) (۲) افسانہ (۳) ۔ ہر ایک مصنف کو بلحاظ مضمون کے اعتبار سے سو روپے تک کا نقد انعام دیا جاویگا۔

اس کے علاوہ

سال بھر تک جن اصحاب کے سب سے اچھے مضامین (نثر ہو یا نظم) چاند میں شائع ہونگے انکو بھی بہترین مضمون پر انعام دیا جاویگا۔ اسمیں بھی تین انعام ہونگے۔ (۱) مضمون (نثر) (۲) افسانہ (۳) نظم سو روپیہ تک کا انعام اسمیں بھی ہوگا۔ مضامین' افسانے اور نظمیں ان شرائط کی پابندی سے لکھے جاویں۔

(۱) مضامین علمی' ادبی' اخلاقی' معاشرتی' علمی' تاریخی یا تحقیقی ہوں۔

(۳) نظم کسی خاص مضمون پر ہو۔ قواعد عروض اور زبان کی غلطیاں نہ ہوں۔

(۵) مضامین غیر مطبوعہ اور نئی طرز کے ہوں۔

(۷) مضامین زیادہ طویل نہ ہوں۔ حشو و زوائد سے پاک ہوں۔

(۹) اگر کوئی مضمون نگار چاہے تو ایک سے زائد بھی مضمون افسانہ یا نظم بھیج سکتا ہے۔

(۱۱) اسپیشل نمبر کے لئے ۱۰ اگست تک تمام مضامین نظم و نثر و افسانے آجانا چاہئیں۔ دیگر مضامین ماہ بماہ آتے رہینگے۔

(۱۳) ہر مضمون نگار کو چاند کا خرید فرمانا ضروری ہے۔

(۲) افسانوں میں کوئی خاص جدت ہو۔

(۴) سب مضامین صاف اور شستہ زبان میں لکھے جاویں۔ ... لطیف یا دقیق اردو میں ...

(۶) جتنے مضامین خواہ نظم ہوں یا نثر یا افسانے انکو مضمون نگار کسی دوسری جگہ میں بھیجنے کا مجاز نہ ہوگا جبکہ حقوق کا مختار ایڈیٹر ہو جائیگا۔ مضمون نگار کا کوئی حق باقی نہ رہیگا۔

(۹) ایڈیٹر کا فیصلہ آخری ہوگا جو کسی طرح مسترد نہ ہو سکیگا اور وہ فیصلہ قانوناً قابل تسلیم ہوگا۔

(۱۱) وہ مضامین جن کو مقابلہ میں انعام نہ دیا جاسکیگا۔ اگر وہ پسند آوینگے تو چاند میں شائع کر دیئے جائینگے۔ لیکن وہ مضامین جو چاند میں نہ شائع ہو سکینگے۔ وہ اسی شرط پر واپس ہو سکتے ہیں کہ مضمون نگار حضرات اپنا پتہ صاف لکھیں۔ اور واپسی کے لئے ٹکٹ روانہ کریں۔

جملہ مضامین وغیرہ حسب ذیل پتہ سے بھیجنا چاہئے۔

منشی کنھیا لال ایڈیٹر "چاند" الہ آباد۔ ٹیلیفون نمبر ۲۰۵۔ تار کا پتہ "چاند"

رجسٹرڈ

نمبر ۵۲

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد [illegible] | بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۳

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi 1927.

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۳	بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۰ع	جلد ۱۵

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ — ششماہی ے — فی پرچہ ۸ر

جامعہ ازہر مصر

اور

تجدید واصلاح کی موجودہ اسکیم

"علامہ شیخ مصطفےٰ المراغی کی تجدید ازہر کی اسکیم کا شہرہ دنیائے اسلام کے ہر ملک میں پہنچ چکا ہے۔ ازہر کو دنیائے اسلام کے دماغ، یعنی ذہنی مرکز سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہر اسلامی ملک اس جامعۂ اسلامیہ سے اپنے طلبہ کے ذریعہ مربوط ہے، اسکا گہرا، اہم اور عالمگیر اثر و نفوذ محتاج بیان نہیں ہے لیکن تعجب ہے کہ مراغی اسکیم کی انقلابی تجاویز تجدید و اصلاح پر اس ملک میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ظاہر کی جا رہی ہے۔ بجز معارف کسی اہم جریدہ نے اس پر کوئی نوٹ بھی نہیں لکھا ہے، حالانکہ اس حرکت کا زبردست و عمیق تعلق، دیوبند، ندوہ علیگڑھ، حیدرآباد اور فرنگی محل کی تحریکات سے ہے۔ مجھے جہانتک معلوم ہے، مراغی اسکیم کے تاریخی مبانی و اصول اور اسکیم کی تفصیلات پر اردو رسائل میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ آج "جامعہ" کے توسط سے میں اس شہرہ آفاق اسکیم کو متعارف کرتا ہوں"

(راغب احسن بی اے، کلکتہ)

ازہر کی موجودہ حالت جامعہ ازہر کی حیثیت آج ایک بین الاقوامی یونیورسٹی کی ہے۔ اس کے زیر حمایت، عالم اسلامی کے تمام ملکوں، قوموں اور طبقوں کے طلبہ کو اعلیٰ تعلیمات، رہائش، خورش و پوشش مہیا کیجاتی ہے۔ ان میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا ہے یہ جامعۂ اسلام، قبلہ اسلام کی طرح اخوت و جمہوریت کے اصول پر قائم ہے۔ دنیا میں اس عہد جمہوریت و اشتراکیت میں بھی اس بین الاقوامی عالمگیر جامعہ اسلامی کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ ازہر ذہنی دنیا کا ایک معجزہ ہے جس طرح کہ مذہبی دنیا کا ایک معجزہ ہے "الازہر کے

رواقون (ہوسٹلز) کی تعداد ۱۴ ہے جن میں قوموں مختلف قوموں اور ملکوں کے دس ہزار سے اوپر طلبہ برادرانہ محبت واخلاص کے ساتھ رہتے اور تعلیم پاتے ہیں۔ حکومت مصر اس کے اخراجات کے بجٹ میں سالانہ ایک لاکھ مصری پونڈ دیا کرتی ہے۔ ازہر کے اوقاف کی وسیع اور عظیم آمدنی اس کے علاوہ ہے۔

ازہر اور جدید وقدیم کا فصل ایک مغربی، ازہر کی تعلیمات کا تذکرہ کرتا ہوا لکھتا ہے: "لیکن جس نوع کی تعلیم ان طلبہ نے حاصل کی ہے اس نے اپنے "مضامین" اور "اسالیب" ہر دو لحاظوں سے عمداً اور کاملاً ایک ایسا ماحول پیدا کر رکھا ہے جس کو ترقی عالم نے پیدا کر دیا ہے۔ اس طرح رفتار زمانہ نے ایک وسیع خلیج ازہر اور اس کے خارجی ذہنی دنیا کے مابین پیدا کر دیا ہے، اور اس ذہنی فصل نے رفتہ رفتہ ازہر کے گریجویٹوں کو ایک عجیب وغریب مخلوق بنا دیا ہے۔ یہ جماعت دنیائے حاضرہ سے مس نہیں رکھتی، اسے سمجھنے سے قاصر ہے اور نئی دنیا بھی اس کو سمجھنے سے عاجز ہے۔ یہ حضرات اس بیسویں صدی کی دنیا میں رہتے سہتے ہیں اور ایک دوسری خیالی دنیا میں سوچتے اور سمجھتے ہیں۔" علامہ ابوالکلام آزاد ایک موقع پر دارس عالیہ اسلامیہ کے فرسودہ نصاب وطریقۂ تعلیم کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "موجودہ مدارس عربیہ کے متون وشروح کی عقیم وکج اندیش تعلیم بجائے خود مسلمانوں کے ذہنی تنزل کی پیداوار ہے اور کئی صدیوں سے اسلامی دنیا کے دماغی تنزل کا سب سے بڑا سبب بن گئی ہے اس تعلیم سے ذہن وفکر کی تمام قوتیں پژمردہ ہو جا سکتی ہیں، لیکن آزادانہ نشو ونما نہیں پا سکتیں۔" یہ قول پورے طور پر ازہر اور دیوبند پر صادق ہے کیونکہ یہ مذکورہ مدارس عربیہ کے دو بہترین نمائندے ہیں۔

اصلاحات ازہر کی مختصر تاریخ تحریک اصلاح ازہر کی تاریخ بجائے خود مسلمانوں کے لئے نہایت عبرتناک وسبق آموز ہے۔ گذشتہ ساٹھ سالوں سے ازہر کی اصلاح کی پیہم کوششیں ہو چکی ہیں تاکہ اس کی تعلیم کے معیار کو بلند تر اور اس کے دائرے تعلیم کو وسیع تر کیا جا سکے، اور اس خلیج کو پاٹا جا سکے جو پیدا ہو چکی ہے اور ازہر کو باہر کی ذہنی دنیا سے جس سے وہ غیر مربوط ہے پیوستہ کیا جا سکے۔ متعدد شاہی کمیشنس تحقیقات کر کے رپورٹ دے چکی ہیں، کئی اہم اسکیمیں پیش ہو چکی ہیں، جن کے تذکرہ کا موقع

نہیں رہی۔ یہاں صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ اس طویل مدت کی سعیٔ اصلاح کا کچھ زیادہ ہمت افزا نتیجہ نہ نکلا۔ تاریخ ازہر میں ۱۸۷۲ء کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سنہ میں ہرکت اصلاح نے سب سے پہلی عملی قدم اٹھایا تھا۔ حکومت مصر کے ایک قانون کے ذریعہ اس سنہ میں ازہر کے "صیغہ تعلیمیہ" اور "صیغہ ادارہ" کو دو مستقل ادارات کی صورت میں منضبط و منظم کر دیا گیا اور ادارہ کے دستوری صفت کو متعین کر دیا گیا لیکن اس سے ازہر کے مضامین تعلیمی اور نظام تعلیمی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اور یہ ہو سکتا تھا کیونکہ اس نے کبھی جامعہ کی تعلیمات کی اصلاح مقصود ہی نہیں تھی۔ وہ قانون محض اسکے نظم و نسق سے متعلق تھا اور گو اشد ضروری تھا لیکن اصل مرض کی دوا کبھی نہیں تھا۔ تاریخ اصلاح ازہر کی دوسری اہم منزل ۱۹۱۱ء کا دستور ازہر ہے۔ اس نئے دستور ازہر کا تعلق علامہ شیخ محمد عبدہ مفتی اعظم مصر کی دعوت اصلاح سے ہے۔ خود شیخ کو یہ روشنائی فکر اور یہ روح اصلاح جدید دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مصلح سید جمال الدین اسدآبادی سے ملی تھی، جنہوں نے مصر، شام، عراق، ایران، ترکی اور قریبًا ہر اسلامی ملک میں سیاسی و ذہنی اصلاح و انقلاب کی تخم ریزی کی ہے ۱۹۱۱ء کے دستور ازہر کے مطابق صیغہ ادارت اور صیغہ تعلیمی دونوں میں اصلاحیں کی گئی ہیں صیغہ ادارہ (نظمیہ یا Executive) کو ایک "مجلس الازہر الاعلیٰ" کے حوالہ کر دیا گیا۔ یہ مجلس ۱۲ علماء و ماہرین تعلیم سے مرکب ہے۔ شیخ الجامعہ ازہر اسکا صدر ہے، جو جامعۂ ازہر اور اس کے ملحقات کا رئیس عمومی ہے۔ بڑا فائدہ اس دستور سے "نظمیہ" کو یہ ہوا کہ اس سے شخصیت کا عنصر دور ہو گیا اور شورائیت نے اسکی جگہ لے لی۔ صیغہ تعلیم میں یہ اصلاح ہوئی کہ کلاس سسٹم کا باضابطہ انتظام کیا گیا اور امتحان کا باقاعدہ طریقہ مروج ہوا۔ خود مضامین تعلیم میں ریاضی اور تاریخ جغرافیہ کو داخل نصاب کیا گیا اور سارے نصاب تعلیم کو (۱) نظامی اور (۲) موقت دو حصوں میں منقسم کیا گیا۔ صیغہ نظامی کی تعلیم کو اہل مصر کی ضروریات ملکی کے لحاظ سے موزوں کیا گیا۔ نظامی کو (۱) درجہ اولی (Entrance) (۲) درجہ ثانوی Intermediate اور درجۂ عالی (Bachelor) تین گریڈوں میں تقسیم کیا گیا اور اس کی مدت تعلیم بارہ سال رکھی گئی۔ صیغہ موقت کو ممالک غیر کے طلبہ کے لئے خاص کیا گیا۔ عباس حلمی پاشا

...خدیو مصر کی توجہ ...سے نئی عمارات میں اس ترتیب ازہر کو جگہ دی گئی اور اسکی حیات کے ایک ...دور اور نئے باب کا افتتاح کیا گیا۔ لیکن بایں ہمہ حق یہ ہے کہ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ہر بنیادی تبدیلیوں اور اصلاحوں کا محتاج رہا۔ مفتی عبدہ خود اپنی تجاویز اصلاح کو پوری طرح جاری نہیں کر سکے کیونکہ قدامت پرست علما انکی مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ انکو اصلاحات ازہر میں ناکامی کا بے حد صدمہ و ملال ہوا کیونکہ وہ ازہر کو نشاۃ الجدید اسلامی کا مرکز و منبع بنانا چاہتے تھے اور ان خطرات سے کماحقہ آگاہ تھے جو اسلام اور امت اسلام کو ہر چہار طرف گھیرے ہوئے تھے اور ہیں۔ اصل وجہ ناکامی کی یہ تھی کہ علما کی اکثریت جن کے قبضے میں امت ہے کسی اصلاح کی ضرورت کی قائل نہیں تھی۔ یہ حضرات سرد مہری، حیرت اور بے پرواہی کے ساتھ خارجی دنیا کو دیکھتے رہے، دنیا کے سیاسی معاشی اور سماجی تقاضہائے ارتقا میں جو جو انقلابات ہو رہے تھے وہ اُس سے کنارہ کش و ناآشنا تھے، اور سائنس و آرٹس (علوم و فنون) میں جو جو فتوحات کی جا رہی تھیں اُن سے قطعاً الگ تھلگ رہے

معاشی دباؤ اور علما کی ذہنیت میں تبدیلی | مقام شکر ہے کہ اگر خالص علمی واخلاقی دلائل اصلاح ازہر میں ناکام ہو چکے ہیں تو اب اقتصادی دلائل کامیاب ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاشی محرک Economic motive بڑی زبردست طاقت ہے "علما" نے رفتہ رفتہ یہ دیکھا کہ جس نوع کی تعلیم انہیں دی جاتی ہے اُس نے علما و حقیقتاً ان کو جنگ زندگانی کے بالکل ناقابل بنا دیا ہے اور یہ کہ دنیا اُن جیسے تنگ نظر اور محدود واقفیت کے آدمیوں کا "طلب" Demand انکی رسد Supply سے بہت کم یعنی نفی کے برابر رکھتی ہے۔ گویا انہوں نے والٹیر کے اس قول کی صداقت کو دیکھ لیا ہے کہ "فلسفہ جاننے سے پہلے آدمی کو اپنی روزی کمانے کا طریقہ سیکھنا چاہئے"۔ چنانچہ آج یہ "علما" ہی ہیں جو طلب اصلاح میں سب سے آگے آگے ہیں اور اس کے لئے برابر شور برپا کر رہے ہیں تاکہ انہیں کوئی ایسی تعلیم ملے جو انکی ذہنیت و علمیت کو وقت کی علمیت و طلب سے متوازن کر دے۔ اس وقت ...اور وقت کی علمیت میں کچھ قدر مشترک نہیں ہے۔ زمانہ کی غیر محسوس تبدیلیوں اور مسلسل ...توازن کو کھو دیا ہے جو کسی عہد میں ازہر اور نظامیہ بغداد کے نصابوں اور انکے وقت

کے دوائیر ذہنی کے درمیان قائم تھا۔ یہ عدم توازن وقت کی ترقیوں نے پیدا کیا ہے، جس کے ساتھ ملنے سے ادارہ اصحاب نظامیہ نے انکار کر دیا ہے۔ "یونیورسٹی" اور "سکون" دو متضاد چیزیں ہیں۔ حرکت ہر میدان زندگی ہے لیکن ایک جامعہ علمی کے لئے حرکت اور ترقی تو اصل حیات (Principle of life) کا حکم رکھتی ہیں۔ لیکن صریح بے انصافی ہوگی اگر اصلاح ازہر کے مسئلہ پر علماء کے تغیر رائے کو محض معاشی اسباب کی پیدائش خیال کر لیا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ نصف صدی کی مسلسل بحث و تمحیث اور تبادلہ افکار نے، جس کی پشت پر دنیا کے احوال کے علمی شاہدات موجود ہیں، خود علماء کی ذہنیت میں زبردست ترقی و فراخی پیدا کر دی ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ یہ بیداری کچھ مصر تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر رجحان ہے۔ حالات بعد از جنگ عالمگیر نے اس کی رفتار کو تیز تر اور اس کے دائرہ اثر و عمل کو وسیع تر کر دیے ہیں اور روز بروز کرتے جاتے ہیں

شیخ الازہر علامہ مصطفےٰ المراغی | بڑے آدمی نہ صرف اپنے وقت کے پیداوار ہوتے ہیں بلکہ اپنے وقت کے پیدا کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔" علامہ شیخ مصطفےٰ المراغی انہیں بڑے آدمیوں میں سے ہیں، وہ عہد حاضر کے روشن خیال اور اصلاح طلب علمائے امت کے نمائندہ بھی ہیں اور انکے بہترین قائد فکر و عمل بھی ہیں بیداری کی پیداوار بھی ہیں، اور خود بیداری پیدا کرنے والے بھی ہیں۔ آپ آج سے تین سال قبل ۱۹۲۸ء میں ازہر کے شیخ یعنی ریکٹر مقرر ہوئے۔ آپ غیر معمولی قابلیت، ممتاز، روشن خیالی اور نہایت جاذب و زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔ ازہر کی ریکٹر شپ کے پہلے ہی سے آپ فضلائے مصر میں درجہ امتیاز حاصل کر چکے تھے۔ آپ سوڈان کے قاضی اور مصر کے مفتی اعظم کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور جس عہدہ پر رہے ہیں کامیاب رہے ہیں۔ اعلیٰ علمی کمالات اور نظامی قابلیت کے علاوہ اعلیٰ اخلاق اور روشن خیالی کے ذریعہ اپنے ملک کی تمام پارٹیوں، قوموں اور طبقوں کی اچھی رائے اور اعتماد حاصل کر لی ہے حتیٰ کہ غیر ملکی طبقے بھی جن میں اہل یورپ شامل ہیں آپ کی علمیت اور قابلیت کا لوہا مان گئے ہیں۔ آپ علوم اسلامی و عربیات کے فاضل ہونے کے علاوہ مغربی زبانوں اور دنیا کی جدید تحریکوں سے بھی کماحقہ آگاہ ہیں۔

شیخ مصطفےٰ المراغی کی تحریک سے سارے ملک کی مذہبی تعلیم کے نظام کا عمیق مطالعہ کیا گیا اور بعد تحقیقات ایک مکمل اسکیم، اصلاحات کی تیار ہوئی ہے۔ یہ اسکیم مدارج ترمیم و تنسیخ طے کر چکی ہے مصری کیبنٹ یعنی مجلس الوزری نے اسکو منظور کر لیا ہے۔ سلطان مصر نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا ہے۔ وہ مسودہ قانون کی صورت میں مرتب بھی ہو چکی ہے۔ صرف باضابطہ طور پر مصری پارلیمان میں دستخط نہیں ہو کر منظور نہیں ہوئی ہے۔ صرف ایک ہی دستوری رکاوٹ اس کے اجرا میں حائل ہے اور اس کے لئے مصر کے موجودہ پیچیدہ سیاسی مشکلات اور اس کی مصروفیت ذمہ وار ہے ورنہ ازہر کو ایک جدید اسلامی یونیورسٹی بنانے کے لئے اب پوری آمادگی و تیاری ہو رہی ہے۔ آٹھ لاکھ پونڈ اسی غرض کے لئے بجٹ میں پاس بھی ہو چکا ہے۔ امید کیجاتی ہے کہ مصر جلد سے جلد اس اصلاحی بل کو ایک دستور کی صورت میں نافذ کرنے میں کامیاب ہوگا۔

مقاصد

مراغی اسکیم اصلاحات ازہر | اصلاحات ازہر کی اس اسکیم کے مطابق جامعہ اسلامیہ ازہر کے مقاصد یہ ہونگے کہ (۱) اولاً وہ اسلام کی اس کے تمام اصول و مبانی کے ساتھ تحفظ و ترقی کی ضمانت کریگی۔

(۲) ثانیاً وہ علوم اسلامیہ اور عربیات کی اس طرح تعلیم، ترویج و توزیع کریگی کہ امت کے لئے مفید ہو اور ملک کی سعادت کی ترقی میں معاون ہو۔

(۳) ثالثاً ایسے علماء کو پیدا کرے گی جو ان چیزوں کی تعلیم و تبلیغ کے فرائض ملک کے مدارس مذہبی اور مخصوصیات دینی میں انجام دے سکیں، گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں کام کر سکیں اور دوسرے پبلک وظائف کو احسن وجوہ پورا کر سکیں۔

نظام تعلیم اور صیغۂ اولیٰ اور ثانوی

مراغی اصلاحات کچھ ازہر ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ وہ دولت اسلامیہ مصر کی ساری مذہبی تعلیم کے سب نظام پر حاوی ہے۔ ملک کی مذہبی تعلیمات دو بالکل معین صیغوں میں منقسم ہوگی یعنی

(۱) صیغہ اعلیٰ وتخصیصی اور (۲) صیغہ ابتدائی وثانوی۔ ازہر صیغہ اولیٰ وثانوی کی تعلیمات سے دست بردار ہو جائیگی۔ ملک کی ابتدائی وثانوی تعلیمات دینی تمام تر ازہر کے ملحقات میں جنہیں "معاہد دینی" کہتے ہیں مرکوز ہوگی۔ جامعہ ازہر کے مرکز سے صرف انکی عام ہدایت ونگرانی کیجائے گی جیسا ہمارے ملک کی یونیورسٹیاں اپنے ملحقہ کالجوں اور اسکولوں کی ہدایت ونگرانی کرتی ہیں۔ ازہر کے ملحقہ مدارس عالیہ میں سے حسب ذیل معاہد فرسٹ گریڈ کالج ہونگے۔

(۱) معہد اسکندریہ	فرسٹ گریڈ دینی کالج	تعلیم اولیٰ وثانوی
(۲) معہد طنطہ	"	"
(۳) معہد اسیوط	"	"
(۴) معہد زقازیق	"	"

ان فرسٹ گریڈ کالجوں میں ہمارے ملک کے بی اے ڈگری تک اسلامیات کی تعلیم مصر کی عام ملکی تعلیمات وفنون مروجہ کی کافی تعلیم کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو کیجائیگی۔ ان چار فرسٹ گریڈ ملحقہ کالجوں کے علاوہ متعدد سکنڈ گریڈ دینی کالج ہوں گے جن میں صرف اسلامیات کی ادنیٰ یعنی ابتدائی تعلیم مہیا کیجائیگی۔ کوشش کیجائیگی کہ انکے نصاب تعلیم کو ملک کے عام نصاب تعلیم سے ملا دیا جائے اور دین و دنیا کی نامبارک تفریق کو مٹا دیا جائے، سکنڈ گریڈ کالجوں میں جن میں اسلامیات کی ادنیٰ وابتدائی تعلیم مہیا کیجائیگی۔ یہ کوشش سب سے زیادہ ظاہر ونمایاں ہوگی، اس سے کمتر فرسٹ گریڈ دینی کالجوں میں، اور سب سے کم اس سارے نظام کے مرکز عمومی یعنی جامعہ ازہر میں۔ جو دو اصول اس جدید نظام تعلیم میں ملحوظ ہیں وہ اصل تعمیم و اصل تخصیص ہیں ابتدائی مدارس دینی میں تعلیم زیادہ سے زیادہ عام و وسیع ہوگی۔ فرسٹ گریڈ کالجوں میں دینی تعلیم کی تخصیص کی طرف جس کی ابتدا مدارس ابتدائی میں کی گئی تھی، پہلا اقدام ہوگا اور خود جامعہ ازہر کی پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں صرف اعلیٰ تعلیم وتخصیصی مضامین کی تعلیم مہیا کیجائیگی۔ بالفاظ دیگر مذہبی تعلیم کے اس جدید نظام کی رو سے مدارس ابتدائی زیادہ سے زیادہ اصل تعمیم Principle of genralisation کی پیروی کرینگے اور اس سارے نظام کے مرکز عمومی جامعہ ازہر زیادہ

اصول تخصص (Principle of Specialisation) کی پیروی کرگئی۔

نظام تعلیم اور صیغۂ اعلیٰ و تخصیصی

صیغہ اعلیٰ تخصیصی کی تعلیمات تمام تر جامعہ ازہر میں مرکوز ہوگی۔ یہ صیغہ اسلامیات کے درجہ پوسٹ گریجویٹ کے مترادف ہوگا۔ اس لحاظ سے ازہر کی حیثیت ان تعلیمی و الحاقی یونیورسٹیوں کے مطابق ہوگی جو صرف ایم۔ اے اور ایم۔ اس ای یعنی رشد و فضیلت کی سب سے اونچی تعلیم اور سب سے اونچی ڈگریاں دیا کرتی ہیں۔ ازہر میں فی الحال فیکلٹی یعنی شعبہائے تعلیمی کا انتظام کیا جاتا (۱) شعبہ اول الٰہیات، اور قرآن و حدیث (۲) شعبۂ ثانی شریعت اسلامیہ و حکمۃ التشریع یعنی فقہ اسلامی اور جوریس پروڈنس (Jurisprudence) اور (۳) شعبۂ ثالث عربیات یعنی عربی زبان و ادب اور اس کے متعلقات۔

علاوہ ان فیکلٹیوں کے ازہر میں فن تعلیمات، فن تبلیغ و خطابت اور علم روحانیات کی اعلیٰ تخصیصی اور تحقیقی تعلیم کے صیغے بھی کھلیں گے۔ قاہرہ۔ طنطہ۔ سوہج اور کینا میں منتخب علمائے محققین کے لئے بھی اعلیٰ انتظامات ہونگے یہ فضلا کا ایسا ہوا گروہ اپنے آپ کو یکسر اسلامیات اور عربیات کی تحقیق و تدقیق کے لئے وقف کر دیگا۔ یہ جماعت براہ راست شیخ الازہر کے زیر ہدایت ہوگی۔

نصاب جدید

مرامی اسکیم کے مطابق پرائمری تعلیم کا کورس ۵ سال کا، سکنڈری تعلیم کا ۴ سال کا اور اعلیٰ تعلیم کا ۸ سال کا ہوگا۔ جماعت اولیٰ (پرائمری) میں ان لوگوں کا داخلہ ہوسکیگا جو (۱) عمر کے لحاظ سے ۱۰ سال کے میان ہوں (۲) قرآن کے جاننے والے ہوں اور عربی پڑھنے لکھنے اور حساب کتاب کے اندر امتحان داخلہ پاس کر سکتے ہوں۔ غیر ملکی طلبہ کی سہولت مزید کے لئے داخلہ کا عمر ۱۸ سال تک بلند کر دیا گیا ہے اور انکو حفظ قرآن کے شرط داخلہ سے بھی بری کر دیا گیا ہے۔

ازہر کی تاریخ میں مراغی اسکیم کے ذریعہ سب سے اول مذہبی تعلیم کے نصاب میں علوم جدید اور یورپ و ایشیا کی بڑی بڑی زندہ زبانوں کی تعلیم کو لازماً مضامین تعلیمی میں شامل کیا جائیگا۔ مجوزہ پروگرام کو بامعان نظر دیکھنے سے واضح ہوجائیگا کہ پرائمری (اولیٰ) اور سکنڈری (ثانوی) تعلیم دینی کے صیغوں کو گورنمنٹ ہائی اسکولوں اور کالجوں کے مطابق اور متوازی رکھا گیاہے اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ ان میں مذہبی تعلیمات مستزاد ہیں، قرآن وحدیث، فقہ، سیرت النبی اور تاریخ اسلام کو ان میں لازمی اور جبری رکھا گیاہے۔ صیغۂ ثانوی یعنی ازہر کے فرسٹ گریڈ کالجوں میں جن کا اوپر ذکر ہوچکاہے علاوہ مذکورہ مضامین دینی کی تعلیم کے ریاضیات، علوم طبعیہ Physical science منطق قدیم منطق استقرائی (جدید)، فلسفہ جدید، نفسیات و اخلاقیات کے مضامین کو رکھا گیاہے۔ تمام فکلٹیوں میں جدید یوربین زبانوں کی تعلیم کو بھی رکھا گیاہے لیکن عربیات اور الٰہیات کی فکلٹیوں میں علاوہ مغربی زبانوں کے مشرق کی زندہ زبانوں کی تعلیم بھی دیجائیگی۔ زبانوں کی تعلیم اختیاری ہوگی یعنی طلبہ کو کئی مشرقی زبانوں میں سے کسی ایک کو پسند کرنا ہوگا۔ اسی طرح آنکے آگے کئی مغربی زبانوں کی تعلیم کا متبادل پیش ہوگا اور انکو پسندیدگی کی آزادی دیجائیگی تاکہ وہ اپنی طبعیت وضرورت کو ملحوظ رکھ کر ان میں سے کوئی زبان چن لیں۔

طریقۂ امتحان میں اصلاح ناکام طلبہ کے دوبارہ امتحان کے متعلق سخت قوانین تجویز ہوئے ہیں ایک مدت مقررہ اور چند سالہائے معینہ کے اندر اگر کوئی طالب علم امتحان میں بار بار ناکام ہوا، یا غفلت سے امتحان میں شامل نہ ہوا، تو اس کا نام کٹ جائیگا اور اسکا وظیفہ بند ہوجائیگا، اور پھر اس کو ازہر میں بیکار کاہلی کی روٹی کھانے کا موقع نہیں ملیگا۔ یہ قانون جہانتک صیغۂ تعلیمی اور صیغۂ ادارۃ کا تعلق ہے سب سے زیادہ صحت بخش اور سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ ازہر کو بیکار، کاہل، اور مفت خور عناصر فاسدہ سے پاک کردیگا اور اس طریقہ فرسودہ کو ختم کردیگا جس کے ماتحت زمانہ دراز سے طلبہ اور کاہلوں کی ایک ایسی بڑی تعداد اس میں داخل ہوگئی ہے جو ایک دفعہ داخل ہونے کے بعد پھر زندگی وہیں مفت کی خورد ونوش و رہائش کے سہارے گذارتی ہے، کوئی تعلیم حاصل نہیں کرتی ہے، کوئی

متحان نہیں دیتی ہے - اور کوئی توجہ "مسند" کے حصول یا کسی اور مفید کام کے کرنے کی طرف نہیں کرتی ہے۔ بلکہ بیکار پڑی حکومت مصر کے وظیفہ پر زندگی کاٹتی ہے۔ اور عظیم فسادِ اخلاق کا باعث بنتی ہے۔ اسکا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس جماعت نے ازہر پر اس طرح قبضہ کر رکھا ہے کہ اس میں سچے طالبعلموں کے لئے جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ ایسے طلبائے صادق کے لئے ازہر کا دروازہ بند ہے لیکن مجوزہ قانون اس نظامِ فاسد کی اصلاح کے لئے وضع ہوا ہے اور اسکا خاتمہ قریب ہے۔ امتحانات میں سختی کیجائیگی لیکن جامعہ ازہر بدستور دنیائے اسلام کی ایک عالمگیر بین الاقوامی یونیورسٹی رہے گی۔ اس کا دروازہ تمام ملکوں کے مسلم طلبہ پر کھلا ہوگا اور طلبہ کی تعلیم رہائش کی کوئی فی (Fee) نہیں لیجائیگی۔ رواقوں کے عادات اور انتظامات میں بھی زبردست اصلاحیں کیجائیں گی تاکہ انکی فضا علم وفضل کے حصول کے موافق ہو۔ جامعہ میں حفظ صحت اخلاقی کے علاوہ اصول طبی جن کا بھی لحاظ کیا جائیگا۔ اس کا ایک اپنا ہوسپٹل بھی بننے والا ہے۔

صیغۂ ادارۃ اور شیخ الازہر کی حیثیت

مجوزہ قانونِ اصلاحات کے مطابق مملکت مصر کے اس وسیع وعظیم، نظامِ تعلیم دینی کا ایگزیکیٹو (Executive) یعنی صدر اعظم صاحب السعادۃ شیخ الازہر ہوگا جو تمام "علمائے کبار" کی طرح "فرمانِ شاہی" کے ذریعہ نامزد ہوگا اور "الہیئت الکبار العلما" کے اندر سے منتخب ہوگا۔ لیکن شیخ الازہر کی حیثیت جامعہ ازہر اور اس کے ملحقات کے صدر اعظم سے کچھ زیادہ ہے وہ صرف مملکت مصر کی دینی تعلیمات کا ہیڈ نہیں ہوگا بلکہ بلادِ مصر کے دساتیر اسلام کا رئیس عمومی بھی ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس کی حیثیت مصر کے شیخ الازہر کے ساتھ ساتھ شیخ الاسلام کی بھی ہوگی۔ وہ دولت مصریہ کے ہر عالم اور فقیہ کی نگرانی کریگا اور انکے اخلاق و اعمال کو دین اسلام کی شان کے مطابق رکھیگا۔

علمائے کبار اور ہیئت الکبار العلماء

شرائط داخلہ | چونکہ ادارات ازہر اس ہیئت کبیرسے پیوستہ ہیں اس لئے انکا تذکرہ یہاں ضروری ہے

مملکت مصر و سوڈان میں اس مجلس کو وہی حیثیت حاصل ہے جو یونان کے عہد قدیم میں ریاست ایتھنز کی "گرینڈ آریوپیگس" (The grand Areo pagus) کو حاصل تھی یا پھر پیٹر اعظم کے قبل مملکت روس میں ہولی سینوڈ Holy Synod کو حاصل تھی۔ لیکن اسلام کی اس مجلس اعلیٰ کی رکنیت کے شرائط اور وظائف کی انجام دہی کے معیار اتنے آسان، سہل اور محدود نہیں ہیں جتنے ہولی سینوڈ کے تھے۔ اس ہیئت کے رکن بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک شخص ۴۵ سال کا ہو، کم سے کم ۵ سال سے "عالم" کا سند رکھتا ہو، اور کسی نہ کسی صیغہ تعلیمی میں پروفیسر یا شرعی مجسٹریٹ قاضی یا مفتی ہو، یا کسی ایسے اعلیٰ دینی عہدہ پر ہو جس پر تقرر بذریعہ "فرمان شاہی" ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شخص نہایت متشرع اور متدین ہو، اور پاکیزہ اخلاق کا مالک ہو، نیک نام اور باعزت ماضی اپنے پیچھے رکھتا ہو، اور کوئی اعلیٰ پایہ اور بلند معیار کی تصنیف معاملات دین یا دوسرے متعلقہ مضامین سے کسی ایک مضمون پر شائع کر چکا ہو اور کم سے کم ۱۶ ارکانِ ہیئت نے اُس کے داخلہ کی تائید کی ہو۔

شرائط اخراج | جس طرح ہیئت کے داخلہ کے شرائط کو بہت بلند اور سخت رکھا گیا ہے۔ اسی طرح علماء سُو کی تعزیر کے ضوابط بھی رکھے گئے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ علماء اسلام کی جماعت کیا بلحاظ علم و فضل کے اور کیا بلحاظ اخلاق و عمل کے امت اسلام کے لئے باعث فخر ہو، اُن سے ملت کو روشنی، انسانیت کو صلاح اور فلاح کا (سبل السلام) اور مملکت مصر کی ہیئت اجتماعیہ کو اجتماعی ضمیر و روحانیت حاصل ہو۔ کوئی عالم خواہ اسکا کوئی منصب ہو اور وہ کسی عہدہ پر بھی ہو اگر وہ کسی ایسے فعل کا مجرم ہو جائے جو "عالم" کی شان کی توہین ہے یا کسی ایسے کام کا ذمہ دار ہو جس سے اسلام کے اصول کو صدمہ پہنچتا ہو یا کسی ایسے خیال و عمل کے پھیلانے کے لئے جوابدہ ہو جو علم و اسلام کی شان سے بعید ہو تو وہ شیخ الازہر کے مطالبہ و تحریک اور "ہیئت الکبار العلماء" میں سے ۱۹ ارکان کی کثرت رائے سے، عالموں کے گروہ سے خارج کر دیا جائیگا۔ اُس سے اُسکا عہدہ و امتیاز چھین لیا جائیگا۔ جامعۂ ازہر کے رجسٹر سے اس کا نام کاٹ دیا جائیگا، اور وہ پھر کسی عہدہ پر متعین نہیں ہو سکیگا۔ تین سال گذرنے کے بعد ایک اس طرح کا سزا یافتہ آدمی دوبارہ داخلہ کی عرضی دے سکتا ہے، بشرطیکہ وہ کافی و شافی شہادتوں کے ذریعہ

غیر جانبدار عدالتوں میں یہ ثابت کر سکے کہ اُسکی سیرت و اخلاق میں اب اصلاح ہوگئی ہے اور وہ دا ہی [illegible] سے تائب ہوگیا ہے۔ دوبارہ داخلہ کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو اول داخلہ کے [illegible]

اسلامی دنیا کا آئندہ ذہنی مرکز

تو یہ ہے مختصر خاکہ آئندہ اسلامی دنیا کے مرکز ذہنی ذکری کا۔ اسلام کو اس جدید نظام سے کیا فوائد حاصل ہونگے محتاج ثبوت نہیں ہے۔ یہ توقع کیجاتی ہے کہ مراغی اسکیم ازہر کو اسلام کی ایسی یونیورسٹی بنادیگی جس سے ایسے علماء پیدا ہوں گے جو مذہب اسلام سے عمیق محققانہ آگاہی رکھنے والے ہونگے لیکن ساتھ ہی ذہنی معلومات عامہ سے بھی مسلح ہونگے، وہ نئی دنیا کی نئی زبانوں سے واقف، نئے طریقہ ہائے فکر و نظر سے آشنا اور نئے خیالات و حالات سے خبردار ہونگے۔ پہلا بڑا فائدہ اسکا یہ ہوگا کہ جدید و قدیم کا فصل وصل سے بدل جائیگا۔ ازہر کی علمی ذہنیت کو خارجی دنیا کی ذہنیت سے توازن حاصل ہوجائیگا۔ اسلام کو دنیا میں زبردست نئی طاقت حاصل ہوجائیگی اور دنیائے اسلام میں مدارس عالیہ عربیہ کی اصلاح کی تحریک کو نہ صرف روحانی و اخلاقی تقویت حاصل ہوگی بلکہ ایک عملی نمونہ اُنکے آگے ہوگا جس کے ماڈل پر وہ اپنے نظام تعلیم اور نصاب کو از سر نو مرتب کرسکتے ہیں۔

شعبہ ہائے تعلیمی پر ایک نظر

شعبہ علوم اجتماعیہ کی کمی | مراغی اسکیم کے لائحہ اصلاحیہ کی تنقید ہمارا مقصود نہیں ہے۔ اس کام کے لئے علماء و ماہرین تعلیم کو توجہ کرنی چاہئے۔ میں آج جامعہ ازہر کے مجوزہ (Faculties) شعبہ ہائے تعلیم میں ایک بڑے اہم شعبہ تعلیم (Faculty) کی کمی پر چند سطور لکھنا چاہتا ہوں۔ غالباً اس عنوان پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ میری مراد Faculty of social sciences یعنی شعبہ علوم اجتماعیہ سے ہے۔

علوم اجتماعیہ سے وہ علوم مراد ہیں جن کا موضوع مجرد فرد اور اس کے قوا و احوال نہیں بلکہ جماعت اور اس کے مختلف احوال ہیں۔ ایک ایک اجتماعی علم نے جماعت کے ایک ایک مخصوص سوشیل پہلو کو اپنی تحقیق، مشاہدہ اور مطالعہ کے لئے چن لیا ہے لیکن ان سب کا گہرا تعلق باہمی سے بغیر ایک کے دوسرے کو بخوبی سمجھنا مشکل ہے۔ ان میں باہمی فرق زیادہ تر تعلیم و مطالعہ کی علمی سہولت کے لئے کیا گیا ہے فی الواقع وہ اسی طرح باہم مربوط ہیں جیسے سماجک حوادث (Social Phenomenon) باہم پیوستہ ہیں۔

علوم اجتماعیہ میں آج سب سے زیادہ اہمیت، سیاسیات (یعنی علم السیاستہ و فلسفۂ سیاست) کو حاصل ہے معلم اول ارسطو نے اپنی "کتاب السیاستہ" میں اس کو "اشرف العلوم" کا عالیشان لقب عطا کیا ہے عصر حاضر میں معاشیات کو سیاست کا ہمسر تسلیم کیا جا رہا ہے بلکہ "سلطنت" (اسٹیٹ) اور "مدبرین سلطنت" (Statesmen) کے لئے اس کے اوپر عبور رکھنا ضروری و لازمی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسیات او معاشیات دو توام نہیں ہیں۔ ان دونوں کے پہلو میں فلسفۂ اجتماعی (Social Phelosophy) ہے لیکن تمام سوشیل سائنسوں کے اوپر علم الاجتماع (Sociology) اور سب کے نیچے لیکن سب سے زیادہ عام تعلیم و عام اشاعت کا مستحق مدنیات (Civics) ہے مدنیات شہر، شہری اور شہریت سے بحث کرتی ہے۔ اسکا موضوع "شہری" ہے لیکن وہ شہری کا اسکے تمام سیول Civil اور پولیٹیکل جغرافی و معاشی، تاریخی و نسلی، دینی و اخلاقی تعلقات و موثرات کی روشنی میں مطالعہ کرتی ہے، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھتی ہے، اور اس کے مقامی، قومی و انسانی روابط کی توضیح کرتی ہے۔ مدنیات، علوم اجتماعیہ کے اندر سب سے زیادہ عملی علم ہے کیونکہ اس کا بڑا مقصد علوم اجتماعی کی روشنی میں "شہری" کی تہذیب و تعمیر ہے، وہ تمام علوم اجتماعیہ کے استقرائی اصول و نتائج سے فائدہ اٹھاتی ہے، وہ اپنی برادری میں سب سے کم عمر ہے لیکن بحالات حاضرہ اسکا دائرہ بحث سب سے وسیع اور اس کی اشاعت عام کی ضرورت سب سے زیادہ اہم ہے۔ تمام آزاد و ترقی یافتہ ملکوں میں مدنیات کی تعلیم اسکولوں میں لازمی ہے۔

شعبہ علوم اجتماعیہ کے قیام کو میں ہر جامعۂ اسلامی کے لئے علی الخصوص نہایت اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں: (۱) اولاً جدید اسٹیٹ اور جدید سوسائٹی کی عمومی ضروریات کے لئے علوم اجتماعیہ کی تعلیم اور مدنیات کی عام ترویج و تعمیم نہایت اہم و ضروری ہے۔ ریاست، حکومت۔ اور ادارات جمہوریہ، کے اصول اور میکانزم (Mechanism) اتنے نازک اور پر پیچ ہیں کہ بغیر خاص مطالعہ کے انکا فہم اور ان پر تبصرہ و تنقید محال ہے لیکن ساتھ ہی اس عہد جمہوریۃ میں آن کی نوعیت ایسی ہے کہ بغیر جمہور کے فہم و تعاون کے انکی کامیابی مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ریاست سے بھی زیادہ پر پیچ اور اہم جدید "معاشی نظامات" ہیں جن کا گہرا اور براہ راست تعلق ہر فرد و ہر شہری سے ایسا ہے جیسے خون کا جسم سے ہے۔ بنابریں ہر ملک میں ان علوم کی تعلیم کو اولین اہمیت حاصل ہے اور جامعات اسلامی کے اندر بھی ضرور حاصل ہونا چاہئے کیونکہ وہ اسٹیٹ اور سوسائٹی کے اندر ہیں باہر نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جدید اسٹیٹ اور جدید سوسائٹی کی ضروریات کا مطالبہ ہے کہ جامعات اسلامی علوم اجتماعیہ کے درس کو اپنے دروس میں شامل کریں (۲) ثانیاً امت مسلمہ کے معاملات کی تعدیل اور شریعۃ اسلامیہ کی محافظت و ترقی کے لئے علوم اجتماعیہ کی روشنی سے استفادہ خصوصی طور سے ناگزیر اور واجبی ہے۔ آج مسلمانوں کے لئے علوم اجتماعیہ کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ توجہ اور محنت کی مستحق ہے جتنی انہوں نے "عہد عباسیہ میں" غلطی سے مابعد الطبیعات، نظری فلسفہ، اور علم الکلام جیسے محض قیاسی و ظنی مضمونوں پر صرف کی تھی۔ اگر زمنہ وسطی میں عمرانی ثروت، اور یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفوں کے تراجم نے مسلمانوں میں نظری فلسفیانہ کرید پیدا کی تھی اور اس کرید کی لازمی خوگیوں نے علم کلام کے ڈھونار معرض وجود میں لائے تھے جن کو اہل حق آج قابل سوخت قرار دیتے ہیں یا عجائب خانہ کے آثار عتیقہ کے درمیان قابل نمائش(۱)، تو آج عہد حاضر کی عمرانی مصیبتیں اور جدید ریاست، جدید معیشت، جدید عائلہ، اور "جدید اخلاقی و دینی رجحانات" کی حقیقی و عملی ضروریات ان پر سیاسیات

---

(۱) ملاحظہ ہو "مذہب و عقلیات" از پروفیسر عبد الباری ندوی جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد اور "تذکرہ" از علامہ ابوالکلام آزاد

معاشیات، دینیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے مطالعہ اور تحقیق کو واجبی و لابدی بنا رہی ہیں۔ اگر عہد عباسیہ میں "غیبیات ماورا طبعی" انکا میدان فکر تھا تو آج عہد حاضر میں موجودات اجتماعی کو ہونا چاہئے اگر کل وہ ایک فارغ البالی فضا میں بے فکری اور آزادی کے ساتھ ظنیات کے عالم میں "اڑ رہے تھے" تو وقت کی صعوبتوں کا تقاضا ہے کہ وہ آج عملیات کی دنیا میں شاہدہ، تجربہ، علم اور عقل عملی کی روشنی میں "پھونک پھونک کر قدم رکھیں، خود سنبھلیں اور دنیا کو بھی سنبھالیں، خود آگے بڑھیں اور دنیا کو بھی آگے بڑھائیں، خود منزل فلاح پر پہنچیں اور دنیا کو بھی پہنچائیں۔ خلاصہ یہ کہ خود امت وسطیٰ اور دین قیم کی فلاح و ترقی کا مطالبہ ہے کہ مسلمان علوم اجتماعیہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کریں زیادہ سے زیادہ انکی تحقیق و تعلیم میں حصہ لیں، زیادہ سے زیادہ انکی روشنی کو پھیلائیں اور پھر انکی روشنی و ہدایت کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو اس مخصوص روشنی و ہدایت کو بھی پھیلائیں جو جمعیۃ بشری کی "سعادت" اور کافۂ انسانی کی "فلاح کے لئے" اسلام نے لایا ہے۔ اگر اسلام صرف ایک شخصی عقیدہ یا انفرادی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی مذہب ہے، جس کے اصول، اجتماعی و تمدنی مصالح پر مبنی ہیں، جو دنیا اور ماورائے دنیا دونوں میں جماعت انسانی کو "فلاح" بخشنے کو آیا ہے تو لازم ہے کہ محض خطیبانہ جوش بیان اور جذباتی زور حمایت کو چھوڑ کر سیاسیات و معاشیات و اجتماعیات و اخلاقیات کے متین و حکیمانہ لیکن ہمیشہ ناقدانہ مطالعہ کی روشنی میں دنیا کے سامنے اسلام کے نظام ہائے سیاسی و معاشی اور دین وسطیٰ کے اصول اجتماعی و اخلاقی کو جرأت کے ساتھ پیش کیا جائے، اس لئے نہیں کہ حامیان اسلام پڑھیں اور خوش ہوں بلکہ اس لئے کہ جماعت بشری اپنے اجتماعی مشکلات کا حل اس میں پائے، اور انکو اختیار کرکے نجات حاصل کرے۔ محض خطابت اور جذبات فروشی کا اب زمانہ گذر گیا ساری دنیا اور خاصکر اسلامی دنیا اب عملی سیاسی و معاشی مشکلات میں گرفتار ہے، جمہوریت معہ اپنے پیدا کردہ مسائل و اشکال کے ان میں نفوذ کر رہی ہے، اپنے استقلال و ہستی کی حفاظت کے لئے وہ خواہی نخواہی صنعت گری (Industrialisation) کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں، اشتراکیت و سرمایہ داری کے سوال بھی انکے سامنے شد و مد کے ساتھ آرہے ہیں، اپنی سلطنت و معیشت کی حفاظت

...ہ کے مذہب کو اختیار کر رہے ہیں۔ جدید اجتماعی احوال میں، وہ عہد وسطیٰ و عباسیہ کے مدون ... کو جو ہارون الرشید کی سلطنت و جماعت کے لئے وجود میں آیا تھا، اپنے لئے نہ صرف ناکافی پاتے ہیں بلکہ خود اُس کے اپنے مسلمہ اصول کے مطابق بھی مزید ترقی اور پھیلاؤ کے تمام دروازے بند پاتے ہیں لیکن مسلم اقوام اور دول اسلامی ایسے سخت و نازک احوال سے دوچار ہیں، کہ ذرا سا تامل و توقف انکو ملیامیٹ کر دینے کے لئے کافی اور ذرا سی غفلت ان کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے لئے بہت ہو۔ ایک بڑا اہم اور قدرتی نتیجہ اس صورت حال کا یہ ہوا ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں شریعت اسلامی محض لوگوں کا شخصی "ضابطہ قوانین" بن کر رہ گئی ہے۔ ترکی، مصر، ایران اور افغانستان ہر جگہ اس کی حیثیت ایک ایسے مجموعہ ضوابط سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے جس کی طرف افراد، رسمیات و عقائد مذہبی کے لئے رجوع کرتے ہیں لیکن جب سے سلطنتیں اپنے سیاسی و معاشی نظاموں میں آزاد ہیں، کیونکہ اُن دوائر کے لئے انہوں نے مجبوراً و ضرورتاً مجالس تشریعی Legis latures) بنا رکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلامی میں تجزیہ دین و سیاست عرصہ ہوا واقع ہو چکا ہے، چرچ اور اسٹیٹ Church & State کی تفریق عمل میں آ چکی ہے۔ "قانون مقدس" اور "قانون دنیوی" کا امتیاز قائم ہو چکا ہے، حالانکہ مسلمان وحدتِ سیاست و دین کی صدا زمانے لگا رہے ہیں اور اب بھی لگانے سے نہیں تھکتے۔ کاش وہ دیکھتے کہ جس وحدت کا وہ دعوے کر رہے ہیں وہ متاع ا... کے پاس نہیں ہے۔ لیکن چرچ اور اسٹیٹ کی جس تفریق کا وہ با... بار یورپ کو طعنہ دیتے ہیں، وہ زمانہ جدید سے خود انکے درمیان پیدا ہے اور سراسر اُنکے جمود و گمراہی کی زائیدہ ہے۔ مسلمانوں نے دنیا کے اجتماعی احوال سے عرصہ سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی اور اپنے اوپر

لہ آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا | منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا | قومیں کچل گئیں ہیں جس کی رواروی میں

"اقبال"

علوم اجتماعیہ کی تحصیل کو اسی طرح حرام کر رکھا تھا، جس طرح صدیوں سے کتاب وسنت سے براہ راست ہدایت حاصل کرنے کو حرام کر رکھا ہے، اور فکر و اجتہاد کے تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے، یہ روش سراسر اس دعوت کے مخالف ہے کہ اسلام ایک اجتماعی وتمدنی مذہب ہے، اور اس کے اصول ومقدمات ہمیشہ کے واسطے جماعت انسانی کے لئے منبع ہدایت و سرچشمہ قوانین رہیں گے۔

اسی دوسری وجہ کے ماتحت، کہ علوم اجتماعیہ کی تحصیل خود امت مسلمہ و شریعت اسلامیہ کی ترقی وسعادت کے لئے ضروری ہے، دو نہایت ضروری اور اہم نکتے قابل لحاظ ہیں اور وہ گویا دلیل ثانی کی مزید توضیح ہیں:

(الف) فقہ اسلامی اور حکمۃ التشریع کے شعبہ کی تقویت و تائید کے لئے بھی نہایت ضروری ہے کہ شعبۂ علوم اجتماعیہ کو قائم کیا جائے۔ فقہ اسلامی کی محافظت و ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں اس کو قرآن وسنت اور منہاجِ خلافتِ راشدہ و طریقۂ سلف صالح کے اصول و مبادیات، مبانی و مقدمات سے براہ راست پیوستہ رکھا جائے اور ساتھ ہی معاملات کے فروعات و جزئیات میں وقت کی ضروریات اور مطالبات کے مطابق تشریعات Legislation اسی طریقۂ "اجتہاد"، "شوریٰ" و "اجماع" کے ذریعہ وضع کئے جائیں، جیسے تاریخ اسلام کے سب سے بڑے مقنن حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رح نے اپنے وقت کے چالیس متقی و مقتدر علماء کی ایک مجلس تشریع کے ذریعے وضع فرمایا تھا۔ دنیا گواہ ہے کہ موصوفین نے جو قوانین "معاملات دنیا" کے لئے استنباط فرمائے تھے، وہ دنیا سے الگ رہکر یا جماعت و نوع کے منافی Antisocial نہیں کئے تھے۔ بصرین، جنہوں نے انکے فقہ و اصول فقہ کا امعانِ نظر مطالعہ کیا ہے، متفق ہیں کہ انکے اصولِ تشریع کتنے حکیمانہ و اعلیٰ تھے۔ بنتھم اور مِل کی افادیت (Uti litarianism) جس کا اصل الاصول "زیادہ سے زیادہ سعادت، زیادہ سے زیادہ اعداد Greatest good of the greatest number" اور انکے وہ اصول تشریع جو اس مذہب افادیت کے تابع ہیں، اپنی بہترین ہیئت میں اسلام کے مقدماتِ اجتماعی میں موجود ہیں اور حضرت امام ابوحنیفہ رح نے بہت حد تک اُن کو اپنے فقہ و اصول فقہ میں منضم کیا ہے، لیکن چونکہ ہر زمانہ

ضروریات اور امتیازی مسائل کو لے کر پیدا ہوتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اُنکے زبردست مطالبات کو پورا کیا جائے ورنہ یقین کیا جائے کہ بے پناہ سماجی قوتوں کی بے پناہ دھارکے سامنے جامد ضوابط حیات زندگانی کھو کر خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں یا مردہ و فرسودہ ہوکر حوالۂ آثار عتیقہ ہوتے ہیں شریعۂ اسلامیہ پر اس کے جمود کے باعث یہی دور گزر رہا ہے، لیکن اگر فی الواقع وہ جماعت انسانی کے سماجی تعلقات کی تعدیل و تہذیب اور حقوق و فرائض کی کوئی بہترین تعلیم دیتی ہے اور دنیا کے موجودہ سیاسی، ومعاشی، روحانی و اخلاقی مسائل مبہمہ کی صحیح حل پیش کرنے کا دعوٰے کررہی ہے اور اس کو ضرور دعوی کرنا چاہئے ورنہ اس کی کوئی وجہ زیست Raisonedetre ہی نہیں ہے تو ضرور نہیں بلکہ واجب ہے کہ انکی ہدایت و تعدیل کرنیکے قبل خود پہلے اُن سے واقف و آگاہ ہو جائے اور یہ بغیر دنیا کے مشاہدہ و تجربہ اور علوم اجتماعیہ کی تعلیم و تحصیل کے ناممکن ہے۔ الغرض علوم اجتماعیہ کا مجوزہ شعبہ از ہر کے شعبۂ فقہ و حکمۃ التشریع (Jurisprudence) کا قدرتی معاون معادل اور قبلی ہے یا دوسرے لفظوں میں اول شعبہ، دوم شعبہ کا تکملہ ہے، کیونکہ وہی وہ اجتماعی مواد اور مسالہ مہیا کرسکتا ہے جس کی زمین پر فقہ و حکمۃ التشریح اپنی عمارات بنا سکتے ہیں۔

(ب) ہر امت اور ہر ملت کو قائدین فکر اور ہادیان عمل کی ضرورت رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی جمہوریت اور صنعت گری نے کچھ لیڈرشپ کے مواقع کی تحدید نہیں بلکہ تشدید کی ہے۔ لیکن قیادت عمل اور ہدایت فکر جتنی اہم اور ضروری شے ہے اتنا ہی مشکل ہے۔ لوگ عموماً "خطیب" Rhetorician کو جو لوگوں کے جذبات کو قابو میں لاسکتا ہے، لیڈر سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ محض ڈیماگوگ (Demagogue) یعنی زعیم ہیں، کیونکہ وہ لوگوں کے جذبات و خواہشات کے بندے ہیں نہ کہ قائد، وہ خود بہنے اور دوسروں کو بہانے کے لئے ہیں نہ کہ خود چلنے اور دوسروں کو چلنا سکھانے کے لیے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ایک قوم کے قائدین کی پیدائش کے کارخانے اس کی یونیورسٹیاں ہیں۔ امت مسلمہ کے رہنماؤں کے معمل بھی اُنکی اعلیٰ تعلیم گاہیں مثل، جامعہ ازہر قاہرہ، دارالفنون قسطنطنیہ، مدرسۃ العلوم علیگڑھ، دارالعلوم دیوبند، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور جامعہ

اہل البیت بغداد وغیرہ ہیں۔ لیکن کیا اس بیسویں صدی میں جب کہ سوشل مسائل پر اندھی رائے ظاہر کرنا "نیم حکیم خطرہ جان" سے زیادہ خطرناک بنتا ہے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ حضرات جو سوشیل علوم سے بے بہرہ اور جدید اجتماعی مسائل کی دماغ فرسا باریکیوں اور پیچیدگیوں سے بے خبر ہیں، سوسائٹی کے لیڈر اور جماعت کے امام بنائے جائیں؟ اگر "رسمًا وعادتًا" وہ حضرات امامت وقیادت کے مناصب پر قابض رہے بھی تو کب تک اور کس مرض کی دوا کے لئے؟ اندیشہ تو یہ ہے کہ ایسے طوفانی زمانے میں یہ نام نہاد قائدین، جن کو خود اپنی خبر نہیں ہے، خود بھی ڈوبینگے اور امت واسلام کو بھی ڈبا کر رہینگے۔ افسوس ہے کہ زمانہ مدید سے علمائے اسلام کی یہی پوزیشن ہے اور اسکا باعث یہ ہے کہ وہ "حقیقی اسلام" اور "حقیقی علم" دونوں سے کوسوں دور ہو چکے ہیں لازم ہے کہ جامعات اسلامیہ کے درس ونصاب کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ انکے ذریعہ اسلام کی حقیقی روشنی اور علم وعقل کی صحیح راہ کو پالینا ممکن ہوجائے۔ مرانی لائحہ اصلاحیہ بہت حد تک اس مقصد کو پورا کر رہا ہے لیکن اس کے شعبہائے تعلیم میں علوم اجتماعیہ کی کمی دراصل ریڑھ کی ہڈی کی کمی ہے۔

بہرکیف اس طویل بحث سے لائحہ اصلاحیہ کی تنقیص مراد نہیں، بلکہ محض علوم اجتماعیہ کے شعبۂ تعلیم کے قیام کی توضیح مقصود ہے معلوم ہے کہ جامعہ ازہر اصلاحات کے اجراء کے بعد ایک بالکل ہی جدید اسلامی یونیورسٹی ہوجائیگی جس کی ایک خصوصیت اسکی ترقی پذیریت ہوگی بنا بریں یہ توقع رکھنا چاہیے کہ آج نہیں تو کل، جلد یا بدیر یہ بڑی کمی ضرور پوری کیجائیگی۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس شعبہ تعلیم کے قیام کی راہ میں زبردست مشکلات ہیں، مثلاً کتب معاری کا نہ ہونا، اور قابل اساتذہ کا نہ ملنا، لیکن میں اس امر پر زور دے رہا ہوں کہ ابتدائی مشکلات پر غالب آنا لازم اور غالب آنیکا ارادہ کرنا مقدم ہے مشکلات اور مصائب بڑے کاموں کی واجبی قیمت ہیں جن کا ادا کرنا انکے انجام پذیر ہونے کے پہلے ضروری ہے اگر جماعت کی سعادت، امت کی فلاح، اسلام کی ترقی، شریعت کی محافظت وپیش رفت، بڑے اور اچھے مقاصد ہیں تو چھوٹے چھوٹے موانع کو دور کیا جا سکتا ہے اور دور کرنا چاہئے۔ ضرورت صرف سچے احساس اور سچے ارادہ کی ہے۔

شاعری

کنایہ شاعری کی اصطلاح میں حسن ادا کی ایک صورت کا نام ہے۔ کنایہ کو سمجھنے کے لئے شاعری کے فلسفہ اور اسکے اجزا ترکیبی پر اختصار کے ساتھ بحث کرنا ضروری ہے۔

قدیم یونانی فلسفہ میں شاعری جزو پیغمبری خیال کیجاتی تھی۔ اسی لحاظ سے یونانی علم ادب میں شاعر و پیغمبر دونوں کے لئے لفظ vate استعمال ہوتا تھا یونانیوں کا خیال تھا کہ کائنات کی ہر شے خواہ وہ مرئی ہو یا غیر مرئی۔ مادی ہو یا غیر مادی اپنے وجود میں ایک راز رکھتی ہے جس کو کائنات کا مقدس راز کہا جا سکتا ہے۔ اور اس مقدس راز تک شاعر کی رسائی بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ پیغمبر کی۔ گوئٹے (Goethe) المانیہ کا مایۂ ناز فلسفی اور شاعر مستشرقین کا امام کائنات کے اس مقدس راز کو اپنی اصطلاح میں Open Secret راز آشکارا کہتا ہے۔ اس کی یہ اصطلاح اتنی مقبول ہوئی کہ تمام السنۂ مغربیہ میں "راز آشکارا" روزمرہ کا محاورہ بن گیا۔ ان دونوں لفظوں کی توضیح کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے وجود میں ایک راز رکھتی ہے۔ راز تو اس وجہ سے کہ عام انسانی آنکھ اس تک پہنچنے سے قاصر ہے اور آشکارا اس لئے کہ قدرت نے اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس راز تک پہنچنا فقط شاعر اور پیغمبر کا کام ہے۔ امرسن کے الفاظ میں موجودات عالم کی ظاہری صورت سے گذر کر اس کی آفرینش کی علت غائی دریافت کرنا شاعر کا کام ہے۔ شاعر کی رسائی زندگی کی حقیقت تک ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ موجودات عالم کی ظاہری صورتیں متغیر ہوتی رہیں مگر حقیقت تغیرات سے بالاتر ہے شاعر موجودات عالم کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے مشاہدہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جس طرح شہد کی مکھی خوشنما پھولوں سے رس لے کر شہد کی صورت میں دنیا کے سامنے رکھتی ہے یا جس طرح ایک ماہر کیمیا آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملاکر پانی کی صورت میں دکھلاتا ہے ٹھیک اسی طرح شاعر دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے مگر دنیا کے سامنے موجودات کی ظاہری

صورت کو پیش نہیں کرتا بلکہ اس نتیجہ کو جو خود اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ موجودات عالم کے تعلقات اسکے نہایت اور باہمی اثرات کا مطالعہ اس کو تخلیق موجودات کے اس راز تک پہنچا دیتا ہے جس کو کائنات کا مقدس راز کہا جاتا ہے یا یوں کہا جائے کہ موجودات عالم کے حسن کے احساس اور اعتراف کا نام شاعری ہے۔

شاعری ایک انکشاف حیات ہے اور جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کے نزدیک انسانی دماغ حسن کی صورت میں دنیا کا مطالعہ کرتا ہے حسن اپنے انواع میں غیر متعین ہے اور اس کے انکشاف کی صورتیں مختلف۔ کبھی تو یہ انسانی جسم کے تناسب خد و خال کی صورت اختیار کر لیتا ہے کبھی تہذیب اخلاق و اطوار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی روح کی آرائش کرتا نظر آتا ہے فی الحقیقت توانین فطرت کے راز کے اظہار کا ذریعہ حسن ہے اور گوئٹے کے بقول حسن اگر راز کو آشکار نہ کرتا تو یہ راز ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتا۔ حسن و عشق لازم و ملزوم ہیں حسن کے احساس و اعتراف کا دوسرا نام عشق ہے۔ جہاں حسن ہے وہاں عشق ہوگا۔ عشق کے مختلف مدارج ہیں اس کی ایک طرف تو جنون سے جا ملتی ہے اور دوسری طرف موافقت اور ہمدردی سے۔ یہ اجمال ایک بڑی تفصیل کا محتاج ہے مگر چونکہ موضوع سے یہ بات علیحدہ ہوتی جاتی ہے لہٰذا اس کو اسی مقام پر چھوڑ کر اصل بحث کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ نفسیات کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ حقیقت شے کو سمجھنے کے لئے اس شے سے کم از کم موافقت اور ہمدردی لازمی ہے۔ شاعر کے جذبات اور احساسات نہایت لطیف ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر شے جو اس کے سامنے آتی ہے اس سے ہمدردی کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کی طبعی فیاضی اس کو ہمدردی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

"رسکن" Ruskin کا قول ہے کہ احساس معیار شرافت ہے۔ انسانی طبیعت کی شرافت کا اندازہ اسکی قوت احساس سے ہوتا ہے۔ شاعر کے احساسات نہایت قوی مگر نہایت لطیف ہوتے ہیں اور اس عالم کون و فساد میں ایک ذرہ کی جنبش بھی ایسی نہیں ہوتی جو اس کے احساس پر اثر ڈالے جب وہ کسی چیز کو دیکھتا ہے تو بغیر کسی خاص کوشش کے اس کو سمجھ لیتا ہے اور اور کائنات کا ہر راز اس کو بے حجاب

ملتا ہے اور وہ اس کی حقیقت کو پہنچ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو موزوں الفاظ میں ادا کرنے کا دوسرا نام شعر ہے۔

فلسفہ اور شعر میں یہ فرق ہے کہ حقیقت شئے تک رسائی حاصل کرنا اور اُس کا اظہار کرنا فلسفی کا کام ہے۔ مگر شاعر کے لئے اظہار حقیقت کے ساتھ ساتھ سوز لازمی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ مایہ ناز شاعر اور فلسفی نے نہایت موثرانہ پیرایہ میں شعر کی تعریف کی ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

شاعر کے جذبات لطیف و نازک مگر نہایت قوی ہوتے ہیں لطیف و نازک تو اس لحاظ سے کہ ہر چیز جو اس کے سامنے آتی ہے اس کے دل پر اثر ڈالتی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس کے قلب کو متحرک کئے بغیر نہیں رہتا اور قوی اس لئے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو اظہار سے نہیں روک سکتی۔

یہ شعر اور شاعر کا حقیقی تخیل ہے۔ عام اصطلاح کی رو سے بھی شعر فی الحقیقت انسان کے خیال یا جذبے کے اظہار کا نام ہے۔ جو موزوں الفاظ میں ادا کیا گیا ہو۔ شعر کے دو جز ہیں ایک تخیل اور دوسرا تکنیک۔ شاعر کے دماغ میں پہلے خیال پیدا ہوتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے وہ الفاظ کی تلاش کرتا ہے خیال ایک سماوی چیز ہے اور الفاظ ارضی۔ اس لئے یہ کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے خیالات کا لامتناہی سلسلہ ایک خیال کا دوسرے سے تعلق متضاد کیفیتیں۔ ان متضاد کیفیتوں میں یگانگت کا ایک گہرا ربط مختلف حالات کے فوری تغیرات۔ تغیرات کبھی محسوس ہوتے ہیں اور کبھی غیر محسوس۔ غرض یہ کہ ان تمام نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ دوسری طرف الفاظ کی بے بضاعتی ان کی کمزوری ان کی متعین قوتیں۔ جن کو دیکھتے ہوئے شاعر کا کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

شاعری ایک قسم کی مصوری ہے جو کام مصور مختلف رنگوں کے باہم ربط و آمیزش سے لیتا ہے۔ وہی کام شاعر مختلف الفاظ کی باہم ترکیب سے جس طرح رنگ کا انتخاب اور ایک رنگ کا دوسرے رنگ سے ربط رنگ کی نسبتی قوت، تصویر میں جان ڈالدیتی ہے۔ اسی طرح الفاظ کا انتخاب ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے ربط۔ الفاظ کی باہم ترکیبیں۔ شعر کی خوبی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ بسا اوقات مصور کو مادی اشیاء

سے گزر کر غیر مادی چیزوں کی تصویر کھینچنا ہوتی ہے۔ مثلاً طبیعت کی مختلف کیفیتیں۔ خوشی و رنج۔ رحم و غضب یہ چیزیں بھی مصور کے قلم سے بچنے نہیں پاتیں۔ اور ایک کامیاب مصور ان مختلف کیفیتوں کا اظہار بھی تصویر میں کر سکتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اُس کا یہ کام بھی شاعر کے کام سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اول تو رنگ خود اپنی اقسام میں غیر محدود ہے پھر ایک رنگ کی دوسرے رنگ سے آمیزش ایک نیا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر رنگ کو اس کی قوت اور کمزوری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو رنگ جو بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے صدہا ہزار ہا بلکہ غیر متعین اقسام اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ رنگ خود اپنے میں ایک قسم کی حرکت رکھتا ہے مگر الفاظ بالکل قائم ہیں اور ہر لفظ کا حسن صورت ایک متعین چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ترکیب دینے سے انکی موسیقیت میں فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے مگر لفظ بجائے خود تغیرات سے بالاتر ہے۔ قائم اور متعین الفاظ سے متحرک اور متموج جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچنا خود ایک طلسم ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو فطرت نے یہ جوہر ودیعت کیا ہو۔

کارلائل Carlyle نے فنون لطیفہ میں شاعری کو فن تعمیر سے تشبیہ دی ہے الفاظ وہ خشت و سنگ ہیں جن سے خیال کی عالیشان عمارت بنائی جاتی ہے لیکن اس پر بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سنگ و خشت میں بھی صورت پذیری کا مادہ موجود ہے یعنی ایک معمار سنگ و خشت کو تراش کر عمارت کے لئے موزوں بنا لیتا ہے مگر الفاظ میں یہ بات ممکن نہیں۔ یعنی سنگ و خشت بھی متحرک ہیں۔ اور انکو جس قسم کی حرکت چاہیں دیجا سکتی ہے مگر الفاظ میں اس کمی کو حسن انتخاب و باہمی ترکیب ہی سے پورا کر سکتے ہیں۔ اور اس بنا پر Aresto کا دعوے کہ الفاظ لعل و جواہر سے بھی گراں بہا ہیں بالکل درست ہے۔

عشق کا وہ وسیع اور وحشتناک میدان جو امید و یاس کے مناظر سے بھرا ہوا ہے جس میں کبھی تو ریگ رواں آب شیریں بن کر رہ نوردان محبت کے دلوں میں امید کی جھلک پیدا کرتا ہے اور کبھی آب شیریں ریگ رواں نظر آکر اس کی مایوسی کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس کی منزل خود متحرک ہے یعنی

...وکیا ہم رہ نوردی پر بھی بعد منزل کم نہیں ہوتا۔

... بغیر میاں اس کی مقناطیسیت جس کے اندفاع میں جذب اور جذب میں اندفاع ہے حسن و عشق کا ربط۔غرض یہ کہ ان دائمی بھول بھلیوں سے گزرنا شاعر کا کام ہے۔

... کے اظہار کے لئے الفاظ کا انتخاب | اس کے لئے کوئی قواعد متعین نہیں ہو سکتے۔ اسکا انحصار شاعر کے اس مذاق سلیم پر ہے جو فطرت اس کو عطا کرتی ہے۔ شاعر کے دماغ میں پہلے خیال پیدا ہوتا ہے پھر اس کے اظہار کے لئے الفاظ کی تلاش ہوتی ہے شاعر کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ خیال سننے والے تک بعینہ اسی عنوان میں پہنچ جائے جس صورت میں وہ خود شاعر کے دماغ میں پیدا ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر سننے والا بھی اس خیال سے اتنا ہی متاثر ہو سکے جتنا کہ خود شاعر ہے۔ بزم کی تصویر کھینچنے کے لئے الفاظ میں سبکی۔ لطافت۔ روانی اور نزاکت لازمی ہے۔ مگر رزم کا صحیح نقشہ اس کے بغیر نہیں کھینچا جا سکتا کہ الفاظ میں وزن۔ ضخامت اور ہیبت ہو۔ اگر معرکہ رزم کو پیش کرنے کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جو بزم کے لئے موزوں ہیں تو وہ صحیح تصویر رزم کی نہ ہوگی۔

جبکہ خیال اپنی وسعت میں لامحدود اور لامتناہی ہے تو اس کے ادا کرنے کے لئے الفاظ بھی غیر محدود و لامتناہی ہونا چاہئے۔ خیال کی وسعت الفاظ کی قلت خیال کی قوت اور الفاظ کی کمزوری خیال کی حرکت اور الفاظ کے سکون کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خیال کی صحیح مصوری انسانی دماغ کی کامیابی کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے۔ الفاظ کا انتخاب انسان کے مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ اس کے لئے کوئی قواعد وضع نہیں ہو سکتے۔ حقیقی شاعر کا کلام قواعد کا محتاج نہیں قواعد اس کے محتاج ہیں۔ وہ قواعد کے انتخاب سے حسن و اثر حاصل نہیں کرتا۔ بلکہ قواعد خود اس کے کلام سے وضع کئے جاتے ہیں۔ اگر اس ربط کی تحلیل کیجائے تو معلوم ہوگا کہ عروض کے قواعد ترتیب دینے کے بعد شاعری کا آغاز نہیں ہوا۔ بلکہ مستند شعرا کے کلام سے عروض کے قواعد بنائے گئے۔ شیکسپیر Shakspear کے کلام کی خاطر ایک مستقل لغت تیار کی گئی اور درسیات نحوی میں خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرنا پڑا قواعد کا کام کلام میں صحت پیدا کرنا ہے نہ کہ حسن خیال کی تصویر کھینچتے ہوئے اس کے لئے الفاظ کا

انتخاب اور پھر اس کی باہم ترتیب اس کا انحصار تمام تر شاعر کے ذوقِ سلیم پر ہوتا ہے۔ اور ارسطو کے خیال کے بموجب شاعری کی کامیابی فقط حسنِ تحیک پر منحصر ہے۔ یعنی الفاظ کا انتخاب اور اس کی باہمی ترتیب اس خوبی سے کیجائے کہ خیال کا صحیح نقشہ سننے والے کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ سوال یہ ہو کہ حسنِ شعر حسنِ تحیک کا نام ہے یا حسنِ تخیل کا۔ افلاطون کے پیرو کہتے ہیں کہ حسن روح میں ہے ارسطو کے متبعین مخالفت کرتے ہیں کہ جسم میں۔ پہلا گروہ تخیل کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا تحیک کو۔ کیونکہ شعر کے اجزاء ترکیبی کو دیکھتے ہوئے الفاظ جسم اور خیال اُسکی روح ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے بقول درحقیقت نہ پیکرِ معشوق میں کوئی معین خطوط ہیں اور نہ کسی رنگ میں کوئی خاص مناسبت خوبی نہ روح سے متعلق ہے نہ جسم سے محدود ہے۔ حسن حسن میں ہے جس کی آفرینش شعراء کا کام ~~اور شعراء کا راز ہے~~ جس طرح خطوطِ اقلیدس سے خوبصورت سراپا تیار نہیں ہو سکتا اسی طرح قواعد کے اتباع سے خوبصورت کلام ترتیب نہیں پا سکتا یہ شاعر کا کام ہے کہ وہ الفاظ کا انتخاب کرے اور جس خیال کو ادا کرنا چاہتا ہے اس کی مناسبت سے الفاظ کو ترتیب دے۔

<u>لفظ بجائے خود نہ ثقیل ہے نہ لطیف</u> | ثقل و لطافت محلِ استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان کا مائہ ناز جذبات کا مصور، واقعہ نگاری کا امام انیس واقعہ کربلا میں حضرت عباس کی شجاعت اور غصہ کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:۔

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے   نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

ہمہمہ اور ڈکار دونوں ثقیل ہیں مگر اس شعر میں جس ترتیب کے ساتھ استعمال کئے گئے فصیح ترین معلوم ہوتے ہیں۔ رزمیہ مضامین لکھتے ہوئے الفاظ میں وزن۔ فخامت۔ اور ہیبت ہونا چاہئے۔ اسدکردگار۔ ضیغم اور کچھار کے ساتھ جس ترتیب سے یہ دونوں لفظ استعمال کئے گئے ہیں سنتے ہی شیر کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ایک اور واقعہ پہ کہتے ہیں:۔

شوکت میں رشکِ بامِ سلیماں تھا خود سر   کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر
دستانے دونوں فتح کا مسکن ظفر کا گھر   وہ رعبِ الاماں وہ تہورکہ الحذر

جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو
پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو

کربلا میں دسویں محرم کو جنگ شروع ہونے سے قبل یزیدی فوج کی طرف سے ابتدا ہوتی ہے تیر پھینکے جاتے ہیں تب بجبوراً حضرت امام خیمہ حرم میں رخصت کے لئے جاتے ہیں۔ حضرت عباس ہتھیار سجکر خیام کے دروازہ پر حفاظت کے لئے ٹہلنے لگتے ہیں۔ اس بند میں حضرت عباس کا فوٹو پیش کیا ہے۔ چھاتی کا پہاڑ ہونا کس قدر غیر مانوس ہے لیکن اس موقع پر جس صورت سے استعمال کیا گیا ہے کیسا لطیف معلوم ہوتا ہے۔

اور بیچ میں وہ خیمہ زنگاری امام — حسین خدا کے عرش کے تاروں کا قیام
کم تھا نہ جس کا خانہ کعبہ سے احترام — قدسی طواف کرنے کو آتے تھے صبح شام
پڑھنا درود آپ کے ملائک کا ورد تھا
سایہ کے بدلے نور قناتوں کے گرد تھا

میدان کربلا میں حضرت امام حسین کے خیمہ کا نقشہ ہے الفاظ کا حسن انکی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ لطافت کا ایک دریا بھر رہا ہے پڑھنے والا اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پاتا ہے جس کی فضا میں حرمت۔ وقار کے سوا کوئی چیز نہیں۔ وقار کی شان۔ محبت کے جذبہ کو دبائے ہوئے ہے۔ پھر بھی وہ جذبہ لفظ لفظ سے ٹپک رہا ہے۔

وہ دشت وہ خیمہ زنگار گون کی شان — گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسمان
بیچ بہ سپہر بنے جس کا سائبان — بیت العتیق دین کا مدینہ جہاں کی جان
اللہ کے حبیب کے پیارے اسی میں تھے
سب عرش کبریا کے ستارے اسی میں تھے

یہ دونوں بند دو مختلف مرثیوں کے ہیں مگر ایک ہی خیال کو مختلف الفاظ اور مختلف تراکیب سے ادا کیا ہے۔ اور یہ کہنا دشوار ہے کہ فصاحت کے لحاظ سے کس کو ترجیح ہے۔

الم و یاس میں غصہ کا اظہار | انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسکا اثر قلب پر پڑتا ہے جس کا اظہار حرکات و سکنات سے ہوتا ہے اس اظہار کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک قوی القلب آدمی خاموش ہو جاتا ہے مگر ایک کمزور انسان الحاح و زاری شروع کر دیتا ہے بعض وقت عالم یاس میں بکنے لگتا ہے پھر یہ کیفیتیں اختلاف طبائع کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ارزق عرب کا مشہور پہلوان۔ سیکڑوں لڑائیوں کو دیکھے ہوئے اس کے چاروں لڑکے میدان جنگ میں حضرت قاسم کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں ایک طرف لڑکوں کا غم دوسری طرف خاندانی شجاعت کے نام پر دھبہ لگنے کا خیال ہے۔ اس واقعہ کو یوں پیش کیا ہے۔

بیجان ہوئے نبرد میں بیٹے جو اسکے چار | ارزق کا دل ہوا صفت لالہ داغدار
جوش غضب سے سرخ ہوئیں چشم نابکار | مثل تنور منہ سے نکلنے لگا بخار
جیب قبا کو مثل کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

چنگھاڑ ثقیل ہے۔ مگر اس موقع پر اُسکی موزونیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ قوی ہیکل مشہور پہلوان مگر جس مقصد سے لڑنا چاہتا ہے وہ اپنی جگہ پر نہایت پست ہے۔ زر کی طمع ظلم کی حمایت پیاسوں کا مقابلہ اسلام کا پیرو مگر بانی اسلام کے جگر گوشوں پر ہتھیار جور۔ یہ تمام کیفیتیں ہیں جو اس بند میں پائی جاتی ہیں۔ ارزق کی دیو سے تشبیہہ۔ دیو کی مہیب آواز کو چنگھاڑ سے تشبیہہ دی ہے جو اصطلاح عام میں ہاتھی کی آواز کو کہتے ہیں۔ پھر اس لفظ کو جس صورت سے اور ترکیبوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نے خیال کے حسن کو کتنا بڑھا دیا۔ البتہ پہلا مصرعہ بلحاظ حسن الفاظ ایک حد تک پست ہے معلوم ہوتا ہے کہ خیال کو ادا کرنے کے لئے الفاظ کو اکٹھا کر دیا ہے جن کو پڑھتے ہوئے زبان کو قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے۔

Suggestion

اس مضمون میں جس مسئلہ پر خاص طور سے بحث کرنا ہے۔ وہ شاعری کی اصطلاح میں کنایہ کہلاتا ہے۔ مگر کنایہ کی تعریف جو علم عروض میں کی گئی ہے اس سے اس لفظ کا مفہوم محدود و متعین ہو جاتا ہے۔ اس

خیبین اس موضوع پر پوری تنقید ہو چکی ہے۔ انگریزی علم ادب میں اس مفہوم کو لفظ Sugges-tion سے ادا کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری کم مایہ زبان میں کوئی لفظ Suggestion کی قائم مقامی نہیں کر سکتا Suggestion کنایہ سے کہیں زیادہ وسیع اور قوی ہے Suggestion کنایہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ کنایہ حقیقۃً خیال کے بالواسطہ طریقہ اظہار کا نام ہے۔ شاعر کبھی تو اپنے خیال کو صریح طور پر بلا کسی واسطہ کے ظاہر کر دیتا ہے۔ اور کبھی اظہار خیال کے لئے کسی واسطہ یا ذریعہ کی تلاش کرتا ہے۔ یہ واسطہ کبھی تشبیہ یا استعارے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور کبھی اُس ذریعہ کے اظہار سے جو ایک خیال کو دوسرے خیال سے ہوتا ہے۔ یعنی ایک خیال کے پیش کرتے ہی وہ خیال سامنے آجاتا ہے جس کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

اگر شاعر کسی جذبہ یا خیال کی تصویر کھینچتے ہوئے اُس کے حدود متعین کر دے اور اس کے ہر جزیہ کو ظاہر کرنے کی کوشش کرے۔ تو شعر کے حسن میں کمی ہو جائیگی۔ اول تو کسی خیال کو اس کے تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ ادا کرنا ہی دشوار ہے۔ خیال کی وسعت اُسکی لامتناہی تفصیلات۔ پھر خیال کی مختلف صورتیں۔ مختلف کیفیتوں کے ماتحت تغیرات۔ اختلافات میں یگانگت کا ایک مخفی ربط۔ غرضیکہ ان تمام اشتباہات سے خیال کو ادا کرنا دشوار ہے۔ اور اگر کسی خیال کو ان قیود اور پابندیوں سے ادا بھی کیا جائے تو وہ علم النفس کا ایک باب منظوم ہوگا۔ شعر کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس موقعہ پر ایک نکتہ قابل غور ہے۔ اگر خیال کی جزئیات اور تفصیلات کو پیش کیا جائے تو اس خیال کا تجزیہ اور تحلیل ضروری ہوگی۔ جو فلسفہ شعر کے تناقص ہے۔ شعر کا تعلق اس کے مجموعی اثر سے ہے نہ کہ تحلیل سے۔ اگر خیال کے ٹکڑے کئے جائیں اور ہر ٹکڑہ کے ثبوت کا مطالبہ کیا جائے تو دماغ شعر کے منطقی پہلو کی طرف رجوع ہو جائیگا اور شعر کا اثر زائل ہو جائیگا۔ شعر خیال کی اجتماعی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اُسکی تحلیل سے۔

بگو کہ اے فلک کز کجروی ہائے تو برگردی ... شب وصل است خواہم ایں قدر آہستہ تر گردی

آسمان سے استدعا ہے کہ ذرا آہستہ چل۔ کہیں شب وصل کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ شاعر اس کو کس خوبی سے بیان کرتا ہے۔ یعنی میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تو کجروی سے باز رہ۔ کجروی تو تیری فطرت ہے۔ مگر ہاں یہ

ضرور کہوں گا کہ اپنی رفتار ذرا مدھم کرے۔ اب اگر اس خیال کے ٹکڑے کئے جائیں اور ہر ٹکڑے کا ثبوت مانگا جائے تو شعر کا اثر بالکل زائل ہو جائیگا۔ اول تو یہ مسئلہ بجائے خود بحث طلب ہے کہ آسمان گردش بھی کرتا ہے یا نہیں۔ حدات دن کا ہونا زمین کی گردش پر منحصر ہے یا آسمان کی۔ پھر آسمان سے یہ خواہش کہاں تک جائز ہے۔ آسمان کی گردش کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ گردش اختیاری بھی ہے یا نہیں غرضکہ خیال کی تحلیل سے مجموعی اثر بالکل زائل ہو جائیگا۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را چندیں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

بہت سی باتیں فرض کر لینے کے بعد خیال میں ایک اثر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی شعر کا اثر خیال کی اجتماعی قوت پر منحصر ہے۔ ورنہ خیال کی تحلیل اُس کے حسن کو ختم کر دے گی۔ پروانہ کا شمع سے عشق۔ شمع کا صبح کے وقت بجھ جانا۔ کیا پروانہ کے خون ناحق کا اثر ہے۔ یا اس میں اس سے زیادہ استطاعت ہوتی ہی نہیں۔

سحر بلبل حکایت با صبا کرد کہ عشق گل بما دیدی چہا کرد

بلبل کا عشق اور اُس کے حالت زار کو تسلیم کرنے کے بعد اُس کے شکوہ کی طرف خیال رجوع ہوتا ہے۔ ورنہ ہر ایک جزو کا ثبوت تو خیال کو بالکل مہمل کر دیتا ہے۔ خیال کا تجزیہ اور تحلیل شعر کے لطف کو زائل کر دیتا ہے۔

انسان فطرتاً آزادی پسند ہے اور اسکی آزادی خیال پر جتنی قیود اور پابندیاں عائد کیجاتی ہیں۔ اُس کو ناگوار ہوتی ہیں۔ اور اگر اُس کی قوت تحلیل کو آزادی سے کام کرنیکا موقع نہ دیا جائے تو طبیعت لطف اندوز ہونے کے بجائے بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اول تو شاعر اور سامع کے خیال میں اس حد تک اتحاد ممکن ہی نہیں کہ اصول سے گزر کر جزئیات میں بھی اختلاف نہ ہو۔ اور اگر ہو بھی تو ایسی حالت میں سامع کے لئے بجز اس کے اور کوئی موقع نہیں رہتا کہ وہ شاعر کے پیش کردہ خطوط میں اپنے دماغ کو محصور کرلے۔ اور دائمی تقلید کرتا چلا جائے۔ اور چونکہ شعر کا تعلق جذبات سے ہے یعنی ایک طرف تو یہ جذبہ شاعر کے دل میں پیدا ہو کر الفاظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دوسری طرف سننے والے

بہ شعر اس کے جذبات کو مشتعل کرتا ہے اور اسکا تعلق خیال کی آزادی سے ہے۔ خیال اپنے نشو
کو با [illegible] دیکھا۔ خیال کے ایک پہلو کو دکھانا اور سننے والے کو اسکی وسعت نظر اور مذاق طبیعت
کے مطابق لطف اٹھانیکا موقعہ دینا۔ شاعر کا مقصد اصلی ہوتا ہے۔

کہیں نظر نہ لگے اس کے دست بازو کو　　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

"غالب"

اس شعر میں معشوق کے دست بازو کو نظر لگ جانیکا اندیشہ زخم کی شدت کو کتنے خوشنما پیرائے میں ظاہر کر رہا ہے۔ رشک کا ایک جذبہ جو لازمہ محبت ہے کس خوبصورتی سے خیال میں مضمر ہے یعنی عاشق یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ چشم غیر کی رسائی اس زخم تک ہو جائے جو دست محبوب سے پہنچا ہے انتہائے رشک ہے کہ محبوب کے ہاتھ سے جو زخم پہنچا ہے اس تک نگاہ غیر کا پہنچنا بھی گوارا نہیں ہے۔ یہ تو اس ہی مجسمہ عشق کا کام ہے۔ جو فنا ظاہری کے دروازے سے داخل ہو کر بقا، دوام تک پہنچنا چاہتا ہے اور جو دلکشائی کے لئے زخم تیغ کا آرزومند نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ جراحت پیکاں اس کے لئے ذریعہ راحت نہیں ہو سکتا۔

نہیں ذریعہ راحت جراحت پیکاں　　　وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے

اب اگر اس خیال کے اظہار میں حدود متعین کئے جاتے اور خیال کو بلا کسی واسطہ کے ظاہر کیا جاتا تو اس خیال میں کمزوری آجاتی زخم کی شدت خواہ کیسے ہی مبالغہ سے بیان کیجاتی مگر جو حد اس کے لئے متعین ہوتی۔ قوت متخیلہ کو اس سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں رہتا۔ اور سننے والے کا خیال اس مقام پر پہنچکر رک جاتا۔

وہ ہم سمجھے : تم آئے کہیں سے　　　پسینہ پونچھ لو اپنی جبیں سے

"داغ"

جب وہ معشوق مکان غیر سے آرہا ہے اور اس کو چھپانا چاہتا ہے مگر اس راز کو آشکارا ہو جانیکا خوف ندامت کا ایک جذبہ پیدا کر رہا ہے اور اس جذبہ کے اثر سے چہرہ پر پسینہ ہے جس کو عرق ندامت کہتے

میں عشق تو ویسے ہی سایہ سے بدگماں رہتا ہے (با سایہ ترا نمی پسندم۔ عشق است و ہزار بدگمانی) کھٹک تو تھا ہے اور اسکا شک یقین تک پہنچ جاتا ہے۔ معشوق کی حرکات و سکنات۔ وحشت چھپانیکی ناکام کوشش غرضکہ یہ سب باتیں عاشق کو یہ یقین دلادیتی ہیں کہ معشوق رقیب کے مکان سے آرہا ہے اس شعر میں اس خیال کو اس خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے کہ حقیقۃً اس پر تبصرہ کرنا دشوار ہے۔

میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ کیا بات ہے ۔ وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسم مجھکو

یہ وہ وعدہ ہے جو ایفاء وعدہ کا روشناس نہیں۔ ہزار ہا مرتبہ کا تجربہ ہے۔ اصرار بالکل بے سود اگر تردید کیجاتی ہے تو وہ خفیف سی امید بھی جاتی ہے جو زندگی کا سہارا ہے اور وعدہ بھی اُسکا جس کے سامنے سوائے تسلیم کے چارہ نہیں۔ پھر سوائے تبسم کے کیا ہو سکتا ہے۔ ان دونوں مصرعوں میں عشق و حسن کا ایک ہنگامہ پوشیدہ ہے۔ اُنکا وعدہ اور میرا تبسم۔ یہ عجیب دلچسپ بات ہے۔ خیال تو فقط یہ تھا کہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوگا۔ لیکن طریقہ اظہار نے خیال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

یہانتک تو کنایہ کے اُس پہلو سے بحث تھا جو ایک حد تک معین ہوتا ہے یعنی جس خیال کو ادا کیا گیا ہے اس میں مفہوم کا ایک بعید تعین ضرور ہوتا ہے۔ یعنی اُس تمام وسعت کے ساتھ جو اس طرز ادا میں پوشیدہ ہے۔ کسی نہ کسی مقام پر خیال کے حدود ضرور آجاتے ہیں مگر اب جس طرز ادا پر بحث کرتا ہے وہ اس سے بھی آگے ہے یعنی محاکات کی وہ صورت جس میں حدود کا تعین نہیں ہو سکتا۔ شاعر اپنے خیال کو اس صورت سے ظاہر کرتا ہے کہ مفہوم محدود ہونیکے بجائے ایک عجیب وسعت اختیار کرلیتا ہے شاعر خیال کے ایک پہلو کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرے پہلوؤں کی طرف جن کا اظہار مقصود ہوتا ہے اشارہ کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اور وہ بھی اس صورت سے کہ نہ تو کوئی پہلو متعین ہونے پاتا اور نہ کسی پہلو کی حد تک سننے والے کی نظر جاتی ہے۔ بلکہ خیال کی تصویر اس صورت سے پیش کیجاتی ہے کہ تعین کے بجائے اس میں وسعت آجاتی ہے۔ فن تنقید میں اس طریقہ اظہار کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور مغربی نقادان سخن نے اس کو بڑی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بعض کا خیال تو یہ ہے کہ شعر کی تمام قوت طرز ادا پر منحصر ہے۔ خیال کی تفصیلات و جزئیات

کوشش [illegible] کے کسی خاص پہلو کو اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا وسعت نظر اور مذاق طبیعت کے مطابق اپنی قوت تخیل سے کام لے۔ اور شاعر کے پیش کردہ خاکہ میں رنگ بھر سکے۔ اور اسی کو انگریزی اصطلاح میں Suggestion کہتے ہیں۔ یہ قوت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی سامع کو اپنے تخیل سے کام لینے کا موقع ملیگا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ Suggestion کہ مفہوم کنایہ سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی تبلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا   (غالب)

اس شعر میں حیرت و استعجاب کا ایک وسیع میدان ہے۔ عشق کی نیاز مندی حسن کی بے نیازی عشق کی محویت حسن کی بے اعتنائی ان میں سے کسی کیفیت کو بیان کرنیکی کوشش کیجاتی تو خواہ کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ ہوتا۔ خیال کے حدود قائم ہو جاتے۔ اس میں ایک طرف تو نیازمندی ہے دوسری طرف بے نیازی۔ بے نیازی کی یہ حالت کہ سراپا نیازکی خبر نہیں۔ دریافت حال ہوتا ہے تو اس محبوبیت سے جو فنا کو بقا و دوام سمجھتا ہے۔ اب اس بے نیازی پر حیرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے مگر اس حیرت میں معذوری کی جھلک پائی جاتی ہے اور اس کی حد بھی نہیں یعنی ہر شخص سے مدد کا طالب ہے کہ وہ اس دشواری کو حل کرے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ "کوئی" نے خیال میں عجب وسعت دے دی۔

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ   کوئی مجھکو یہ تو سمجھائے وہ سمجھائیں گے کیا؟

خیال تو یہ ہے کہ جو کچھ حضرت ناصح سمجھائیں گے وہ ہم کو معلوم ہے۔ وہی فرسودہ نصیحت۔ وہ ظاہری علت و معلول کا غیر متناہی جھگڑا۔ وہی معقول و منقول کا صبر شکن انبار مگر یہاں تو معاملہ ہے دل کا۔ جذبہ کا۔ سامنا ہے ایک ایسی قوت سے جس کا مقابلہ ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی اس کے لئے تیار ہیں کہ جو کہا جائے سن لیں۔ حضرت ناصح کی عزت کو جس صورت سے ظاہر کیا ہے اُس نے ایک عجیب لطف خیال میں پیدا کر دیا ہے۔ ناصح تو علیحدہ شاعر تو ہر شخص کو ناصح بنانے کے لئے تیار ہے۔ مگر پھر بھی اظہار کچھ نہیں۔ اس خیال کو جس سادگی سے ادا کیا ہے اس نے خیال کی قوت میں بہت زیادہ

[illegible] سادگی انتہائے اشکال ہے۔ کسی خیال کو وقت کے ساتھ ادا کرنا آسان ہو مگر سادگی کے ساتھ ادا کرنا دشوار ہے۔

خوب است جفا لیکن بر ما تو ز حد گذری   با بیدل ناکدہ ظلم اما نہ چنیں باید

(حزیں)

اب اس میں دل آزاری کی حد متعین نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف تو جفا کو سینہ سے لگاتا ہے اور دوسری طرف شکایت کرتے ہوئے اس کے حدود قائم نہیں کرتا سکے جاتے۔ سننے والا اپنے خیال کے مطابق جہاں چاہے اس کی حد قائم کرلے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ   دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

خیال یہ ہے کہ مقصد کے حصول تک دیکھئے کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔ قطرہ کو گہر بننے تک جن خوفناک منزلوں کو طے کرتا ہے وہ اس وقت خیال کی رسائی سے باہر ہیں۔ اس شعر میں اگر مصائب کو بیان کر دیا جاتا۔ تو وہ مصائب کیسے ہی سخت کیوں نہ ہوتے مگر سننے والا اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ مگر طرز ادا نے عجیب میدان پیش کر دیا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اسکی دیکھا چاہیے

تخیل کی انتہا ہے۔ ناامیدی کی حد کہاں ہو سکتی ہے۔ جس کی ساری امید موت پر منحصر ہے۔ خیال یاس کی انتہا تک پہنچنے سے قاصر ہے مگر پھر بھی ہر دماغ اپنی قوت و وسعت کے لحاظ سے ایک حد قائم کر سکتا ہے غرضکہ

آں راز در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت

اب اگر اس راز کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی تو راز پھر راز نہ رہتا۔ اگر اس راز کو کچھ تعلق ہے تو دار سے۔ اس تعلق نے خیال میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ خیال جہاں تک اس کی رسائی ہو تلاش کرے۔ مگر پھر بھی راز کی حقیقت تک پہنچنے کا دعوے نہیں کر سکتا۔ دار تک پہنچنے کے بعد بھی اس راز کا انکشاف

بےخودی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

پردہ داری کا اصلی سبب دریافت کیجئے اور اپنے مذاق طبیعت اور نظر کے اعتبار سے لطف اٹھائیے کچھ ہے تو ضرور مگر معلوم نہیں کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کنایہ عارض سخن پر ایک ہلکی نقاب ہے جو مشتاقان جمال کے شوق دید کو بڑھاتی رہتی ہے۔ نظارہ کے بعد شوق نظارہ اور بڑھ جاتا ہے۔

عمرانیات و مسئلہ تعلیم ہند

مسئلہ تعلیم ہند کی تشریح و توضیح

"چاہے برطانوی حکومت سے ہندوستان کو کتنے ہی فوائد پہنچے ہوں مگر اس کی بقا کیلئے یہ قیمت بہت زیادہ ہے کہ ہماری آبادی کے ۹۵ فیصدی افراد ہمیشہ کے لئے ان پڑھ رہیں"

سالہا سال سے حقیقۃً برطانوی حکومت کے ابتدائے دور تعلیمی سے تدریجی شدت و وسعت کے ساتھ ہندوستان میں مقصد و طریق تعلیم کے متعلق تنازعہ ہے۔ حکومت کو خوشگوار و ناگوار صحیح و غلط تنقید سنا پڑی اور اس نے اپنی طرف سے جائز و ناجائز ہر ممکن طریق سے اپنی مرضی کے پورا کرنے اور اپنے مقاصد میں کامیاب رہنے کی پوری کوشش کی۔ چاہے حکومت کی نیت کیسی ہی ہو، اس ایک مسلمہ بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انگلستان نے ہندوستان کو تعلیم حاصل کرنے کے صرف چند محدود ذرائع فراہم کئے وہ بھی ایسے جن سے صرف چند کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

آج سے بیس سال قبل "خودمختار حصہائے برطانیہ مثلاً کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ میں معتدبہ رقوم ابتدائی تعلیم کے لئے صرف کیجاتی ہیں، مگر فوقانیہ و جامعاتی تعلیم کے ذرائع محدود ہیں جب ہم ہندوستان کی تعلیمی حالت پر غور کرتے ہیں تو وہ اور زیادہ خوفناک معلوم پڑتی ہے۔ بجز دو ملین (بیس لاکھ) پونڈ کی رقم تعلیمات پر صرف کرنے کے، حکومت تین سو ملین (تیس کروڑ) اشخاص کی بہتری و تربیت کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ اور یہ بالکل محال ہے کہ ہندوستان کے غریب باشندے خوانگی اخراجات سے (تعلیم کے لئے) کچھ بھی بچا سکیں"[1] یہ قول کسی ہندوستانی قوم پرست

(۱) "معاشیاتی مطالعہ و تحقیقات" مطبوعہ ۱۸۸۰ء لندن ۱۹۰۲ء جلد دوم صفحہ ۳۰۰

لیڈر کا نہیں بلکہ انگلستان کے ایک نامور ادیب، ماہر مالیات وعلم اعداد وشمار یعنی سر رابرٹ گفن کا ہے۔

یہ حال تو بیس سال قبل تھا اُس وقت سے بہتیرے تغیرات ہوئے مگر ہندوستان کی جہالت دور نہ ہوئی۔ ان پڑھ لوگوں کی تعداد میں کوئی قابل لحاظ، اطمینان بخش کمی نہیں ہوئی۔ بڑے بڑے شہروں میں بھی ابتک مفت تعلیم کا انتظام نہیں ہوا اور زراعتی درسگاہیں جن کی سخت ترین ضرورت عرصے سے محسوس ہو رہی ہے اب تک قائم نہیں ہوئیں، اسی لئے ہندوستان بدترین ... ریکی میں مبتلا ہے اور ہندوستان کو اُسکی موجودہ تکلیف دہ عمرانی ومعاشی حالت سے نجات دلانا ایک حد تک ناممکن ہے، قوم کو ایک بالاتر میعارِ زندگی پر بسر اوقات کرانیکی کوئی امید اور کوئی امکان باقی نہیں۔

سرکاری اطلاع نامے بابت ۲۵-۱۹۲۴ء میں مرقوم ہے کہ " بیشتر مسائل ہند کا ایک تنہا ماخذ ہے۔ یہ تعلیم کی عام کمی ہے جو ہندوستانی عوام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ تاوقتیکہ یہ خرابی دور نہ کی جائے گی یہ غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اس قدر جانداری پیدا کر سکے گا جو معاشی و سیاسی خوشحالی حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے۔ تاوقتیکہ لوگوں کے خیالات وسیع نہوں گے اور اُن کی وسعت نظر اُن تنگ حدود سے باہر نہو سکے گی جس میں رسم ورواج نے اُسے مقید کر رکھا ہے عوام الناس ہمیشہ غریب وجاہل ہی رہیں گے، عورتیں اپنے محدود دائرہ عمل میں رہیں گی، طریق حفظان صحت کا عمل درآمد امراض متعدی کا تدارک غیر معین زمانے کے لئے ملتوی کرنا پڑیگا۔ مختصر یہ کہ عام وسعت تعلیم کے بغیر جو اُس کی ضرورت واستطاعت کے موافق ہو ہندوستان قومیت کے وہ توقعات پورے نہیں کر سکتا جو کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں پائے جاتے ہیں"[1]۔ باوجو

---

(۱) " اطلاع نامہ (رپورٹ) متعلقہ اخلاقی ومعاشی ترقی وحالات در ہند۔ دوران ۲۵-۱۹۲۴ء" مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء صفحہ ۲۷۷

ہی احساس سے کہ برطانوی ہند میں تعلیمی ترقی کے لئے کیا ہو رہا ہے اس کے متعلق بہترین و مستند ثبوت ذیل جدول فراہم کرتا ہے (۱)

ملک	۲۱-۱۹۲۰ء میں فی شخص تعلیمی اخراجات
ممالک متحدہ امریکہ	۲۷ شلنگ یعنی ۳۲۴ پنس
برطانیہ	۱۵ شلنگ یعنی ۱۸۰ پنس
فرانس	۱۱ شلنگ یعنی ۱۳۲ پنس
ہندوستان	صرف ½ شلنگ یعنی صرف ۶ پنس

بیشک برطانوی حکومت ہند کے یہاں اس قدر آمدنی نہیں جس قدر کہ دوسرے ممالک کی حکومتوں کو حاصل ہے تاہم یہ حقیقت باعث فکر و تردد ہے کہ حکومت سرکاری آمدنی کا صرف ایک قلیل ترین حصہ تعلیمی اغراض کے لئے صرف کرتی ہے۔

یہ حقیقت اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہے کہ سرکاری آمدنی کا یہ قلیل حصہ جو تعلیمات پر صرف ہوتا ہے، مختلف علوم و فنون میں بالکل ہی غیر مساوی طور پر تقسیم پاتا ہے۔ حکومت اپنی اندھا دھند طریقے پر عمداً یا مصلحتاً فلسفہ، تاریخ، فنون لطیفہ، ادبیات اور السنۂ قدیمہ و جدیدہ کی تعلیم کی تحریص و ترغیب دلاتی ہے اور میکانی، زراعتی و صنعتی تعلیم کو خواہ مخواہ نظر انداز کرتی ہے۔ حسب ذیل جدول سے، جو سرکاری اعداد و شمار سے تیار کیا گیا ہے (۲) بآسانی انداز کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی باوجود قوم پرست مدبرین اور ماہرین تعلیمات کے پرزور مطالبات کے، طلبہ کن علوم و فنون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

---

(۱) ماخوذ از "ساٹھ سالہ ہندوستانی مالیات" مصنفہ پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ۔ مطبوعہ تاراپوروالا بمبئی ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۴۲

(۲) ملاحظہ ہو Statistical Abstract مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء صفحہ ۲۷۲

قسم تعلیم	تعداد طلبہ در جامعتہائے ایف اے و بی اے	جملہ تعداد طلبہ کا فیصد
علوم نظری و فطری السنہ قدیمہ و جدیدہ	۵۰،۹۴۴	۸۴٫
قانون	۵،۹۶۰	۸٫
علم تعلیم	۲،۹۳۶	۴٫۴
طب	۱۰۳۵۴	۲٫
زراعت	صرف ۵۶۷	٫۸۶
فنون میکانی	صرف ۲۹۰	٫۵۶
عمل تجارت	صرف ۱۳۶	٫۱۸
میزان	۶۹،۰۳۹	۱۰۰٫۰۰

کیا یہ تعجب خیز امر نہیں کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں کی آبادی ۷۰ فیصدی زراعت پیشہ ہو ۸۴ فیصدی طلبہ علوم نظری و فطری کا مطالعہ کریں اور ۱۲۵ طلبہ میں سے صرف ایک خود کو زراعت کی تعلیم کے لئے وقف کرے؟ جرمانیہ جیسے صنعتی ملک میں زراعتی جامعات میں تعلیم حاصل کرنیوالوں کی تعداد ۱۹۲۲ء کے سرمائی میقات میں ۴،۱۲۰ تھی اور ہندوستان میں برخلاف اس کے صرف ۵۶۷۔

یہ ایک تلخ واقعہ ہے کہ فریڈرش لسٹ Friedrich List کا یہ طعن آمیز قول ہندوستان پر کلیۃً صادق آتا ہے کہ قوم میں کافی فلسفی ہو سکتے ہیں جو کائناتی معموں کو حل کرنیکی دردسری مول لیتے ہوں، اور اسی قوم میں ایسے لوگوں کی کمی ہو جو آلو کی کاشت سے واقف ہوں(1)۔ اسی عالم معاشیات کی ہم اگر ایک طور ترکیب استعمال کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں دولت کی پیدائشی

---

(1) ماخوذ از Das Nationale System der politischen
Cotta بمقام Stuttgart ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۴۲

... ہم آہنگی نہیں ہے۔

اس غیر مناسب طرز تعلیم میں حکومت بے قصور نہیں۔ بغیر نیت و مصلحت پر بحث کئے ہم صرف یہ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان کے ۲۲۸ کالجوں میں صرف ۵ زراعتی کالج ہیں اور ممالک محروسہ سرکار عالی میں ایک کالج بھی زراعت کا نہیں حالانکہ وہاں نظری و فطری علوم کے لئے چھ کالج موجود ہیں۔ برخلاف اس کے المانیہ میں فنون لطیفہ، علوم عمرانی و فطری، ادبیات وغیرہ کے اگر پچیس جامعات ہیں تو میکانی کے لئے آٹھ، صنعتی کے لئے آٹھ اور صرف زراعت کے لئے چار جامعات ہیں۔

سچ پوچھئے تو ہمیں کلیات کی شدید ضرورت نہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ زراعتی درسگاہیں، جن میں (مثل جرمانیہ کے جہاں اس قسم کے تقریباً تیس ادارے ہیں(۱)) کسانوں اور انکی اولاد کو زراعت کی عملی اور تھوڑی بہت نظری تعلیم دیجاتی ہو، قطعی مفقود ہیں۔ اس طرح سلطنت ایک قوم کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے جس کی تین چوتھائی آبادی زراعت سے پلتی ہو!!

یہ بھی ایک بدیہی امر ہے کہ بقیہ علوم و فنون کا نصاب تعلیم بھی کسی طرح مکمل یا اطمینان بخش نہیں اگر ہم ان لوگوں کی تنقید کا لحاظ نہ کریں جو برطانوی حکومت ہند کے علانیہ مخالف ہیں۔ تب بھی ہم اُن کو نظرانداز نہیں کرسکتے جو خود انگریز اور انگریزی حکومت کے موافقین میں سے ہوں۔ سر بی فلر سابق گورنر مشرقی بنگال و آسام "طریق امتحانات کی آسانیوں"۔ "سطحی معلومات"۔ "بے ضابطگی"۔ "رٹنے" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مدرسین کم اجرت پاتے ہیں وہ درس دینے کو دوسرے پیشوں تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ مدرسہ فوقانیہ کا مدرس خوش قسمت ہے اگر اُسے سالانہ پچیس پونڈ ہی ملیں(۲)"۔

---

(۱) دیکھئے
Prof. Remme: Die Hochschsulen Deutschlands
مطبوعہ برلن یونیورسٹی ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۳

(۲) از تصنیف سر بی فلر "Studies of Indian Life and Sentiment."
مطبوعہ جان مرے لندن ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۰

باوجود اس کے سرجیم فائلڈ فلر، گو ایک سابق گورنر کے شایانِ شان زبان ہی میں سہی، اقرار کرتے ہیں کہ ہماری رقمی امداد زیادہ نہیں"(۱)

لیکن ہندوستانی طرز تعلیم کے نقائص، خامیوں اور کمزوریوں کا بیان اب بھی ختم نہیں ہوا۔ گاندھی جی کا قول ہے کہ "صحیح تہذیب و تربیت ایک غیر زبان کے توسط سے حاصل کرنا ممکن نہیں" علبہ کے دماغ بھرتی کی معلومات سے پاٹ دیئے جاتے ہیں اور وہ مثل طوطے کے گورٹ رٹا کر بولنے لگتے ہیں مگر ذاتی فکر و ملیت کے لئے وہ بیکار ہوتے ہیں اور دوسروں کے لئے یا خود کے لئے اپنے علم سے استفادہ کرنیکی ان میں صلاحیت نہیں ہوتی۔

تعجب انگیز صحت سے پروفیسر ڈاکٹر کارل برنکمن Carl Brinkmann کے متنبہ کرنے والے ہدایات ہندوستانی حالات پر بھی منطبق کئے جا سکتے ہیں۔ صاحب موصوف امریکی یونیورسٹی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: "مختلف جماعتوں کے درس بجائے عمیق تحقیقات کا ذوق پیدا کرنے کے دماغی ورزش سے بڑھ کر نہیں ہوتے اور مغربی دنیوی تعلیمی اداروں میں ازمنہ وسطیٰ کے مدرسوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں جس میں امتحانات کی تیاری کے لئے درسی کتب کو رٹا رٹا کر مشق کرائی جاتی ہے۔ بالآخر یہ طریق لامحالہ علمی تحقیقات کے لئے نا ممکن ثابت ہو گا کیونکہ جس چیز کے حاصل کرنے کی علبہ میں تمنا ہو گی وہ کسی پیشے کی تیاری کے لئے ضروری معلومات کے حاصل کرنے کا خیال نہ ہو گا بلکہ اپنے نام کے آگے پیچھے القاب، اسناد، مخصوص حروفِ ابجد کے رقم کرنے کی خواہش ہو گی، تاکہ تعلیم یافتہ ہونیکا نشان انکے نام ہی سے واضح طور پر ظاہر ہو سکے(۲)"

---

(۱) از تصنیف سر بی فلر

(۲) ماخوذ از Demokratie und Erzie hung inAmerika

مطبوعہ Fischer بمقام برلن ۱۹۲۰ء صفحہ ۳۹ و ۴۰

گویا عوام کے لئے مفت مدارس کا عدم وجود، زراعتی درسگاہوں کی عدم موجودگی تعلیم گاہوں کی کمی، مختلف اقسام تعلیم کی غیر متناسب تعلیم، غلط طریق و اصول تعلیم، ناکمل، مشکل اور غیر ... نصابہائے تعلیم، زیادہ تر انہیں وجوہ کی بدولت ہندوستانی قوم کی تعلیم تشفی بخش طور پر نہیں ہو سکتی اور یہ مسلم الثبوت واقعہ ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہاں حکومت کو چاہئے کہ قومی تعلیم کی خاطر دخل انداز ہو اور قوم کو موزوں و مناسب علمی و عملی، صنعتی و پیشہ وری بالخصوص زراعتی تعلیم دے۔ صرف سلطنت ہی تعلیم کے لئے ضروری انتظامات کر سکتی ہے، صرف سلطنت ہی ہندوستان سے جہالت کی سخت تاریکی دور کر سکتی ہے اور اس طرح معاشی ترقی کی شاہراہ کے لئے راستہ قائم کر کے ہندوستانیوں کی غربت و ناداری، مفلسی و محتاجی کے دور کرنے کا وسیلہ فراہم کر سکتی ہے۔

مسئلہ تعلیم ہند کی تحلیل

نظام العمل موجودہ تعلیم ہند کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ طرز تعلیم زیادہ تر نظری، شالیاتی، اور ادبی ہے جو معاشیاتی نقطۂ نظر سے کسی مصرف کی ہو تو صرف اس حد تک کہ وہ منشی سازو بابو گر بھی ہے۔ جہاں تک کہ ادبی تعلیم کا تعلق ہے خود ماہرین تعلیمات بار بار کہہ چکے ہیں کہ وہ ناقص ہے۔

پر جوش مگر صحیح الفاظ میں دار السلطنت دکن کے ایک علمی ادارے کے صدر لکھتے ہیں: "تقریباً پچاس سال کی ادبی تعلیم کے باوجود اب تک کوئی ایسی جماعت کی بنیاد نہیں پڑی ہے جو علمی ذوق و شوق رکھتی ہو اور علم کو محض علم کی خاطر حاصل کرتی ہو۔ اگر یہ نہیں تو کم از کم اتنے عرصے کی تعلیم کے بعد ہم اتنی توقع ضرور کر سکتے ہیں کہ اس نے دماغوں کو روشن کر کے تباہ کن رسم و رواج اور مذہبی توہمات کو تھوڑا بہت دور کر کے انسانی برادریت کا خیال پیدا کر دیا ہوگا۔ لیکن آپ دیہات تو دیہات شہروں میں بھی ڈھونڈ ھیں تو مشکل سے ایسے آدمی نظر آئیں گے جو ہماری تعلیم گاہوں کے مدارج پورے کرنے کے بعد اپنے عادات و اطوار، رسم و رواج، اور مطمح نظر میں اپنے جاہل بھائیوں سے شاید ہی کسی قدر بہتر ہونگے۔ اگر آپ کو اس میں کلام ہے تو اپنے یہاں کے ادنیٰ ترین چپراسی کی زندگی کا

مقابلہ کسی گریجویٹ کی زندگی سے کر لیجئے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو اسی اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ سب کچھ گریجویٹ صاحب بھی کرتے ہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وہ تنگدستی کے باعث ہر بات چھوٹے پیمانے پر کرتا ہے اور یہ اس سے بڑے پیمانے پر۔"(۱)

یہ ایک عام مشاہدہ ہے چنانچہ پروفیسر احمد محی الدین صاحب اپنے رسالے "خرچ و بجٹ" میں لکھتے ہیں کہ "ہمارے ہاں کے گھروں کی صفائی، بچوں کی تعلیم و تربیت اور امور خانہ داری کی وہی حالت ہے جو پچاس برس پہلے تھی۔ اس میں ذرا بھی فرق نہیں ہوا۔ شوہر اپنے لئے ایک دو کمرے سجا کر رکھ لیتا ہے جس میں دو تین ٹوٹی کرسیاں یا دو چار میلے کچیلے سوفے اور دو تین گرد آلود تپائیاں ہوتی ہیں۔ کمرے میں اوپر جالے نیچے پیک اور گرد آلود دیواروں پر چند بری بھلی تصویریں ٹنگی ہوتی ہیں۔ اس ڈرائنگ روم کا فرش جھاڑا بھی جاتا ہے تو گرد زمین سے اڑ کر دیواروں اور تصاویر پر جم جاتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دوستوں کی خاطر مدارات کی جاتی ہے اگر گھر میں داخل ہوں تو دوسرا ہی سماں نظر آتا ہے۔ ہر کمرے اور دالان میں غلاظت، ترکاری کے چھلکے، تو صحن یا دالان کے کونوں میں کوڑا کرکٹ۔ ایک طرف پلنگ پڑا ہے تو دوسری جانب سیلابچی اور لوٹا رکھا ہے۔ پلنگ میں دیکھو تو کھٹمل اور فرش پر چیونٹیاں۔ بچے نے کھانا کھایا تھا تو غلیظ رکابی وہیں رکھی ہے۔"(۲)

ہندوستان کی انقلاب پسند ہستیاں نہیں بلکہ پروفیسر الیاس برنی جیسے متانت اور سنجیدگی سے اعتراض کرنے والے مسئلہ تعلیم ہند پر بیساختہ کہہ اٹھتے ہیں: "اب غور کیجئے کہ موجودہ طریق تعلیم کہاں تک ہمارے درد کی دوا اور ہماری ضروریات کی کفیل ہے، پنجاہ سالہ کوششوں کے پھل، کروڑہا روپے تعلیمی مصارف کے حاصل، ترقی کے زندہ آثار، سرمایہ ناز افتخار، ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں

---

(۱) از "تعلیم روزگاری" مصنفہ سجاد مرزا صاحب ایم اے (کنٹب) مطبوعہ صدر جمعیت اتحاد امداد باہمی حیدرآباد ۱۳۴۳ف صفحہ ۱۰-۹

(۲) از رسالہ "خرچ و بجٹ" مطبوعہ جمعیتہ اتحاد امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن ۱۳۴۳ف صفحہ ۴

کے کمالات پر نظر ڈالیے۔ ایک انبوہ کثیر سرگرداں وحرماں نصیب سائلوں اور احمد داہدوں کا ایک ہجوم غفیر سپاس گزار و فرماں بردار محرروں کا ایک روز افزوں گروہ نزاع پرور و جدال پسند وکیلوں کا، وہ فرشتے آزادکش و بیباک اور مصلحت اندیش و کرم خواہ سفیروں کے، اور سب سے چھوٹی جماعت خوددار و متانت شعار کارگذاروں کی، جو صنعت وحرفت، زراعت و تجارت کو ترقی دے کر صحیح اصول کے مطابق ملک کی بہبودی اور مرفہ الحالی کے وسائل پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ مطالبات جیسے چاہو اعلیٰ، ہمت جتنی چاہو پست، قول بغایت فصیح و بلیغ، عمل نہایت بدسلیقہ و بے ترتیب، نہ خیالات میں تمکنت نہ جد وجہد میں استقلال، جذبات سریع الاشتعال، ارادات سریع الزوال۔

"ہماری جیسی بے اصول و ناکمل طریق تعلیم سے اور کیا نتائج برآمد ہو سکتے تھے جسم کے تمام اعضا کو معطل کر کے دماغ مجسم بننے کی کوشش کا نتیجہ اضمحلال، مرض اور موت کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ کامل صحت و تندرستی کے واسطے تمام اعضا کا قوی ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح قومی عروج بھی اخلاقی، معاشرتی اور بالخصوص معاشی حالت کی عمدگی بغیر محض دماغی ترقی پر قائم نہیں ہو سکتا۔ افراد کیا ہیں؟ جسم قوم کے بے شمار اعضا! اور ہر عضو کا کام جداگانہ مخصوص ہے۔ اگر کسی عضو کو معطل کیا جائے یا کار مخصوص کی بجائے اس سے دوسرا کام لینے کی کوشش کی جائے تو ممکن نہیں کہ جسم قوم کی صحت و قوت کو مضرت نہ پہنچے۔ کیسے ممکن ہے کہ تمام لوگ ادیب، زباں دان، مورخ فلسفی، مہندس یا عالم الہیات بن جائیں اور اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ نظام عالم کی درہمی و برہمی نہیں تو اور کیا ہے؟ بہت سے بدقسمت نوجوان اپنا قیمتی وقت اور بہت سا روپیہ مروجہ تعلیم میں ضائع کر کے ناکام و نامراد رہ جاتے ہیں، لیکن ان میں سے بہت سے صنعت وحرفت، زراعت یا تجارت کے واسطے ایسی موزوں طبیعت اور اس قدر وافر استعداد رکھتے ہیں کہ اگر ان کو صنعتی تعلیم میسر آ سکتی تو بہت بڑی کامیابی اور نام و نمود حاصل کرتے اور بجائے بار کے سہارا اور بجائے عار کے سرمایہ بن جاتے۔ ان لوگوں کی خداداد قابلیتوں کا خون اور ان کی بربادی کا گناہ ہمارے ناقص طریق تعلیم کی گردن پر نہیں تو اور کس پر ہے؟" (۱)

(نوٹ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ؟)

ہیں فی الوقت ادبی تعلیم، علوم عمرانی وفطری کی اعلیٰ تعلیم کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر "تعلیم روزگاری کی ہے" جس سے مراد ایسی تعلیم سے ہے جو انسان کو اس قابل بنائے کہ وہ خود اچھا کھائے، اچھا پہنے، اپنی بیوی کو اچھا کھلائے، اچھا کپڑا اور زیور پہنائے، اپنی اولاد کو اپنے سے بہتر اور آرام دہ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرے۔ اور اپنے اوقات فرصت دماغی اور روحانی ترقی میں صرف کرے۔"(۱)

ہماری ضروریات مختلف ہیں لہذا ہماری تعلیم بھی ہماری ضروریات کی مناسبت سے مختلف قسم کی ہونی چاہیے۔ کوئی انکار نہیں کرتا اور ہمیں بھی اس میں کلام نہیں کہ ماہرین، السنہ قدیمہ وجدیدہ کے جاننے والوں، اور علمائے معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، حیاتیات وغیرہ کی ضرورت ہے۔ تاہم ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اُنکے ساتھ ساتھ اور اُن سے زیادہ ہمیں ماہرین مالیات زر، فنون کارآمد، صنعت وحرفت، اور تجارت درکار ہیں۔ اعلیٰ ادبی وتحقیقاتی اداروں Research institutes کے ساتھ ساتھ مگر اُن سے زیادہ ہمیں صنعتی مدارس، تجارتی اداروں، تجرباتی کھیتوں، اور زراعتی درسگاہوں کی شدید ضرورت ہے۔

ہندوستان میں فوری نفاذ جبری تعلیم کے خلاف دلائل

ہماری مالی حالت وشدید ترین ضروریات کو نظر انداز کرتے ہوئے بعض ریاستوں اور شہریاؤں (Municipalities) نے یورپ وامریکہ کی کورانہ تقلید میں جبری تعلیم نافذ کر دی جو نہ صرف قبل از وقت بلکہ غیر مفید ثابت ہوئی چنانچہ مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے، صدر مہتمم تعلیمات بلدہ، جو ہندوستان

(نوٹ صفحہ ۲۰) تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے الیاس برنی صاحب کی لاجواب تصنیف "علم المعیشت" مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڑھ ۱۹۲۰ء صفحہ ۹۰ تا ۹۸

(۱) از "تعلیم روزگاری" مصنفہ سجاد مرزا صاحب، پرنسپل چادرگھاٹ گورنمنٹ ہائی اسکول۔ مطبوعہ مجلس اتحاد امداد باہمی حیدرآباد دکن ۱۳۳۶ف صفحہ ۱

کے تعلیمی حالات سے باخبر ہیں، لکھتے ہیں: "برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں میں جابجا پرائمری مدارس کثرت سے قائم ہیں لیکن ان مدارس پر جس قدر روپیہ صرف ہوا ہے اور جیسی توجہ مبذول کی گئی ہے اُس کے مطابق خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا۔ رپورٹ مردم شماری سے واضح ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں باوجود مجموعی آبادی میں بیشی ہونے کے اور مدارس وطلبہ کی تعداد میں اضافہ ہونے کے، خواندہ ذکور کی تعداد بجائے بڑھنے کے کم ہو گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جو مدارس تحتانیہ میں تعلیم پاکر نکلتے ہیں وہ کتاب کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ چند سال کے بعد زمانہ طالب علمی کا پڑھا لکھا نسیاً منسیاً ہوجاتا ہے۔ خصوصاً دیہات میں یہ مرض بہت عام ہے۔ شہروں میں پھر بھی لوگوں کو پڑھنے لکھنے کے مواقع حاصل ہیں، لیکن دیہاتی زندگی کی نوعیت عموماً ایسی ہوتی ہے کہ تحتانیہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد لکھنے پڑھنے اور علمی مشاغل کے جاری رکھنے کے لئے نہ تو کوئی ایسی ترغیب وتحریص ہوتی ہے اور نہ موقع ہی ملتا ہے۔"[1]

افادیت کے نقطہ نظر سے تقریباً یہی حال فوقانیہ وجامعاتی تعلیم کا ہے۔ "اور مروجہ تعلیم تقسیم کار کے لحاظ سے اُس طبقے کے لئے جو اپنی تعداد کے مدنظر ملک کے جملہ طبقوں میں چوتھے درجے پر ہے محض بے سود ہی نہیں بلکہ مضرت رساں ہے۔ ایک ہی وضع قطع کے وسطانیہ وفوقانیہ مدارس وانٹرمیڈیٹ کالج کا قیام ہوتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ انہیں نقشی ساز کارخانوں کا مال خود بانیان کارخانہ جات ہی قبول نہیں کرتے۔"[2] محض اس وجہ سے کہ جو "مال" وہ تیار کرتے ہیں اس کی کھپت کی گنجایش نہیں۔ ہندوستانی محکمہ تعلیم مثل اس کارخانے کے ہے جو خریداروں کی ضرورت کا لحاظ کئے بغیر زائد تعداد میں مال تیار کرتا ہے، جس قدر مال کی ضرورت ہوتی ہے وہ تو فروخت ہوجاتا ہے اور بقیہ مال بیکار پڑا رہتا ہے۔ یہی حال اُن زائد طلبہ کا ہے جو علوم عمرانی وفطری، ادبیات، وفنون

---

(۱) از "تعلیم بالغان" مطبوعہ صدر جمعیت اتحاد امداد باہمی محدود ۱۳۴۳ف صفحہ ۲ تا ۸
(۲) از "تعلیم روزگاری" مصنفہ سجاد مرزا صاحب صفحہ ۱۲ و ۱۳

نظری تعلیم حاصل کر لیتے ہیں، اور انکا قدردان نہیں ملتا لہٰذا ہمیں ضرورت اسکی ہے کہ سب سے پہلے مختلف قسم کی تعلیم دیں۔ موجودہ زمانے کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمیں سب سے زیادہ زراعتی درسگاہوں (جہاں کسانوں کو کھیتی باڑی کے عملی طریقے اور نظری اصول بتائے جاتے ہیں) اور فنی مدارس کی (جہاں لوگوں کو بڑھئی، لوہار، سنگتراش، باورچی وغیرہ بننے کا موقع ملے) سخت ترین ضرورت ہے، اُس کے بعد صنعتی و تجارتی مدرسوں Technical and Commercial School اور فنون لطیفہ کے ادارے جہاں پارچہ بافی، مصوری، آرائشی کام کاج سکھایا جاتا ہے درکار ہیں۔ ادبیات، علوم فطری و نظری السنہ قدیمہ و جدیدہ کے لئے ہمارے ملک میں فی الحال ضرورت سے زائد لوگ موجود ہیں، نظری مدارس بھی کافی تعداد میں ہیں لہٰذا ہمیں اس قسم کے مزید اداروں کی ضرورت نہیں، شاید تخفیف ہی درکار ہو۔

موجودہ زمانے کی معاشی و سیاسی ابتری کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ہم نے جس کسی کو تعلیم دی زیادہ تر علوم فطری و عمرانی، ادبیات و السنہ کی دی یعنی بغیر طلبہ کے قدرتی رجحان کا لحاظ کئے سب کو ایک طرف ہانکا۔ اس پر مزید غلطی یہ کی کہ بغیر حاصل کردہ تعلیم کا لحاظ کئے اُن سے جو چاہا کام لیا۔ محکمہ فنانس میں ادبیات و تواریخ کے جاننے والے موجود ہیں تو مالیات و معاشیات کے جاننے والے محکمہ پولس میں ملازم ہیں۔ زراعتی محکمے اور محکمہ جنگلات میں علم آثار قدیمہ کے شوقین اور شاعری کے دلدادہ ہیں تو بیسیوں مدرسین جنہیں علوم فطری و عمرانی سے کوئی دلچسپی نہیں، آئندہ نسل کی تربیت و تعلیم میں مصروف ہیں جنہوں نے ریاضی کی تعلیم پائی ہے محرری کر رہے ہیں اور جو ادبیات کا ماہر ہے وہ کسی دفتر میں ادنیٰ خدمات بجالا رہا ہے۔ جغرافی ارضیات کے متعلق ایک دکیل کتاب تصنیف کرتا ہے تو سائنس داں افسانہ نویسی کرتے ہیں۔ ماہرین سیاسیات و عہدہ داران مالیات ادبی تبصرات و منتخبات کرتے ہیں تو ارکان ڈاک سیاسی رہبروں کے حالات زندگی اور سیاسی واقعات پر تبصرہ کرتے ہیں (۱)۔ جب لوگوں کے پیشے اور شغل میں اور اُنکے علم و عمل میں اس قدر بے ربطی ہو گی تو رفتار

(۱) [illegible] کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۸

ترقی کس طرح ہوسکے گی۔ قومی ترقی کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو اس کے قدرتی رجحان کے مطابق علم، فن، صنعت، تجارت یا میکانی تعلیم دیجائے بلکہ یہ بھی کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس شخص سے اس کے علم وہنر کے مطابق کام لیا جائے۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ خصوصاً متوسط درجے کی قابلیت کے لوگوں کے قدرتی رجحان کا کیونکر پتہ چلایا جاسکتا ہے؟ یہ بیشک سہل نہیں۔ مگر جب ملک میں مختلف مدارس ہوں گے اور ایک طالب علم جو فرض کیجئے صنعتی مدرسے میں داخل کیا جائے اور اس کی آرزو زراعتی مدرسے میں داخل ہونے کی ہو یا یہ کہ صنعتی مدرسے کے معلمین، طالب علم کے والد یا سرپرست یا عزیز کو رائے دیں کہ لڑکے کی طبیعت اس فنی تعلیم کے لئے موزوں نہیں معلوم ہوتی تو اس لڑکے کو دوسرے مدرسے مثلاً تجارتی یا زراعتی میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح بہت جلد اس کی اہلیت کا اندازہ ہوسکیگا جس طرح موجودہ زمانے میں بعض طلبہ مورخین بنتے ہیں اور بعض وکلا، بعض فلسفی نکلتے ہیں اور بعض عمرانی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں، بعض مشرقی یا مغربی زبانیں سیکھتے ہیں اور بعض قدیم زبانوں کی طرف متوجہ ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کے مدارس رائج ہونے کے بعد طلبہ زراعتی، تجارتی، صنعتی ونظری علوم کے مدرسوں میں آپ ہی منقسم ہوجائیں گے۔ اور جو کچھ ردوبدل وتبدیلیاں ہوتی رہیں گی وہ ازخود جاری رہیں گی۔

فی الحال گورنمنٹ کو چاہیئے کہ تعلیم کو جبری کرنے سے قبل مختلف قسم کے

(نوٹ صفحہ ۲۰۹)

---

(۱) میری مراد "نیرنگ ارض" ، "حکایات شرلاک ہومز" ، "تمہید کلیات اقبال" The Life of Lord Morley وغیرہ سے ہے۔ اردو مطبوعات سے جو لوگ باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کن کی کتابیں ہیں۔

اور جہانتک ہو سکے عوام کے لئے مفت مدارس کا افتتاح کرے ۔ اور بجائے تعلیم جبری فرائض کرلے اپنے ذمہ اور گورنمنٹ اور دوسری مول لینے کے ، اور قانون کے مطابق عمل کروانے میں محنت و دولت صرف کرنے کے ۔ لوگوں کے لئے مختلف قسم کے مختلف مدارس کے قیام کا انتظام کرے ۔ طلبہ کو وظائف دے کر ، مفت کتابوں اور (جہاں ضرورت ہو بالخصوص غرباء کے محلوں میں کم از کم ایک وقت کی مفت غذا دے کر) تعلیم کی ترغیب دلائے ۔ تعلیم اس قسم کی ہو جو انکے کام آئے اور نہ صرف انکے عام معلومات میں اضافہ کرے بلکہ انکی معاشی حالت کو بھی بہتر بنائے ۔ مفلس و آفت زدہ ، جاہل و ناعاقبت اندیش ہندوستان کو صرف ایک ہی طریقے سے یعنی صرف ادبی تعلیم کے ذریعے سے مرفہ الحال بنانا قطعی ناممکن ہے ۔ جن لوگوں کو پیٹ بھر غذا میسر نہ ہو ان کے لئے جبری تعلیم کا انتظام کرنا ستم ظریفی ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ اس تعلیم سے انکی معاشی حالت بھی نہیں سدھرتی ۔ ہمیں چاہئے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ انکی معاشی حالت کو درست کریں اور ان کی معاشی حالت و صحت کو درست کرنے کی خاطر حسب ضرورت تعلیم دیں ۔ لوگوں کی اشتہا حروف ابجد اور معمولی حساب کتاب سکھانے سے دور نہیں ہو جاتی ۔ لوگوں کی صحت اصول حفظان صحت اور امراض متعدی پر لکچر دینے سے عمدہ نہیں ہو جاتی لوگوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ روٹی کمانے کے طریقے سکھانے چاہئیں اور ان کے لئے موزوں پیشے یا مواقع خدمات مہیا کرنے چاہئیں ۔ اگر یہ ناممکن ہے کہ لوگوں کے لئے یہ سب کچھ ہو سکے تو انہیں تعلیم دینا بھی بیکار ہے ۔ لہذا مسئلہ تعلیم کی خاطر خواہ تحلیل کے لئے یہ لابدی ہے کہ نہ صرف مختلف اقسام کے مدرسے قائم کئے جائیں بلکہ ہر مدرسے کا نصاب تعلیم اس مدرسے کے طلبہ کے لئے معاشی و عمرانی دونوں اعتبار سے مفید و کارآمد ہو ۔ بجائے نئے مدارس کا افتتاح کرنے کے ہمیں چاہئے کہ موجودہ نیم ادبی نیم نظری مدارس کی حالت کو سدھاریں ۔ اور ان میں تعلیم پانے والوں کے لئے پیشے یا سرکاری نوکریاں یا کسب معاش کے دیگر مواقع فراہم کریں ۔

علم مرفہ الحالی کا یہ ایک مسلم الثبوت کلیہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ حتی المقدور مکمل نیکی کرنی چاہئے

کیونکہ بسا اوقات نصف نیکی کرنا قطعی نیکی نہ کرنے سے اس وجہ سے برا ہے کہ نصف نیکی کرنے میں جو وقت اور محنت صرف ہوتی ہے وہ رائگاں جاتی ہے یہی حال ہندوستان میں موجودہ طریق تعلیم کا ہے لوگوں کو تعلیم دے کر نصف نیکی تو کیجاتی ہے مگر انہیں اپنی حاصل کردہ تعلیم سے مستفید ہونیکے مواقع نہیں دیئے جاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کی محنت و مشقت، جو انہوں نے تعلیم حاصل کرنے میں صرف کی تھی قطعی بیکار جاتی ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ ادھوری نیکی کرنا بسا اوقات مطلق نیکی نہ کرنے سے بدتر ہے۔

دو ضروری اعلان

تار کا پتہ
چاند

ٹیلیفون نمبر ۱۰۲

متعلقہ چاند (اردو ایڈیشن)

ایڈیٹر۔ منشی کنھیا لال ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ

۱۔ چاند کا خاص ایڈیٹر نمبر نومبر اور دسمبر کا یکجائی نمبر ہوگا

یہ نمبر ہر حیثیت سے ایک قابل قدر نمبر ہوگا۔ سو سے زائد ایڈیٹر صاحبان نے اپنے مضامین افسانے اور نظمیں بھیجی ہیں۔ علاوہ ان کے متعدد رنگین اور سادی تصویریں اور کارٹون بھی شامل کئے جائیں گے۔

اس نمبر کی قیمت صرف تین روپئے ہوگی مگر مستقل سالانہ خریداروں کو مفت دیا جائے گا۔ یہ رعائت نئے ششماہی خریداروں کے ساتھ نہیں کی جاسکتی

۲۔ چاند کے سالانہ چندے میں خاص رعائت

چاند کی کثیر اشاعت کو اور بھی بڑھانے کی غرض سے اور بہت سے حضرات کے خاطر ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جو لوگ فوراً چاند کی خریداری منظور فرمائیں گے تو ان سے صرف ۵ روپیہ لیا جائے گا۔ چاند کی کسی خصوصیت میں کمی نہیں ہوگی۔

دیر نہ کیجئے۔ اپنا نام فہرست خریداران میں فوراً درج کروا لیجئے

جغرافیہ اور اہل عرب

(۱)

صدر اسلام ہی میں عربوں کی توجہ علوم و فنون کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ اس میدان میں بھی وہ دوسری قوموں سے پیچھے نہیں رہے۔ انکی علمی فتوحات نے تاریخ میں وہ نام چھوڑا ہے جس کو زمانہ آسانی سے محو نہیں کرسکیگا جس زمانے میں کہ یورپ پر گھٹاٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یورپی اقوام تہذیب و تمدن کے نام سے آشنا تک نہ تھیں عربی ممالک علم و حکمت کی تابناک روشنی سے کرہ ارضی میں ماہ منیر کی طرح لمعہ فگن تھے۔ اہل عرب جہاں گئے علوم و فنون نے انکا ساتھ نہ چھوڑا۔ انہوں نے اپنے یکجائی اتفاق سے جہاں مردہ علوم و فنون کو جو کتابوں میں بند پڑے تھے۔ نئی زندگی بخشی اس کے ساتھ ہی اپنی خداداد ذہانت اور انتھک کوششوں سے اس علمی وراثت کو اور پروان چڑھایا۔ انکی برکت سے دنیا کو قرون وسطیٰ کی تاریکی سے نجات ملی۔ اہل عرب نے علم دوست خلفا کے ظل عاطفت میں کشت علم کو سینچا اور اس میں وہ وہ جدتیں پیدا کیں اور وہ گل بوٹے کھلائے کہ انکی عظمت و کمال کا انکار ممکن نہیں۔

تاریخ اسلام کا طالب علم عربوں کی حیرت انگیز قوت عمل اور سرعت کار دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے کہ کس طرح ایک قلیل مدت میں ایک نیم مہذب قوم لق و دق اور بے آب و گیاہ صحراؤں سے نکل کر دنیا کا مرقعہ پلٹ دیتی ہے۔ انکی تلوار ایران و روم کی زبردست سلطنتوں کو سرنگوں کرہی چکتی ہے کہ اس کے ذہنی دنیا کے سامنے ایک دوسرے لباس میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ یہ کسے معلوم تھا کہ عرب کے بدو جو اپنے ماحول کے سوا دنیا اور مافیہا سے قطعاً ناواقف تھے قوموں کو علم و حکمت کا سبق دینگے اور اونٹوں کی مہار تھامنے والے اور بات بات پر خون کی ندیاں بہانے والے دنیا کو قعر جہالت سے نکال کر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی دولت سے مالامال کرینگے۔ عربوں کا زمانہ تاریخ عالم کا ایک زرین اور قابل فخر عہد ہے۔

میں اہل عرب جس قدر ناز کریں بجا ہے۔

فتوحات کے بعد فوراً ہی بلاد اسلامیہ کے اس سرے سے اس سرے تک ایک علمی لہر دوڑ گئی تھی جس نے عربوں کے افکار پر گہرا اثر ڈالا اور قلیل عرصہ میں اس ذہنی انقلاب کے آثار نمودار ہوگئے جس سے آگے چل کر رفیع الشان نتائج مرتب ہوئے۔

ساتویں صدی میں اسلام کا آغاز ہوتا ہے اور آٹھویں صدی کی ابتدا ہی ہے کہ عربی سلطنت دنیا کے ایک بڑے حصہ پر پھیل جاتی ہے۔ ارض شام کی فتوحات کا سلسلہ سنہ ۶۳۲ء سے شروع ہو کر سنہ ۶۳۶ء میں ختم ہوتا ہے، ایران، سندھ، اور جیحوں کا درمیانی علاقہ سنہ ۶۴۲ء تک عربی سیادت میں آجاتا ہے۔ مصر سنہ ۶۳۸ء اور شمالی افریقہ سنہ ۶۴۸ء اور روس اور قبرص کے جزائر سنہ ۶۴۹ء میں عرب فاتحین کے لئے دروازے کھول دیتے ہیں۔ شمال میں ارمینیا اور کوہ قاف تک عربی علم لہراتا نظر آتا ہے آٹھویں صدی کے اوائل یعنی سنہ ۷۱۰ء میں ماوراء النہر اور سنہ ۷۱۱ء سے سنہ ۷۱۴ء تک اسپین عربی مقبوضات میں شامل ہوجاتے ہیں۔ تقریباً ایک سو سال بھی نہیں گذرتے کہ ادھر بحر ہند سے کر بحر اوقیانوس تک اور ادھر کوہ قاف کی برفیلی چوٹیوں سے وسط افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں تک عربوں کا پرچم کوس لمن الملک الیوم بجاتا نظر آتا ہے۔

اہل عرب رومیوں کی طرح ملکوں کو فتح کرنے کے ساتھ ہی وہاں باقاعدہ نظم و نسق قائم کرنے میں مصروف ہوجاتے اور پھر آگے بڑھتے۔ عرب صرف فاتح ہی نہ تھے وہ بہترین حکمراں اور اچھے مدبر بھی ثابت ہوئے۔ جس ملک میں انکے قدم پہنچے اور جن شہروں کو وہ فتح کرتے وہاں کا کونہ کونہ ان کی متجسسانہ نگاہوں سے نہ بچتا۔ مفتوحہ اقوام کے ساتھ ملنے میں عربوں نے کبھی بھی احتراز نہیں کیا۔ انکے اس آزادانہ اختلاط نے ان کو بہت جلد محکوم قوموں کے مراسم و عادات، ان کی معاشرت اور انکے علوم و فنون سے واقف کر دیا۔ اہل عرب نہایت مستعدی اور غیر معمولی شوق سے سابقہ علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے اپنی فطرت ذکاوت اور غور و فکر اور مشاہدہ کی قوت اور سب سے زیادہ اپنی غیر معمولی قوت عمل سے ان پر پورا عبور حاصل کرلیا۔

شروع شروع میں اہل شام کی وساطت سے عربوں کو یونانی علوم سے سابقہ پڑا۔ اہل شام ان نسطوری علماء کے شاگرد تھے جو رومی قیصروں کے مذہبی تعصب اور اُن کے ظلم و جور سے تنگ آکر ایران میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ یہ لوگ فلسفہ و حکمت اور خاص طور پر طب میں ید طولی رکھتے تھے۔ انہوں نے بڑے وسیع پیمانہ پر ایدسا میں طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی جو زینون نامی بادشاہ کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ اس کے بعد نیشاپور ان لوگوں کا مرکز قرار پایا۔ جہاں ۵۳۱ء میں خسرو نوشیرواں نے فلسفہ اور طب کی تعلیم کے لئے دارالعلوم قائم کیا جس میں زیادہ تر نسطوری علماء علم تھے۔ اس طرح یہ لوگ ایرانی بادشاہوں کی سرپرستی میں مشرق قریبہ میں یونانی علوم کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔ اہل شام کو اس میں سے ایک وافر حصہ نصیب ہوا۔

اموی خلافت ہی میں فلاسفہ یونان کی کتابیں اہل عرب کے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ انہوں نے اس علمی سرمایہ کو اپنی گمشدہ چیز سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اُنکے مطالعہ میں غیر معمولی شوق و رغبت کا اظہار کیا لیکن اس راہ میں سب سے پہلا علمی قدم خلافت عباسیہ میں اٹھایا گیا۔ خلیفہ منصور نے اپنی نگرانی میں یونانی تصانیف کے ترجمے کرائے۔ اور علوم و فنون اور فلسفہ حکمت کی ترویج و اشاعت کی داغ بیل ڈالی۔ منصور کے جانشینوں ہارون الرشید اور مامون الرشید کی سرپرستی میں اسکو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوئی۔ موخرالذکر کے زیر سایہ پایہ خلافت مشرق و مغرب کے علوم اور علماء کا مرکز بن گیا تھا۔ مامون کی علم دوستی دور دراز ممالک سے علماء کو بغداد میں کھینچ لائی۔ خلفاء کی علم پروری اور علوم و فنون کی قدر و قیمت نے رعایا میں بھی تعلیم و تعلم کا بے انتہا شوق پیدا کر دیا تھا، یہ زمانہ علمی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے انتہائی عروج و کمال کا عہد گزرا ہے۔

اس باب میں مزید گفتگو اصل موضوع سے دور لیجائیگی۔ ان صفحات میں ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ اہل عرب نے فن جغرافیہ میں کیا کیا کام کئے اور اُنکے وجود سے اس میں کہاں تک ترقی ہوئی۔ وہ اسباب جنہوں نے صدر اسلام ہی میں عربوں کی توجہ علم جغرافیہ کی طرف منعطف کی کثیر التعداد ہیں۔ ان تمام کا شمار طوالت سے خالی نہیں۔ ہم صرف ان میں سے زیادہ اہم اور واضح اسباب کے

بیان پر آغاز کرتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے عہد میں عربی سلطنت کے حدود کافی وسیع ہو چکے تھے مفتوحہ ممالک اور محکوم قوموں کے حالات کی وجہ سے جانچ ضروری تھے، بعض شہر ایسے تھے جو بزور شمشیر فتح ہوئے اور بعض ایسے جو صلح و صفائی سے زیر ہو گئے۔ کچھ شہروں نے مقابلہ کیا اور مقابلہ کی تاب نہ لاکر حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ ان مختلف صورتوں میں تحصیل محاصل اور خراج و مالگذاری کی تقسیم شریعت اسلامی کی رو سے مختلف ہے کہیں جزیہ ہے اور کہیں صرف خراج۔ اس کے علاوہ زمین کی پیداوار کے لحاظ سے مالگذاری میں فرق ہے۔ ان اسباب کی بنا پر خلیفہ ثانی کے حکم سے عراق اور دوسرے ممالک کی پیمائش وغیرہ عمل میں آئی اور اراضیات کی تقسیم کی گئی۔ دوسرا بڑا سبب عربوں کا تجارتی شوق تھا۔ عرب قدیم زمانے سے تجارت میں حصہ لیتے چلے آتے تھے ظہور اسلام سے پہلے قریش اور اُن سے بہت پہلے متعدد یمنی قبائل تجارت میں غیر معمولی شہرت حاصل کر چکے تھے، اہل عرب کو یہ شوق ورثہ میں ملا جس نے اسلامی دور میں اُن کو بحر و بر کی سیاحت اور اُس کے خطروں سے دوچار ہونے پر آمادہ کیا۔ اہل عرب کا تجارتی سلسلہ کسی صورت میں انکی فتوحات سے کم نہ تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ عرب تجار مشرق و مغرب کے درمیان ایک تجارتی واسطہ تھے، سمندر کا کوئی حصہ بھی عرب ملاحوں کی ترکتازیوں سے محفوظ نہ تھا۔ درحقیقت اس زمانہ میں بحری سیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی، ہندوستان اور چین کی پیداوار اہل عرب کے جہازوں اور بری قافلوں میں لدکر بحر روم کی بندرگاہوں میں پہنچتی تھی۔ عرب تجار کی جفاکشی اور ہمت کے سامنے متواج سمند، لق و دق صحرا اور سنگلاخ پہاڑ کچھ حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ تجارت میں اہل دنیس اور قدیم تجارتی قوموں سے بازی لے گئے۔ تاریخ اسلام پر بغور نظر ڈالنے سے اہل عرب کے تجارتی قافلوں کے چار بڑے راستے معلوم پڑتے ہیں۔ جن کا حیطہ عمل طنجہ سے شروع ہو کر مشرق اقصیٰ پر ختم ہوتا تھا۔ پہلا راستہ اسپین اور جنوبی شہروں سے ہوتا ہوا بلخ اور بحیرہ خزر کے علاقوں پر منتہی ہوتا تھا۔ دوسرا راستہ شمالی افریقہ سے شروع ہوتا تھا اور مصر و شام، کوفہ، بغداد، اہواز، فارس، کرمان سے گزرتا ہوا ہندوستان تک پہنچتا تھا۔ تیسرا شام، عراق عرب، اور خلیج فارس تک محدود تھا۔ اور آخری بحر ہند اور بحیرہ احمر

و اسکندریہ تک جاتا تھا، الغرض عربی تجار نے مشرق میں اقصائے چین، شمال میں بحیرہ بالٹک جنوب میں جزیرہ مدغاسکر اور مغرب میں بحر اوقیانوس کے آئس لینڈ سے ملا دیئے تھے۔

علم جغرافیہ کی ترویج و اشاعت کا تیسرا اہم محرک فریضۂ حج تھا۔ تمام دنیائے اسلام کے مسلمان حج کی ادائیگی کے لئے دور دراز ممالک سے سرزمین حجاز کا قصد کرتے، دشوار اور جانگداز راستے اور اُن کے خطرات اُن کے عزائم میں حائل نہ ہوتے۔ اسی جذبہ نے مسلمانوں میں خشکی و تری کے سفروں کا شوق پیدا کیا۔ متذکرہ بالا اسباب کے علاوہ سیر و سیاحت اور علمی تجسس و تحقیق کا شوق بھی تھا جو نویں اور دسویں صدی عیسوی کے عربوں میں جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا ان حقائق کی روشنی میں علم جغرافیہ کی طرف عربوں کا میلان واضح ہو جاتا ہے، عرب اہل قلم نے ملکوں اور شہروں کے متعلق اپنی ذاتی معلومات اور دوسرے سیاحوں، تجار اور حجاج سے حاصل کی ہوئی چیزوں کو باقاعدہ کتابی صورت مدون کیا۔

مسلمان جغرافیین اپنی تصنیفات کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ اول وہ جنہوں نے مشہور ممالک اور اُنکے شہروں کے حالات، آمد و رفت کے راستے اور اُنکے باہمی مسافت کو بیان کیا ہے ان میں حسب ذیل علما، خاص قابل ذکر ہیں۔ ابن خرداذبہ۔ احمد بن واضح۔ الجیہانی۔ ابن الفقیہ۔ ابو زید بلخی۔ ابو اسحٰق اصطخری۔ ابن حوقل۔ ابو عبد اللہ۔ البشاری۔ الحسن بن محمد مہلبی۔ ابن ابی عون بغدادی ابو عبید بکری۔ قزوینی۔ یاقوت۔ مقدسی۔ ابو الحسن ہروی۔ ادریسی۔ ابو الفدا۔ احمد سرخسی۔ مسعودی المراکشی۔ عبد الرشید الباکوری۔ ابو القاسم شیرازی۔ اسفرائنی۔ شیخ تقی الدین مقریزی

دوسرے وہ جو صرف عرب اور اس کے جغرافیہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان میں مشہور علماء کے اسماء درج ذیل ہیں: اصمعی، ابو عبید السکونی، ہمدانی، ابو الاشعث الکندی، ابو سعید سیرانی، ابو محمد الاسود الغندجانی ابو زیاد کلابی، محمد بن ادریس، ہشام بن محمد الکلبی، ابو القاسم زمخشری، ابو الحسن عمرانی، ابو عبید البکری، ابو بکر الحازمی، ابو الفتح اسکندری، برہان الدین تاجی، ابو الفتح ہمدانی، ابن جورانی۔ علی بن محمد خوارزمی محمد بن ایاس الحنفی، ابو المجد اسمٰعیل موصلی، ابو الفضل البقالی، ابو عمر الکندی، ابو عبد اللہ القضاعی، الظاہری

ابوالحسن اشعری، ان لوگوں نے عرب کے مواضع اور قریے، پہاڑ، ندی نالے، میدان، وادیاں اور قابل ذکر مقامات کو قلمبند کیا جن کا ذکر عربی اشعار اور کتابوں میں آتا تھا۔ اول الذکر جماعت ملکوں اور شہروں کی تفصیل اور بیان میں یونانی علماء کے نقش قدم پر چلی۔

علماء کی ان دو جماعتوں کے علاوہ تیسری جماعت سیاحوں کی گذری ہے۔ ان میں سب سے مشہور ابن بطوطہ ہے۔

جغرافیین کے اس گروہ میں سے جنہوں نے عرب کے علاوہ دوسرے ممالک پر بھی بحث کی ہے ایک فریق صرف بلاد اسلامیہ کے حالات وجغرافیہ بیان کرنے تک محدود رہا۔ غیر اسلامی ممالک میں سفر کرنا یہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ اس وجہ سے انکی کتابیں اجنبی ممالک کے متعلق نہایت ناقص اور غلط معلومات پیش کرتی ہیں۔ یہ معلومات زیادہ تر سماعی تھیں۔ ان لوگوں نے نہ تو ان ممالک کے باشندوں کی زبانیں سیکھیں اور نہ اُنکے رسوم وعادات کا مشاہدہ کیا۔ اس لئے اپنی کتابوں میں رطب ویابس کا طومار باندھ دیا۔ ابوالفدا نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان کے مقدمہ میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے عجز کا اعتراف کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"مذکورہ کتب میں جو کچھ ہمیں ملا ہم نے اس مختصر تصنیف میں جمع کر دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں ان ممالک کے متعلق پوری معلومات کا دعوٰی نہیں۔ اس فن کی مجموعی تصانیف اس معاملہ میں زیادہ دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتیں۔ اب چین کو لیجئے، باوجود اپنی وسعت اور شہروں کی کثرت کے ہم اس سرزمین کے حالات سے بہت کم واقف ہیں۔ اور اس میں بھی ہمارا علم یقینی نہیں۔ یہی حال ہندوستان کا ہے۔ اس ملک کے حالات بھی مکمل طور پر ہمیں معلوم نہیں۔ اسی طرح بلغار بلاد چرکسی۔ روس اور خلیج قسطنطنیہ سے لے کر بحر اوقیانوس تک یورپی ممالک کے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ محدود اور ناقص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خطہ زمین نہایت وسیع وعریض اور آباد ہے۔ اس میں بڑے بڑے شہر بکثرت موجود ہیں۔ لیکن ہمیں معدودے چند کے باقی کا علم نہیں۔ اس طرح جنوب میں سوڈان اور افریقہ کے وسطی حصوں کے متعلق ہمارا علم محدود ہے۔ ان اطراف میں حبشی، زنگی، نوبی اور

[...] آباد ہیں، لیکن ہم تک اُنکے حالات نہیں پہنچے۔ کتب جغرافیہ کا دار و مدار زیادہ تر بلاد اسلامیہ کے حالات پر ہے لیکن وہ بھی حد کمال تک نہیں پہنچا۔"

جغرافیہ کی عربی تصانیف دیکھنے سے ان لوگوں کے حسن اسلوب اور طریقہ بحث کی خوبی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ان لوگوں نے اس زمانہ تک کے حاصل شدہ حقائق اور مفید معلومات کو مناسب ڈھنگ سے مرتب کیا اور بعد میں آنے والوں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ عرب جغرافیین نے تحقیقات کے نئے موضوع اور نئے انداز خیال پیدا کئے، جغرافیہ میں بعض جگہ مثلاً آب و ہوا کے بیان میں سائنس کے مسائل داخل کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تصانیف میں موجودہ زمانے کا سا نظم و تنسیق جغرافائی مناسبت اور دیگر محاسن کا فقدان طالب علم کی نظر میں کھٹکتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کمزوری انکے علاوہ اس زمانہ کی اور بہت سی قوموں میں بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ عرب جغرافیین کے لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ انہوں نے اس فن کو استوار بنیادوں پر کھڑا کیا اور اپنی انتھک کوششوں سے اگرچہ اسے انتہائی کمال تک نہ پہنچا سکے لیکن پھر بھی آئندہ نسلوں کے لئے ایک قابل قدر وراثت چھوڑی جس پر چل کر انھوں نے اس فن کو موجودہ ترقی و محاسن سے جلا دی۔ آٹھویں صدی یعنی پہلی ہجری میں علم جغرافیہ کا ماہتاب افق سے طلوع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ترقی کے منازل طے کرتا بدر کمال بننے کو تھا ہی کہ یہ تاتار کے گہن نے اور اسلامی علوم و معارف کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی مسدود کر دی۔

(۲)

نضر بن شمیل

آٹھویں صدی کی جغرافیہ کی تصانیف زیادہ تر رسائل کی شکل میں ہیں۔ جن میں عرب قبائل کی سہولت کے لئے سرزمین عرب کے مواقع و قرئے، چشموں، صحراؤں اور وادیوں کا بیان ہے۔ ان میں النضر شمیل کی کتاب زیادہ مشہور ہے۔ نضر مذکور کی پیدائش ۱۲۲ھ کی بتائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے متعدد نسخے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر عورتوں، مردوں کے خصائص، مقامات، وادیوں، پہاڑوں، چشموں، کنوؤں، اونٹوں، حیوانات، چاند، سورج، مراتب

خلق، دودھ، شراب، بارش، درختوں اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے صرف ان امور کو چھیڑا ہے جن کی صحرائی عربوں کو آئے دن ضرورت رہتی تھی۔ النضر کی یہ کوشش واقعی قابل تعریف ہے کہ اس نے وقت کی سخت ضرورت کو نہایت عمدہ صورت سے پورا کر دیا۔ مصنف مذکور کے علاوہ اس موضوع میں اور بھی علماء نے تصنیفات کیں جن کا بیان طوالت کے خوف سے حذف کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اصطخری

شہروں اور ملکوں کے اوصاف اور جغرافیہ کے متعلق سب سے پہلی تصنیف جو ہمارے ہاتھ لگی ہے ابو اسحٰق اصطخری کی ہے۔ موصوف کا شمار مشہور علمائے اسلام میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نویں اور دسویں صدی کے سیاحوں میں آپ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ سیاحوں کی یہ جماعت علمی تحقیق و تجسس، مختلف ممالک اور قوموں کے خصائص اور اُنکے حالات، عجائبات اور نوادر جمع کرنے کی غرض سے صحراؤں اور سیداوں سمندروں اور براعظموں کی سیاحت کرتی پھرتی تھی۔ ان میں سے ایک گروہ نے صرف اپنے مشاہدات اور سیر و سیاحت کے حالات کی تدوین پر اکتفا کی دوسرے فریق نے ذاتی معلومات کے ساتھ اس فن کی دوسری تصانیف سے مدد لیکر کتابیں مرتب کیں جیسا کہ ان سے پہلے یونان کے علماء و فضلا کر چکے تھے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس زمانہ میں علوم و فنون کے مرکز اور ماخذ سہل الحصول نہ تھے۔ طلبہ اور متلاشیان علم کو تحصیل علم کے لئے شہر بشہر پھرنا پڑتا تھا اور ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد وہ منزل مقصود کو پہنچتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد قدیم میں ہیرودٹس۔ پولیبوس یونان میں اور مسعودی اور ابن حوقل اسلام میں مشہور مورخ و جغرافیہ داں ہونے کے ساتھ ساتھ چوٹی کے سیاح بھی تھے۔ اصطخری نے دسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ پایا ہے۔ موصوف ایران کے شہر اصطخر میں پیدا ہوا۔ طلب علم کے شوق میں ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھرتا رہا۔ بعد ازاں اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا۔ اصطخری نے اپنی کتاب میں ملکوں، شہروں، پہاڑوں، دریاؤں اور آمد و رفت کے راستوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کمی کے باوجود کہ اس نے شہروں کے اوصاف اور وہاں کی خصوصیات سے زیادہ بحث نہیں کی اس کی کتاب قابل قدر ہے۔ اس فن میں اس کا مرتبہ بہت اعلیٰ ہے۔

اصطخری کی کتاب اپنے ہمعصروں اور متاخرین میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ ابن حوقل نے کتاب مذکور سے بہت سی چیزیں نقل کی ہیں۔ اور اکثر جگہ اس کو بطور سند پیش کیا ہے۔ اصطخری نے بلخی کی مشہور کتاب تقویم البلدان سے اپنی تصنیف میں مدد لی ہے۔ موخرالذکر کتاب ۹۲۱ء میں لکھی گئی۔ بعد میں آنے والے مسلمان جغرافئین اصطخری کے نقش قدم پر گئے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات اور سیر و سفر کے نتائج کے علاوہ متقدمین کی تصانیف سے حسب الضرورت اخذ مطلب کیا کرتے تھے اہل یونان کے ہاں یہی طریقہ رائج تھا۔ چنانچہ بطلیموس نے اپنی تصنیف میں مارینوس کے جغرافیہ سے بہت سی چیزیں نقل کیں۔

ابوالعباس اسرخسی

نویں صدی میں فن جغرافیہ پر اسرخسی متوفی ۸۹۹ء کی کتاب المسالک والممالک مشہور ہے۔ کتاب مذکور کے اصل مصنف کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ یہ زیادہ تر ادریسی کی مشہور تصنیف نزہتہ المشتاق سے مشابہ ہے۔ البتہ موخرالذکر کے مقابلہ میں بہت مختصر ہے۔ اس میں بیشتر راستوں اور بعد مسافت کا ذکر ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ تصنیف مجموعی طور پر بطلیموس کی کتاب کا عربی ترجمہ ہے۔ مصنف نے ۹۱۱ء میں وفات پائی۔ کتاب نہایت مختصر ہے، اور فرانسیسی زبان میں اسکا ترجمہ ہوگیا ہے۔

مسعودی

مسعودی نویں صدی میں بغداد میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں طلب علم اور سیر و سیاحت کے شوق نے وطن چھڑا دیا۔ ایک عرصہ تک بلاد اسلامیہ اور آس پاس کے ممالک میں پھرتا رہا۔ مسعودی کا پایہ علم و فنون میں نہایت بلند ہے۔ فلسفہ، ادب، تاریخ اور جغرافیہ میں اسکا فضل و کمال مسلم ہے۔ ۹۱۵ء میں اصطخر پہنچا۔ وہاں کچھ مدت قیام کرکے ہندوستان کا رخ کیا اس سرزمین کے دیار و امصار کو دیکھا تقریباً ۴ سال بعد پھر واپس اصطخر لوٹا، وہاں سے سمندر کے راستہ سے مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں کی سیر کرتا عرب میں داخل ہوا۔ مسعودی کے اس طول و طویل سفر کی تاریخیں کسی صحیح ماخذ سے

ہم تک نہیں پہنچیں۔ البتہ اس کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ ۹۴۳ء میں وہ سیر و سیاحت سے فارغ ہو کر اطمینان سے تصنیف و تالیف میں لگ گیا۔ مسعودی نے ۹۵۶ء میں بمقام فسطاط وفات پائی۔

مسعودی کی کتاب اخبار الزمان ومن ابادہ الحدثان تاریخ کے فن میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کافی ضخیم تصنیف ہے۔ ابتدا میں زمین کی شکل، ملکوں، پہاڑوں، دریاؤں ابتدائے آفرینش قوموں نسلوں کی تقسیم پر بحث کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ہم جغرافیہ طبعی کا نام دے سکتے ہیں اس کے بعد گذشتہ قوموں، سلطنتوں اور انبیا کی تاریخ بیان کرتے کرتے اسکا سلسلہ اپنی دوسری تصنیف مروج الذہب و معادن الجوہر کے سن تصنیف ۹۴۷ء تک ملا دیا ہے۔ اخبار الزمان کے بعد ایک متوسط کتاب مدون کی جس میں اول الذکر کو مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ پھر اس متوسط کو اور مختصر کرکے مروج الذہب و معادن الجوہر کا نام دیا ہے۔ کتاب کا مطول نسخہ تیس نسخوں پر مشتمل تھا۔ یہ کتاب زمانے کے ہاتھوں سے نہ بچ سکی۔ مطول کے علاوہ متوسط بھی ناپید ہے۔ دونوں نسخوں کی مجموعی تعداد بیس جلدوں کے قریب بیان کیجاتی ہے۔ مروج الذہب عربی تصانیف میں بے نظیر کتاب ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمہ میں اپنی دوسری تصنیفات مطول اور متوسط کا ذکر کیا ہے۔ کتاب مذکورہ کا ترجمہ پیرس سے آٹھ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ مجمع شرقی نے ۱۸۶۱ء میں اس کام کو شروع کیا اور ۱۸۷۷ء میں کتاب طبع ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ ابن خلدون نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر کے مقدمہ میں مسعودی کی مروج الذہب کی بڑی تعریف کی ہے۔ مغربی مصنفین مسعودی کو مشرق کا پلینیوس قرار دیتے ہیں اور یہ تشبیہ کسی لحاظ سے بے محل نہیں۔ مسعودی کی شخصیت کو مزید واضح کرنے کے لئے تاریخ فلسفہ اسلام سے حسب ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں۔

"تاریخ نے اپنی تحریر کے دائرہ میں ذہنی زندگی، عقائد و اخلاق، علوم و ادبیات بھی لے لئے دوسری قوموں سے واقفیت حاصل ہونے کی بدولت تقابل کی تحریک ہوئی، چنانچہ ایک بین الاقوامی "انسانی" عنصر پیدا ہو گیا "انسانی" مشرب کا ایک نمائندہ مسعودی ہے، وہ ہر چیز سے جس کا

انسان [illegible] سے دلچسپی اور ذوق رکھتا ہے۔ وہ تمام ان لوگوں سے سبق لیتا ہے جن سے اسکا سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس کی کتب میں جس میں اسکی تنہائی کی زندگی گذرتی ہے سب نمائندہ نہیں ہے۔ اس کی تسکین نہ تو زندگی اور عقائد کے تنگ حلقہ عمل سے ہوتی ہے نہ فلسفہ کے پادر ہوا افکار سے۔ وہ اپنے ذہن کے رجحان کو جانتا ہے اور آخر دم تک جبکہ وہ وطن سے دور مصر میں اپنے بڑھاپے کے دن کاٹ رہا تھا اس کی وجہ تسلی اور اس کی روح کی دوا تاریخ کا مطالعہ تھا۔ تاریخ اس کے نزدیک جامع علم ہے جس کا فلسفہ یہ ذکر جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اس کی حقیقت ظاہر کیجاتے، علوم دنیوی اور ان کی نشو و نما بھی تاریخ کا موضوع ہے۔ بغیر اس کے دنیا کبھی کی برباد ہو گئی ہوتی کیونکہ علما پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن تاریخ انکے ذہنی جد و جہد کے نتائج کو قلم بند کرتی ہے اور اس طرح ماضی سے حال کو ربط دیتی ہے۔ وہ بلا تعصب انسانوں کے حالات اور خیالات سے خبر دیتی ہے۔"

ابن حوقل

دسویں صدی کے نصف آخر میں ابن حوقل کا ظہور ہوا۔ اسکا پورا نام ابو محمد ابن العلی الموصلی ہے۔ بغداد میں پیدا ہوا اور یہیں نشو و نما پائی۔ ابن حوقل مشہور تاجر اور سیاح تھا جس زمانہ میں کہ مسعودی سیر و سیاحت کا سلسلہ منقطع کر کے شغل تصنیف و تالیف میں منہمک تھا ابن حوقل نے زاد سفر باندھا، اور ۹۴۳ء سے ۹۶۹ء تک تقریباً اٹھائیس برس سیر و سیاحت میں گذارے۔ اس طویل مدت کے مشاہدہ و تجربہ کے بعد ۹۷۵ء میں المسالک والممالک کے نام سے اپنی مشہور تصنیف مرتب کی۔ کتاب مذکور صرف بلاد اسلامیہ کے حالات تک محدود ہے۔ غیر اسلامی ممالک کے بیان سے مصنف نے عمداً اجتناب کیا ہے۔ ابو الفدا تقویم البلدان کے مقدمہ میں المسالک والممالک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کتاب مذکور کافی ضخیم ہے۔ اور شہروں کے اوصاف بتفصیل بیان کئے گئے ہیں لیکن اسماء میں تحقیق و ضبط سے کام نہیں لیا اس لئے کہیں کہیں تسامح و سہو پایا جاتا ہے۔ نیز طول البلد اور عرض البلد بھی بیان نہیں کئے۔ اس وجہ سے ناموں اور مقامات میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ابن حوقل

کی تصنیف جغرافیہ کے صرف ضروری جزو سے بحث کرتی ہے۔ اس میں زیادہ تر ملکوں، خطوں، دریاؤں، پہاڑوں، میدانوں، صحراؤں اور شہروں اور انکی مدن، تجارت محاصل اور آمد و رفت کے راستوں کا ذکر ہے۔ مستشرقین اس زمانہ کے اسلامی سلطنت کے حالات معلوم کرنے کے لئے اسی کتاب کو اکثر پیش نظر رکھتے ہیں۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کو بنظر احترام دیکھا جاتا ہے۔ کتاب مذکور ۱۸۷۳ء میں لندن میں طبع ہوئی۔ دسویں صدی کی مشہور تصنیفات میں ابو محمد حسین بن احمد الہمدانی متوفی ۹۳۵ء کی کتاب الممالک والمسالک بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ کتاب مذکور یمن اور اس کے عجائبات اور عرب کے جغرافیہ تک محدود ہے۔

مقدسی

اسی زمانہ میں مشہور جغرافیہ داں مقدسی نامی گذرا ہے۔ اس کی تصنیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم فن جغرافیہ میں نہایت اہم اور بیش قیمت کتاب ہے۔ مصنف نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ اور اپنے زمانہ کی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے پیشے اختیار کرکے ان تجرباتا اور مشاہدات کے بعد مقدسی نے کتاب مرتب کی۔ اس میں شہروں کے باہمی فاصلے، آمد و رفت کے راستے پہاڑوں دریاؤں معدنیات کی کانوں اور ملکوں کی خصوصیات وغیرہ کے متعلق بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔ مصنف کا بیان ہے کہ کتاب مذکور سیاحوں، علماء، اور رؤسا کے لئے جزو لاینفک ہے" مقدسی کا انداز تحریر نقادانہ ہے، وہ اس علم کا قائل ہے جو تحقیق و تدقیق سے حاصل ہو، نہ کہ روایتی عقائد یا خالص عقلی احکام کا۔ وہ ان ممالک کا ذکر کرتا ہے جنہیں اس نے خود دیکھا تھا۔ اول نمبر پر وہ اپنے ذاتی تجربات رکھتا ہے پھر وہ جو اس نے معتمد لوگوں سے سنا ہے۔ اس کے بعد وہ جو اس نے کتابوں سے پڑھا ہے" اسکی خصوصیات میں اس کے چند اپنے جملے خاص طور پر قابل غور ہیں

"میں نے علوم متداولہ اور علم الفرائض کا درس دیا ہے۔ منبر پر بیٹھ کر وعظ کہا ہے۔ مسجد سے صدائے اذان بلند کی ہے۔ میں علماء کی مجالس اور زہاد کی ریاضت میں شریک رہا ہوں۔ میں نے صوفیوں کے ساتھ

ﻪ تاریخ فلسفہ اسلام

...ہے راہبوں کے ساتھ دلیا کھایا ہے اور جہاز رانوں کے ساتھ جہاز کے کھانوں کا مزا چکھا ہے کبھی میں نے بہ احتیاط تھا اور کبھی میں نے جان بوجھ کر حرام کھانے کھائے ہیں لبنان کے تارک الدنیا لوگوں کے ساتھ پھرا ہوں اور دربار شاہی میں بھی رہا ہوں۔ میں لڑائی میں شریک ہوا ہوں اور جاسوسی کے الزام میں قید بھی ہوا۔ آج میں جلیل القدر سلاطین اور وزرا کا مشیر تھا اور کل قزاقوں کے گروہ میں شامل تھا یا بازار میں خردہ فروشی کرتا تھا۔ میں نے عزت و احترام کا لطف اٹھایا ہے لیکن اسی طرح گالیاں بھی سنی ہیں اور جب مجھ پر کفر یا جرائم کا شبہ کیا گیا تو سم کھانے کی ذلت بھی اٹھائی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے مقدسی کا علمی شوق اور بنی نوع انسان کے ذہنی خزانوں کو اپنے قبضۂ تصرف میں لانے کی ہوس اور اس راہ میں اس کی قابل رشک جدوجہد کا پتہ چلتا ہے۔

اسی زمانہ میں خطط مصر کے نام سے مصر کے حالات میں ابو عمر الکندی متوفی ۹۶۱ء نے ایک کتاب لکھی جو اس خاص موضوع میں پہلی تصنیف ہے۔

ابن فضلان

مسعودی کے زمانہ میں نواحی روس کے ایک امیر نے عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کو اپنے اسلام لانے کی خبر دی اور ساتھ ہی دین کی نشر و اشاعت اور احکام شرع کے نفاذ و قیام کے لئے علما طلب کئے۔ خلیفہ نے علما کا ایک وفد امیر مذکور کے پاس بھیجا۔ اس میں احمد بن فضلان نامی بھی تھے۔ انہوں نے بغداد چھوڑنے سے لے کر واپسی تک کے پورے حالات قلمبند کئے۔ ابن فضلان نے راستے کے مشاہدات اور امیر مذکور کے ملک اور وہاں کے باشندوں کے متعلق مفید معلومات جمع کی تھیں لیکن بدقسمتی سے زمانہ کے منحوس ہاتھوں نے اس بیش قیمت ذخیرہ معلومات کو باقی نہ رکھا ہنوز اس کے بعض اقتباسات متعدد مصنفین کی تصنیفات میں ملتے ہیں۔ کتاب مذکور کے حالات اور روایات کی تصدیق اس زمانہ کے غیر مسلم سیاحوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ ابن فضلان نے ۹۶۱ء کا زمانہ پایا۔

ابوزید بلخی

ان سیاحوں اور جغرافیین کے علاوہ مسلمان ملاحوں کا گروہ بھی گذرا ہے۔ ان لوگوں نے طویل بحری سفر کئے۔ ان میں سب سے مشہور اور قدیم ترین سلیمان نامی ایک تاجر تھا۔ مسعودی اس کا زمانہ آٹھویں صدی کا نصف آخر بتاتا ہے۔ سلیمان موصوف سیراف شہر کا باشندہ تھا، جو اس زمانہ میں ایران کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں ہر وقت مشرق اقصیٰ اور دور دراز ممالک کے جہاز مختلف النوع اور دیس دیس کی مصنوعات اور پیداوار سے لدے ہوئے آتے جاتے نظر آتے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی تجارت کا سلسلہ کافی وسیع ہو چکا تھا اور تمام مشہور ممالک و شہروں تک انکی تجارت کا جال پھیلا ہوا تھا۔ سلیمان نے تجارت کی غرض سے بحری سفر اختیار کئے۔ وہ بحر عرب سے سیلون اور سیلون سے بحر ہند کے جزائر کو طے کرتا بحر چین تک چلا گیا۔ سیاح مذکور کے مشاہدات کو ابوزید بلخی نے ۸۵۱ء میں مرتب کیا۔ اور اس کے ساتھ دوسرے سیاحوں کے اقوال بھی جو ساحل چین کا سفر کر چکے تھے نقل کئے۔ ان میں ابن وہاب کی شخصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ابن وہاب چین کی حدود کے اندر وارد ہوکر وہاں کے باشندوں اور ملکی حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اور ہر دو چین سے دار السلطنت کا قصد کیا۔ تقریباً دو ماہ کی مسافت کے بعد شہر مذکور میں پہنچا اور بادشاہ سے ملا۔ ابوزید کی کتاب فرانسیسی میں ترجمہ ہوکر ۱۸۱۱ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ کتاب موصوف چین کے حالات میں بیش قیمت معلومات کا جلیل القدر مجموعہ ہے۔ سرزمین چین کے متعلق اس سے قبل کی کوئی تصنیف ہم تک نہیں پہنچی۔ ابوزید بلخی نے تصنیف مذکورہ کے علاوہ صور الاقالیم، مسالک الممالک اور کتاب البدء والتاریخ وغیرہ دیگر تصنیفات بھی کیں۔ ابوزید نے ۹۳۴ء میں وفات پائی۔

ان دور دراز ممالک کے متعلق جہاں راستوں کی دشوارگذاری اور دیگر موانع کی بنا پر عرب سیاح نہ جا سکے عرب مصنفین کے بیانات عجیب و غریب قصوں اور مبالغہ آمیز کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ اس قسم کی تحریروں کا ایک نمونہ الف لیلہ میں سندباد کا قصہ ہے۔ بعض متاخرین نے بحث و

نمبر [illegible] زبان زد تھیں۔ یونانی اور رومی خرافات کے زیر اثر عربوں نے بحر ادقیانوس کو بحر ظلمات کا نام دیا۔

ان تجارتی کارناموں اور بحری سیاحتوں کا بیان ادھورا رہ جائیگا اگر ہم اس چھوٹے سے آلہ کا جس نے جہاز رانوں کے سامنے تاریخ کا ایک نیا باب کھول دیا تھا ذکر نہ کریں۔ اس آلہ کو عام طور پر قطب نما کہتے ہیں۔ اس کی بدولت جہاز رانی اور بحری تجارت کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی۔ اس قابل قدر ایجاد کا سہرا اہل چین کے سر ہے۔ لیکن دنیا عربوں کی وساطت سے اس سے آشنا ہوئی۔ اور خاص طور پر اہل مغرب کا جہاز رانی کے منتہائے کمال تک پہنچنے میں اہل عرب کے رہین منت ہیں۔ عربوں اور مغربی اختلاط کے زمانہ میں اول الذکر کے ہاں قطب نما کا استعمال بہت عام تھا اور تمام عرب جہاز راں اپنے بحری سفروں میں استعمال کرتے تھے۔ اہل مغرب نے عربوں سے قطب نما لے کر امریکہ کا انکشاف کیا اور اسی کے طفیل سے سمندروں اور نئے ممالک کو معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

قطب نما کے علاوہ بحری سفروں کی سہولت کے لئے اہل عرب کے ہاں جہاز رانی کے نقشوں کا بھی پتہ چلتا ہے نیز جہاز رانوں کے لئے قواعد مرتب تھے جن پر عام طور پر عمل ہوتا تھا۔ اس قسم کا ایک نقشہ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما مشہور پرتگالی جہاز راں کو ایک مسلمان کی وساطت سے ہاتھ لگا جو اس کے جہاز میں ملازم تھا، اس طرح بیوکرک اعظم امیر البحر کے پاس بھی بحر عمان اور بحر فارس کا نقشہ تھا۔ جس سے وہ ان سمندروں کے سفر میں بڑی مدد لیا کرتا تھا۔ یہ نقشہ عمر نامی عرب نے اس کے لئے تیار کیا تھا۔

البیرونی

بارہویں صدی عیسوی میں فن جغرافیہ میں بہت سے سیاحوں اور اہل قلم نے تصانیف کیں ان میں سب سے ممتاز البیرونی کی شخصیت ہے۔ علامہ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی متوفی ۱۰۴۸ء کی ذات مجمع کمال تھی۔ موصوف کو متعدد علوم میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ہیئت اور نجوم میں انکی شہرہ آفاق تصنیف قانون مسعودی ہے۔ تاریخ اور نجوم میں کتاب الآثار الباقیہ مشہور ہے۔ ریاضیات میں انکا پایہ کمال مسلم تھا۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ آپ مورخ اور سیاح بھی تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستانی حملوں میں جن کا زمانہ ۱۰۰۱ء سے ۱۰۲۶ء تک کے مابین ہے علامہ موصوف سلطان کے ہمراہ تھے۔ سندھ اور شمالی ہندوستان کے حالات میں ان کی کتاب قابل قدر ہے۔ البیرونی سنسکرت زبان کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے بعض سنسکرت تصانیف کو عربی جامہ پہنایا۔

شہروں وغیرہ کے ناموں کے متعلق شیخ ابو محمد الحسن بن احمد النسابہ الہمدانی کی کتاب مولفہ ۹۴۵ء میں ہے۔ بلاد افریقہ کے حالات میں البکری کی تصنیف مشہور ہے۔ یہ کتاب وادی نیل سے بحر اوقیانوس اور بحر روم سے سوڈان تک کے ملکوں پر مشتمل ہے۔ کتاب مذکور نہایت مختصر ہے۔ ۱۸۵۹ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ مصنف کی ایک اور تصنیف معجم ما استعجم من اسماء البقاع نامی ہے جو یاقوت کو باوجود کوشش کے دستیاب نہ ہو سکی۔ کتاب مذکور کے متعدد نسخے اس وقت یورپ میں موجود ہیں یہ عربی کی پہلی معجم ہے اور صرف عرب کے ان مقامات و منازل کو بیان کرتی ہے جن کا تذکرہ کتب ادب اور عربی اشعار میں آیا ہے۔ المختار فی ذکر الخطط والآثار کے نام سے مصر کے حالات میں ابو عبداللہ القضاعی کا متوفی ۱۰۶۲ء کی کتاب قابل ذکر ہے۔ اسی طرح ابو القاسم زمخشری متوفی ۱۱۴۳ء سے عرب کے مواضع و قریے، پہاڑوں و دریاؤں کے متعلق معجم تدوین کی جو اپنی صحت روایت اور ایجاز و اختصار کی بنا پر غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ القاموس کے مولف نے جغرافی معلومات میں کتاب مذکور کے حوالے دئے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ اٹلی زبان میں ہو گیا ہے۔ شہروں اور مقامات کے ناموں اور انکے حالات میں اور بھی متعدد تصانیف ہیں جن کا بیان طوالت کے خوف سے نہیں کیا جاتا۔

ادریسی

یہ مشہور و معروف جغرافیہ داں جزیرہ صقلیہ کا باشندہ تھا۔ صقلیہ کے عیسائی حکمراں جورجیہ نامی کے ہاں اس کو بڑی عزت و توقیر حاصل تھی۔ اور اسی کے لئے اپنی مشہور تصنیف نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق مدون کی۔ ادریسی نے معمورہ عالم کو سات اقالیم میں تقسیم کیا۔ اور ہر اقلیم کے ملکوں شہروں اور انکی باہمی مسافت کا مفصل طور پر ذکر کیا۔ مصنف نے طول البلد اور عرض البلد نہیں دکھائے۔ شریف ادریسی

... کے مشہور مسلمان جغرافیین میں شمار ہوتا ہے۔ اسکی ولادت ۱۰۹۹ء میں سبتہ میں ہوئی علم کا شوق کشاں کشاں قرطبہ لے گیا۔ فارغ التحصیل ہو کر صقلیہ پہنچا۔ حاکم صقلیہ نے شاندار استقبال کیا اور اپنے مصاحبین کے زمرہ میں داخل کر لیا۔ ۱۱۵۴ء میں امیر موصوف کے لئے ادریسی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف مرتب کی، اس کے علاوہ چاندی کا ایک کرہ بنایا جس میں مشہور شہروں کو نمایاں کرکے دکھایا تھا۔ ادریسی مسلمان اور مغربی جغرافیین کے نزدیک درمیانی واسطہ ہے۔ اہل یورپ نے کتاب مذکور کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ ادریسی نے نزہتہ المشتاق میں اپنے ذاتی مشاہدات، ہمعصر تجار اور سیاحوں سے حاصل کردہ معلومات کے علاوہ متقدمین کی تصانیف کو پیش نظر رکھا۔ کتاب میں ۷۰ کے قریب نقشے بھی دئے گئے ہیں۔ نزہتہ المشتاق کے علاوہ ادریسی کی ایک اور کتاب روض الانس ونزہتہ النفس بھی ہے۔ یہ اول الذکر مفصل اور جامع تھی۔ بدقسمتی سے اسکا کوئی نسخہ ہمارے ہاتھوں تک نہیں پہنچا۔ ابوالفدا نے اپنی کتاب کی تصنیف میں اس کتاب سے بڑی مدد لی ہے۔

اس موضوع میں اور بھی کثیر التعداد تصنیفات ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں:۔

ابوالمجد اسمٰعیل بن ہبتہ اللہ موصلی کی مزیل الارتیاب عن مشتبہ الانساب جو انساب کے متعلق ہے۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب التفصیل بھی ہے۔ اسی طرح ابوالحسن المراکشی کی المسالک الممالک شمس الدین دمشقی کی عجائب البر والبحر، شیخ اسفرائی کی عجائب الدنیا، ابن جزار کی عجائب البلدان۔ احمد اشعری کی کتاب اللباب الی متفرقہ الانساب۔ ابوالفتح محمد بن جعفر ہمدانی کی اسماء البلدان۔ محب الدین النجار کی عیون الاخبار الدنیا، ابوالقاسم شیرازی کی عجائب الاقسار وغرائب الاخبار حسن بن احمد مہلبی کی العزیزی جو عزیز باللہ فاطمی کے لئے لکھی گئی، انکے علاوہ ابوعبداللہ الجیہانی وزیر خراسان کی کتاب المسالک والممالک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وزیر موصوف کو علوم فلسفہ اور نجوم سے خاص شغف تھا۔ اس نے اجنبی تجار اور سیاحوں سے مختلف ممالک کے حالات راستے اور انکی مسافت کی معلومات حاصل کیں۔ مصنف نے دنیا کو سات اقالیم میں تقسیم کرکے ہر اقلیم کے لئے ایک مخصوص کوکب

البتہ شہروں اور ملکوں کے حالات میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا۔ البتہ آمد و رفت کے راستوں پر مکمل بحث کی ہے۔ کتاب مذکور اچھی خاصی غنیمت ہے۔ خلیل بن شاہین نے سفر کے متعلق ایک مفید کتاب لکھی۔ جس میں مصر کا پورا جغرافیہ بیان کیا۔ ابن حورانی کی کتاب الاشارات الی اماکن الزیارات صحابہ کے مقابر اور دمشق کی زیارتگاہوں پر حاوی ہے۔ اسی طرح شیخ علی بن ابی بکر متوفی ۱۲۱۵ء نے اپنی کتاب منازل الارض ذات الطول والعرض میں اپنے سیر و سیاحت کے مشاہدات کو قلمبند کیا ہے۔ اس مصنف کی دوسری مشہور تصنیف الاشارات الی معرفۃ الزیارات خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں مصنف نے حیرت انگیز ہمت اور بے نظیر جد و جہد کا ثبوت دیا ہے۔ بلادِ اسلامیہ کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں مصنف مشاہیر اسلام کے مقابر کی تلاش میں نہ پہنچا ہو۔ اس زمانہ میں وسائل آمد و رفت کے فقدان، راستوں کی دشوارگذاری اور سفر کے بے شمار موانع اور تصانیف کا تصور کر کے اس شخص کی پامردی اور ہمت پر رشک ہوتا ہے۔ مصنف کو اس کتاب کی تکمیل کے لئے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ وطن سے دور بادیہ پیمائی اور صحرائے غربت میں گذارنا پڑا۔ مذکورہ بالا کتب میں سے بیشتر نادر الوجود ہیں اور بعض ایسی ہیں جو صفحۂ عالم سے ناپید ہو چکی ہیں

تیرہویں صدی کے اہل قلم میں سے جنہوں نے جغرافیہ کے موضوع پر کتابیں لکھی ابن سعید المغربی مشہور ہیں۔ یہ بزرگ ۱۲۱۳ء میں غرناطہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۶ء میں تونس میں راہی ملک عدم ہوئے۔ صاحب مذکور حج کی نیت سے وطن سے نکلے اور افریقیہ، مصر، فلسطین، حلب اور شام کی سیاحت کرتے مکہ معظمہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ نے النفحۃ المسکیہ فی الرحلۃ المکیہ کے نام سے سفر کے حالات کو قلمبند کیا۔ دوسری بار ۱۲۶۶ء میں بعزم مشرق تونس کو خیرباد کہا۔ مصنف موصوف کی متعدد تصانیف ہیں، جن کے نام دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان میں المغرب فی حلی المغرب اور المشرق فی حلی المشرق مشہور ہیں۔ ابن سعید نے اپنی تصنیفات میں متقدمین کی کتابوں سے تحقیق و تدقیق کے بغیر بہت کچھ رطب و یابس جمع کر دیا تھا۔ ابوالحسن مراکشی نے اپنی کتاب وصف بلاد المغرب والاندلس میں مصنف مذکور کی بہت سے اغلاط کی تصحیح کی۔ ابوالفدا نے عرض البلد اور طول البلد کے متعلق

ابن سعید کی تصنیفات کو پیش نظر رکھا اس لئے اُس کی تصنیف تقویم البلدان میں کہیں کہیں تسامح

و...

یاقوت

معجم البلدان اور اُسکا مصنف آسمانِ شہرت کے آفتاب و ماہتاب ہیں یاقوت حموی کا پورا نام امام شہاب الدین ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ حموی الرومی ہے۔ یاقوت کی متعدد تصانیف ہیں مصنف مذکور یونانی الاصل تھا بعمر سنی میں قید ہو کر بغداد کے ایک مسلمان تاجر کے ہاتھ فروخت ہوا۔ تاجر مذکور یاقوت کے لئے بہترین مربی اور مہربان آقا ثابت ہوا۔ مصنف نے اُس کے زیرِ عاطفت عربی زبان اور مختلف علوم و فنون میں مہارت تامہ حاصل کی۔ اس کے بعد تجارت میں اپنے آقا کا ہاتھ بٹانے لگا اس سلسلہ میں کبھی کبھی یاقوت کو ارد گرد کے ممالک اور شہروں میں جانا پڑتا تھا اور خاص کر بحیرہ فارس کے جزیرہ کیش میں تو بار ہا جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں جزیرہ مذکور تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کی منڈیوں میں پردیس کی مصنوعات و پیداوار کا تبادلہ ہوتا تھا اور ملک ملک کے تجار کی آمد و رفت رہتی تھی۔ یاقوت نے آزاد ہونے کے بعد تجارت اور خاص طور پر تجارت کتب کا شغلہ اختیار کیا۔ اس سے اُس کا دائرہ معلومات اور بھی وسیع ہوتا گیا۔ جوں جوں مدت گذرتی گئی علوم و معارف میں یاقوت کا پایہ کمال بلند ہوتا گیا۔ کتابی تعلیم کے بعد مطالعہ عالم کے لئے سیر و سیاحت اختیار کی بلاد اسلامیہ کے علاوہ مشرق میں خراسان اور جیحوں کے ساحلی علاقے اور شمال میں قسطنطنیہ اور اُس کے قرب و جوار کے بلاد و امصار تک اُس کی سیاحت کا سلسلہ چلا گیا چنگیز خاں کے حملہ کے وقت (سنہ ۱۲۲۰ء) وہ خوارزم میں موجود تھا۔ وہاں سے شام کا رُخ کیا اور ۱۲۲۹ء میں وہاں وفات پائی۔ یاقوت کی کتاب معجم البلدان فن جغرافیہ میں اہم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ کتاب کی ترتیب حروف معجم پر کی گئی ہے۔ معجم البلدان کی نمایاں خوبی جس نے اس کو دوسری تصانیف پر خاص امتیاز بخشا ہے اُس کی تفصیل اور اجمال ہے۔ کتاب مذکور حصص عالم کے حالات، شہروں، پہاڑوں، میدانوں، وادیوں، مواضع، قریے، دریاؤں، سمندروں، جھیلوں، بتوں اور دوسری قابل دید چیزوں کے حالات پر

مشتمل ہے۔ یاقوت نے ہیئت زمین اور طبعی جغرافیہ پر بھی بحث کی ہے۔ معمورہ عالم کی تقسیم میں وہ یونانی علمار کے نقش قدم پر گیا ہے۔ اس نے دنیا کو سات حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ اور انکے باہمی اختلافات پر بھی بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ برید فرسخ، لشکر، طول البلد اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحات کی تشریح بھی کی ہے۔ نیز ملکوں کی آب و ہوا، انکی خصوصیات، ستاروں کے طلوع و غروب اور انکے بارش پر اثرات، شہروں کے ناموں اور انکے اشتقاقات اور دیگر مفید معلومات کو مفصل طور پر کتاب مذکور میں مدون کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صحابہ، تابعین اور مشاہیر اسلام کے مقابر کے محل وقوع پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور ان بزرگوں کے چیدہ چیدہ اشعار وغیرہ بھی نقل کئے ہیں ان سب خوبیوں کے علاوہ کتاب کا ایک اور وصف خاص اہم اور قابل تعریف ہے۔ یاقوت نے بلاد فرنگ کے حالات کی تدوین میں سابق مسلمان سیاحوں کے کارناموں اور آثار کو اپنی کتاب میں درج کرکے انکو زمانہ کی دست برد سے محفوظ کر لیا۔ ان میں سے ابن فضلان کا سفر نامہ بلغار خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مصنف معجم البلدان کے مقدمہ میں فن جغرافیہ پر کثیر التعداد تصانیف گنانے کے بعد جن سے اسے کتاب مذکور کی تالیف میں مدد ملی لکھتا ہے کہ انکے ماخذوں کے علاوہ میں نے عرب شعرار کے دواوین محدثین، راویوں اور دیگر اہل علم کی تصنیفات کو بھی پیش نظر رکھا اور رہی سہی کمی کو سیر و سیاحت اور کتاب فطرت کے مطالعہ سے پورا کیا۔ ۱۲۱۵ء میں وہ مرو میں مقیم تھا کہ چند وجوہ کی بنا پر کتاب کی ترتیب و تالیف کا خیال دامنگیر ہوا۔ اور ایک مدت کی محنت و مشقت کے بعد ۱۲۲۴ء میں اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا اس کے بعد نظر ثانی کی اور کئی بار اغلاط کی ترمیم و اصلاح کی۔ معجم البلدان کے متعدد نسخے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں ان میں سے ایک قلمی نسخہ ۶۲۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اسی نسخے سے معجم البلدان آٹھ جلدوں میں لیزبک سے ۱۸۶۶ء میں بڑے اہتمام سے شائع کی گئی۔ کتاب کے آخر میں مشہور ناموں کی فہرست کا اضافہ کیا گیا ہے۔ معجم البلدان کے علاوہ یاقوت کی ایک اور تصنیف کتاب المشترک وضعاً والمفترق صقعاً نامی ہے جو اول الذکر کی ایک مختصر صورت ہے کتاب مذکور گوٹنگن سے شائع ہوئی ہے۔ یاقوت نے معجم البلدان کو مراصد الاطلاع علی مراسد الاطلاع کے نام سے مختصر کرنا شروع کیا تھا لیکن عمر نے

وفات کی اور یہ کام ناتمام رہ گیا جس کو صفی الدین عبدالمومن نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ کتاب یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے اور جرمنی سے شائع ہوئی ہے۔

قزوینی

شیخ زکریا بن محمد قزوینی تیرہویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔ انکی وفات ۱۲۸۳ء میں واقع ہوئی۔ قزوینی کی کتاب آثار البلاد واخبار العباد مشہور ہے۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب عجائب المخلوقات نامی ہے جس میں رطب و یابس سب قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ اسکی تالیف کا زمانہ ۱۲۷۵ء ہے۔ یہ دونوں کتابیں گوٹنگن سے شائع ہو چکی ہیں اکثر مورخین قزوینی کو مشرق کا پلینوس کہتے ہیں کیونکہ اُس نے اپنے یونانی پیشرو کی طرح طبعی تاریخ پر بحث کی ہے۔ اور اس موضوع میں اپنی معلومات اور قدما سے اخذ شدہ علم کو اپنی تصنیف میں مدون کر دیا ہے۔

زین الدین عمر بن مظفر متوفی ۱۳۴۸ء کی کتاب خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب بھی قابل ذکر ہے کتاب کا نصف اول ملکوں، شہروں اور انکے اوصاف پر مشتمل ہے اور نصف آخر میں معدنیات حیوانات اور نباتات پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب مذکور کے کئی نسخے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں بحیثیت مجموعی صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ اس لئے کتاب قابل اعتماد نہیں۔ قاضی تاج الدین متوفی ۱۲۹۵ء کی کتاب اتعاظ المتأسل و ایقاظ المتغفل مصر کے حالات میں مفید تصنیف ہے۔

ابوالفدا

چودھویں صدی کے علماء جغرافیہ میں ابوالفدا سب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ہمعصروں میں ابوالقاسم محمد نوری تھا جس کا دار و مدار زیادہ تر متقدمین کی کتابوں پر رہا اور اپنی تصنیف میں کوئی نئی بات نہ پیدا کر سکا۔ اس کے علاوہ ذہبی اور عبدالرشید بھی قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر کی کتاب تلخیص الآثار فی عجائب الاقطار کے نام سے مشہور ہے۔ ابوالفدا الملک المؤید عماد الدین اسمٰعیل حماہ کا فرمانروا تھا۔ صاحب موصوف ۱۲۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ترقی کرتے کرتے امراء دمشق کے زمرہ میں شمار ہونے لگے۔ ملک ناصر محمد بن قلاوون نے اس کے حسن خدمت و وفاداری کے صلہ میں حماہ کی امارت بخش دی۔

ابوالفدا غیر معمولی خوبیوں کا مالک تھا حسن اخلاق اور ذاتی محاسن کے ساتھ ساتھ علم وفضل اور طب حکمت میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ علم ہیئت میں اس کو پورا درک تھا۔ اس نیک دل حاکم اور بے نظیر عالم نے ۱۳۳۱ء میں اس عالم فنا کو خیرباد کہا۔ اس کی کتاب تقویم البلدان کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہوا۔ ابوالفدا کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ "ہم نے اس مختصر تصنیف میں ضروری معلومات کو جو مختلف کتب میں منتشر تھیں یکجا مرتب کر دیا ہے۔ اس مناسبت سے کتاب کا نام تقویم البلدان رکھا گیا۔ شہروں اور ملکوں کے ذکر سے قبل زمین کی شکل اور معمورہ عالم کی تقسیم اور سمندروں وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے"۔ کتاب مذکور میں بعض جگہ فاحش اغلاط ملتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے متقدمین کی کتابوں سے تحقیق و تدقیق کئے بغیر بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔ ان تسامحات کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تاریخ اسلام کے طالب علم کے لئے اس وقیع تصنیف کا مطالعہ نہایت مفید ہے

ابن بطوطہ

تمام مسلمان سیاحوں میں ابن بطوطہ کا درجہ کثرت سیاحت اور وسعت معلومات کی بنا پر سب سے بلند وارفع ہے۔ اسکا مشہور ومعروف سفرنامہ تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم المعروف بہ ابن بطوطہ ۱۳۲۵ء میں طنجہ میں پیدا ہوا۔ سیر وسیاحت کے شوق میں وطن کو خیرباد کہہ کر مشرق کا رُخ کیا۔ افریقہ کے ساحلی علاقوں کو دیکھتا مصر وفلسطین کے راستہ شام میں وارد ہوا دمشق اور حلب دیکھنے کے بعد بغرض حج حجاز روانہ ہوا۔ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد نجد ہوتا ہوا واپس شام آیا۔ اور پھر مشرقی ممالک کا زادِ سفر باندھا۔ عراق، ایران اور ماوراءالنہر کے علاقوں کی سیاحت کرنے کے بعد بحر عرب کو طے کرتا افریقہ کے مشرقی ساحل پر اترا۔ وہاں سے حضرموت اور عرب کا جنوبی ساحل دیکھتا خلیج فارس جو موتیوں کی وجہ سے مشہور تھی پہنچا۔ اور بحیرہ فارس کے جزائر میں پھرتا رہا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ حج کے بعد شام آیا اور شام سے ایشیائے کوچک اور اناطولیہ کی سیر وسیاحت کرتا جنوبی روس تک چلا گیا۔ ان حصوں میں چنگیز خاں کی اولاد کی امارتیں تھیں۔ جنوبی روس سے بلاد

بلغار کے دارالخلافہ بلغار کا قصد کیا۔ اس سے قبل ابن فضلان ان حصوں کو دیکھ چکا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے پیشرو کے بیان کردہ آثار و اخبار کا مشاہدہ کیا۔ یہ اولوالعزم سیاح شمال میں آخری حد تک جو اس وقت تک عربوں کو معلوم تھی چلا گیا۔ یہ مقام بلغار مذکور سے چالیس دن کی مسافت پر تھا۔ ابن بطوطہ نے اس سے آگے جانے کی کوشش کی لیکن وسائل آمد و رفت کے فقدان اور اس جان جوکھوں سفر سے برآمد ہونے والے نتائج کی قلت منفعت نے اسے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا۔

ابن بطوطہ نے اس سرزمین پر جسے وہ ارض ظلمت کا نام دیتا ہے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس یخ بستہ حصوں میں آمد و رفت کے لئے ایک قسم کی گاڑی کے سوا جس کو کتے کھینچتے ہیں، اور کوئی ذریعہ نہیں۔ آدمی اور دوسرے جانور برف پر پھسل پھسل جاتے ہیں۔ لیکن کتے اپنے پاؤں کے ناخنوں کی وجہ سے گاڑی کھینچے جاتے ہیں۔ تجار میں سے چند اہل ہمت ہی اُدھر کا رُخ کرتے ہیں۔ تجارت زیادہ تر اس طرف کی اجناس اور دیگر اشیاء کے سمور اور کھالوں کے تبادلہ تک محدود ہے۔ بلغار سے وہ قسطنطنیہ آیا اور اس پرعظمت شہر کے مناظر سے ایک عرصہ تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہاں سے چل کر روس کے جنوبی حصوں سے گذرتا بحر خزر کے شمالی شہروں میں پہنچا۔ اور پھر جنوب میں خیوا، بخارا، خراسان کی سیاحت کی۔ وسط ایشیاء کی بادیہ پیمائی کے بعد افغانستان کے راستہ سے ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا۔ شمالی ہند کے شہروں کو دیکھتا ہوا دہلی میں وارد ہوا۔ اور ایک عرصہ تک وہاں قیام کیا۔ اس زمانہ میں تخت دہلی پر خاندان تغلق جلوہ افروز تھا۔ بادشاہ نے ابن بطوطہ کو قاضی بنایا۔ ایک مدت تک قاضی کی خدمات ادا کرنے کے بعد دل میں پھر سفر کا ولولہ اٹھا، چنانچہ بادشاہ سے شاہ چین کے پاس سفیر بن کر جانے کی رضامندی حاصل کی، دہلی سے ہندوستان کے شہروں کو دیکھتا کالی کٹ کے راستہ جزیرہ مالدیپ پہنچا۔ وہاں دو سال تک قاضی کے عہدہ پر فائز رہا۔ مالدیپ سے سیلون، جاوا، ساٹرا ہوتا ہوا حدود چین میں داخل ہوا۔ اور دارالسلطنت میں کچھ عرصہ قیام بھی کیا۔ وہاں سے وطن مالوف کا رخ کیا اور پورے چوبیس سال کی سیاحت اور بادیہ پیمائی کے بعد ۱۳۴۹ء میں طنجہ پہنچا۔ اس طویل اور کٹھن سفر کی تکان

اور کوفت ابھی باقی ہی تھی کہ طبیعت کے نچلاپن نے نئے سفر پر آمادہ کیا۔ چنانچہ اسپین کے قصد میں دوسری بار وطن کو الوداع کہا، ایک عرصہ تک گلستان اندلس اور مملکت غرناطہ کے جاں پرور مناظر اور قابل عز و افتخار آثار سے حظ اٹھاتا رہا۔ اس کے بعد سلطان مراکش نے اس کو سوڈان میں سفیر بنا کر بھیجا ابن بطوطہ ان حصوں کو دیکھتا ہوا دریائے تمبکتو تک چلا گیا۔ وہاں سے فاس واپس لوٹا۔ اور ۱۳۷۷ء میں یہ جہاں پیما سیاح عالم فانی سے راہی ملک عدم ہوا۔ ابن بطوطہ نے اپنے مشاہدات کو سفرنامہ کی صورت میں مدون کیا ہے۔ یہ تصنیف ملکوں شہروں اور وہاں کے باشندوں کے حالات اور انکے مراسم کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کرتی ہے۔ پیرایہ بیان نہایت دلکش ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں ایسے بیانات ہیں جن کو عقل تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ کتاب مذکور کا فرانسیسی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے سفرناموں میں جن کو مشہور علماء و فضلا نے مرتب کیا حسب ذیل قابل ذکر ہیں:۔ سفرنامہ ابن حبیب، سفرنامہ ابن جبیر۔ سفرنامہ ابن خلدون جو نادر الوجود ہے۔ سفرنامہ ابن رشید۔ سفرنامہ ابن صلاح، سفرنامہ ابوالقاسم۔ سفرنامہ بدرالدین۔ اور سفرنامہ سیوطی اور ابن رشید وغیرہم۔

مقریزی

تیرہویں صدی کے مشہور علماء جغرافیہ میں سے تقی الدین مقریزی بھی ہیں۔ ان کی تصنیف کتاب المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار فن جغرافیہ میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ موصوف کے معاصرین میں برہان الدین ابراہیم بقاعی متوفی ۱۴۸۰ء ہیں۔ جو قبرص اور رودس کے حملوں میں شریک تھے۔ ۸۴۴ھ میں انہوں نے اسفار عن الشرد والاخبار کے نام سے کتاب لکھی۔ اسکے بعد محمد بن ایاس جس کا زمانہ ۱۵۱۴ء ہے، نے نشق الازہار فی عجائب الاقطار نامی تصنیف مدون کی۔ مصنف مذکور نے کتاب کی تدوین میں مختلف قوموں کی تاریخوں سے مدد لی اور خاص طور پر مصر کے جغرافیہ اور اس کے عجائبات کو بیان کیا۔ شروع میں فلکیات اور علم ہیئت پر بھی گفتگو کی ہے۔ حسن نامی دوسرا جغرافیہ داں پندرہویں صدی کے اواخر میں غرناطہ میں پیدا ہوا۔ بلاد مغرب کی سیر و سیاحت کے دوران میں عیسائیوں کے ہاتھ پڑ گیا جو اُسے

وفات پاپائے اعظم کے پاس لے گئے۔ حسن نے عیسائیت قبول کرلی اور اطالیہ کو اپنا وطن بنالیا۔ اس کا مسیحی نام یوحنا قرار پایا۔ عربی کے علاوہ اس نے اٹلی اور لاطینی میں خوب مہارت پیدا کی۔ حسن مذکور نے افریقہ کے حالات میں کتاب لکھی۔ اصل کتاب عربی میں تھی بعد میں اسکو اٹلی زبان میں ترجمہ کیا۔ افریقہ کے حالات میں یہ کتاب مستند خیال کیجاتی ہے۔ اس کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوگیا ہے۔ مسلمان جغرافیین کے بیان میں آخری قابل ذکر شخصیت چلپی یا حلبی کتاب جہاں نما کے مصنف کی ہے جس کی وفات ۱۰۶۵ھ میں ہوئی۔ مصنف مذکور نے زیادہ تر مغربی تصانیف کو پیش نظر رکھ کر اپنی کتاب مدون کی۔

(۴)

گذشتہ صفحات میں وصفی جغرافیہ کے متعلق اہل عرب کی کوششوں اور مشہور علماء جغرافیہ کے حالات مجمل طور پر بیان کردئے گئے ہیں اب ہم جغرافیہ کی اس خاص شق پر بحث کرتے ہیں جس کو اہل عرب نے جغرافیہ ریاضیہ کا نام دیا۔ اس سے قبل بتایا جاچکا ہے کہ قدیم علوم سریانی اور یونانی تصنیفات سے عربوں تک پہنچے تھے۔ خلیفہ منصور نے فلسفہ وحکمت کی کتابوں کے ترجمہ میں عملی قدم اٹھا۔ اس کے جانشین مامون الرشید کے عہد میں یونانی علوم وفنون کی نشر واشاعت میں غیر معمولی ترقی ہوئی، اس خلیفہ کے لئے مجسطی اور بطلیموس کے جغرافیہ کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان کتابوں نے اسلامی جغرافیہ کی تاریخ پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ مسلمان علماء جغرافیہ اس فن بطلیموس کے نقش قدم پر گئے۔ جغرافیہ ریاضیہ میں انکے مباحث کا دار ومدار زیادہ تر بطلیموس کے جغرافیہ پر رہا۔ مامون الرشید کے زمانہ میں علم ہیئت اور ریاضت کی طرف توجہ کی گئی۔ علماء اسلام نے ان فنون کی ترقی میں غیر معمولی جدوجہد کی۔

سنہ ۸۳۰ء میں مامون کے حکم سے علم نجوم کی تدوین واصلاح عمل میں آئی۔ چنانچہ مجسطی میں ضروری اصلاح کرکے جدید زیج مرتب ہوئی اور کرۂ ارضی کے بعض مقامات کے طول البلد درست کئے گئے۔ اس خلیفہ کے ایماء سے زمین کے دائرۂ عظیمہ کی پیمائش ہوئی اور اس میں چار مشہور علماء ہیئت نے حصہ لیا جن کے کارنامے ابھی تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ اس مہم کے متعلق ابوالفدا کا بیان قابل توجہ ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے" زمانہ قدیم میں علماء ہیئت کے ایک گروہ نے جس میں مجسطی کے مصنف بطلیموس کا نام

خاص طور پر قابل ذکر ہے زمین کے دائرہ عظیمہ کی تحقیق کی تھی انکی تحقیق کے بموجب یہ دائرہ ۶۶½ میل کا تھا۔ انکے بعد علما متاخرین نے مامون الرشید کے زمانہ میں اسکی تحقیق کے لئے قدم اٹھایا چنانچہ سنجر کے میدان میں یہ تجربہ کیا گیا۔ اور ۶۶½ میل کی بجائے ۵۶ میل کا دائرہ عظیمہ قرار دیا گیا۔ ابوالفدا نے صرف سنجر کی مہم کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ اس کے علاوہ تدمر اور فرات کے درمیانی علاقہ میں بھی اس قسم کا تجربہ عمل میں لایا گیا۔ ابن یونس نے جو عہد عباسیہ کے مشہور ہیئت دانوں میں شمار ہوتا ہے اس امر کی تصدیق کی ہے۔ ابن یونس کی وفات ۱۰۰۸ء میں ہوئی۔ اس کے متعلق سناد بن علی لکھتا ہے کہ خلیفہ مامون نے مجھے اور خالد بن عبدالملک کو سطح زمین کے دائرہ عظیمہ کی پیمائش کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک طرف ہم روانہ ہوئے اور دوسری طرف علی بن عیسیٰ اسطرلابی اور علی بن بحتری گئے۔ ہم چلتے چلتے فاؔمیہ اور تدمر تک پہنچے اور ہمارے حساب کے مطابق دائرہ عظیمہ ۵۶ میل کا تھا۔ اسی طرح علی بن عیسیٰ اور علی بن بحتری کی تحقیقات کا یہی نتیجہ برآمد ہوا۔ اسی تحقیق میں ابن یونس نے ایک اور روایت نقل کی ہے اس امر سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس علم میں صرف تقلید ہی نہیں کی بلکہ اس میدان میں تحقیقات کیں۔ اور قدما کے علم میں اضافہ اور اصلاح کی۔

گیارہویں صدی میں البیرونی نے قدیم زیجوں میں اصلاح کی اور بلاد روم، ماوراء النہر اور سندھ کے طول البلد وغیرہ درست کئے۔ اور مشرق کی جہت میں زمین کے نقشہ میں ترمیم کی۔ اس کے بعد ابوالحسن علی المراکش متوفی ۱۲۳۰ء نے جہت مغرب کے طول البلد اور عرض البلد میں اصلاحیں کیں۔ ابوالحسن مراکش میں پیدا ہوا۔ اسکا مشہور سیاحوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے بحر روم کی جنوبی سمت میں اسکی وسعت کے متعلق بطلیموس کی غلطیوں کی اصلاح کی اور نیز علم تاریخ ہیئت اور ریاضیات میں ایک قابل قدر تصنیف کی۔ جس میں ممالک اسلامیہ کے ان شہروں کے نام جمع کئے جن کا طول البلد اور عرض البلد محقق تھا، ان کی تعداد تقریباً ایک سو پینتیس ۱۳۵ ہے۔ ان میں سے چوالیس ۴۴ نو وادی نیل اور بحر اوقیانوس کے اطراف میں واقع تھے اور باقی دوسرے حصوں میں۔

تیرھویں صدی کے آخر میں ناصرالدین مشہور فلکی کا ظہور ہوا۔ اور پندرھویں صدی کے نصف

میں ایک مشہور عالم فلکیات ہوا ہے۔ جو الغ بیگ ابن شاہ رخ فرمانروائے بلاد سمرقند کے نام سے مشہور ہے۔ موصوف نے جدید زیج مرتب کی اور ۱۴۳۳ء میں کرہ ارضی کا خریطہ تیار کیا۔ مصنف مذکور اپنی تحقیقات میں ناصر الدین طوسی کی کتابوں سے استشہاد کرتا تھا۔ طوسی علم ہیئت و نجوم میں امام گذرا ہے وہ ایک مدت تک مراغہ کے رصد خانہ سے جو ہلاکو خاں نے اس کے لئے تعمیر کیا تھا نجوم و کواکب کی حرکات کا مطالعہ کرتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ الغ بیگ مذکور نے زمین کی پیمائش کے متعلق بھی کوشش کی۔

جغرافیہ ریاضیہ میں عربی تصنیفات اور اہل عرب کی بنائی ہوئیں زیجوں کو دیکھنے سے ان میں اور نئی تحقیقات اور اکتشافات میں غیر معمولی تفاوت نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے ہیئت داں اور ماہرین فلکیات تحقیق و اکتشافات میں عربوں سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل عرب بطلیموس اور دوسرے یونانی علماء سے فوقیت لے گئے تھے۔ اور ان کے اغلاط کی تصحیح وغیرہ میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ مسلمان علم ہیئت وغیرہ کے ایسے قدر داں تھے کہ خالص بطلیموس کا بنایا ہوا کرہ قاہرہ کے کتب خانہ میں ۴۳۵ھ تک موجود تھا۔ اس علم کی تحقیقات کے لئے نئے نئے آلات ایجاد ہوئے۔

اس کے علاوہ اسلامی شہروں میں بکثرت رصد خانے بنائے گئے جن کے کھنڈرات آج تک اہل عرب کے فضل و کمال کی شہادت دیتے ہیں۔

مسلمانوں نے بطلیموسی نظام کی غلطی کو پرنکس سے پہلے دریافت کرلیا تھا۔ چنانچہ محمد بن عبد الملک طفیل کے متعلق جو بارہویں صدی میں اندلس میں پیدا ہوا ایک یورپی مصنف اپنے رسالہ علم ہیئت کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ مشہور عالم ابو یا سر (طفیل کا انگریزی نام) نے کہا ہے کہ نظام شمسی اور حرکات اجسام فلکی میں میری تحقیقات اہل یونان سے مختلف ہیں نیز اہل عرب نے علماء فرنگ سے تقریباً پانچ سو سال قبل بحر روم کا صحیح قطر دریافت کرلیا

غرض علم جغرافیہ میں عربوں کے کارنامے اس قابل ہیں کہ اُن پر بجا طور پر فخر و ناز کیا جا سکتا ہے۔ اہل عرب عہد جدید اور عہد قدیم کی درمیانی کڑی ہیں۔ انہوں نے قدمار کے علوم و فنون کو گوشہ گمنامی سے نکالا۔ اور اُن کو جلا دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا موجودہ عہد کی علمی ترقی ایک حد تک اہل عرب کی ساعی جمیلہ کی رہین منت ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب

مخزن نجات ۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی نصائح کو اکثر علما، نے چہل حدیث یا اربعین کے نام سے متفرق طور پر چالیس چالیس اقوال مجموعوں میں جمع کیا ہے۔ مولوی شرف الدین احمد صاحب نے چہل حدیث کے ایک مجموعہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ہر حدیث کے ساتھ مولنا جامی علیہ الرحمۃ کا فارسی منظوم ترجمہ بھی لکھدیا ہے اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ چھوٹی تقطیع پر ایک جزو کا رسالہ ہے۔ کاغذ۔ لکھائی۔ چھپائی سب اعلی درجہ کی ہے۔ اور ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ قیمت

ملنے کا پتہ: مولوی شرف الدین احمد صاحب محلہ زینہ عنایت خاں۔ ریاست رامپور

تلاش حق ۔ مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی کے تجربات گجراتی زبان میں اخبار نوجیون میں سلسلہ وار لکھے تھے جو انگریزی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا بھر میں شائع ہو چکے تھے۔ اگر موجودہ زمانے کے اس سب سے بڑے لیڈر اور ہندوستان کے مخلص خادم کے حالات سے بیخبر تھے تو اردو پڑھنے والے لوگ۔

مکتبہ جامعہ ملیہ نے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ و مدیر رسالہ جامعہ سے اسکا اردو زبان میں ترجمہ کرا کے اردو خواں طبقہ کے لئے شائع کر دیا۔ آسانی کے لئے کتاب کے دو حصے کر دئے ہیں جس کی مجموعی ضخامت .. ۷ صفحات سے زیادہ ہے اور جس میں مہاتما جی کی زمانہ طالب علمی سے لے کر اب تک کی متعدد تصویریں بھی ہیں۔ کاغذ۔ چھپائی اور لکھائی عمدہ اور صاف ہے باوجود اس کے قیمت فی حصہ صرف ایک روپیہ رکھی ہے تاکہ لوگ آسانی سے خرید اور پڑھ سکیں۔ مجلد کی قیمت فی حصہ عار ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ترجمہ اسقدر لطیف، سلیس اور صاف کیا ہے کہ ساری کتاب پڑھ کر بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ اصل کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اور ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ آسان اتنا ہے کہ ہر شخص بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرولباغ۔ دہلی

تاریخ نثر اردو حصہ اول۔ مصنفہ حضرت احسن مارہروی اردو لکچرر انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ حجم صفحہ ۶۱۰ قیمت فی نسخہ عمر۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں اردو نثر کے ابتدا سے لیکر آجتک کے حالات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ۱۳۹۰ء سے موجودہ دور تک نثر اردو کے نشو و نما اور عہد بعہد ارتقا کی تاریخ ہے۔ ہر دور کے ہر قسم کے اردو نثر کے نمونے بھی درج کئے گئے ہیں اور نہایت کوشش اور کاوش کے ساتھ مواد فراہم کرکے اس کو ترتیب دیا گیا ہے۔ مذہبی۔ طبی۔ اخلاقی۔ سیاسی۔ قانونی۔ دفتری اور اخباری ہر قسم کی اردو کے نمونے معہ حوالوں کے دئے گئے ہیں جس سے ہر دور اور ہر قسم کی اردو کی کیفیت الگ الگ نمایاں ہو جاتی ہے۔

اردو زبان کی اساسی تاریخ کے متعلق ادھر چند سالوں میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہ کتاب بسط و تفصیل کے لحاظ سے خاص خصوصیت رکھتی ہے۔ اردو زبان اردو اور اس کے ارتقائے مدارج کی تاریخ کے متعلق اس میں مفید معلومات ہیں۔

ابھی یہ اس کتاب کا پہلا حصہ شائع ہوا ہے۔ کاغذ۔ چھپائی اور لکھائی وغیرہ کے لحاظ سے اوسط درجہ کا ہے۔ لیکن قیمت نسبتاً زیادہ ہے۔ کاش اس سے نصف ہوتی تاکہ اشاعت زیادہ ہو سکتی۔

شذرات

ہندوستان میں عربی تعلیم کا ہولناک تنزل آنکھوں کے سامنے ہے۔ بہت سے مدارس جہاں سے بڑے بڑے علماء اسلام پیدا ہوتے تھے یا تو فنا ہو گئے یا ہچکیاں لیکر دم توڑ رہے ہیں۔ اسلامی ریاستوں میں عربی کے لیے جو مدارس قائم تھے اور جن سے کبھی اچھے اچھے عالم نکلتے تھے وہ پرانے دفاتر کی طرح نام کو زندہ ہیں مگر حقیقت میں مردہ۔ دہلی میں مسلمان تجار نے بہت سے مدارس قائم کر رکھے ہیں جن کو وہ اپنے اہتمام و اپنے ہی خرچ سے چلاتے ہیں۔ بار بار کوشش کی گئی کہ یہ جملہ مدارس ایک کر دیے جائیں تاکہ کوئی علمی خدمت ہو سکے مگر ان سوداگروں نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کی جس کی وجہ اگر ہم حسن ظن سے کام لیں تو یہ ہے کہ سارا ثواب اس مدرسہ کا وہ خود حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر ذرا غائر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقصد سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ" در سر کار ما ایں ہم باشد" اس افراتفری کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کساد بازاری میں ان میں سے بہت سے ٹوٹ گئے اور جو ہیں وہ جاں بلب ہیں۔ ہرچند کہ یہ جملہ عقیم تھے مگر پھر بھی عربی خوانی کا سلسلہ ان سے قائم تھا۔

پنجاب کے مسلمانوں نے عربی تعلیم کی ترویج کی طرف کبھی زیادہ توجہ نہیں کی نہ ایسے مدارس قائم کئے جہاں سے علماء اسلام پیدا ہوتے۔ یہی حال بنگال کا ہے۔ سرکاری عربی تعلیم گاہیں جو پنجاب یا بنگال میں ہیں ان سے ہم عربی کے احیاء کی توقع نہیں رکھ سکتے۔

دیوبند اور سہارنپور کے مدارس بھی دو ایسے ہیں جو عربی تعلیم کا کام بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں اور اسوقت ملک میں بہت بڑی تعداد علماء اسلام کی وہی ہے جو ان مدارس سے نکلی ہے۔ لیکن ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے لئے یہ دو مدرسے کہاں تک کفایت کر سکتے ہیں اور کیونکر انکی علمی اور دینی ضروریات ان سے پوری ہو سکتی ہیں بحالیکہ ان مدارس میں بھی جو تعلیم ہوتی ہے وہ تقلیدی ہے نہ کہ تحقیقی اور ان میں سے جو علماء پیدا ہوتے ہیں وہ عہد حاضر کے لئے اسی قدر قدیم ہیں جس قدر وہ کتابیں جن کو وہ پڑھتے ہیں۔

دہلی کا دار الحدیث رحمانیہ بھی جو یہاں کے عربی مدارس میں ممتاز ہے ہماری توقع پوری کرنیکی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ بھی شخصی مدرسہ ہے جس کی عمر بالعموم کم ہوا کرتی ہے۔ ندوۃ العلماء کا دائرہ عمل اپنے ۴۰ یا ۵۰ طلبہ تک محدود رہتا ہے جس سے امید نہیں کہ وہ قوم میں کچھ زیادہ مفید علماء کا اضافہ کر سکے۔ ایسی حالت میں زعماء ملت اور ہمدردان اسلام کا فرض ہے کہ وہ علوم عربیہ کے احیاء اور ترویج کے لئے متفقہ کوشش کریں ورنہ اسکا زوال درحقیقت ہندوستان کے مسلمانوں کا دینی زوال ہے۔

عربی تعلیم میں دو دشواریاں حائل ہیں۔ ایک تو خود علماء کی طرف سے ہے کہ انہوں نے اس کے نصاب میں غیر ضروری علوم اور فرسودہ مضامین کا اضافہ کرکے اس کو اسقدر بوجھل بنا دیا ہے کہ اسکی تحصیل میں پوری عمر صرف کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے عربی کی تحصیل مشکل اور اس کے منافع محدود ہوگئے ہیں۔ دوسری دشواری محکومیت کی وجہ سے ہے کہ کارآمد دماغ جو عربی کی تحصیل کرتے وہ حکومت کے مدارس میں مغربی علوم پڑھتے ہیں۔ ان دونوں دشواریوں کا حل آسان نہیں ہے علماء میں اسقدر جمود ہے کہ وہ جو کچھ پڑھاتے ہیں اس میں کسی اصلاح کی ضرورت کو نہیں تسلیم کرتے۔ اور طلبہ ضرورت زمانہ سے مجبور ہیں کہ انگریزی پڑھیں۔

ایسی حالت میں صرف یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مختصر سے مختصر عربی تعلیم کا نصاب ترتیب دیا جائے اور زبان عربی۔ اور دینیات کی تعلیم پر قناعت کی جائے۔ منطق، فلسفہ، اصول۔ نام نہاد عقائد ہیأۃ اور ریاضی وغیرہ یکقلم اس سے خارج کر دی جائیں اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ عربی خواں طلبہ کو دوسرے مفید علوم و فنون پڑھنے کے لئے وقت مل سکے گا۔ اور اگر ان کو عربی ادب کی اچھی اور پختہ تعلیم مل گئی ہے تو وہ زیادہ صحیح اور بہتر طریقے سے دینیات کو سمجھ سکیں گے۔

(۱۔ ج)

جمیعۃ علماء ہند کی وہ مساعی ہرطرح قابل ستائش ہیں جو ملک کی تحریک آزادی میں شریک ہوکر وہ مسلمانوں کو بے عملی، حکومت پرستی اور غلامی کی شرمناک الزاموں سے بچانے کے لئے عمل میں لارہی ہے۔ اس وقت موقع تو اس کا تھا کہ جن لوگوں کو اپنی انگریزی دانی، وسیع النظری اور ریاست پر ناز تھا، عمل سے اپنی فضیلت کا ثبوت دیتے، لیکن تاریخ میں یہی لکھا جانا مقسوم تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ناعاقبت اندیشانہ بے عملی سے جس کی طرف نہیں بیشتر "روشن خیال" لیڈر لیجانا چاہتے تھے ہٹاکر تدبر اور آزادی کی صحیح راہ پر لگانے والے وہ بزرگ ہوں جن کے فرائض بالعموم سیاست سے الگ سمجھے جاتے ہیں۔

اس بروقت رہنمائی کی قدر، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے مسلمانوں نے جیسا چاہئے تھا ابھی تک نہیں کی۔ ایک ایسی جماعت کا جس کے ہاتھ میں تنہا ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی لاج ہے، یہ شکایت کرنا کہ وہ مقروض ہے، اور نو ماہ سے مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کرسکی ہے، نہایت افسوسناک ہے۔ اور ہم اس رسالہ کے ذریعہ مسلمانان ہند کو اس اپیل کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو جمعیۃ نے رضاکاروں اور مالی اعانت کے لئے حال میں شائع کی ہے۔ اور پرزور درخواست کرتے ہیں کہ امداد میں درمے قدمے سخنے کسی طرح بھی دریغ نہ کیا جائے۔

پڑھے لکھے لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو مولنا محمد مارماڈیوک پکتھال کے نام نامی سے آشنا نہ ہو۔ موصوف ایک نومسلم انگریز ہیں اور عربی علوم اسلامیہ کے بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ انگریزی کے نہایت ہی اچھے جرنلسٹ بھی ہیں۔ آپنے کلام مجید کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے، جو اس وقت زیر طبع ہے اور اکتوبر ۱۹۳۰ء تک چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ یہ ترجمہ جیسا کہ اس اطلاع سے معلوم ہوتا ہے جو ہمیں موصول ہوئی ہے، دوسرے ترجموں سے بلحاظ معنی و مفہوم بہت بہتر

ہوگا۔ اس کی شہادت اس واقعے سے بھی ملتی ہے کہ ترجمہ پر نظر ثانی کا کام مصر میں علامہ شیخ مصطفیٰ المراغی امیر جامعہ ازہر کی زیر ہدایت انجام پایا ہے، نیز اس سلسلہ میں ہز اکسلنسی فواد سلیم بے الحجازی اور پروفیسر شیخ محمد الغمراوی سے بھی مدد لی گئی ہے، جو اپنے وقت کے متبحر عالم سمجھے جاتے ہیں۔ ہم مترجم موصوف کو ان کے اس وقیع کارنامہ پر جس سے اسلام کی اہم ترین ضرورت پوری ہوتی ہے، مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ علمی حلقوں میں پکتھال صاحب کا ترجمہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔

خود نوشت سوانح حیات مہاتما گاندھی

MY EXPERIMENTS WITHTRUTH

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ - ڈی

دنیا بھر میں شہرت ہو، لاکھوں آدمی پڑھ چکے ہیں، کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن اردو داں طبقہ موجود
دنیا کے سب سے بڑے لیڈر اور اپنی قوم کے خادم مہاتما گاندھی کے ان حالات زندگی سے اب تک ناواقف تھا جو وہ
مسلسل اپنے گجراتی اخبار "نوجیون" میں لکھتے رہے تھے اور جنکا انگریزی ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔
اب نہایت آسان اردو میں دونوں جلدوں کا ترجمہ علحدہ علحدہ شائع کیا جا رہا ہے۔ مکمل کتاب کی ضخامت
۰۰، صفحات سے زیادہ ہے۔ زمانہ طالب علمی سے لے کر اب تک کی بہت سی تصویریں ہیں۔ کاغذ طباعت
کتابت نہایت عمدہ تاجران کتب اور عام خریدار فوراً طلب کریں ورنہ دقت کی پیزہے دوسرے ایڈیشن
کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت فی حصہ ایک روپیہ (عہ) مجلد عار

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

۱۰ | بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ع | نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ۔ ڈی

جلد ۱۵	بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳ء	نمبر [illegible]

فہرست مضامین

مقدمہ

نفسیات شباب

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت ہونگی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

(اقبال)

انگلستان کا مشہور شاعر پوپ کہتا ہے کہ "انسان کے لئے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہے"
جو لوگ فلسفیانہ طبیعت رکھتے ہیں دنیا کو گہری نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں انہیں چار و ناچار اس مقولے کی
تصدیق کرنا پڑتی ہے کیونکہ کائنات کے گورکھ دھندے کا سرا انسان ہی کی ذات ہے۔ اس بھول
بھلیاں میں وہ کہیں سے چلنا شروع کریں گھوم پھر کر انسان تک آ پہنچتے ہیں اور یہیں سے اس پیچ
در پیچ رستے کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو فلسفیانہ تحقیق کی خلش سے محروم یا محفوظ ہیں اور
عملی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انہیں پوپ کے مقولے کے تسلیم کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ انہیں
تو ہر قدم پر اسکی ضرورت پڑتی ہے کہ اپنے بنی نوع کی سیرت کو جانیں، انکے مزاج کو پہچانیں، انکے قول کو
سمجھیں، انکے فعل کو پرکھیں۔

انسان کی عمر کا وہ حصہ جس کا مطالعہ سب سے زیادہ مشکل اور ایک لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے
نوجوانی کا زمانہ ہے۔ خالص نظری ذوق رکھنے والے طلسم شباب کی نیرنگیوں سے گھبراتے ہیں۔ شاید
وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو دیکھنا ہی ہے تو اس صورت میں دیکھنا چاہئے جب اس کی سیرت کے
نقوش ذرا ابھر آئیں اور کسی قدر پختہ ہو جائیں۔ عنفوان شباب کی سیمابی تصویر کو جو کبھی ایک رنگ
پر نہیں رہتی، نت نئے روپ بدلتی ہے۔ دیکھنے سے کیا فائدہ اور فائدہ بھی ہو تو اس جھگڑے میں
کون پڑے۔ مگر ارباب عمل یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے۔ انہیں تو اور لوگوں کی طرح نوجوانوں کی بھی
حتی الامکان خدمت کرنا ہے اور ان سے حسب حیثیت کام لینا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے

کر وہ انکے جذبات وخیالات انکی قابلیت وصلاحیت اور انکی ضرورتوں کا صحیح اندازہ کر چکے ہوں۔

سب سے پہلے تو والدین کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اپنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی افتاد مزاج کو سمجھیں تاکہ زندگی کی کٹھن منزل میں انکی رہنمائی کر سکیں۔ انکے بعد مگر ان سے زیادہ معلموں کو نوجوانوں کی سیرت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہی انکی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ والدین کو آسانی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بچپن سے دیکھتے چلے آتے ہیں اور اُس کی ارثی خصوصیتوں کو پہلے سے جانتے ہیں۔ مگر معلموں کو موجودہ طریقہ تعلیم کے مطابق اپنے شاگردوں سے واقف ہونے کا بہت کم وقت ملتا ہے۔ نوجوانوں کے معلم ہائی اسکول کے اعلیٰ مدرس یا کالج کے پروفیسر ہوتے ہیں اور وہ عموماً ان کی بچپن کی زندگی سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ والدین کو جو باتیں چودہ پندرہ برس کے سلیقے میں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں وہ معلموں کو دو چار برس کے عرصے میں مشاہدے اور تجربے سے دریافت کرنا پڑتی ہیں۔

والدین اور معلموں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے لئے بھی نوجوانوں کی افتاد مزاج سے واقف ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی پیشوا جو انہیں عقیدت اور معرفت کے رستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ سیاسی لیڈر یا سماجی مصلح جو ان سے ملک وملت کی خدمت لینا چاہتے ہیں اگر ان کی مخصوص ترکیب نفسی سے واقف نہ ہوں تو اپنی کوششوں میں ناکامیاب رہتے ہیں اور ان بیچاروں کی زندگی برباد کرتے ہیں۔ عدالت کے حاکم نوعمر مجرموں سے تبھی انصاف برت سکتے ہیں، کارخانوں کے مالک اور محکموں کے افسر نوجوان ماتحتوں سے تبھی کام لے سکتے ہیں جب وہ عنفوان شباب کی نفسی خصوصیات سے محرم ہوں۔

اب رہے خود نوجوان ان کی تو سب سے بڑی آرزو اور سب سے شدید ضرورت یہی ہے کہ اس طوفان و تلاطم کی حقیقت کو سمجھیں جو انکے نفس میں برپا ہے جب تک وہ اس دریا کے مد و جزر سے آشنا نہ ہوں صحیح سلامت ساحل تک نہیں پہنچ سکتے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ ناکردہ کار نوجوانوں میں اتنی بصیرت نہیں ہوتی کہ اپنی نفسی کیفیات کو تحقیق اور

نقید کی نظر سے دیکھ سکیں اور اپنی کیا موقوف ہے خود اپنی یا اپنے جیسوں کی سیرت کا نفسیاتی مشاہدہ جب چاہے کوئی بھی نہیں کر سکتا کسی شخص کی ترکیب نفسی کی تحلیل کرنا اسی کا کام ہے جسے اس شخص سے تعلق ہو مگر بہت قریب کا نہ ہو۔ نوجوانوں کی طبیعت کو اگر پوری طرح سمجھ سکتے ہیں تو وہی لوگ جو نوجوانی کی منزل سے آگے بڑھ گئے ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ نوجوانی کا دور گذرنے کے بعد لوگ اسے یاد تو بہت کرتے ہیں مگر اسکی واردات انکے ذہن میں بہت کم محفوظ رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک خواب سا دیکھا تھا جس طرح صبح اٹھ کر رات کے خواب کے محض چند متفرق نقوش لوح دل پر رہجاتے ہیں اسی طرح جوانی کی نیند سے بیدار ہونے کے بعد شباب بیتی کے کچھ بیرنگ اور بے ربط واقعات یاد رہتے ہیں مگر وہ نفسی کیفیتیں یاد نہیں رہتیں جو اس ماجرے کی جان تھیں۔ اس ناتمام مرقعے سے زندگی کے مبصر کا کام نہیں چلتا۔ اس کے لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ان لوگوں سے مدد لے جو ابھی تک عنفوان شباب کی منزل میں ہیں۔ مگر نوجوانوں کی رمیدگی اور پردہ داری کی بدولت یہ تدبیر بھی نہیں چلتی۔ انہیں درد پنہاں کی کسک سے تڑپنا گوارا ہے مگر اپنے دل کا حال کسی سے کہنا گوارا نہیں۔

آپ کہیں گے کہ اچھا اگر نوجوان اپنے بھید کو چھپاتے ہیں تو کیا ہم خود انکی حالت نہیں دیکھ سکتے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اگر ہم چشم بینا اور ذہن رسا رکھتے ہوں اور تحقیق و تنقید کی زحمت گوارا کریں تو بیشک دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر ہر شخص چاہے کہ یوں ہی سرسری نظر ڈال کر نوجوانوں کی پیچ در پیچ ترکیب نفسی کو سمجھ لے تو تقریباً ناممکن ہے۔ عام تجربہ بعض راہوں میں صحیح رہنمائی کرتا ہے مگر اس منزل میں قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔

عام تجربے کی بنا پر نوجوانوں کی سیرت کی جو تصویر ہمارے ذہن میں قائم ہوتی ہے وہ عجیب اَن مِل بے جوڑ نقوش کا مجموعہ ہے۔ کبھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نوجوان بے فکری اور لاابالی پن کی زندگی میں مگن ہے، نہ اسے طمع سود ہے نہ اندیشۂ زیاں نہ غم دوش ہے نہ فکر فردا، اور کبھی یہ کہ وہ ہر وقت کسی خیال میں محو ہے کسی تشویش میں گھل رہا ہے گویا ساری دنیا کی ذمہ داریاں اسی کے سر ہوں۔ کبھی ہم اسے اس قدر احدی اور آرام طلب پاتے ہیں کہ دن بھر پڑا چارپائی توڑتا ہے اور اپنے ہاتھ سے

کر پانی پینا بھی گوارا نہیں کرتا اور کبھی اتنا محنتی اور جفاکش کہ بھوت بن کر کام کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اس دھن میں نہ اسے کھانے کا ہوش رہتا ہے نہ سونے کی فکر۔ کبھی وہ ہمیں یار دوستوں کی صحبت کا شیدائی نظر آتا ہے، جب دیکھو احباب کے مجمعے میں ہنسی، دل لگی، قہقہوں، چہچہوں کا لطف اٹھا رہا ہے اور کبھی اس درجہ تنہائی پسند کہ صحبت کے نام سے بیزار ہے۔ انسان کے سائے سے بھاگتا ہے۔ کبھی اس کی شکایت کی جاتی ہے کہ بے حد خود سر اور خود رائے ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، کسی کا کہنا نہیں مانتا اور کبھی تعریف ہوتی ہے کہ بڑوں کے سامنے آنکھیں بچھاتا ہے اور انکی دل سے اطاعت کرتا ہے۔ کبھی اس کی حالت پر افسوس کیا جاتا ہے کہ مذہب سے غافل ہے، سست اعتقاد ہے۔ نماز روزے کے پاس نہیں پھٹکتا اور کبھی اس کی دینداری، عبادت گذاری، پرہیزگاری کی قسم کھائی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ عام یہ خیال ہے کہ عنفوان شباب محض حسن و عشق کا دلکش اور دلنواز طلسم ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس نوبہار عمر میں حسن کا رس گلبن زندگی کو تازگی اور شادابی بخشتا ہے محبت کی نسیم غنچۂ دل کو شگفتہ رکھتی ہے اور نوجوانوں کو ناز و نیاز کا لطف اٹھانے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو معلوم ہو جائے کہ عشق بھی ان کانٹوں میں سے ایک کانٹا ہے جو نوجوان کے پہلو میں کھٹکتے ہیں یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ غم زندگی اور الم روزگار کی گوناگوں خلش میں جو نوجوان کے دل کو تڑپاتی رہتی ہے۔ ہمیں صرف عشق کی چبھن دکھائی دیتی ہے اور اسے بھی ہم لطف و مسرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لالۂ نو دمیدہ کے خون جگر کو ہم رنگ شباب کی سرخی اس کے درد بھرے دل کی فریاد کو الفت کا ترانہ سمجھتے ہیں!

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا　　　اے وائے نالۂ لب خونیں نوائے گل

غرض عام تجربے سے نوجوانوں کی ترکیب نفسی کے سمجھنے میں کام نہیں چلتا۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو یہاں محض ایک دھوپ چھاؤں کا کھیل ایک تلون کا طلسم دکھائی دیتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس رنگ کو اصلی رنگ سمجھے۔

زندگی کی تفسیر میں عام تجربے سے آگے بڑھیئے تو ادب کی منزل آتی ہے۔ حیات انسانی کی

جو باریکیاں عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں انہیں شاعر اور ادیب کی نکتہ رس نظر دیکھ لیتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری زبان کا ادب ہمیں نوجوانوں کے دل کا بھید سمجھنے میں بہت کم مدد دیتا ہے۔ ہمارے ادب کا جزو اعظم شاعری ہے۔ اردو کے شاعروں کا دعوے تو یہ ہے کہ ہم عہد شباب کے مصور اور مفسر ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ انکی ساری بلند پروازی محدود ہے "چنانکہ افتد و دانی" کی تفسیر تک اور یہ بھی بھی کچھ ہے ظاہر ہے۔ اب رہے ہمارے ناول نویس اور افسانہ نگار انکا زاویہ نگاہ کسی قدر وسیع ہے مگر دقت نظر ان میں شاعروں سے بھی کم ہے، اردو میں جتنے ناول لکھے گئے ہیں ان میں زندگی کی سچی تصویر اگر ہے تو صرف نذیر احمد کے ناولوں میں ہے۔ توبۃ النصوح اور فسانہ مبتلا میں نوجوانوں کی زندگی کے ایک پہلو پر نہایت خوبی سے نظر ڈالی گئی ہے مگر نفسی تحلیل کی یہاں بھی کمی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ہمارا ادب ہی نوجوانوں کی نفسی زندگی کی ترجمانی سے قاصر ہے تو اس مسئلے میں علمی تحقیق کیسے کیجا سکتی ہے۔ انسان کے قلب کی گہرائیوں کا مشاہدہ اصل میں شاعر اور ادیب کا کام ہے نفسیات کا ماہر ادب کے سہارے کے بغیر اس منزل میں نہیں چل سکتا۔ اس کے پیش نظر باکمال شاعروں اور ناول نویسوں کے مشاہدات ہوں تو وہ انہیں تنقید کی کسوٹی پر کسے اور عقلی اصول کے مطابق ترتیب دے لیکن جب یہ لوح بالکل سادہ ہو تو وہ کس برتے پر تحقیق کا حوصلہ کرے۔

اب اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو داں پبلک نوجوانوں کی ترکیب نفسی کے اہم مسئلے سے واقف ہو تو لے دے کر یہی ایک صورت رہجاتی ہے کہ دوسری زبانوں میں جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہوں انکا اردو میں ترجمہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں جو کچھ توقع ہوسکتی ہے مغربی زبانوں سے ہوسکتی ہے۔ مگر جب ہم یورپ اور امریکہ کے نفسیاتی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اس خاص مسئلے پر بہت کم تحقیق کی گئی ہے۔ حکمائے مغرب نفسیات کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) نفسیات بحیثیت سائنس کے اور (۲) بحیثیت فلسفے کے۔ پہلی قسم میں اس تعلق سے بحث کیجاتی ہے جو انسان کے نفس کو عالم مادی سے ہے اور دوسری میں خالص نفسی کیفیت اور انکے مرکز یعنی انسانی سیرت کا تمدنی زندگی کی روشنی میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ پہلی قسم کی نفسیات میں بہت کچھ تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔

دوسری قسم کی نفسیات ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے اس کے دو شعبے قرار دیے گئے ہیں نفسیات عمومی جس میں نوع انسانی کی عام حالت اور عام سیرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نفسیات خصوصی جس میں مختلف قوموں، مختلف طبقوں اور مختلف عمر کے لوگوں کی مخصوص نفسی کیفیت کی تفسیر منظر ہوتی ہے۔ ابھی تک فلسفیانہ نفسیات عمومی خود ناکمل ہے اس لئے نفسیات خصوصی پر قلم اٹھانے کی ہمت کرنا بہت مشکل ہے۔

پھر بھی تھوڑی بہت کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں جن میں سے چند میں نوجوانوں کی مخصوص کیفیت نفسی پر بحث کی گئی ہے۔ ان میں فلسفیانہ دقت نظر کے اعتبار سے پروفیسر اشپرانگر کی جدید تصنیف Psychologie des jugendalters. کو خاص امتیاز حاصل ہے وہی کتاب کا ترجمہ ہم ارباب نظر کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر جن کمالات کے جامع ہیں انکے لحاظ سے نفسیات شباب کی تحقیق کے لئے بہت کم لوگ ان سے زیادہ موزوں ہوں گے۔ موصوف برلن یونیورسٹی میں فلسفہ تمدن اور فلسفہ تعلیم کے پروفیسر ہیں اور انہیں موجودہ عہد کے جرمن فلسفیوں کی صف اول میں جگہ دی جاتی ہے فلسفہ کے مختلف شعبوں کے علاوہ تاریخ اور ادب میں انکا تبحر تمام جرمنی میں مسلم ہے۔ فلسفیانہ نفسیات میں موصوف نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ہے جس نے علمی تحقیقات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس وسعت نظر کے ساتھ ساتھ انکا عملی تجربہ اس قدر وسیع ہے کہ بہت کم علما کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت (۱۹۲۴ء) موصوف پندرہ برس سے یونیورسٹی میں معلم تھے اور انہیں ہزار ہا نوجوانوں سے سابقہ رہ چکا تھا۔ اس سابقے کی قدر و قیمت سمجھانے کے لئے موصوف کی سیرت کا تھوڑا سا ذکر ضروری ہے۔

جرمنی میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کا تعلق اپنے شاگردوں سے ایسا ہوتا ہے جیسا گرو کا چیلوں سے۔ ان کا کام صرف درس و تدریس ہی نہیں بلکہ زندگی کی ہر منزل میں طالب علموں کی رہنمائی کرنا سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر اشپرانگر کی شفقت کا یہ حال ہے کہ شاگرد کو اپنا عزیز سمجھتے ہیں اور سادگی انکے

مزاج میں اس قدر ہے کہ نوجوانوں میں ہمعصروں کی طرح گھُل مل جاتے ہیں۔ کوئی انہیں حلقۂ درس میں دیکھے تو یہ سمجھے کہ وہ ایک برس بڑا بھائی جو چھوٹے بھائیوں سے دو چار سبق آگے ہے انکے ساتھ بیٹھا پڑھ رہا ہے کہیں اگلے سبق میں انہیں کچھ بتاتا ہے اور کہیں پچھلے سبق میں اُن سے کچھ سمجھتا ہے۔ ظرافت جو اور جرمن پروفیسروں میں مفقود ہے۔ پروفیسر آشپرانگر کا خاص جوہر ہے۔ لکچروں میں انکے پاکیزہ مطایبات سے نوجوانوں کا غنچۂ دل کھل جاتا ہے اور انہیں فلسفہ کے ادق مسائل سے بجائے وحشت کے انس پیدا ہو جاتا ہے۔ موصوف کی محبت اور ہمدردی کا یہ عالم ہے کہ جب اپنے شاگردوں سے گھر پر ملتے ہیں تو انکی علمی مشکلات حل کرنیکے علاوہ انکی صحت، انکے عام مشاغل، اور انکی زندگی کے مقاصد کے متعلق نہایت دلسوزی سے سوالات کرتے ہیں اور انہیں مشورے کی ضرورت ہو تو مشورہ اور مدد کی ضرورت ہو تو مدد دیتے ہیں، اس سادگی، خوش مزاجی، اور حسن خلق کی بدولت نوجوانوں کے دل سے موصوف کے علم و فضل کا رعب بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے اور وہ کھلے دل سے اپنا سارا حال کہہ سناتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ موصوف کے زہد و اتقا اور انکی اخلاقی سخت گیری کی وجہ سے ان لوگوں کو اپنی بعض لغزشوں کے ذکر کی جرأت نہیں ہوتی لیکن کہیں اس کہنہ مشق ماہر نفسیات اس عارف زندگی کی نظر سے یہ باتیں ان خامکاروں کے چھپائے چھپ سکتی ہیں؟

اب ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ پروفیسر آشپرانگر کا ہزارہا نوجوانوں سے پندرہ برس کا سابقہ کیا معنی رکھتا ہے لیکن انکا تجربہ یہیں تک محدود نہیں جرمنی کی "تحریک شباب" ہے جس میں یونیورسٹی کے طالب علموں کے علاوہ اسکولوں کے لاکھوں لڑکے شامل ہیں موصوف کو بہت گہرا تعلق ہے وہ اکثر ان جماعتوں کے ارکان سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ انکے جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں اور انہیں مفید مشورے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی انکی خامیوں پر سختی سے نکتہ چینی بھی کرتے ہیں۔ یہ آزاد منش نوجوان اعتراض سننے کے عادی نہیں لیکن پروفیسر اشپرانگر سے وہ اس قدر محبت رکھتے ہیں اور انکی اتنی عزت کرتے ہیں کہ انکی شیریں کلامی کے ساتھ ان کی تلخ گوئی کو بھی محض صبر سے نہیں بلکہ شوق سے سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکولوں کے معلموں کے توسط سے بھی موصوف کو نوجوان طالب علموں کے متعلق بہت وسیع

معلومات حاصل کرنیکا موقع ملتا ہے۔ موصوف جرمنی کے مدرسوں کے پیر سمجھے جاتے ہیں۔ برلن میں انکا ایک
... بہت سے مدرس ان سے تعلیم کے نظری اور علمی مسائل حل کرتے ہیں۔ جرمنی کے اور
مدرس ان کی تحریر یا ملاقات کے ذریعے سے استفادہ کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ نوجوانوں کی سیرت اور زندگی
کے متعلق ان سے اپنے تجربے بیان کرتے ہیں جن میں سے موصوف اہم باتیں انتخاب کر کے قلمبند کر لیتے ہیں
اس وسیع اور گہرے تجربے کی بنا پر دفیسر اشپرانگر جیسے عالم تبحر نے "نفسیات عنفوان شباب" لکھی
ہے۔ جرمنی میں اس کتاب کی اتنی قدر ہوئی کہ پہلا اڈیشن چند مہینے میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب تک متعدد
اڈیشن چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں علمی کتابوں کو یہ بات یوروپ میں بھی بہت کم نصیب ہوتی ہے۔
جامعہ ملیہ کی اردو اکادمی کو یہ فخر حاصل ہے کہ یوروپ کی دوسری زبانوں میں اسکا ترجمہ ہونے
سے پہلے وہ اسکا اردو ترجمہ شائع کر رہی ہے۔ ہم جناب مصنف کے بیحد ممنون ہیں کہ انہوں نے نہ صرف
ترجمے کی اجازت دی، بلکہ ہماری درخواست پر اردو ترجمے کے لئے ایک خاص دیباچہ لکھ کر بھیجا۔ اس
میں انھوں نے مترجم کے متعلق جو ان کا ناچیز شاگرد ہے ایسے کلمے لکھے ہیں جن سے ناظرین کو ان کی
وسعت اخلاق اور بزرگانہ شفقت کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو جائیگا۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انہیں
غریب ہندوستان سے کس قدر عقیدت اور محبت ہے۔
اس کتاب میں جس نفسی زندگی کا خاکہ ہے وہ جرمنی کے نوجوانوں کی مخصوص زندگی ہے اس
سے ہماری یہ ضرورت کہ ہندوستان کے نوجوانوں کی ترکیب نفسی کو سمجھیں پوری نہیں ہوتی پھر بھی جو
تصویر ہمارے سامنے ہے وہ بجائے خود دلکش ہے اور اس میں جا بجا وہ خط و خال بھی نظر آجاتے ہیں جو تمام
دنیا کے نوجوانوں میں مشترک ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ جناب مصنف نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے ہمیں اپنے
آپ کو سمجھنے میں ان لوگوں کی زندگی کے مطالعے سے زیادہ مدد نہیں ملتی جو ہو بہو ہماری طرح کی ہے بلکہ ایسی
طبیعتوں کا مشاہدہ زیادہ مفید ہوتا ہے جو بعض باتوں میں ہم سے مشابہ ہیں اور بعض باتوں میں ہم سے مختلف۔
اس لحاظ سے یہ امید ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ہمارے لئے بیکار نہ ثابت ہوگا۔

عربوں کی رواداری
تاریخ اندلس کا ایک ورق

۱۹۲۳ء میں محمد کرد علی صاحب رئیس مجمع العلمی العربی دمشق نے اسپین کی سیاحت سے واپسی کے بعد "غابر الاندلس وحاضرہا" کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں اپنے مشاہدات وتاثرات کے ساتھ اندلس کی قدیم تاریخ سے بھی بحث کی ہے۔ میرے عزیز دوست مصطفےٰ کریم صاحب ندوی کو کتابوں سے خاص محبت ہے ایک دن میں انکے یہاں گیا تو یہ کتاب نظر آئی اور میں وہاں سے اٹھالایا کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھے خیال ہوا کہ اس قسم کی قدیم وجدید حالات پر حاوی محققانہ اور مختصر کتاب ہماری زبان میں ابتک کوئی نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ترجمہ کا خیال آیا لیکن تعلیمی مصروفیتوں نے کئی برس تک اسکا موقع نہ دیا ابکے رمضان میں کچھ سکون واطمینان حاصل ہوا تو برسوں کے خیال نے عملی صورت اختیار کی۔ کام شروع ہوا اور ختم ہوگیا مگر اشاعت کی نوبت ابتک آئی اس مہینہ کے جامعہ میں اسکا ایک باب پیش خدمت ہے۔ سہو ونسیان پر معذرت خواہ ہوں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول

عبدالسلام قدوائی ندوی

عرب اپنے مخالفین کے ساتھ جوان سے اعتقاد قومیت اور زبان میں مختلف تھے سب سے زیادہ روادار قوم ہیں۔ اگر انکے غلبہ وشوکت کے زمانہ میں انکی رواداری کا یہ عالم نہ ہوتا تو مغلوبہ ومفتوحہ قوموں سے کوئی شخص بھی اپنے دین اپنی شریعت اور اپنی زبان کی حفاظت کے ساتھ باقی نہ رہتا لطف و مدارا کا یہ برتاؤ اس لئے تھا کہ شریعت سمحا رفق ورحمت چاہتی ہے اور اسکا منشا یہ ہے کہ مخالفین کے دین ومذہب اور انکے مال ومتاع سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

...ی پر رواداری برتا و کیا اور صرف جزیہ (فوجی ٹیکس) لیکر انکی آزادی پر قائم ...
... بہت پسند آیا کیوں کہ عربوں نے انہیں سلامتی عطا کی فتنہ وفساد سے جان و مال اور
... ایمان کو محفوظ رکھا۔

تعصب کو عرب یوں ہی ناپسند کرتے تھے مگر اندلس میں اور بھی بے تعصبی کا اظہار کیا۔ انہوں نے انتہائی رواداری اور پورے اتفاق و مدارا کا اظہار کیا۔ کامل خلوص ومحبت اور یکجہتی و یگانگت سے کام لیا اور پرتگالی باشندوں کی طرف انکا میلان عام تھا یہانتک کہ اگر فوج کے کسی عیسائی اور مسلمان میں جھگڑا ہو جاتا تو حق اکثر عیسائی ہی کو دلاتے۔ محض عیسائیوں کی سہولت وآسانی کی غرض سے جمعہ کے بجائے اتوار کو یوم تعطیل قرار دیا۔ ہر شخص کو پوری پوری آزادی عطا کی کہ جس طرح چاہے عبادت کرے اس طرز برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب ومغلوب اور فاتح ومفتوح کے درمیان وطنیت کی ایسی یکسانی قائم ہوگئی کہ سوائے شاذ ونادر صورتوں کے امتیاز دشوار ہوتا تھا۔ امویوں نے اپنے دور حکومت کے بڑے حصہ میں سلی ہی کی فوج پر اعتماد کیا جو جنگی اسیروں اور زرخرید غلاموں سے عبارت تھی۔ ان سسلی والوں کا اثر بادشاہ وقوم دونوں پر اتنا تھا کہ جب ایک صقلوی نے ایک کتاب "الاستظہار والمغالبۃ علی من انکر فضائل الصقالبہ" لکھی تو کسی نے چوں تک نہ کی حالانکہ اس کتاب میں کھلے ہوئے تعصب کا اظہار کیا گیا تھا بعض اوقات تو انکی عربوں سے دشمنی اور عداوت کا یہ عالم ہو جاتا تھا کہ بغداد کے دشمنان عرب شعوبی قبائل کی یاد تازہ ہو جاتی تھی لیکن پھر بھی طرح دیجاتی تھی اور کسی قسم کی سختی سے کام نہیں لیا جاتا تھا

اس رواداری برتاؤ کا اثر یہ ہوا کہ عربوں کی محبت کے ساتھ انکا تمدن اور انکی تہذیب ومعاشرت مخالفین کے دلوں میں گھر کر گئی تھی۔ جہاں جہاں عرب گئے اور ٹھہرے عربی زبان پھیلتی گئی یہانتک کہ پچاس ہی برس کے اندر گرجوں تک میں نماز ودعا کے ترجمہ کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ عیسائی لاطینی زبان سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔ انہیں سمجھانے کے لئے اسکی ضرورت تھی کہ عربی میں ترجمہ کیا جائے جس کا عشق انکے دلوں میں سما گیا تھا وہ اسی کے قواعد میں مہارت پیدا کرتے اسی کے اشعار گاتے اسی میں لکھتے اور بالکل اہل زبان کی طرح فصاحت وبلاغت سے محظوظ ولطف اندوز

کرتے ۔

عربوں کے مفتوحہ علاقوں کا ذکر چھوڑ کر یہاں تو عربیت تھی ہی تعجب تو یہ ہے کہ جلالقہ، قشتالی،
لیونین، نافارین بھی جو عربوں کے دائرہ حکومت سے باہر تھے عربی زبان سے غافل نہ تھے یہ بھی اسے
حاصل کرتے اور اندلسی خلیفہ اور اس کے کسی وابستہ دولت تک پہنچ کر ملازمت کی استدعا کرتے شرفائ
اسپین احکام اسلامی کے نفاذ کے وقت شرفاء عرب میں مل جاتے جو لوگ شدت و عصبیت سے اپنے
دین پر قائم تھے وہ بھی اس روادانہ اسپرٹ سے اس درجہ متاثر ہو چکے تھے اور اسلامی تمدن میں اس
طرح جذب ہو چکے تھے کہ اپنے مذہب کے ابتدائی احکام و قوانین تک سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اب وہ
مسلمانوں کی طرح عورتوں کو پردہ میں بٹھاتے مسلمانوں کی طرح عادات و اطوار اختیار کرتے اور مسلمانوں
کی طرح لباس و پوشاک استعمال کرتے تھے۔ غرضکہ ہر چیز میں مسلمانوں ہی کی اقتدا اور انہیں کا اتباع پیش نظر
اور انہیں کا اسوہ عمل دلیل راہ تھا۔

رواداری کی انتہا یہ تھی کہ مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کے وزرا، یہودی و نصرانی بھی ہوتے تھے
حالانکہ وہ اپنے مذہب پر قائم ہوتے تھے جدید الاسلام لوگ بھی ان فرائض کی ادائگی کے لئے منتخب ہوتے
تھے (۱) ذمی کسی رعایت سے محروم نہیں کئے جاتے تھے انکے لئے وظائف مقرر کئے جاتے انہیں
روزینے عطا ہوتے ملی مصالح میں اعتماد کیا جاتا انکو سفارتوں میں روانہ کیا جاتا انہیں شریک راز رکھا جاتا
انتہا یہ کہ سلاطین و امراء اپنی اور اپنے محلات کی جانیں تک انکے سپرد کر دیتے یعنی علاج و معالجہ میں بھی عیسائی
اور یہودی طبیبوں اور معالجوں پر بھروسہ کیا جاتا غرضکہ نازک سے نازک موقعوں پر بھی انکے اعتماد
میں فرق نہ آتا۔

شادی بیاہ کا باہمی رواج تعلقات کی انتہا ہے لیکن عربوں نے اہل اسپین سے یہ رشتہ بھی قائم
کر رکھا تھا۔ صاحب جمال اسپینی اور پرتگالی عورتیں فاتحوں اور مفتوحوں کے درمیان تعلقات کا بہترین ذریعہ

(۱) السفیر الی الموتمر

بعض عربوں اور سپینیوں میں یہ رسم عام تھی بلکہ یہاں تو مستزاد یہ بھی ہوا کہ مسلمان عورتیں عیسی فرمانرواؤں کے حبالہ عقد میں آئیں۔ طوائف الملوکی کے دور میں سیحی فرمانروا برابر مسلمان امیرزادیوں سے شادیاں کرنے لگے تھے چنانچہ الفانسو سادس نے امیر اشبیلیہ کی صاحبزادی زائدہ سے نکاح کیا تھا اس قسم کی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں۔ اسپینی اور پرتگالی عورتیں اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور اسپینی اور پرتگالی مرد اندلس کے آخری ایام میں اس قسم کی شادیاں بکثرت ہونے لگی تھیں یہاں تک کہ اس معاملہ کا ذکر اس مشہور عہد نامہ میں بھی آیا ہے جو غالب و مغلوب اور فاتح و مفتوح کے درمیان سپرد غرناطہ کے وقت کیا گیا تھا۔

بعض عرب اسپینیوں کی وضع قطع کو پسند کرتے تھے انکی زبان سیکھتے انکا طرز معاشرت اختیار کرتے اور انکی اوضاع و اطوار کی نقل کرتے تھے مثلاً محمد بن سعد بن مردنیش صاحب بلاد الشرق (۵۶۱ھ) بہت سے وزرا ایسے تھے جو اپنے پڑوسیوں کی زبان سے واقف تھے اور بات چیت طرز ماند و بود اور دوسرے اوضاع و اطوار میں انکی مشابہت اختیار کرتے تھے مثلاً محمد بن الحاج (۵۱۶ھ)

یہ تو مسلمان عرب فاتحوں کا برتاؤ اپنے مفتوح مسیحیوں کے ساتھ تھا یہودیوں کے ساتھ اگر انکے برتاؤ پر غور کرو تو تمہیں اور بھی تعجب ہوگا یہ ذرہ نواز عربوں ہی کا روادارانہ اور ہمدردانہ برتاؤ تھا جس نے علم و فن صنعت و حرفت اور تجارت و کاریگری میں یہودیوں کو اندلس میں اس بلند ترین مرتبہ پر پہنچا دیا کہ پایہ تخت غرناطہ یہودیوں کی کثرت و عظمت کی بنا پر مدینۃ الیہود کہہ کر پکارا گیا۔

یہی طرز ہمدردانہ تھا جس سے تمام اہل ملک جو اسپینی پرتگالی اور عربی میں یکساں گفتگو کرتے تھے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اپنے معاملات صرف عربی میں چکانے لگے انکے معاملات و کاروبار سے متعلق اس قسم کی تقریباً دو ہزار دستاویزیں برآمد ہوئی ہیں جنہیں ملک کے اصلی باشندوں نے عربی زبان میں لکھا تھا۔ عربی اسلامی سلطنتوں کی زبان تھی جس کے آگے تمام ممالک میں دوسری سب زبانیں متروک ہوگئیں عربی کا استعمال شعار اسلام اور رطاقت عرب کے مرادف تھا۔ تمام قوموں نے ہر علاقہ میں اپنی زبان ترک کر دی جہاں عربوں کا نشان فتح بلند ہوا عربی زبان وہاں کی زبان ہوگئی، نوبت یہاں تک

پہنچی کہ ہر جگہ عربی رائج ہو گئی اور دوسری زبانیں اجنبی سمجھی جانے لگیں (۱)۔

یہی وجہ ہے کہ تین صدیاں گذر جانے کے بعد بھی شمالی علاقوں کے اسپینی عربی حکومت وسلطنت سے باہر تھے اور گو اپنے ملک کے اطوار وعادات فراموش کر چکے تھے مگر شمالی حکومتیں مجبور تھیں کہ اپنے دشمنوں (عربوں) سے علم وفن اور صنعت وحرفت کے درس لیں مسلمان نظم وتدبیر اور تہذیب وتمدن میں ان سے بہت ترقی یافتہ تھے اس وقت کی بڑی بڑی یورپین حکومتیں انکی خوشنودی اور رضاجوئی میں لگی رہتی تھیں ان سے علم حاصل کرتی تھیں اور انکے ساتھ بڑے اعزاز واکرام اور خاطر و مدارات سے پیش آتی تھیں۔

یہاں تک کہ عبدالرحمن ثالث بادشاہ ہوا یہ آج کل کے سلاطین کی طرح بہت بڑا مدبر اور سیاست داں تھا۔ اگر ایک طرف بربری سردار اطالین فرمانروا اور رومی شہنشاہ اس کے حلیف تھے تو دوسری طرف جرمنی فرانس اور یونان کے سفراء دار السلطنت قرطبہ میں آتے رہتے تھے۔ اس خلیفہ نے عربوں اسپینیوں اور بربروں کی جنگ کے لئے اندلس میں حد بندی کی۔ اپنے حدود مملکت کی لیون قشتالہ اور نافار سے حفاظت کی غرض سے قلعہ بندی کی۔ اپنے جہازوں کی مدد سے بحر متوسط کے مغربی حصہ پر قابض ہو گیا اور اپنے حدود فرمانروائی کو شمالی افریقہ تک وسیع کیا۔

یہ عبدالرحمن علم وفن اور تجارت وصنعت کا بہت بڑا حامی تھا گویا اپنے وقت میسین العلوم والفنون (۲) تھا دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے الفاظ ہیں کہ

"قد اصبحت اسبانیا العربیۃ علی عہدہ وعہد اخلافہ فی القرون الوسطیٰ اکثر البلاد مدنیۃ وحسن ادارۃ"	"عربی اسپین اسکے اور اسکے جانشینوں کے عہد میں قرون وسطیٰ میں مدنیت اور حسن نظم کے اعتبار سے سب سے زیادہ تھا۔"

(۱) ابن خلدون۔

(۲) میسین اغطس قیصر روم کا ندیم تھا اس نے اپنے آقا کے اثر سے علوم وفنون کی اشاعت میں کام لیا اس نے فرجیل ہوراس پرو پرس وغیرہ کو نعمتوں سے ڈھانک دیا سنہ ق م میں مر گیا اب یہ لفظ مطلقاً حامی علوم و فنون کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خلفاء اندلس کی رواداری عام کا یہ حال تھا کہ اگر ان پر شک کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا عہد میں دوسری قوموں میں اس کی نظیر ملنی محال ہے۔ انکی رواداری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے ملک میں نصرانی واعیان مذہب کو پورا حق دے رکھا تھا کہ آزادانہ اپنے معتقدات کی اشاعت کریں اور لوگوں میں مسیح کی آسمانی بادشاہت کی منادی کرتے پھریں۔ ان میں بعض تو ایسے دریدہ دہن ہوئے اور ان کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ جامع مسجد کے دروازوں پر کھڑے ہوکر اپنی دعوت دینی سے مسلمانوں کو انکے دین سے ہٹانے کی سعی کرنے لگے۔

چونکہ عیسائی واعظین علانیہ اسلام پر سب وشتم کرنے لگے تھے۔ اس تعصب کو دور کرنے کے لئے عبدالرحمن ثانی نے ایک کانفرنس اشبیلیہ کے اسقف اعظم کے زیر صدارت منعقد کرنی چاہی تاکہ عیسائیوں کی اس عادت بد کا سد باب کیا جائے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس موتمر کا انعقاد ہو خلیفہ کی وفات ہی ہوگئی (۲۳۸ھ)

خلفاء اندلس نے خطباء ۔ واعظین ۔ مورخین اور کتاب کو تقریر وتحریر کی پوری آزادی عطا کر رکھی تھی۔ حتی کہ خود ان خلفاء کے معاملات پر وہ اعتراض ونکتہ چینی کرتے رہتے تھے مگر انکی طرف سے سوائے لطف وکرم اور انعام وبخشش کے کوئی سلوک بد نہ ہوتا۔ عبدالرحمن الناصر اور قاضی منذر ابن سعید کا واقعہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ ناصر کو عمارتوں کا بڑا شوق تھا اس نے جب قصر زہرا کی داغ بیل ڈالی اور اس کی تیاری ودرستی، آرائش وزیبائش اور نقش ونگار میں پوری قوت صرف کردی تو ایک دن اسی انہماک میں جامع مسجد کا جمعہ ناغہ ہوگیا اور وہاں نہ پہنچ سکا۔ بس پھر کیا تھا قاضی منذر بن سعید (خطیب جامع) نے برسر منبر خلیفہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ قاضی صاحب نے زجر وتوبیخ کی انتہا کردی اور اس بارہ میں کسی مصلحت کا خیال نہ کیا۔[۱] خلیفہ کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس نے قسم کھائی کہ کبھی قاضی منذر کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا۔

---

(۱) اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے حسب ذیل ہیں:۔
قاضی صاحب نے خطبہ کی ابتدا ان آیتوں سے کی۔ اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ

بیٹے کو معلوم ہوا تو عرض کی کہ کیوں نہ آپ منذر ابن سعید کو معزول کر دیں اور انکے بجائے کسی اور کو مقرر فرما دیں ان الفاظ کا سننا تھا کہ ناصر غضبناک ہو گیا اور بیٹے کو ڈانٹ کر کہا کہ منذر کا سا صاحب علم و فضل اور ورع و تقوی شخص اپنی خواہش نفسانی کی بنا پر معزول کر دیا جائے کلا ثم کلا"

یہ تو خطابت کی آزادی کی مثال تھی اب کتابت کا نمونہ بھی لاحظہ کیجئے. ایک اندلسی مورخ نے اپنے معاصر بادشاہ پر حرف گیری کی. بادشاہ کے بیٹے کو بڑا غصہ آیا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اس مورخ کو قتل کرے مگر جب اس کے باپ کو اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو بیٹے کو جھڑک کر کہا کہ اپنے اس ارادہ سے باز آ ورنہ اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو میں اس کے خون کا بدلہ تجھ سے لوں گا کیا تو اسے اس لئے قتل کرے گا کہ لوگ بعد کو ہمیں اپنے مورخ کے قتل کا عیب لگائیں. تھوڑے دن کے بعد ایک دن وہ مورخ حمام میں غسل کے لئے گیا جب غسل کے بعد کپڑے پہننے کے لئے نکلا تو اس نے دیکھا کہ وہاں ایک تھیلی رکھی ہے جس میں ایک ہزار دینار اور ایک شاہی رقعہ ملفوف ہے جس میں بادشاہ نے لکھا ہے کہ

"ان الذی اوصل الیک ہذہ الدراہم وانت لاتشعر قادر ان یرسل الیک من یقتلک فلف غرب لسانک عنا واذا اعدت فارخت ثانیا لاتشنع علینا اعمالنا"	جس نے تیرے بغیر علم یہ دراہم تجھ تک پہنچائے ہیں وہ کسی کو بھیج کر تجھے قتل بھی کرا سکتا ہے تو اپنی تیز زبانی ہمارے متعلق روک اور جب دوبارہ تاریخ لکھ تو ہماری عیب جوئی نہ کر"

مورخ دوزی کہتا ہے کہ "اگر تم عربوں کی حریت و آزادی کا مقابلہ فرنگی آزادی سے کرو گے تو تمہیں یہ فرنگی حریت استبداد معلوم ہو گی۔

(بقیہ صفحہ) واذا بطشتم بطشتم جبارین۔ فاتقوا اللہ واطیعون۔ واتقوا الذی امدکم بانعام وبنین وجنات وعیون۔ انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم۔ اس کے بعد زجر و توبیخ کرتے ہوئے یہ آیتیں پڑھیں۔ افمن اسس بنیانہ علی تقوی من اللہ و رضوان خیر، ام من اسس بنیانہ علی شفا جرف ہار۔ فانہار بہ فی نار جہنم واللہ لا یہدی القوم الظالمین، لایزال بنیانہم الذی بنوا ریبۃ فی قلوبہم، الا ان تقطع قلوبہم واللہ علیم حکیم)

یہ قابل ستایش رواداری اس وقت تک برابر قایم رہی جبتک کہ ملک پر موحدین و مرابطین کا تسلط تام نہ ہوگیا۔ یہ لوگ افریقی تھے اور عصبیت سے بالکل خالی نہ تھے ان میں عرب اموین کی سی بے تعصبی نہ تھی اس کی وجہ سے وہ اگلی رونق اور تر و تازگی باقی نہ رہی لیکن آل نصر کی حکومت نے پھر اس کمی کو پورا کر دیا اگر انکا کوئی ملک ہاتھ سے نکل جاتا تو بھی ترقی میں کوئی کمی نہ ہوتی بلکہ اور اضافہ ہوتا جس حصہ سے انکی حکومت ختم ہوگئی تھی وہاں کی رونق سمٹ کر یہاں آجاتی انکا برتاؤ اپنے پڑوسیوں اور ذمیوں کے ساتھ بہت زیادہ روادارانہ اور ہمدردانہ تھا صنعت و حرفت کی ترقی۔ زراعت و فلاحت پر توجہ، تہذیب و تمدن کی اشاعت، عدل و انصاف کے فروغ اور جود و عطا کی بارش انکی سلطنت کا نشان شرف اور طغرائے امتیاز تھا۔

عمرانیات اور مسئلہ تعلیم ہند

(۲)

تمدنی حکومت کا فرض | حکومت کا یہ فرض ہو کہ وہ ہر معقول آدمی کے لئے ایک موزوں جگہہ فراہم کرے۔ صرف تعلیم سے کچھ نہیں ہوتا۔ تعلیم کے عمدہ اثرات نمایاں طور پر تبھی ظاہر ہونگے جب سلطنت کے کل شعبوں میں اعلیٰ تنظیم ہو اور طریق عمل میں خوش اسلوبی برتی جائے۔ لوگوں کو پڑھانا اور انہیں کسب معاش کے مواقع نہ دینا اپنے اور انکے وقت کو رائگاں کرنا ہے۔ جس تعلیم سے لوگوں کو علاوہ اور چیزوں کے معاشی نقطۂ نظر سے بھی فائدہ نہ ہو رہا ہو وہ بیکار ہے۔ یہ بدرجہا بہتر ہے کہ سرکار اسی رقم سے مکانات تعمیر کروائے۔ نہریں کھدوائے۔ نمونے کے کھیت قائم کرے۔ باغات و جنگلات کا انتظام کرے، شہروں کے لئے تفریح گاہیں، ضروری مدارس کے لئے بازی گاہیں بنائے، خاص و عام کے لئے تیراکی حوض (Swimming baths) تعمیر کروائے اور اس طرح لوگوں کو اپنی صحت بہتر بنانے کا موقع دے کیونکہ حقیقی مرفہ الحالی کا سرچشمہ صحت ہی نہ کہ تعلیم۔

ہندوستانی طریق تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہی ہو کہ جس قدر محنت ہندوستان تعلیم کے لئے کرتا ہی اور جس قدر اسکا روپیہ اس سلسلے میں صرف ہوتا ہے اُسکا مساوی القدر بدل اسے نہیں ملتا لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ فی الحال ہر اس شخص کی امداد کریں جو اپنی مدد آپ کرنا چاہتا ہو اور جسے اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے کے لئے صرف سہارے کی ضرورت ہو۔ ہم ابھی اپنی قوت محدود ہونے کے باعث انہیں کی مدد کرسکتے ہیں جو تھوڑی بہت امداد ہی سے ترقی کرسکتے ہوں۔ بہرطور نکموں کو کام کے آدمی، کاہلوں کو مستعد بنانے، (اور اگر استعارے کا استعمال یہاں جائز قرار دیا جائے) مُردوں کو جلانے کی کوشش سے پہلے، ہمیں شائقین علم کو تعلیم اور ذاتی کوشش کرنے والوں کو فنون سکھانے چاہئیں یعنی ڈوبتوں کو بچانا چاہیئے۔

...د آباد کی ریاست تقریباً پینسٹھ لاکھ سالانہ تعلیمات پر صرف کر تی ہے اگر رعایا کو اس کا معاوضہ مادی و دولت یا حقیقی مسرت میں ملتا ہے تو بیشک موجودہ طریقِ تعلیم قابلِ ستائش ہو۔ برعکس اس کے اگر اس طریق تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں جو معاشی جد و جہد کے لئے ویسے ہی نا اہل ہیں جیسے پہلے تھے تو یہ طریق تعلیم بہ حیثیت مجموعی زیادہ مفید نہیں۔ موجودہ طریق تعلیم سے لوگوں کی کارکردگی میں اضافہ نہیں ہوتا صرف ان کے غرور میں بے جا طور پر اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے ایک طرح کا گھمنڈ کرنے لگتے ہیں اور حاصل کردہ علم کو حقیقی تعلیم کی ابتدا نہیں بلکہ اس کی انتہا سمجھتے ہیں۔

غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اسکا بیان ضروری ہو کہ فی نفسہٖ یعنی اپنی اپنی جگہ ادب، منطق، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، غرض یہ کہ ہر علم و ہر فن و ہر زبان ضروری اور مفید ہے۔ بحث صرف انکے جاننے والوں کی نسبتِ تعداد کے متعلق ہے جو موجودہ عہد کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے نہ تو متناسب ہو اور نہ اس کے ہونیکی مستقبل قریب میں کوئی امید، کوئی امکان یا کوئی توقع ہو۔

امکانات اور توقعات

اگر ہندوستان کو موقع ملے اور اسے سیاسی، معاشی، عمرانی شعبہائے زندگی کو سنبھالنے والے اعلیٰ درجے کے منتظمین مل جائیں تو ہندوستان بھی مثل جاپان کے چند سال یعنی دس پندرہ سال ہی میں حیرت انگیز ترقی کر سکتا ہے، کیونکہ ترقی کے لئے قوم کو جتنی قوتوں (یعنی زیادہ تر دماغی و معاشی) کی ضرورت ہو وہ سب بدرجۂ اتم ہندوستانیوں میں موجود ہیں۔ ہمیں صرف اعلیٰ تنظیمی قابلیت رکھنے والے، سیاسی، معاشی و عمرانی رہبروں کی ضرورت ہو۔[1]

---

(1) تنظیم کی اہمیت اور اہمیت پر میں نے ایک مضمون لکھا ہے جو رسالہ جامعہ کے جنوری سنہ ۳۱ء کے نمبر میں مسئلہ تنظیم کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

معاشی ترقی کے لئے جو عاملین درکار ہیں یعنی قدرتی دولت، محنت، سرمایہ وہ سب ہندوستان میں موجود ہیں۔ ہمیں ایسے منتظمین، آجروں اور ذہین معاملہ فہم، ضرورت شناس، موقع آشنا رہبروں کی ضرورت ہے جو قوم کو تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کے مرحلے طے کرائیں اور منزل مقصود تک پہنچا دیں اور ہمیشہ اسی دھن میں لگے رہیں کہ قوم کی مرفہ الحالی میں اور اضافہ ہو۔ جن کی زبان پر ہمیشہ ہل من مزید کا نعرہ ہو۔

یہ کام اسی وقت انجام پاسکتا ہے جبکہ حکومت، معاشرت اور افراد مل جل کر کام کریں اور اپنے قائم کردہ مطمح نظر کو حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرم رہیں۔ مستقبل کے معاشی امکانات کی بابت سر ایم وسوس دارایا، جن کی معاشی معلومات اس قدر وسیع ہیں کہ خود گردہ معاشیین میں انکے معاشی بیانات و تحریرات وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں جن کی وسعت معلومات، ذہانت و علمیت کا اعتراف گورنمنٹ ہند نے انہیں "معاشی تحقیقاتی کمیشن" کا صدر مقرر کرکے کیا ہے، لکھتے ہیں:

"موافق حالات میں، ہمت و مستعدی سے جدید اصول زراعت و تجارت منطبق کرکے اور سائنس و جدید آلات سے مدد لیکر ہندوستان کی زرعی پیداوار و مصنوعات کی پیدائش آئندہ دس سال میں بآسانی دوگنی اور پندرہ سال میں سہ گنی کی جاسکتی ہے"[1] پروفیسر برجی اپنے گراں قدر مضمون میں جو جرمانیہ کے ایک ممتاز زراعتی رسالے میں شائع ہوا ہے، لکھتے ہیں: موافق حالات میں ہندوستان چھ تا آٹھ گنی زیادہ زراعتی پیداوار حاصل کرسکتا ہے"[2] پروفیسر موصوف نے قیاساً نہیں کہا بلکہ علمی تحقیقات اور عملی مشاہدوں کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ مجموعی زرعی پیداوار ہند کا اندازہ قیمت بیس

---

(۱) Reconstructing India ناشر King & Co. لندن ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۰

(۲) "Bericht über Landwirtschaft" جلد چہارم حصہ سوم صفحہ ۱۸۸ برلن ۱۹۲۶ء ناشر Carey

بیس ارب کیا جاتا ہے۔[1]

اگر ہندوستان اپنی زراعتی دولت کی مقدار کو صرف دوگنی ہی کرلے تو اُسے بجائے بیس کے کم از کم تیس ارب وصول ہونگے جو ہماری قومی مرفہ الحالی کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے لئے کافی ہے یہ مطلق مبالغہ نہیں جس کی طرف ارنلڈ لپٹن (Arnold Lupton) اشارہ کرتے ہیں کہ ہندوستان موجودہ آبادی کی دُوگنی تعداد کو بھی صحت و مرفہ الحالی کی حالت میں بآسانی پال سکتا ہے بشرطیکہ اس کی رہبری عاقلانہ ہو۔[2]

ظاہر ہے کہ رہبروں کے لئے، ماہر مزدوروں کے لئے، کسانوں کے لئے، صناعوں کے لئے مختلف پیشہ وروں کے لئے ہمیں تعلیم کی ضرورت ہے۔ مگر کیسی تعلیم کی؟ موجودہ زمانے کی برائے نام تعلیم نہیں بلکہ تجارتی، زراعتی، فنی، صنعتی، کاروباری، مفید، کارآمد، نفع بخش، تربیت آموز تعلیم۔

یوں آنکل بچے بچے ہر ایک کو حرف شناسی اور خطوط نویسی سکھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ لوگوں کو پڑھا لکھا کر بھوکا مارنا انکو ان پڑھ رکھنے سے بدتر ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں بچوں اور لڑکوں کو ہنسی خوشی کھیلنے دینا بدرجہا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو زبردستی ناقص و ناکارہ مدرسوں میں شریک کروایا جائے اور ان کو ایسی معلومات بہم پہنچائی جائے۔ جو اُنکے کسی مصرف کی نہ ہو سرکار لوگوں کو تعلیم دے اور سرکاری عہدیدار ہی نوکریوں کے متلاشیوں سے بیزار ہوں اور انہیں نوکریاں حاصل کرنے کے لئے بالواسطہ خوشامد، مدح سرائی، چاپلوسی، خدمتگذاری، فرمانبرداری، غلامی و محکومی کے طریقے سکھائیں۔ تجارت و زراعت، صنعت و حرفت کے لئے انکی تعلیم ناموزوں ہو، سرکار کا روپیہ مدرسین کی محنت، قوم کی دولت طلبہ کا وقت اکارت جائے اور کسی کو فائدہ نہ ہو، مچھلی کی جان جائے اور

---

(1) تفصیل کے لئے دیکھئے: Wealth and Taxable capacity of India مصنفہ K. T. SHAH مطبوعہ تاراپوروالا بمبئی ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۹۹

(2) از Happy India مطبوعہ George Allen and Union ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۲۱

کھانے والے کو مزہ نہ آئے۔

باوجود ان حقائق کو تسلیم کرنے کے کس قدر تعجب کی بات ہے کہ خود وہی لوگ جو موجودہ طرز تعلیم نصاب سے مطمئن نہیں جبری تعلیم کے نفاذ کے خواہاں ہیں۔ وہ غالباً اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں یا اپنے جوش عمل میں بھول جاتے ہیں کہ وہی لوگ جو موجودہ نظام تعلیم کو مفید اور کارگر نہیں بنا سکتے کیونکہ اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر تعلیم کا انتظام کر سکیں گے۔ وہ اس حقیقت کو بھلائے ہوئے ہیں کہ نظری تعلیم دینا سب سود ہے جب تک کہ نظری تعلیم پانے والوں کے لئے مستقبل میں جب وہ اپنی تعلیم ختم کر چکیں کوئی وسیلہ آمدنی مہیا نہ ہو اور نہ حکومت انکے لئے نوکریوں کا انتظام کر سکے۔ اسی طرح فنی تعلیم تجارتی تعلیم اور زراعتی تعلیم اسی حد تک دینی چاہئے جس کی کہ قوم کو ضرورت ہو۔ تعلیم کو محض اس وجہ سے جبری کرنا کہ یورپ و دیگر ترقی یافتہ ممالک میں اسکا رواج ہے عقلمندی کی دلیل نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی کورانہ تقلید پسندی کا ایک مزید ثبوت ہے۔

کسی شے یا فعل کے عمدہ یا خراب ہونیکا معیار مقرر کرنا ایک نہایت دشوار فلسفیانہ کارنامہ ہے۔ علما، ماہرین سیاسیات و عمرانیات کی متفقہ تحقیقات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی کردار یا سیاسی واقعات کو اچھے یا برے گرداننے کا ایک ہی مفید اور کارگر طریقہ ہو سکتا ہے۔ پس یہ دیکھنا چاہئے کہ کسی فعل یا عمل سے، کسی قانون یا طریقے سے کن لوگوں کو فائدہ اور کن لوگوں کو نقصان ہوتا ہے۔ اگر ایک طریق پر پانسو کا نقصان اور صرف پانچ یا پچاس کا فائدہ ہے تو وہ طریق برا ہے۔ یہ کلیہ تمیز خیر و شر اصول اکثریت پر مبنی ہے۔ Principle of Numerical Majority

اگر ہم اس نظریہ کو تسلیم کر لیں، اور سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہیں کیونکہ اس سے بہتر اصول ہمارے علم میں نہیں اور اسکو ہندوستانی حالات پر منطبق کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کے لئے وہی عمل یا طریق یا قانون اچھا کہلائے جانے کا مستحق ہے جو ہندوستان کی اکثریت کے لئے مفید ہو۔ ہندوستان کی اکثریت، کوئی انکار نہیں کر سکتا، یہاں کی زرعی آبادی ہے جو جدید ترین اعداد و شمار کے اعتبار سے تقریباً اسی فیصدی ہے اور ہم زرعی آبادی میں اگر کسانوں کے علاوہ

اُن تمام لوگوں کو شامل کریں جو گاؤں، کھیڑوں میں رہتے ہیں تو یہاں کی زرعی آبادی کل آبادی کی ۹۰ فیصدی ہی پس ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ اگر ہندوستان کے شہروں میں تعلیم کو جبری کرنیکی تحریک کامیاب بھی ہوئی تو وہ قابل ستائش نہیں۔ کیا یہ بدرجہا بہتر نہ ہوگا کہ ہندوستان کی قومی دولت و آمدنی بجائے شہری جبریہ تعلیم کے دیہات میں زراعتی درسگاہیں، نمونے کے کھیت Model Farms قائم کرنے پر۔ اور لوگوں کو صنعتی و پیشہ وری تعلیم دینے پر صرف کیجائے خصوصاً جبکہ دیہاتی تعلیم شہری تعلیم کے برابر بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ ناانصافی ہے کہ دیہاتی آمدنی سے دیہات کو زراعتی تعلیم نہ ملے اور بڑے بڑے شہروں میں جبریہ تعلیم رائج کیجائے۔ مالیات ہند کے اصول و قوانین کے یہ سراسر خلاف ہوگا کیونکہ مالیات بھی اخلاقی پہلو کو ملحوظ رکھتی ہے اور انصاف کو نظر انداز نہیں کرتی

عام تعلیم اور جبری تعلیم پر روپیہ ضائع کرنا اور یہ توقع رکھنا کہ "توہمات، مہمل رسوم، کمسنی کی شادی عورتوں کے حقوق کی پامالی، فضول خرچی، افلاس، قرض داری، اصول حفظان صحت کی عدم پابندی آئے دن کے فرقہ واری مناقشات"، صرف تعلیم دینے سے دور ہوجائینگے غلط ہے۔ یہ احساس عام طور پر علماء و ماہرین تعلیمات کے طبقے میں پایا جاتا ہے جو انکی خوش اعتقادی و زود اعتقادی کا بدیہی ثبوت ہی۔ کیا ہندوستان کے تعلیم یافتہ حضرات وہم پرست نہیں ہوتے؟ اور کیا وہ خود انگلستان یا دیگر ممالک یورپ کی تعلیم حاصل کرنیکے چند دن بعد ہی مہمل رسوم کی پابندی نہیں کرتے؟ جن کو اس قول میں ذرا بھی شک ہو وہ جائیں اور شمال سے لے کر جنوب تک اور پورب سے لے کر پچھم تک ہندوستان کے کسی گوشے میں دیکھیں وہ ہمیشہ ایسے لوگوں کی کثرت پائیں گے جو یورپ کی تعلیم کے بعد بھی اپنے مہمل رسوم مثلاً شادی میں ناچ رنگ، قیود پردہ، دسویں یا چہلم میں پلاؤ زردہ پکانے کے سختی سے پابند ہیں۔ خود ہمارے شہر میں کتنے یورپ کے تعلیم یافتہ اور مغربی تہذیب و شائستگی کے دلدادہ ایسے ملیں گے جو باوجود علم و دانست کے بچپن کی شادی کو گوارا کرتے ہیں، مروجہ پردے کی پابندی انکے گھرانے کا عام رواج ہے، عورتوں کے بالخصوص بیوی کے حقوق کی پامالی اور حاکمانہ برتاؤ انکا عام شعار ہے اور اصول حفظان صحت کی عدم پابندی اور لاپروائی انکے طریق زندگی کا

جزو لاینفک ہو۔ اُن میں علم ہے مگر عمل نہیں، دل ہو مگر احساس نہیں، دماغ ہو مگر دانائی نہیں۔

رہا افلاس، فضول خرچی، قرضداری اور آئے دن کے فرقہ واری مناقشات تو سرکاری و نیم سرکاری اعداد و شمار، بیانات و تحریرات سے بخوبی واضح ہو کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی مطلقاً، کلیتہً یا نسبتہً کسی طرح کمی نہیں ہوئی: کمی تو ایک طرف سمجھے تو اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ موجودہ تعلیم نے دو ایک صلح کل کے ساتھ ہی سیکڑوں جنگجو پیدا کئے، جنہوں نے مذہبی جوش کو خوب ابھارا اور آپس کے فرقہ داری مناقشات کو قومی تنازعات میں مبدل کر کے پھوٹ اور نااتفاقی پھیلائی۔ قوم میں اسقدر، تعلیم یافتہ، حضرات نہ ہوتے تو اس قدر فرقہ واری مناقشات بھی نہ ہوتے۔

جس طرح لکھنا پڑھنا جاننے سے انسان میں دانائی نہیں آتی اسی طرح لکھنا پڑھنا نہ جاننا جہالت نہیں۔ جہالت سے مراد یہ ہو کہ انسان زندگی کے صحیح اصول اور فہم عامہ سے بے بہرہ ہو۔ یہ صحیح اصول اصول زندگی کیا ہیں اور فہم عامہ سے کیا مراد ہے۔ ایک جداگانہ بحث ہو (جس کے لئے ایک علحدہ مضمون کی ضرورت ہو) اگر قوم سے جہالت دور کرنی منظور ہو تو اُس کے لئے صرف تعلیم کافی نہیں۔ ایک بدگمان جنگجو، خود شادی، بدظن، ظالم، راشی، پڑھا لکھا آدمی جاہل ہو اور ایک خوش مزاج ملنسار، خود دار، معاملہ فہم، محنتی، ایماندار مگر ناخواندہ شخص عقلمند ہوتا ہے یہی وجہ ہو کہ دنیا میں اَن پڑھ عقلمند، اور تعلیم یافتہ جاہل بھی پائے جاتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو جہالت حقیقی طور پر قومی تربیت و معاشرتی اصلاح سے دور ہو سکتی ہو۔ قومی تربیت و معاشرتی اصلاح اُسی وقت ممکن ہو جبکہ لوگ عملاً نمونہ بنکر اخلاق حسنہ، پابندی اصول حفظان صحت، عموماً بالخصوص ماں اور بیوی کی عزت اور مساویانہ برتاؤ، ہمت، مستعدی، جفاکشی، خدمت قوم و ملت، فرض شناسی اور دیانت داری کی مثالیں قائم کریں۔ ہر قوم بلکہ ہر فرد میں تقلید پسندی کی جبلت (Instinct of imitation) ہوتی ہے جب قوم کے افراد دوسروں کو بہتر اور اعلیٰ تر پائیں گے تو خود بخود تقلید کرنے لگیں گے۔ سگریٹ سوز، آرام طلب، نفس امارہ کے پجاری، عیش پرست، بادہ خوار ڈاکٹر کمسنی کی شادی کے مضر جسمانی اثرات کا قوم کو یقین نہیں دلا سکتے

کیونکہ جین کی شادی سے زیادہ سگریٹ پینے، روزانہ سنیما دیکھنے، عیاشی کرنے اور شراب پینے کی انسان کے جسم کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمیں کریل جیسے محقق کا کہا یاد ہے کہ "شراب نوشی اور سگریٹ پینے سے کوئی اثر ہوا ہے تو وہ ہمیشہ خراب ہی ہوا ہے۔ یہ سراسر غلط بیانی ہے کہ اعتدال سے شراب پینے والے کی کارکردگی بڑھتی ہے۔ شراب درد کو نہیں بلکہ احساسِ درد کو چند گھنٹوں کے لئے دور کر سکتی ہے جس کے لئے انسان کو جسم اور مال دونوں کی قربانی کرنی پڑتی ہے"[1] اسی طرح ڈین انج نے موجودہ زمانے کے خوش باشوں (Engenist) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "اناطولیہ کے ترکوں افغانوں اور ترکستان کے باشندوں کی صحت اور جسمانی طاقت برطانوی آبادی سے بدرجہا بہتر ہے۔"

یہاں تک تو عام تعلیم و جبری تعلیم کے فوائد و نقائص سے بحث تھی۔ عام تعلیم سے زیادہ مضرت رساں موجودہ زمانے کی وسطانی اور فوقانی تعلیم کا عام رجحان ہے[2] سال بہ سال اُن لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو تحتانیہ مدارس میں داخل ہوتے ہیں "آج کل ترقی کا واحد راستہ فوقانی تعلیم ہے"، "بغیر میٹرک پاس کئے لڑکا کر ہی کیا سکتا ہے"؟۔ "میری اولاد کو مجھ سے بہتر حالت میں ہونا چاہئے، لہٰذا اسے سب سے پہلے فوقانیہ مدرسے کی تعلیم ختم کر لینی چاہئے۔"

یہ خواہشات ہر اس شخص کے دل میں موجزن ہوتی ہیں جسے معاشی اور معاشرتی ترقی مطلوب ہو کیونکہ فوقانی تعلیم اعلیٰ معیارِ زندگی تک پہنچنے کا زینہ تصور کی جاتی ہے۔ کوئی کلارک بننا چاہتا ہے یا کسی کاروباری کمپنی میں، سرکاری دفاتر میں نوکری چاہتا ہے یا کسی بنک میں، اس سے ہمیشہ دریافت

---

(۱) پروفیسر ڈاکٹر کریل (Krehl) اندرونی معالجات کے بہترین جرمانی طبیب تصور کئے جاتے ہیں صاحب موصوف نے مارچ ۱۹۲۶ء میں ہائڈلبرگ یونیورسٹی میں "عام اصول حفظانِ صحت" پر ایک لکچر دیا تھا۔ سطور بالا اُسی لکچر سے ماخوذ ہیں۔

(۲) ذیل کے دو Paragraphs جرمن رسالہ Uhu کے مضمون Der Berechtigungsfimmel نوشتہ With ماخوذ ہیں۔

کیا جاتا ہے کہ تم کیا پاس ہو۔ اور جس شخص نے کم از کم میٹرک کا امتحان بھی نہ پاس کیا ہو وہ کس شمار میں ہو سکتا ہے۔ گویا سرکاری و نیم سرکاری، تجارتی یا کاروباری غرض کسی شعبۂ زندگی میں داخل ہونے کے لیے اسناد طلب کیے جاتے ہیں جن کے بغیر داخلہ نہایت مشکل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ گھبراہٹ اور خوف سے تعلیم حاصل کرنے لگے ہیں۔ اُنکے دل میں یہ خوف سمایا ہوا ہے کہ وہ میدان ترقی میں پیچھے نہ رہ جائیں اور محض اسناد کی کمی کی وجہ سے زندگی کا انہیں تلخ تجربہ نہ ہو۔ خصوصاً مدت العمر مطمئن رکھنے والی سرکاری ملازمت کا خبط ہمارے متوسط الحال خاندانوں میں پایا جاتا ہے، حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ مدارس میں داخل ہونیوالے دس طلبہ میں سے بمشکل چار میٹرک تک پہنچتے ہیں اور اُن میں سے بمشکل نصف کو سرکاری نوکریاں ملتی یا مل سکتی ہیں۔ ہر سال جب مدارس کا نیا سال شروع ہوتا ہے تو ہزار ہا والدین اپنی اولاد کو وسطانیہ اور فوقانیہ مدارس میں داخل کرتے ہیں وہ اپنی اولاد کی طبیعت کا لحاظ نہیں کرتے کہ وہ کس مصرف کی ہے۔ اور اُس سے کس طرح بہترین طریق پر کام لینا چاہیے۔ "بہرصورت پڑھنے کی کوشش تو کرلینی چاہیے نقصان تو اُسے کسی صورت میں نہیں ہو سکتا" یہ انکی زندگی کا اٹل اصول ہے۔ وسطانیہ مدارس کے ابتدائی درجوں میں تو خیر "ترقی" مشکل نہیں۔ مگر جب نئی زبان اور اختیاری مضامین لینے پڑتے ہیں، حساب، ریاضی اور تاریخ و جغرافیہ کا نصاب نہ صرف بڑھتا ہے بلکہ مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی اکثر مصنوعی طریق پر امداد حاصل کر کے یعنی "خانگی اتالیق" "رٹنت ودیا" اور دن رات کی دردسری سے کچھ دنوں تو بھلے برے طریق پر تعلیم جاری رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی یکے بعد دیگرے راہ ترقی پر تھک کر مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہندوستان میں کسی اور قسم کے مدارس نہیں کہ وہ فنی تعلیم، زراعتی تعلیم یا تجارتی تعلیم میں قسمت آزمائی کریں۔ لوگوں کو اتنی توفیق نہیں، ملک میں اس قدر روشن خیالی نہیں، قوم ابھی اس قدر ترتیب یافتہ نہیں کہ خود ہی پیشہ وری تعلیم کا انتظام کرے۔ کوئی شخص اگر اپنی اولاد کو بڑھئی، لوہار معمار، سنگتراش یا آئینہ گر بنانا چاہے تو اُس کے لئے بھی مواقع نہیں کیونکہ ہندوستان میں پیشہ وری مدارس بھی عنقا ہیں۔ ہمارے ذات پات کے رسوم نے مصیبتوں میں مزید اضافہ کیا اور معاشیا

نے زرعی قانون تقسیم عمل کو اس طرح اُلٹا کہ وہ اب بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہو رہا ہے۔[1]

اور جو لوگ میٹرک تک پہنچکر اُسے پاس ہی کر لیتے ہیں اُنکی دماغی حالت کیا ہوتی ہے؟

دماغ مختلف معلومات کا کھنڈر ہوتا ہے جس میں نہ کوئی ربط ہے نہ تسلسل نہ کوئی باقاعدگی ہے اور نہ نظام۔ بارہ بارہ چودہ چودہ برس کے لڑکوں کی تاریخ و جغرافی معلومات یہ ہیں کہ وہ نظامِ شمسی اور سورج کے گرد طواف لگانے والے سیاروں سے واقف ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ پھل پھول کہاں ہوتے ہیں، ترکاریاں کہاں سے آتی ہیں، شہر کے قرب و جوار میں وادیاں، بڑے بڑے تالاب اور عمارتیں ہیں بھی یا نہیں۔ بلدہ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، تعلیم یافتہ ہیں مگر بیدر، ایلورا اور اجنٹا نہیں جانتے، اورنگ زیب کے حالات تاریخ میں پڑھتے ہیں مگر گولکنڈا نہیں دیکھا، جاپان، امریکہ کی سیر کی، سوئٹزرلینڈ و سویڈن کے مناظر کی تعریفیں کرتے ہیں مگر کشمیر نہیں دیکھا، شہری اور قصباتی زندگی کے صحیح حالات سے واقف نہیں مگر مدرسے میں تاروں اور سیاروں کا حال رٹ رہے ہیں یا پڑھا رہے ہیں اور زمین کو مثل گولے کے سمجھے ہوئے ہیں۔ کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ دنیا ایک سیب یا گیند کی طرح ہے جس سے بالعموم زمین کو تشبیہ دیجاتی ہے، معمولی چیز ہے وہ بھول جاتے ہیں یا انہیں بتایا ہی نہیں جاتا کہ اس چھوٹی دنیا میں چین سے رہنے کے ابھی بہت سے امکانات ہیں۔ لکھوکھا مربع میل زمین غیر آباد پڑی ہے، اور آسٹریلیا میں، جنوبی افریقہ میں، امریکہ میں، بلکہ خود ہندوستان میں اور ریاستِ نظام میں محنت و مشقت، عقلمندی و خوش سلیقگی سے خوب دولت پیدا کیجا سکتی ہے۔ ان کمسن لڑکوں کا دماغ ابھی زمین کی گولائی کے ثبوت کو سمجھنے کے لئے کافی نشو و نما نہ پاسکا مگر درس اسی کے دئے جاتے ہیں۔

---

(۱) مزید تشریح کے لئے دیکھئے راقم الحروف کا رسالہ "زرعی افلاس ہند"۔ ناشر: صدر جمعیۃ اتحاد و امداد باہمی حیدرآباد دکن صفحہ ۱۱

تقریباً یہی حال ہمارے کالج کے طلبہ کا ہے۔ سینیر انٹرمیڈیٹ و بی اے کے اکثر تاریخ کے طلبہ انگلستان اور ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات کو سمجھنے سے قطعی قاصر ہیں۔ جامعہ مدراس کے ایک طالب علم تاریخ نے نمک کی قانون شکنی پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا کہ Social reform اور Non payment of taxes کو چھوڑ کر گاندھی کیوں پیچھے پڑے ہیں آخر نمک تو ایک ضروری چیز ہے!" محض سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے معاشی مسائل کی اہمیت کیونکر سمجھ سکتے ہیں؟ میٹرک کا کورس تو ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ جنگ عظیم تک ہی ہوتا ہے تو انہیں بالڈون یا میکڈانلڈ وغیرہ سے کیسے آگاہی ہو سکتی ہے؟ تاریخ انگلستان کے طالب علم کی بسمارک، ڈزرائیلی سے ناواقفیت پر مجھے ایکبار سخت تعجب ہوا۔ وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ سال اول میں ۱۰۶۶ء تک ہی تعلیم ہوئی ہے۔ اُن سے سینسر کے حالات پوچھئے، الفریڈ اعظم کی سن ولادت دریافت کیجئے۔ Doomsday Book کے متعلق سوالات کیجئے! ابھی بسمارک کا "نمبر" نہیں آیا! تاریخ یورپ پڑھتے ہیں مگر ایشیائی تاریخ سے بالعموم اور تاریخ چین سے بالخصوص مطلق واقف نہیں ہوتے۔ لوتھر نے کس سنہ میں پاپائے روم کے خلاف بغاوت شروع کی تھی یہ تو وہ جانتے ہیں مگر چین کے نامور قابل احترام، الہی فلسفی، حکیم دانا، کونفوشس کے نام تک سے واقف نہیں (۱)! قدیم

---

(۱) ۱۹۲۶ء میں جرمانیہ کی ایک مشہور یونیورسٹی کے صدر شعبہ تاریخ کے یہاں ایک ہندوستانی صاحب آئے اور اپنا کارڈ بھجوایا جس پر پروفیسر ۔ ۔ ۔ ۔ ایم اے، ایل ایل بی، ایم آر اے ایس لکھا ہوا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ کوئی بیرونی جامعہ کا پروفیسر آیا ہو اسے صدر شعبہ نے ملاقاتی کمرہ میں بٹھلایا اور تھوڑے عرصے کے بعد ہی اُن کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کرتے ہوئے، مقصد تشریف آوری دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ جناب تحقیقاتی کام کے لئے آئے ہوئے ہیں اور اس جامعہ میں بحیثیت Research Student کے شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جو مکالمہ ان دونوں میں ہوا وہ میں اپنی یادداشت سے ہدیہ ناظرین کرتا ہوں جس کی غرض و غایت ناظرین خود ہی سمجھ جائیں گے۔

یورپ کے رسم ورواج، پاپائے روم کی طرزِ زندگی، اور وسطی یورپ کی معاشی حالت و معاشی طریق پیدائش دولت و مصنوعات کے متعلق ان سے دریافت کیجئے تو بھی آپ مایوس ہونگے۔ وجہ پوچھیے گا

جرمانیہ یونیورسٹی کا صدر شعبہ تاریخ: "تو آپ کا قصد یہاں Research کرنیکا ہے"

ہندوستانی پروفیسر: "جی ہاں"

صدر شعبہ تاریخ: "کس مضمون میں؟"

ہندوستانی پروفیسر: "تاریخ میں"

صدر شعبہ: "ہندوستان میں آپ کے مضامین کیا تھے؟"

ہندوستانی: "انگریزی ادب، قانون، تاریخ وغیرہ"

صدر شعبہ: "آپ ہندوستان میں کس مضمون کے پروفیسر ہیں؟"

ہندوستانی: "تاریخ کا"

جرمانی صدر شعبہ: (متحیر ہو کر شک دور کرنے کے لئے) "تاریخ کے آپ پروفیسر ہیں اور یہاں تاریخ میں آپ تحقیقات کرنے کے لئے آئے ہیں!؟"

ہندوستانی: "جی ہاں"

(اس بیساختہ جواب سے صدر شعبہ بہت مایوس اور ساتھ ہی کچھ پریشان اور برانگیختہ بھی ہوئے اور پوچھا:)

صدر شعبہ: "آپ نے کس ملک کی تاریخ کے کس عہد کا مطالعہ خصوصی کیا ہے؟"

ہندوستانی: "میں نے ابتک صرف تاریخ انگلستان اور تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے مطالعہ خصوصی کی غرض سے جرمانیہ آیا ہوں"

صدر شعبہ: "کیا آپ نے ہندوستانی اور انگریزی تاریخ کے علاوہ دیگر ممالک یورپ و ایشیا کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا؟"

ہندوستانی: "کیوں کرتا؟ ان ملکوں کی تاریخ ہمارے کورس میں نہیں تھی!"

تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف سیاسی تاریخ پڑھتے ہیں۔ عمرانی و معاشی تاریخ یورپ سے بے بہرہ ہیں ہندستان کی تاریخ پڑھتے ہیں اور "ظالم، جابر، قہار، موذی" سراج الدولہ کے وحشیانہ Black hole of Calcutta کی مفروضہ روایات سے باخبر ہیں مگر بغاوت ملابار کے عظیم قومی سانحہ کا انہیں علم ہی نہیں کہ ساٹھ مظلومین کی عین موسم گرما میں پیاس کی شدت اور حبس کی تکالیف سے دردانگیز طور پر شہادت ہوئی۔

بہرطور یہاں تک ذکر کیا جائے ہمارے اصول تعلیم، طریق تعلیم، مقصد تعلیم، نصاب تعلیم میں اہم تغیرات کی ضرورت ہی تبھی عمرانی، معاشی، سیاسی و اخلاقی ترقی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس ملک کی

صدر شعبہ: "تو آپ فریڈرش ولہلم اول و دوم کے کارناموں سے واقف نہیں ہیں؟"

ہندوستانی: (شرمندہ ہو کر) "نام سنے ہیں"

(اس کے بعد کچھ دیر تک انگلستان اور ہندوستان کی معاشی تاریخ کے متعلق بحث ہوتی رہی۔ جب ہندوستانی پروفیسر نے اناپ شناپ جواب دینے شروع کئے تو صدر شعبہ نے دریافت کیا)

صدر شعبہ: "کیا آپ ہندوستان و انگلستان کی معاشی اور عمرانی تاریخ سے بخوبی واقف نہیں؟"

ہندوستانی: "میں نے صرف سیاسی تاریخ پڑھی ہے"

صدر شعبہ: "ہندوستانی قطعوں کی سرگزشت اور ازمنہ وسطیٰ کے تعلیمی و معاشرتی حالات سے آپ واقف نہیں؟"

ہندوستانی: "یونہی"

صدر شعبہ: (غصہ کو ضبط کر کے) "آپ نے تمام ممالک عالم میں سے صرف انگلستان و ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بھی صرف سیاسی تاریخ کا! آپ کے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ آپ بجائے تحقیقاتی کام کرنے کے کچھ عرصے تک عام تاریخی معلومات حاصل کریں"

نانی کیسے ممکن ہے جہاں کے معلمین و مدرسین کو اصول تعلیم کے اس ابتدائی کلیہ سے واقفیت نہ ہو کہ تاریخ و جغرافیہ کو پڑھانے کا واحد صحیح طریق یہ ہے کہ جس زمانے میں اور جس جگہ ہم رہتے ہیں وہاں کے اور اسی عہد کے سیاسی و جغرافی حالات سے ابتدا کرنی چاہئے ورنہ نتیجہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ اُس لڑکے کا تھا جسے جغرافیہ سال بھر پڑھنے کے بعد یہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوئی کہ اُس کے مدرسے کی بازیگاہ بھی "سطح زمین" کا ایک حصہ ہے۔

اختتام

مختصراً ہمارے مضمون کا ماحصل و لب لباب یہ ہے کہ

(۱) تعلیم اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جبکہ قومی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے متناسب طریق پر علمی، عملی، فنی، کاروباری، تجارتی و زراعتی تعلیم دیجائے۔

اور ساتھ ہی چونکہ حکومت کا فرض ہے کہ ہر معقول آدمی کے لئے ایک موزوں جگہ مہیا کرے اُس کو چاہئے کہ

(۲) اُن لوگوں کے لئے جو تعلیم پا چکیں ذرائع معاش مہیا کرے یعنی چند نوکریاں، اور بقیہ کو بالواسطہ یعنی صنعتی و زراعتی ترقی کے لئے انتظامات کرکے، یا قومی صنعت و حرفت کی (بذریعہ تامین تجارت) حفاظت و سرپرستی کرکے وسیلۂ آمدنی یا ذرائع معاش فراہم کرے۔

(۳) معاشی پالیسی اور سیاسی سرپرستی اُسی وقت ممکن ہے جبکہ سلطنت اندرونی معاملات میں آزاد ہو۔

(۴) ہندوستان کی زراعتی و صنعتی زمین میں سونے چاندی کے نہیں بلکہ نفیس معاشی دولت کے خزانے مدفون ہیں اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ بھی اکثر پیشوں اور کاموں کے لئے موزوں ہیں قومی ترقی حاصل کرنے کے لئے نہ صرف اعلیٰ تنظیمی قابلیت کے رہبروں، تاجروں اور مصلحان قوم کی ضرورت ہے بلکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ قومی تربیت و معاشرتی اصلاح لابدی ہے۔

(۵) قومی تربیت و معاشرتی اصلاح تعلیم دینے اور لکچر پڑھ کر عوام کو سنانے سے حاصل نہیں ہوجاتی بلکہ قومی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ لوگ خود اخلاق حسنہ و عمدہ اصول زندگی کا نمونہ بن کر قوم کو تقلید کا موقع دیں، یعنی مصلح نہیں بلکہ خود اصلاح کا مجسمہ بنیں۔

تاوقتیکہ ان سب کا انتظام نہ ہوسکے یا یہ کہ سب حالات موجود نہ ہوجائیں قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ بہرطور عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب تعلیم اس وقت تک مفید نہیں جب تک کہ تعلیم کے ساتھ ہی قومی تربیت اور مفید معاشی پالیسی کا تعین نہ ہو۔

جوش ملیح آبادی

جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی اُن شعرا میں سے ہیں جن کی عظمت پر عہد
حاضر کا پردہ پڑا ہوا ہے! میرا خیال ہے کہ ادبی دنیا نے ہنوز اُن کی طرف کافی اعتنا نہیں کیا ہے محفل
پر ایک عجیب بیخودی و خود فراموشی کی کیفیت طاری ہے اور اُسکو خبر نہیں کہ "شمع شاعرہ" کسی مسند
نشین سخن کے سامنے پہنچ چکی ہے! مگر بالغ نظر شخصیتیں اس عام بے حسی و بے بصری سے یقیناً بالا
ہی ہیں اور نقادانِ سخن کی ایک منتخب جماعت کے اندر جوش نے ممتاز نشست حاصل کر لی ہے۔
حضرت لسان العصر اکبر مرحوم نے یقیناً "زبانِ خلق" بن کر شروع ہی میں جوش کا شایانِ شان خیر مقدم
کیا، اور اپنی پہلی ہی لب کشائی میں انکو ایک گراں قیمت خراج تحسین پیش کیا۔ صاحب ممدوح الصدر
نے فرمایا تھا کہ:

"جوش کی افق قلب پر ایک عجیب سرمدی پرتو پڑ رہا ہے . . . . . کاش مرنے سے
پہلے مجھکو یہ حسن اتفاق نصیب ہوتا کہ میں، جوش اور اقبال ایک دفعہ ایک صحبت میں
یکجا ہو جاتے!"

مشہور لذت آشنائے سخن جناب عبد الماجد صاحب دریابادی میں نہیں لکھنا چاہتا کہ "مصنف
فلسفہ جذبات"! اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ ؎

جونہی جاکے مکتبِ عشق میں سبق فنا و بقا لیا — جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا!)

نے ان الفاظ میں ایک حقیقت بیان کی ہے جسے سجاد انصاری مرحوم بھی زبان کا غلط استعمال نہ کہتے:۔

"ہر صف اول کا شاعر ایک مستقل پیغام اور فلسفۂ حیات کا پیامبر ہوتا ہے۔ جوش شعراء کے اسی
سلسلۃ الذہب کا ایک گوہر ہے، چنانچہ اُس کا دیوان نظم و نثر بھی ایک خاص "مذہب" کا صحیفہ
ہے!"

بعض حضرات جوشؔ کے "خروج" کی ابتدا ہی سے اس سے دست و گریبان رہے جن کے علمبردار جناب سجاد علی انصاری مرحوم تھے، لیکن اس سے جوش کی تنقیص نہیں ہوتی اسلئے کہ ع

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے ؟

بہتر ہے کہ اس تقریب سے ہم ایک شاعر ہی کی رائے کا یہاں ذکر کریں جو دنیائے زبان و ادب کی ایک اقلیم کا تاجدار مطلق مانا جاتا ہے اور فطرت انسانی کی اسرار و خفایا کے متعلق اس کو جو معرفت و عبور حاصل ہے اس کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ اُسکا قول، قول فیصل کہا جائیگا۔ ہمارا روئے سخن شیکسپیئر کی طرف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :

"اگر تو برف کی طرح صاف اور یخ کی طرح شفاف ہوگا تب بھی زبان خلق سے مامون نہیں رہ سکتا!"

پھر اسی معاملے کا ایک دوسرا لطیف پہلو بھی ہے۔ ممتاز و باکمال لوگوں کی بعض اوقات جس شدّ و مد سے مخالفت کیجاتی ہے اُسکا نشانہ درحقیقت اُنکا امتیاز و کمال نہیں ہوتا بلکہ اُنکا سرچشمہ دراصل صف مخالفین کا رشک و حسد ہوتا ہے! کمال، اعتراف سے پہلے عموماً تعریض و تضحیک کا محرک بنتا ہے! دنیا کے اکثر باکمالوں کو یہ واردات پیش آئی ہیں۔ جناب حافظ شیرازی نے اپنے کسی ناکام حریف ہی کی حرکات مذبوحی پر فرمایا تھا :

حسد چہ میبری اے سست نظم بر حافظ　　قبول خاطر و لطف سخن خداداد است!

سجادؔ مرحوم نے جو کچھ جوش کے متعلق وقتاً فوقتاً لکھا ہے اُسکو شاید تمام و کمال اس ذیل میں نہیں رکھا جا سکتا اس لئے کہ وہ خود ایک قابل رشک حیثیت رکھنے والے ادیب اور شاعر تھے لیکن اُنکی بلاوجہ شدید تنقیدات کو شاید اس جذبے سے بالکل پاک بھی نہیں سمجھا جا سکتا! سارے فضل و ہنر کے بعد بھی بالآخر ہم "انسان ہی رہتے ہیں" اور "احسن تقویم" ایک لغزش کے سقوط میں "اسفل سافلین" کی تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے! وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا!

جناب اکبرؔ مرحوم نے جوش کے پایۂ شاعری کے متعلق جو غیر معمولی ریمارک کیا تھا جناب سجاد صاحب نے (عفا اللہ عنہ) اس کی نوعیت کے بارے میں بہت کچھ تدقیق و کاوش کرنی چاہی ہے۔ خود حضرت

ایک ایک خط لکھ کر ان سے انکے الفاظ کی تعبیر پوچھی ہے حالانکہ ان تفسیر طلب الفاظ میں کسی الہام سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ خیر جو جواب آیا ہے بجائے اس کے کہ سجاد خود اس کو ناظرین کے سامنے رکھدیں اس کے ضمنی مفہوم کو ایک معنی خیز تمہیدی جملے میں ادا کرنا چاہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

"(جناب اکبر) کا جواب ایک عجیب رنگ میں آیا۔ . . . . "

بیشک "ایک عجیب رنگ میں"! لیکن اس میں اپنے تبصرے کی تشریح اسقدر نہ تھی جس قدر کہ ایک لطیف پیرائے میں خود جناب مستفسر (سجاد) کو تنبیہ! جناب سجاد نے نہ معلوم ان الفاظ کا محل کس چیز کو سمجھا؟ :

" . . . . . . اللہ کو یاد کیجئے! ان باتوں میں کیا حاصل ہے؟ وہ (جوش) میرے کرمفرما ہیں، مجھکو محترم شمار کرتے ہیں، میں انکو اپنا عـــزیز جانتا ہوں! . . . . . "

سجاد مرحوم کے ذخیرۂ تنقید میں جوش پر موقع و بے موقع ایرادات ملتے ہیں اور انکو بتدریج جوش سے جو ضد و کد بڑھتی چلی گئی ہے اس نے تقریباً ایک (ہمدردان و مداحان سجاد مرحوم معاف کریں، میں خود سجاد کے نادر و پاکیزہ ذوق سخن کا معترف ہوں، نیز انکی لطیف سخن سنجی و سخن گوئی کا) الہی بغض کی حیثیت اختیار کر لی ہے!

ایسا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خود جوش، سجاد کی اس ناحق کی پرخاش پر قدرتاً اپنے دل میں کافی غبار رکھتے تھے جو انکی بعض نظموں میں مترشح ہوتا ہے جن کا ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا مشکل یہ ہے کہ اس تذکرے نے غیر معمولی طوالت اختیار کی اور وہ "افسانہ از افسانہ می خیزد" کا مصداق بنا جا رہا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ "حکایت دراز" "لذید" ضرور رہے گی۔ دو ممتاز اور نوجوان و نوخیز شاعروں کی اس غائبانہ چشمک نے اردو کے ذخیرۂ ادب کو بعض بڑی ہی نادر چیزیں نظم و نثر کی دی ہیں۔ یہ لڑتے ضرور ہیں لیکن صرف قلم ادب و انشا کی "پھول کی چھڑی" سے! اور ان کی "رزم" نے ایک "بزم" کا منظر پیدا کر دیا ہے! میں بھی چاہتا ہوں کہ ناظرین کو سیر کرنے سے پہلے اس تذکار رنگین کو تشنہ نہ چھوڑوں۔

موضوعِ تنقید پر جوش کی ایک بے مثل نظم ہے جس میں روئے سخن در پردہ یقیناً سجاد صاحب ہی کی طرف ہے۔ یہ نادر نظم اپنی شعریت پاشیوں اور معارف طرازیوں کے اعتبار سے ایک مجسم دنیائے رنگ و کیف ہے۔ اور اس کے ایک ایک بند کو کوزہائے قند و شکر کی طرح چکھنے کو جی چاہتا ہے!

افتتاحِ کلام ہی میں غالباً اپنے معہود ذہنی حریف و ناقد کی طرف خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رحم اے نقادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو؟ — کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو؟!
شاعری اور منطقی بحثیں؟ یہ کیسا قتلِ عام! — برشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام!
فکر کا جس کی حواسِ ظاہری پر ہو مدار — شاعری کے قصرِ مدہوشی میں پا سکتا ہے بار؟
کیوں اٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کے لئے — کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لئے؟

عامیانہ تنقید کی ان ثقالتوں اور ناتراشیوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس نازک و لطیف کام کی اہمیت کے شرائط بیان کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ اس کے لئے خود فطرت کا عارف اور مخاطب اور محرمِ راز ہونا شرطِ اولیں ہے، چنانچہ کہتے ہیں:

غور تو کر دل میں اے خو کردۂ غوغائے عام — کرتی ہیں خاموشیاں قدرت کی تجھ سے بھی کلام؟
منکشف کیا تیری جانب بھی ہے لیلائے حیات — محوِ سرگوشی ہے کیا تجھ سے بھی روحِ کائنات؟
ان بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب؟ — خاک کو جن کے تبسم نے بنایا ہے گلاب!
دل سے اپنے پوچھ او زندانیِ علم و کتاب — حسنِ مطلق کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب؟
تو پتہ اسرارِ عالم کا لگاتا ہے کبھی؟ — عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی؟
جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تو نے داغ؟ — جس کے پرتو سے غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ!
طورِ فطرت کی بلندی پر بھی چڑھ سکتا ہے تو؟ — کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو؟

یہ نہیں تو بس، وہیں رک جا یہ دنیا اور ہے
تیری دنیا اور ہے، شاعر کی دنیا اور ہے!

آئندہ متعدد بندوں میں اس حقیقتِ نغز کی طرف لطیف ترین کنائے کئے ہیں کہ کسی شاعر کے کلام پر تنقید

ن مجازی اور اعتباری معنی میں صحیح ہے اور یہ کہ اصل شعر ایک حقیقت مجردہ ہے جس سے صرف شاعر کا قلب و روح ہی لبریز کیف ہوتا ہے اور لب و دہان پر اُس کا محض ایک خفیف سا پرتو پڑا کرتا ہے جو اپنی اصلیت کا برائے نام ہی ترجمان ہوا کرتا ہے۔ الغرض حقیقی شعر تک رسائی ایک امر محال ہے اور وہ آلات زبان و دہان کی دسترس سے بالکل ورا الورا ایک شے ہے!

اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
شعر کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات؟

"شعر" کیا؟ جذبات دل کا ایک نقش ناتمام
ایک مبہم سا اشارہ، مشتبہ سا اک کلام!

نشہ میں اک لغزش پا کلک گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لب گفتار کی!

بے حقیقت سی نے کے اندر زمزمہ آواز کا!
عارض محدود پر ایک عکس لامحدود کا!

شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
پنکھڑی پر رات کو شبنم کے گرنے کی صدا!

شعر کیا ہے، غور کرنا ہے وہ بند آواز سے
دل کی سرگوشی حقیقت کی عروس ناز سے!

جوئے قدرت کی روانی دشت مصنوعات میں
ٹوٹنا رنگیں ستارے کا اندھیری رات میں

ہاتھ میں جھونکوں سے اک بجھتا ہوا دھندلا چراغ
جھلملانا دل کی شمعوں کا سر بزم دماغ!

"لفظ و معنی میں توازن کی مسلسل آرزو
"ترزبانی" اور "خاموشی کی باہم گفتگو!

نہر میں حسن قمر کی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکنا قطرے کے روزن سے عروس بحر کا!

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

شعر کی "تنقید" سے پہلے مری تقریر سن
خود "زبان شاعری" سے شعر کی تفسیر سن!

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش خیال
نطق پر بوندیں "ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار

ڈھال لیتی ہے جنہیں شاعر کی ترکیب ادب
اور انہیں دنیا "در تاباں" کا دیتی ہے لقب

گو جواہر بن کے ہوتی ہیں وہ زیب تاج زر
اُن میں لیکن ظلمتیں آتی ہیں شاعر کو نظر!

دل میں بستی ہیں تر و تازہ جو کلیاں زر فشاں — پھونک دیتی ہیں انہیں "الفاظ" کی چنگاریاں!
جام میں آتے ہی اُڑ جاتی ہے یہ رنگیں شراب — ٹوٹ جاتے ہیں نفس کی زد پڑا اگر یہ حباب!
شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال — کاگ کے کھلتے ہی پڑ جاتا ہے اس ساغر میں بال!
نطق سے خدمت کبھی ممکن نہیں جذبات کی — تفسیر ہے باریک محسوسات کی!
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دل سرشار پر — ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر،
رہتے ہیں "بیدار" دل کی محفلِ خاموش میں — بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کی "آغوش میں"!

کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں!

جن کے جاں پرور اثر سے دل ہیں سب گرویدہ جو — کھوکھلے نغمے ہیں وہ الفاظ میں جکڑے ہوئے!
شاعری کا خانماں لفظوں کا ہے ٹوٹا ہوا — اسکا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا!
گوہر نایاب جن نظموں کو کہتا ہے جہاں — وہ تو شاعر کے سمندر کی ہیں خالی سیپیاں!
قعرِ رقصاں تھپیڑوں نے نکالا ہے جنہیں — نطق کی "بے مغز" موجوں نے اچھالا ہے جنہیں!
سیپیاں "امواج" تک نغمے سنا سکتی نہیں — کھو گئے ہیں کس جگہ موتی، بتا سکتی نہیں!

اس تلاطم میں کب اے نقاد ابھر سکتا ہے تو!
جب یہ عالم ہے تو کیا "تنقید" کر سکتا ہے تو!

ایک تنکا دخل کیا دیگا بھلا طوفان میں! — اور اگر ضد ہے تو آ تنقید کے میدان میں
لیکن اتنی بات کا دل میں رہے تیرے خیال — ننگ ہے شعر و سخن میں مدرسے کی قیل و قال

اک ترنم سے لبِ تنقید کھلنا چاہیے
"قطرۂ شبنم" کو "برگِ گل" پہ تلنا چاہیے!

ان مناظرانہ بے لطفیوں کو عبور کر کے اب ہم جوش کی "نگارخانۂ خیال" کی بے خلل دنشیں سیر کرنی چاہتے ہیں اور مختلف عنوانوں کے ماتحت اس کی قادر الکلامیوں اور نکتہ طرازیوں سے لطف اندوز

ہونا چاہتے ہیں :-

(۱) جوش کے جذبات شاعرانہ وعاشقانہ غیر معمولی طور سے گرم اور شوخ رنگ ہیں اور یہ جوش کے نفحات قلم کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کی ہر نظم کے سرنامے پر بخط جلی "جوش" لکھا ہوا ہے! غالبًا جوش ان معدودے چند شعرا کے زمرے میں داخل ہے جو اسم بامسمیٰ ہیں یعنی جنہوں نے اپنے تخلص کے انتخاب میں اپنے کلام کی حقیقی نوعیت کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ ان لوگوں کو شاید اپنے کلام کی تنقید کے لئے کسی ناقد کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ یہ فرض وہ خود ہی انجام دے گئے ہیں۔ اُنکے تخلص کے چند حرفی نقطے کے اندر اُنکے کلام کے سارے امتیازات وخصائص منعکس ہیں۔ الغرض جوش کا ایک ایک نغمہ "لبریز" جوش "ہے! بطور مشتے نمونہ از خروارے ایک غزل کا مطلع دیکھئے جو فتح باب کرتا ہے ایک مخصوص تخیل شبستان عشرت کے مشاہدات وواردات کا :

شب کہ حریم عشق میں دور شراب ناب تھا ‏ ‏ عشق بھی تھا برہنہ سر حسن بھی بے نقاب تھا!

(۲) اُسکی "حقانی" غزلیں بڑی ہی جنون خیز اور وجد آور ہیں۔ کہتے کہتے وہ خود اپنے وجد انگیز قال سے اس درجہ محو حال ہوجاتا ہے کہ بالکل فانی فی اللہ اور واصل باللہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی قسم کی ایک عارفانہ غزل کا مقطع ملاحظہ ہو :

نظم عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے جوش سے ‏ ‏ ہنس کے رباب الملیانعمۂ ربِ الست سنے!

(۳) وہ ایک شاعر وعاشق اور "انسان اعلیٰ" کی انتہائی رفعت روح اور بلند نظری رکھتا ہے اور مجنونانہ ومجذوبانہ حیات فداکاری ودرد کی کشی سے مست دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ایک نعرۂ رندانہ اور چشمک بیبا کانہ سنئے :

عشق سے مست ہوں مجھے ساغر ہوش سے غرض؟ ‏ ‏ ترک سیاہ چشم کو سرمہ فروش سے غرض؟

آپ کو حسن خیر وشر، آپ کو حب مال و زر ‏ ‏ آپ جنوں سے بے خبر، آپکو جوش سے غرض؟

(۴) ایمان بالغیب اور غیر آشتی طلب وابستگی مشرب :-

تیرے ہر ایک وعدے پر جشن منائے شاد ہو ‏ ‏ تجھسے بہانہ ساز کو مجھ سا خوش اعتقاد ہو!

ہم سے وفا پرست اگر "کارِ جنوں" کو چھوڑ دیں — "اہلِ خرد" کے درمیان جوش بڑا "فساد" ہو!

(۵) عام رنگِ تغزل ملاحظہ ہو:

عقل و خرد سے ارتباطِ روح کو وجہ ننگ ہے — پائے جنون ادھر نہ جا دشت ناشعور تنگ ہے!

اسکا جمال چھوڑ کر اس سے بہشت مانگنا — تیری نظر میں ہمنشیں سیر سے تو تنگ ہے!

ابتدا تھی ابھی کہانی کی — اسے کیا نیند ہے جوانی کی

(۶) فلسفیانہ انجام بینی میں ذرا بلوغ نظر کو دیکھئے:

"ہوس" انجام کی تلخی سے ڈر جاتی تو اچھا تھا — ہمارے دل سے یہ دنیا اتر جاتی تو اچھا تھا!

یہ ماحسن میں پائی نشاط زندگی میں نے — "ذرا کچھ اور بھی گہری نظر" جاتی تو اچھا تھا!

یہ کتنا لطیف اور عبرت آموز "کنایہ" اس حقیقت کی طرف ہے جس کو صراحت کے ساتھ کوئی سادہ بیان شاعر اس طرح کہہ گیا ہے:

ز طرف چشم حقیقت بہ بیں کہ جلوہ گر است — تن نگار حقیقت نہ لباس مجاز!

تو باز ساعد شاہی بر استخواں منگر — ہمائے ہمت خود را بلند دہ پرواز!

(۷) جوش حقیقی معنوں میں ایک شاعر فطرت ہے اور نیز ایک عاشق فطرت! صبح کے بہشتی سماں میں وہ ہر روز ایک "معراج روح" حاصل کرتا ہے، اس نے اپنی انسانیت اور صاحب ذوق زندگی کو بڑے اہتمام و التزام کے ساتھ اس مجمل کن تعریض سے بالا رکھا ہے کہ

مرغ سحر زندہ و تو مردۂ — او بنوا گرم و تو افسردۂ!

جوش ایک شب زندہ دار عاشق الٰہی اور ایک سحر خیز عارف ربانی ہے۔ اس کی روح کا عین الیقین ہے کہ اس وقت بلاشبہ خدائے قدوس اور • بلکہ سطح ارض پر نزول اجلال وجلال فرماتا ہے اور اہل نظر کو زمین ہی پر "رفع الی السماء" کی لذت وسعادت نصیب ہو جاتی ہے! جوش کی اُستادی شعری کی یہ اتنی نمایاں اور مرکزی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے تخلص "جوش"

کے ساتھ الفاظ "سحر پرست" کو اکثر ایک "تخلص ثانوی" کی طرح استعمال کرتا ہے اور بڑے کیف و سرور سے ساتھ اپنے کو چونکے "القاب و آداب" سے "جوش سحر پرست" کہتا ہے! اپنے محرم راز پیامبر "صبا" کی معرفت معشوق حقیقی کی بارگاہ ناز میں اس نے اکثر یہ پیام بھیجا ہے:

کہنا سلام بھیجا ہے "جوش سحر پرست" نے!

(۸) تہجد کے وقت اُسکی روح کی بیداری، غلطانی و ہیجانی، اور سوز اور تڑپ کا دلدوز تماشا دیکھئے:

نسیم ہوتی ہے محو راحت سکوت ہوتا ہے جب چمن میں
میں پیش کرتا ہوں اپنے اشکوں کا ہار تاروں کی انجمن میں!

سرِ گلستان بیخودی میں لچکنے لگتی ہیں سبز شاخیں
نسیم "رقاصۂ گلستاں" ہنوز چلتی نہیں چمن میں

مجھے سنگھاتی ہیں نرم لہریں ہوا کی اُسوقت انکی خوشبو
مہک چمن کی ہنوز ہوتی ہے قید غنچوں کے پیرہن میں

سفید ہلکی سی چاندنی میں بلند ہوتے ہیں میرے نغمے
چٹکنے والی تمام کلیاں خموش ہوتی ہیں جب چمن میں

ہمیشہ اسوقت جاگتی ہے مری عروس "سحر پرستی"
فلک پہ ہوتا ہے خواب آلودہ چاند تک شب کے پیرہن میں!

ہنوز نغموں کی خوابگاہوں کے گرد ہوتے ہیں سرخ پردے
رباب دل کا میں چھیڑتا ہوں حریم دوشیزۂ سخن میں!

ہوا میں ہوتی نہیں ہے لرزش خموش ہوتا ہے نطق ہستی
سحر کو اس وقت جاگتی ہے زبان فطرت مرے ذہن میں!

نظر کی وسعت سے میرے رخ پر ادھر چھلکتے ہیں گرم آنسو
ادھر جھلکتی ہے کچھ کچھ افشاں افق کے گیسوئے پُرشکن میں!

یہ اب تو دستور ہو گیا ہے کہ جوش کچھ رات بیتتے ہی
دہکنے لگتی ہے سوز دل سے اک آگ سی میرے تن بدن میں!

(۹) صبح کے بعد پھر کہیں شام کو جاکر جوش کی وقت شناس طبیعت انگڑائی لیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی ساری روح ایک "مغنی فطرت" ہے جو مصداق

چاک مت کر جیب بے ایام گل   کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے!

ترنم ریز ہونے کے وقت کے "ساز ہم آہنگ" کی شرط کو ناگزیر سمجھتی ہے! - ایک حقیقی شاعر کی طرح اُس کی نبض قلب پر ہر وقت فطرت کی انگلیاں رکھی رہتی ہیں، اسکا سارا کالبد خاکی روح فطرت کے

سے زندہ رہتا ہے اور اس کے سلسلے اعمال حیات اشارات فطرت کی تحریک پر انجام پاتے ہیں۔ خود کہتے ہیں :

یہی وہ وقت ہے جب شاعروں کے دل مسخر کرتے ہیں — اندھیری رات ہے، میدان ہے تارے چمکتے ہیں!

اب تو "سرِ شام" کے ایک ترنم سے سامعہ نواز ہوجیے :

خورشید جہاں تاب جب آنکھوں سے ہو اوجھل — آوارہ نظر آتے ہوں جب چرخ پہ بادل
سینے میں خیالات ہوں جب نا متناہی — جب چھائی ہو ہر چیز پہ ہلکی سی سیاہی
جب خونِ شفق گرم ہو خاموش ہو صحرا — ہو سست روانی میں مچلتا ہوا دریا
جب چرخ پہ دو چار ستارے نظر آئیں — جب دشت میں پرتوں کے طائر اتر آئیں!
جب چرخ پہ قندیلِ مہِ نو کی ہو روشن — جیسے کسی نو عمر کا ٹوٹا ہوا کنگن!
ہمراہ مرے جب کوئی ہمدم ہو نہ ہمراز — کچھ دور سے جب بانسری کی آتی ہو آواز
کچھ آئیں جب اس مرکزِ اسرار پہ جذبات — پیدا ہوں خموشی سے غم انگیز خیالات!
جب دردِ جگر اپنی لطافت سے ہو پیدا — دل کو اثرِ غم پہ بشاشت کا ہو دھوکا!
کھینچا ہو طبیعت نے جب احساس کا جوہر — آنکھوں میں ہوں اشک اور تبسم ہو لبوں پر!
جب شورشیں ادراک کی خاموش ہوں دل میں — جب شادی و غم دونوں ہم آغوش ہوں دل میں!

جب موج ہوا میں نفسِ شام کی بو آئے
حسرت ہے کہ اس وقت مرے سامنے تو آئے

(۱۰) صبح و مسا کے بعد آخر میں رات کا مخصوص وقتِ خلوت آتا ہے جبکہ ایک شاعر عارف کی روح کا "انبساط" یا "انقباض" بعینہٖ ایک شبِ وصل یا شبِ ہجر کی سی کیفیات و واردات رکھتا ہے! جوش پر بعض راتیں قیامت کی گذرتی ہیں ایک شبِ دیجور میں اُسکی "رقصِ بسمل" کا نظارہ قابلِ دید ہے، ملاحظہ ہو :

تاریک رات اپنا سکہ جما چکی ہے — زلفِ سیہ کمر تک لہرا کے آ چکی ہے!

چاندنی چمک پر تارے چمک رہے ہیں ۔۔۔ کلیوں میں مہوشوں کے عارض جھلک رہے ہیں!
خاموش ہیں ہوائیں ذرے بھی سہمے ہیں ۔۔۔ شاخیں جھکی ہوئی ہیں پتے تھمے ہوئے ہیں!
خاموشیوں میں "سن سن" آواز آ رہی ہے ۔۔۔ "لیلائے شب" پھریرا شاید اڑا رہی ہے!
وہ غل نہ اب جہاں میں وہ شور و شر رہا ہے ۔۔۔ گویا تمام عالم "کچھ غور" کر رہا ہے!
ہستی کا ذرہ ذرہ بے حس ہو سو رہا ہے ۔۔۔ لیکن کنول جلائے اک شخص رو رہا ہے!

ہم تک رہی ہے اک "تشنگی" نظر سے ۔۔۔ "دیدار" کی تمنا ظاہر ہے "چشم تر" سے!
پلکیں سلگ رہی ہیں ٹوٹے رہے ہیں آنسو ۔۔۔ سوز دل و جگر سے دوزخ ہیں دونوں پہلو!
جذبات بیخودی کی ندی ابل رہی ہے ۔۔۔ "تخئیل" کی سنہری قندیل جل رہی ہے
آنکھیں بتا رہی ہیں صدمے بڑے سہے ہیں ۔۔۔ ناکام زندگی کے حلقے پڑے ہوئے ہیں
گہرا سکوت شب کا آنکھوں میں بہہ رہا ہے ۔۔۔ تاروں سے بیخودی میں اس طرح کہہ رہا ہے

"اے خوشنما ستارو! شمعیں جلانے والو! ۔۔۔ گردوں پہ سادگی سے جگمگانے والو!
آرائش جہاں کی خاطر سنورنے والو! ۔۔۔ ہاں "صورت سرمدی" پہ "رقص" کرنے والو!

اک بات میری مانو صدقے میں اس ضیا کے ۔۔۔ جب گلشنوں میں جھونکے چلنے لگیں ہوا کے
جب آسماں پہ کچھ کچھ رنگیں دھاریاں ہوں ۔۔۔ جب بادلوں کے ٹکڑے زرتار و زرفشاں ہوں
سب لپٹے ہوئے ترپ میں دیوار و در کھڑے ہوں ۔۔۔ ہلکی سی چاندنی کے ہیرے جڑے ہوئے ہوں
کچھ نور کچھ سیاہی جس وقت مل رہے ہوں ۔۔۔ فردوس کی ہوا سے جب پھول کھل رہے ہوں
جب صبح کا ستارہ مشرق سے جگمگائے ۔۔۔ جیسے ہی آج تم میں حسن ازل سمائے

کہنا کہ ایک بندہ ــ مدت سے رو رہا ہے — رو رو کے بیکسی میں جاں اپنی کھو رہا ہے!
رونے کا چشم تر سے گویا معاہدہ ہے — معبود! یہ ہمارا عینی مشاہدہ ہے!
ہم جاگتے ہیں کچھ یوں شب بھر کراہتا ہے! — اور تجھ سے صرف اتنا اے دوست چاہتا ہے

جب نور صبح گاہی ذروں کو جگمگا دے
تو اک ذرا نکل کر پردے سے مسکرا دے"

(۱۱) اب ایک "شب معراج" کی بھی روایت سن لیجئے: ہے یہ گویا ایک "ع" افسانہ آں شبے کہ با یار گذشت!

شب وہ سرخی سی لئے آنکھ کے پیمانے میں — بےحجابانہ در آیا مرے غم خانے میں!
سایۂ کاکل شب رنگ تھا مست آنکھوں پر — پرتو ابر چھلکتے ہوئے پیمانے میں!
سینکڑوں ناز تبسم کی جلو میں بیتاب — لاکھوں انداز ستم زلف کے بل کھانے میں!
آ رہی تھی وہ مرے مست کے گیسو کی شمیم — منہ اندھیرے جو مہک ہوتی ہے بتخانے میں!
چشم مخمور پہ وہ شوخی مژگان دراز — جس طرح خط سے کھچے ہوتے ہیں پیمانے میں
سینۂ عشق میں رہتا ہے تلاطم جن سے — جمع تھیں سب وہ ادائیں مرے مستانے میں

مسکراتا ہوا نزدیک جو میرے آیا
روشنی پھیل گئی مرے سیہ خانے میں!

دوڑ کر میں نے سر اس طرح قدم پر رکھا — جس طرح کوئی پجاری ہو صنم خانے میں!
میرا سجدے میں وہ گرنا وہ جھکنا اس کا — جھلکیاں خون کی چہرے پہ وہ شرمانے میں!
میرا دل تھام کے اس آفت جاں سے کہنا — تو ادھر اس سوختہ ساماں کے سیہ خانے میں!
اے چراغ دل ارباب نظر شمع صفا — دیکھ کیا ذوق تپش ہے ترے پروانے میں!
نیند آتی ہی نہ تھی ہجر کی راتیں ہیں گواہ — الجھا رہتا تھا تری زلف کے افسانے میں!
سیر کی شہر جنوں ہی کی ہمیشہ میں نے — کبھی رکھا نہ قدم عقل کے ویرانے میں!

سن کے تقریر مری جس کے ستمگر نے کہا ہائے کیا شانِ محبت کی ہو دیوانے میں!
خلوت ناز سے آنا مجھے منظور نہ تھا کھینچ لائیں تری آہیں مجھے ویرانے میں!
آج ہو سوزِ محبت کا ترے سر سہرا برہمن تجھسا نہیں من کے بتخانے میں!
اس سے پہلے میں تری بزم وفا میں آتا ہو گئی دیر مجھے زلف کے سلجھانے میں!
ساقیِ حسن کو ہر بوند ہے جس کی کوثر ہے وہ صہبا ترے تھوڑے ہوئے پیمانے میں!

اسکی باتوں سے ہوئی دل میں وہ گرمی پیدا خون سب کھول گیا قلب کے پیمانے میں!
یونہی تا دیر رہا سلسلۂ راز و نیاز عمر درکار ہے ہر بات کے دہرانے میں!
مختصر یہ کہ سحر تک وہ مرا ماہ تمام جلوہ افروز رہا میرے سیہ خانے میں
ڈوبتے تاروں کے جھرمٹ میں تھا اک چاند ادھر اور اک چاند ادھر تھا مرے کاشانے میں!
چشم خونبار محبت میں ادھر سرخ آنسو شبنم تازہ ادھر صبح کے پیمانے میں!

واقعات اپنے بیاں کیجئے کیا کیا اے جوشؔ
ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں

(۱۲) جوش اپنے ہندوستانی ماحول سے باہر نکل جانے کی غلطی نہیں کرتا جو جدید آداب ادب میں ایک قابل عفو بے راہ روی ہے۔ وہ جس وقت فکر سخن کرتا ہے تو ایران کی کانوں سے لعل و یاقوت نہیں لاتا۔ وہ اپنے میدان شاعری (ہندوستان) کی مالا مال شعریت سرزمین کو نظر انداز کر کے ایران و توران کی طرف آوارہ نہیں ہوتا۔ ارض نوشیرواں و جمشید کی ضرب المثل فصل بہار سے انکار نہیں لیکن یہ محض ایک ایمان بالغیب ہوگا جو شاعر کا "حال" نہیں بلکہ "قال" ہو سکتا ہے۔ قطع نظر اس کے ہندوستان کے موسم برسات کے بہشتی مناظر بر خود فراموش ہندی شاعر سے بزبان حال اس طرح شکوہ سنج ہیں:

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درا تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، در دل کشا بچمن درا!

کم از کم جوش سے ہندوستان کو یہ شکایت۔ ہندوستان جنت نشان میں جوش کو بیشمار موقعوں

پر "ارضِ جمال و تجلی" کے جلوے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان کے ایک خالص ہندی منظر کو جوش نے اس قدر لوچ، مزہ، اور مٹھاس سے بیان کیا ہے کہ اس نے ملک محمد جائسی کی روح کو بھی تڑپا دیا ہوگا۔ یہ ایک خوش جمال ہندو دوشیزہ کے گنگا اشنان سے واپسی کا نظارہ ہے اور دیکھئے کہ اس کا کتنا قیامت خیز مرقع کھینچا ہے!

بڑھائے چہرے کی سرخی ہوائے صحرا نے
الٰہی خیر! یہ کون آ رہا ہے دریا سے؟

مقابلہ جو کرے کوئی چاند پھیکا ہے
جبینِ ناز پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے!

بلا کا حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہا ہے بدن کمسنی کی خوشبو سے!

نمی ہے چہرے پہ اشنان کر کے نکلی ہے
دلوں کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے!

کبھی نہ آئیں گھٹائیں یہ آسمانوں پر
پڑے ہیں بھیگے ہوئے بال دونوں شانوں پر!

نظر جھکائے ہوئے محوِ تیز گامی ہے
خموشیوں پہ فدا جانِ خوش کلامی ہے!

شراب سرخ کے ساغر پڑے ہیں پانی میں
رسیلی آنکھوں کی شوخی وہ نوجوانی میں!

سیاہ زلف پہ آنچل جو ہے وہ آبی ہے
برہنہ پا ہے تو، ہر نقش پا گلابی ہے!

لرزتا سامنے جوش آفتاب آئے گا!

جب ان اداؤں پہ پورا شباب آئے گا!

"دلنواز"، جوش کی ایک نہایت پرسوز و گداز نظم کا عنوان ہے۔ یہ نظم شاید ناقدین کے دائرۂ تنقید سے خارج کر دینی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ غالباً خود جوش کے واردات شاعرانہ و عاشقانہ سے ہے اس کا مضمون ع "کراماً کاتبین را ہم خبر نیست" کا مصداق ہے تاہم حالات و واقعات سے قطع نظر کر کے ہم اس کے طرزِ ادا کا پوری آزادی سے جائزہ لے سکتے ہیں لیکن پھر یاد رہے کہ یہ "مقامِ ادب" ہے کیونکہ وہ جوش کے حریمِ عشق کا خاص خلوتکدہ ہے۔ آپ اس نادر موقع کو اپنی ہزار خوش قسمتی سمجھئے کہ آپ کو یہاں تک الفاظ کے توسط سے باریابی نصیب ہو گئی، مگر اب اس سے آگے "لاتجسسوا" کی قطعاً ممنوع حدود واقع ہیں۔ بہر حال سنئے:

میری پرستش اور تیری بزم ناز!
آفریں اے شاہد عاشق نواز!

میں سراپا خاک اور میرے لئے
سلسلہ جنبانیٔ راز و نیاز!

مل نہیں سکتی کہیں اس کی نظیر
بینوا بیمار، سلطان چارہ ساز!

اک مرے دل کی تسلی کے لئے
زلزلے میں ہے تری تمکین ناز

یہ ترا دل اور یہ سوز نہاں!
یہ ترا حسن اور یہ ضبط حرف راز!

یہ ترا رخ اور رنگ خستگی
یہ ترے لب اور حدیث سوز و ساز!

تیرا سینہ اور میری آرزو!
میری محفل اور تری شمع ناز!

تیرا دل اور درد پنہاں کی خلش!
تیری آنکھیں اور اشک دلگداز!

تیری طبع ناز اور آشفتگی،
تیرا پہلو اور خراش سوز و ساز!

کلفت بیچارگی اور تیری جان
گرد حرمان اور تری زلف دراز!

سرخیٔ دوشیزگی و خون دل!
پیکر ناز و غم طاقت گداز!

خال حسن اور سوزش داغ جگر!
زلف اور اندیشۂ دور و دراز!

اس سے تو یہ بات بہتر تھی کہ تو
کاش ہوتی بے وفا و حیلہ ساز!

تا نہ ہوتیں دل پہ دہری سختیاں
حسن کا غم، عشق کا سوز و گداز!

اس کے دل سے پوچھے غم کا مزا
"دلشکن" جس کے لئے ہو "دلنواز"!

تیرا بندہ اک عجب عالم میں ہے
رحم فرما اے کریم کارساز!

مفت "دو جانیں" تلف ہو جائیں گی
سن رہا ہے اے خدائے بے نیاز!

ابر میں ہے سنگباری کی گرج،

آئینوں کو دیکھ لے آئینہ ساز!

(۱۴۳) جوشؔ نے کم از کم ایک نظم ایسی کہی ہے کہ اگر وہ ہندوستان کے جہادِ آزادی کے کامیاب خاتمے تک جیا اور خدا اُس کو اُس کے زندۂ جاوید نام کی طرح تا دیر سلامت رکھے) تو یقیناً اُس کے سر پر "شاعرِ ملت" کا "تاجِ گل" رکھا جائیگا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت اُس کے اعزاز میں ایک "جشنِ ادبی" منائیگی۔ جوشؔ ایک شاعرِ فطرت اور ایک انسانِ کامل ہے۔ حساس و لطیف انسانیت کے سارے عناصر ہر ساعت اُس کے دل و دماغ میں بیدار رہتے ہیں اور اس لئے وہ ایک سیاسی مذاق اور حریت پرستانہ مزاج رکھتا ہے۔ ہندوستان کی نکبت و مسکنت کے متعلق کسی لباسِ شعریت کے اندر جب کبھی اُسکی نظر کا تصادم کسی دردانگیز منظر سے ہوگیا ہے تو اُسکا آبگینۂ قلب و روح چکنا چور ہوگیا ہے! اسی نوع کے پارہائے بلوریں و رنگیں کو اُس کی ایک نظم میں دیکھئے جو جوشؔ نے کسی "گدڑی کے لعل" پر لکھی ہے:

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بیقرار — چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار!
چوڑیوں کے "ساز" میں یہ درد ہے کیسا بھرا — آنکھ میں "آنسو" بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا!

گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں — کمسنی سوئی ہوئی ہے دیدۂ غمناک میں!
دھوپ میں ہے یہ نکھری سا رنگ سنولایا ہوا — کس سے دیکھا جائیگا چہرہ یہ کملایا ہوا؟!

اُف یہ ناداری؟! مرے سینے سے اٹھتا ہے دھواں! — آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں!
حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے؟! — دستِ نازک اور پتھر پھوڑنے کے واسطے؟!
آسمان رنج طرب کو وقفِ مجبوری کرے — "صنفِ نازک" بھوک سے تنگ آکے مزدوری کرے!
سر یہ ہو مجبور وہ پتھر اٹھانے کے لئے — جس کے نرم اعضا ہوں پھولوں میں بسائے گئے!

جھک رہی ہو وہ اتھا ٹھیں التجا کے واسطے جن کو فطرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے!
نازکی سے وہ لب تر ہیں تکلم کے لئے جن کو فطرت نے تراشا ہو تبسم کے لئے!
کاکل شبرنگ اور افشاں خس و خاشاک کی روئے زیبا اور تعاب افسوس جلتی خاک کی!

نازنینوں کا یہ عالم! مادر ہند آہ! آہ! کس کی چالوں نے یہ کردی ہے تری حالت تباہ؟
کیوں ترا گلزار دوزخ کا نمونہ ہوگیا آہ کیوں تیرا بھرا دربار سونا ہوگیا!
برکتیں تھیں سایہ افگن تیری ارض پاک پر من برستا تھا کبھی اے ہند تیری خاک پر!

اے خدا! ہندوستاں پر یہ ہلاکت تابکجا؟ ہم پر آخر جہل و نکبت کی حکومت تابکجا؟
گردن حق پر خراش تیغ باطل تابکے؟ بیکسوں کے واسطے طوق سلاسل تابکے؟

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے!

الغرض جوش کے کلام میں بلا امتیاز و تفریق قریباً ہر چیز ایسی ہی حسین و رنگین ہے۔ اس کے کلام کے نمونے نقل کرنے میں "انتخاب واقتباس" کے الفاظ خارج از بحث ہیں، اس لئے کہ اس کی ہر ہر سطر اور ایک ایک لفظ "منتخب" ہے۔ سارا مجموعہ کلام اس حقیقت کا مصداق ہے کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست!

جوش کے کلام میں میں نے طویل و مسلسل حصے نقل کئے ہیں۔ مجھکو اس امر کا احساس ہے کہ اس میں "نقد و نظر" کے آداب سے تجاوز کیا گیا ہے لیکن میرے پاس اس کا ایک عذر ہے کہ

لذیذ بود حکایت دراز ترگفتم!

جوش کے رشحات قلم کا مطالعہ کیجئے اور اُس کو دوسروں سے روشناس کرانے کا ارادہ کیجئے تو ایک مبسوط مجموعے میں بہ شکل ایک چیز بھی نظر آئے گی جس کو اخذ و نقل کے وقت قلم انداز کرنے کو جی چاہے! لیکن کسی رسالے کے ایک متوسط "مضمون" کو "کتاب" نہیں بنایا جا سکتا اسلئے اس حسرت آمیز احساس کے ساتھ اس "طلسمات شعر و سحر" کو خیرباد کہنا پڑتا ہے کہ:

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز دامان گلہ دارد!

جدید علم کلام کی اسکیم پر نظر

(۱) رسالہ جامعہ دہلی کے جون [illegible]ء کے پرچہ میں ایک مضمون بعنوان "جدید علم کلام" قاری سرفراز حسین صاحب کی جانب سے شائع ہوا تھا اتفاقاً میری نظر پڑ گئی اُٹھا کے دیکھنا شروع کیا اُس میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ جدید علم کلام کے ترتیب دینے میں کیا کیا امور پیش نظر رہنا چاہئیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس عنوان سے مضمون کی اُٹھان ہے وہ اس قدر دلفریب ہے کہ کوئی آنکھ اس سے محروم رہنا پسند نہ کرے گی مگر افسوس ہے کہ اس کو پڑھ کر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پڑھنے والے کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا اس مضمون میں علم کلام کی جدید اسکیم پیش کی گئی ہے یا اجتہاد کے فرعی مسائل کی اصلاح مدنظر ہے یا محض عبارت آرائی ہے۔

(۲) اس میں شک نہیں کہ آج جب کہ فلسفۂ قدیم کا عہد زینت طاق نسیاں ہے۔ ہمارا قدیم علم کلام بھی زیادہ تر بیکار نظر آ رہا ہے اس لئے کہ علم کلام کے مدون کرنے کی غرض ہی اصل میں یہ تھی کہ دہریت اور فلسفیت محض کا جو عقل انسانی ہی کا نتیجہ ہے، استیصال اس طریقہ سے کیا جائے کہ انہیں کے مسلمات سے اُن پر احتجاج کیا جائے چنانچہ متکلمین اس میدان میں بہت کامیاب ثابت ہوئے اور انہوں نے فلسفیوں کی ترقی میں رکاوٹیں ہی نہیں پیدا کیں بلکہ گویا معدوم کر دیا لیکن آج وہ علم کلام ہمارے کام نہیں آتا اس لئے کہ جدید فلسفہ کی رد میں جتنے خس و خاشاک آتے ہیں وہ اس قدر نئے کہ پرانی تحقیقات پر کسی طرح ٹھیک نہیں اترتے سائنس نے آج جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اور تجربہ اور مشاہدہ نے خیالات میں جو عظیم تغیر پیدا کر دیا ہے وہ جزلایتجزی اور ہیولیٰ کی خیالی بحثوں سے کہیں بالاتر ہے۔ خرق والتیام فلک کے مسئلہ کا ذکر ہی اب ایک کہانی معلوم ہونے لگا ہے، پس اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ ہمیں ایک جدید علم کلام جو آج کل کے مادیین اور دہریین کا استیصال کر سکے ترتیب دینا چاہئے۔

تاکہ ان مباحث کا ہم سے آئے دن سابقہ رہتا ہے۔ ہم پورے طور سے اس کے ذریعہ مذہب کی حمایت کر سکیں۔ مگر اس پر کچھ لکھنے سے پہلے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ علم کلام کا موضوع کیا ہے اور کن چیزوں سے اس میں بحث کرنا چاہئے۔

(۳) علم کلام کا موضوع "خدا" ہے۔ جو چیزیں خدا سے متعلق ہیں وہ سب اس میں آ جاتی ہیں۔ پس اس صورت میں اگر علم کلام کو دیکھئے گا تو اس کے مباحث توحید نبوت اور معاد تک ختم ہو جاتے ہیں یہ تو عامہ اسلام کے خیال کی بنا پر عرض کیا گیا اور امامیہ دو چیزیں اور اضافہ کر دیتے ہیں ایک عدل دوسرے امامت اس تمام تعریف کا ماحصل صرف یہ ہوا کہ علم کلام میں خدا کی ذات صفات اس کے انبیاء اور عدالت اور اس کے عذاب و ثواب سے بحث ہوتی ہے بنابریں جتنی چیزیں علم کلام میں ذکر کی جاتی ہیں وہ عقائد سے متعلق ہیں۔

(۴) جب یہ بتا چکا تو اب مجھے قاری صاحب موصوف کے مندرجہ ذیل تینوں نظریوں کو دیکھنا ہے کہ انکا تعلق علم کلام سے ہے یا نہیں۔

(۱) اسلام ساری دنیا کے لئے ہے نہ کسی خاص ملک کے لئے۔

(۲) اسلام کی تعلیم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔

(۳) اسلام ساری دنیا کے لئے نجات اخروی اور دنیوی کا واحد اکمل ذریعہ ہے۔

مذکورہ تینوں نظریوں کو جب علم کلام پر مطابق کیا جاتا ہے تو ان میں سے کسی کا تعلق اس سے نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ تعلیمات اسلام دو قسم پر منقسم ہیں ایک تو عمل سے تعلق رکھتے ہیں دوسرے محض اعتقادات سے۔ آپ کے مذکورہ نظریوں کو دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں نظریوں کا تعلق زیادہ تر عمل سے ہے۔ ورنہ محض اعتقاد کے لئے ان تینوں نظریوں کے ماتحت دلائل کی بھرمار کرنا ایک بے سود بات ہے۔

اس لئے کہ وہ ایک چیز ہے جو محض قلب تک محدود ہے اور وہ کسی وقت کسی زحمت کا باعث نہیں ہو سکتی۔ اس کا یقین و اعتقاد ہر وقت ہر جگہ ممکن ہے البتہ دلائل کی ضرورت پڑے گی جو نظرات

ے مطالعہ پر موقوف ہو لہذا اب علم کلام میں اُن تینوں چیزوں کا لحاظ کرنا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ایک
ے سی ہی بات ہو۔ البتہ صرف ایک بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ قدیم علم کلام انہیں لوگوں کے لئے مفید
ہو سکتا ہے جو فلسفۂ قدیم کا مذاق رکھتے ہیں یا واقف ہیں یا صحیح جانتے ہیں ہر شخص اس سے فائدہ نہیں
اٹھا سکتا لہذا ہم کو ایک علم کلام ایسا ترتیب دینا چاہئے جس کے اصول مسائل فلسفۂ جدید پر مشتمل ہوں جو
اس زمانہ کے لئے بھی کافی ہو سکے۔

رہ گئی فروع اور فقہیات کی ترمیم تو وہ علم کلام سے تعلق ہی نہیں رکھتی البتہ تعلیم عملی کی حیثیت
سے اگر اصلاح کیجائے یا زیادہ وسعت نظر سے کام لیا جائے تو یہ محض اجتہادی ہوگی تاہم اس میں
بھی اصول اربعہ کا خیال اور لحاظ لازم ہوگا بالفاظ دیگر قرآن حدیث عقل اجماع اور بنا بر اقوال سواد اعظم
اسلام قیاس سے کام لینا پڑے گا اور اس کے علاوہ اگر کسی شے سے کام لینا ہو تو اس کو پہلے تمام
فرق اسلام کے سامنے لا کر طے کر کے اور معین کر کے کام لیا جا سکے گا۔ پس اگر مذکورہ اصول کے ذریعے
سے استنباط کیا جائے اور سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تو صحیح ہوں گی ورنہ نہیں۔

(۵) اب مجھے قاری صاحب موصوف کے مضمون پر ایک تفصیلی نظر ڈالنی ہے۔

یہ امر پہلے سے مسلم ہے کہ اسلام کی تعلیم وہ تعلیم نہیں جس کو کوئی شخص کسی وجہ سے تبدیل کر سکے
نہ وہ کسی خاص مقام اور خاص وقت کے لئے نہیں نہ وہ مشترک بمذاہب دیگر ہے (اگر مشترک بمذاہب
دیگر سے مراد محض عام انسانی اخلاق ہیں تو وہ البتہ کہے جا سکتے ہیں لیکن اگر وہ مراد نہیں تو کم از کم کسی
مثال سے واضح کرنے کی ضرورت ہے ورنہ میری نظر میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے) بلکہ تعلیمات اسلام
تمام تر نجات دنیوی اور اخروی کی ذمہ دار ہیں خواہ وہ تعلیم عملی ہو یا غیر عملی اسلام نے اپنے احکام میں
وہ کلیہ معین کر دئے ہیں کہ ہر شخص چاہے جہاں ہو اور جیسے وقت میں ہو تمام کو پورا کر سکتا ہے تکلیف
مالایطاق اسلام کی تعلیم کا عنصر نہیں، البتہ تمام کلیوں کی تخصیص موضوع شریعۃ کا کام نہیں۔ انسان
موقع اور محل کو سمجھے اور اپنا کام کرے۔

اُس نے کچھ چیزیں مکروہ کچھ حرام کچھ سنت کچھ واجب قرار دی ہیں جن کی مکمل فہرست

بیان کردی ہے اب بھی اگر کسی کو دقت ہو تو اس کی ذمہ دار شریعت اسلامیہ نہیں ہو سکتی۔

البتہ بعض جزئی چیزیں ایسی ہیں جن کو اوقات یا مقامات سے مخصوص کیا گیا ہے اور وہ محض :
اس لئے کہ اسلام ساری دنیا کے لئے آیا ہے ایک جگہ کے لئے نہیں پس اس کو ضرورت تھی کہ ہر ملک اور ہر وقت کا لحاظ کرکے احکام مرتب کرے اور ایسا ہی کیا۔

(۶) آپنے پیراگراف نمبر۲ میں ارشاد کیا ہے کہ ید اللہ فوق ایدیہم۔ اینما تولوا فثم وجہ اللہ کی بحث یا خلق قرآن اور اس کے حدوث و قدم کی بحث فضول ہے میرے خیال میں آپ نے اس بارے میں بھی دقت نظر سے کام نہیں لیا اصل یہ ہے کہ ان تمام مباحث کو اس لئے عالم میں پیش کیا گیا کہ ذات و صفات الٰہی پر انکا اثر پڑتا ہے اس کی جسمیت اسکی حدوت و قدم کا عکس ان تمام مباحث میں نظر آتا ہے آپ اگر ایک ذرا دقیق نظر سے کام لیجئے گا تو میں جو عرض کر رہا ہوں وہ شاید ایک حد تک صحیح ثابت ہو۔ میرے خیال میں اگر آپ کا فرمانا صحیح ہوتا تو کبھی اس کا اثر عقیدۂ الوہیت پر نہ پڑتا۔

(۷) عبادات کے مسئلہ میں بھی آپ کے خیالات کی تائید کسی طرح نہیں کیجا سکتی۔ اس مسئلہ پر آپنے جس سہولت کے بہم پہنچانے کی خواہش کی ہے وہ بس اسی حد تک رہ سکتی ہے جہانتک میرے مذکورہ پانچ اصول مساعدت کریں لیکن دقت یہ ہے کہ آپ کو مسلمات میں ترمیم مدنظر ہے جو خیال سے بھی بالاتر ہے۔

(۸) اسی کے ساتھ آپ نے قرآن مجید کی تلاوت بغیر معنی سمجھے ہوئے پڑھنے پر بھی اعتراض کیا ہے اور اسکو ناجائز ٹہرانے کی کوشش کی ہے میرے خیال میں یہ سخت غلطی ہے اس لئے کہ اسلام کا ہر حکم قیامت تک کے لئے ہے قرآن مجید کی حفاظت کا یہ ایک سیاسی عنوان تھا ورنہ اگر تلاوت قرآن رائج کی گئی ہوتی تو آج قرآن نہ اس قدر شائع ہو سکتا بلکہ تحریف ہوتے ہوتے اس کی اصل کی جگہ مفتریات رہ جاتے اور جو حشر آج انجیل کا ہوا ہے وہی ہو جاتا۔ آپ کو جواب دیا گیا ہے کہ ذکر کے لئے معنی سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں بالکل صحیح ہے اس لئے کہ اگر ہر ذکر کے لئے معنی کا سمجھنا ضروری ہو تو نماز کی تمام دعائیں اور سورتیں پڑھنا بلکہ خود نماز بیکار رہے گی۔

(۹) پیراگراف نمبر۶ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "کوئی ایسا راستہ نکالنا پڑے گا جس کی رو

ے شیعہ سنی کے پیچھے اور سنی شیعہ کے پیچھے نماز ادا کر سکے اور اسی کے تحت میں یہ بھی طے ہو جائے کہ مسلمان اگر چاہیں تو کسی وقت کی نماز مثلاً شافعی طریقہ سے اور کسی وقت حنفی کسی وقت مالکی کسی وقت حنبلی طریقہ سے پڑھ سکیں"

اس تمام گفتگو سے مقصود اتحاد معاشرت ہی ہیں آپ کی نیت کی داد ضرور دوں گا مگر یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ کاش آپ نے اصول کو ایک کرنے کی کوشش کی ہوتی اور ان چاروں مذہبوں کے بنیادی اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی ہوتی تو آپ کی ساری امیدیں بر آتیں اگر اصول ایک کر دئے جائیں تو فروع خود بخود درست ہو جائیں گے۔ اصول استنباط مسائل امامیہ کے نزدیک قرآن حدیث عقل اجماع چار چیزیں ہیں اور اہل سنت کا حنفی فرقہ قیاس کی اور زیادتی کرتا ہے اگر ان تمام اصول کو ایک کر دیا جائے تو ہرگز تفرقہ باقی نہ رہے گا اس لئے کہ جب اصول ہی ایک رہیں گے تو مسائل کا استنباط خود بخود تفرقہ کو مٹا رہے گا اب جو چیز باقی رہ جائیگی وہ یہ کہ محض جزئی امور میں نظر کی وسعت اور کمی کی وجہ سے تفرقہ رہ جائیگا لیکن بہت ہی کم اور معمولی۔

(۱۰) اسی ضمن میں یہ بھی کہتا چلوں کہ آپ نے جو تجویز جماعتی اجتہاد کی پیش کی ہے وہ بھی بالکل بے جا بات ہے اس لئے کہ جس وقت اصول استنباط جدا گانہ ہوئے تو ان لوگوں میں اگر جماعتی اجتہاد ہو بھی تو فرع نفلی رہ جائیگی اور کوئی ایک مسلک پھر بھی نہ طے ہو سکے گا ہاں اگر اصول ایک ہوں مثلاً قیاس کو ہر فرقہ جائز جانتا ہو تو البتہ یہ ممکن ہے کہ جماعتی اجتہاد دلائل اور ثبوت پیش کر کے ایک معین اور صحیح راستہ پیدا کر سکے یہ اور بات ہے کہ اصول ہی جماعتی حیثیت سے طے ہو جائیں تو پھر اختلاف کیسا اور اس میں اصلاح کی کوشش کیا۔

اگر ایسا ہو تو قرآن مجید کے اوپر پورا پورا عمل ہی نہ ہو جائے اور خدا کرے کہ وہ دن دیکھنے میں آئے کہ جب تمام عالم ایک راستہ پر ہو۔

لہٰذا جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ اصول استنباطیہ ہوں اس وقت تک نہ مصلی ہائے خانہ کعبہ کی تشکیل ہو سکتی ہے اور نہ اتحاد معاشرت۔

(۱۱) ایک نئی شے آپ نے ایجاد کی ہے کہ ٹیکس کی رقم زکوۃ میں محسوب کئے جانے کی کوشش کیجائے،، یہ ایک ایسی بات ہے جو اسلام کی تعلیم میں وقتی ترمیم کی موئد ہے اگر ایسا کیا جائے تو ہر سلطنت کے انتظامات کو دیکھکر احکام اسلام میں مختلف تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی اور اس لئے تعلیمات اسلام قیامت تک کے لئے نہ ہونگی۔

اسی لئے شریعت اسلامیہ نے زکوۃ وخمس کے لئے شرائط بیان کر دیئے ہیں تاکہ زحمتوں کا سامنا نہ ہو۔ اور آج مجھے فی صدی ۱۰ ایسے نہیں دکھائی دیتے جو زکوۃ ادا کرتے ہوں پھر کوشش کس کے لئے۔

(۱۲) پیرا نمبر میں تعلیم عام تعلیم نسواں پردہ انتظام نکاح وغیرہ میں مذہب اور رواج کے خلط ملط کا ذکر کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ اسکو علٰحدہ علٰحدہ کرکے رواجی چیزوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔
میرا خیال آپ سے بالکل متفق ہے مگر محض ڈاکٹر ڈنکن کے خیالات سے کامل اتفاق نہیں رکھتا، طلبہ اور استادوں کی معاشرت پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ایسے ہیں جن پر بحث کی ضرورت ہے تاہم صرف اتنا کہ استاذوں کی تعظیم اور انکی اطاعت یہ ایک اخلاقی جوہر ہے اس کو بیہودہ کے ترک کیا جائیں متمدن دنیا کی بات چیت ہی اور ہے۔

بڈھا سُودخوار

بڈھا سود خوار لالہ سدھا مل لکڑی ٹیکتا، آہستہ آہستہ قدم دھرتا گلی سے گذر کر اپنے مکان میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر حسب معمول زور سے کراہا، پھر ذرا لنگڑاتا ہوا سامنے کے دالان میں چلا گیا، اور ایک کُھرّے تخت پر بیٹھ گیا۔ کچھ دور پلنگ پر اس کی بیوی ستیلا ایک پھٹا دوشالہ اوڑھے خاموش لیٹی تھی۔ پلنگ کا بچھونا بہت میلا تھا۔ پائنتی سدھا مل کی لڑکی سندری جس کی عمر نو سال کی ہوگی بیٹھی بیمار ماں کے پاؤں دبا رہی تھی۔ پلنگ کے پاس ایک مٹی کا برتن راکھ سے بھرا ہوا رکھا تھا جس میں تھوک اور بلغم پڑا تھا، اور اس پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ بڈھے کی سانس چڑھنے لگی تھی اسی لئے تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا

یہ ٹانگ کا درد میری جان لیکر رہیگا۔ ۔ ۔ ۔ گورکھ کے پتے پلائے تھے۔

ستیلا۔ ہاں پیے تھے،

سندری۔ اس وقت بھی پلائے تھے، مگر پتا جی اس سے کچھ فائدہ ہوتا معلوم نہیں ہوتا صبح سے پھر جاڑا دے کر بخار آگیا۔ اس وقت تو اتنا تیز ہے کہ بدن پر ہاتھ رکھو تو جلنے لگتا ہے۔

سدھا مل۔ فائدہ دینا نہ دینا تو بھگوان کے اختیار میں ہے۔ لوگ سینکڑوں روپئے دواؤں میں خرچ کر ڈالتے ہیں اور پھر بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ لالہ جگن ناتھ کہتے تھے کہ ایک دفع انکے گاؤں میں بخار پھیلا، آدھا گاؤں تہس نہس ہوگیا۔ کسی ڈاکٹر وید کے کئے کچھ نہ ہوسکا تب کہیں سے ایک سادھو آگیا جس نے لوگوں کو گورکھ کے پتے بتائے۔ لوگوں نے پینا شروع کئے۔ آٹھ ہی دن میں سب چنگے ہوگئے۔ بزرگوں کی زبان میں بھی عجب تاثیر ہوتی ہے"

یہ کہکر سدھا مل کراہا اور اپنی ٹانگ کی کل بدلی۔

سندری۔" پتا جی اماں کے پینے کے لئے عرق منگوا دیجئے۔ پیاس بہت ہے اور پانی پیتی ہیں تو کلیجہ

میں لگتا ہے۔

سدھامل۔ عرق بھی کلیجے میں لگے گا۔ اور دوسرے گولر کے پتوں کے ساتھ پانی ہی پیا جاتا ہے۔"

یہ کہکر سدھامل پھر کراہا۔ سندری اٹھ کر باورچی خانے چلی گئی اور ایک تھال میں تین موٹی موٹی روٹیاں تھوڑے آلو، ایک پیالی بھر چٹنی اٹھالائی اور پاس رکھ کر بولی۔

پتاجی مصرانی نے کہلا بھیجا ہے کہ میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اس لئے میں بھی نہیں پکا سکی۔

سیتلا۔ وہ کل ہی کہہ رہی تھی کہ مجھ سے دمڑی دمڑی کا حساب نہیں دیا جائیگا۔ میں نے چھوٹے بڑے سبھی گھروں میں نوکری کی ہے مگر کہیں تیل اور مسالے کا حساب نہیں دیا۔

سدھامل۔ ہاں پیسے خرچ کروں مگر حساب نہ لوں؟ تم ہمیشہ پکاتی رہیں۔ موسی نے اتنے دنوں پکایا ہمیشہ سیر بھر تیل دس روز میں خرچ ہوا۔ انکو ابھی آئے چھ ہی روز گذرے تھے کہ سر پر موجود۔ لاؤ تیل کے پیسے۔"

سیتلا۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں یا موسی بھی تمہارے خیال سے کبھی تیل زائد ڈالتی تھی؟ مصرانی ان باتوں کو کیا جانے؟ اس نے جتنا ڈالنا چاہئے اتنا تیل ڈالا۔

سدھامل۔ تم ہر بات میں میرا ہی قصور نکالتی ہو۔ میں نے مصرانی سے کہا تھا کہ تیل زائد ڈالو۔ بابا مجھ سے اتنا خرچ نہیں برداشت ہو سکتا۔ تنخواہ کی تنخواہ، پھر اتنا خرچ۔ نہ میں نے کبھی مار کھی اور نہ رکھ سکتا ہوں جب تک تم بیمار ہو سندری دال بھات پکا لیا کرے گی۔ سندری! راجو کے لئے بھی کچھ رکھا ہے۔

سندری۔ کہاں پتاجی! چار روٹیاں رات کی رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بھیا اسکول جاتے وقت کھا گئے۔ تین بچی ہیں۔

سدھامل۔ اچھا لو میں اس وقت کم ہی کھاؤں گا۔ دو روٹیاں اور یہ آلو راجو کے لئے رکھ دو۔

سدھامل جلدی سے کھا کر کھڑا ہو گیا۔ سندری برتن اٹھالے گئی۔ وہ کلی کرکے پھر تخت پر بیٹھ گیا

سننے میں سیتلانے پانی مانگا۔ اور پی کر بولی۔

"سیدھا جاکر کلیجے میں لگتا ہے۔"

سدھا مل کچھ سوچ کر بولا "لے سندری گوپال کو بلا کر اپنی ماں کے لئے عرق منگوالے۔"

سندری اپنے چچا زاد بھائی گوپال کو بلانے کوٹھے پر چلی گئی۔ سدھا مل اور اس کے بھائی کا مکان ملا جلا تھا۔ بیچ میں ایک کھڑکی تھی۔ مگر آپس کی ناچاقیوں کی وجہ سے چن دی گئی تھی۔ اب کوٹھے پر ایک سوکھا سا تھا جس سے عورتیں باتیں کر لیا کرتی تھیں۔ سندری نے اسی سوکھے سے گوپال کو پکارا اور پھر نیچے آئی۔ دیکھا تو سیتلا بیٹھی کھانس رہی ہے۔ سندری نے دوڑ کر سنبھال لیا۔ کھانسنے میں سیتلا کا سر اور سینہ برابر جھکولے لیتا رہا۔ جب بہت سا تھوک اور بلغم گر لیا تب اس کو تسکین ہوئی اور پلنگ پر آنکھیں بند کرکے لیٹ گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سانس سنبھلی تو گوپال کی طرف متوجہ ہوئی جو دیر سے کھڑا تھا۔

سیتلا۔ "گوپال"۔

گوپال۔ "کیسی ہو چاچی؟"

سیتلا۔ ویسی ہی ہوں بیٹا۔ موسی کیسی ہیں؟

گوپال۔ صبح سے دست آرہے ہیں۔ چار آچکے ہیں اور ابھی تک بند نہیں ہوئے۔ حکیم جی نے ایک دوا بتائی ہے وہ پلائی ہے۔

سیتلا۔ "بھگوان شفا دے۔ بچاری ہاتھ پیر سے معذور ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں تو آٹھ روز سے بالکل چل پھر نہیں سکتی ورنہ ضرور دیکھنے آتی۔ بیٹیا ذرا میرے پینے کے لئے عرق لادے۔ بوتل وہ سامنے طاق پر رکھی ہے۔ پیسے اپنے چاچا سے لیلے۔"

سدھا مل۔ لو بیٹیا۔ دو پیسے کا عرق لادو

سندری۔ بپاجی ایک بوتل منگوا دیجئے۔

سدھا مل۔ ایک بوتل! ایک بوتل کیا ہوگی۔ کچھ پانی پلانا کچھ عرق۔

سیتلا۔ رہنے دے سندری۔ انکے جی سے چار پیسے تھوڑی نکلیں گے۔

سدھامل۔ چار پیسے کیسے کہوں آٹھ پیسے دیدوں۔ دس پیسے دیدوں۔ مگر ضرورت بھی تو ہو۔ پوری بوتل ہی لادے۔

گوپال پیسے اور بوتل لے کر چلا گیا۔ سدھامل پیسے دیکر بولا۔

کوئی میں اپنے پیسہ پیسہ جوڑتا ہوں میں خود تانگ کے درد سے مرا جاتا ہوں اور تیری بیری بنائی ہوئی دوا کرتا ہوں۔ کبھی یہ نہ کیا کہ چار روپے کی دوا کسی ڈاکٹر سے لی ہوتی۔ اگر ایسا کرتا تو آج لڑکی اور لڑکے کے بیاہ کے لئے ایک پیسہ بھی نہ ہوتا۔

ابھی سدھامل کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا لڑکا راجو آگیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک اسٹول اور ایک میز پڑا ہوا تھا میز پر ٹاٹ بچھا تھا، دو تین کتابیں آٹھ دس کاپیاں۔ دیاسلائی کی چند ڈبیاں۔ ایک لالٹین۔ دفتی کے دو تین ڈبے۔ میز کی آرائش تھے دیواروں پر اخبار سے کاٹی ہوئی تصویریں چپکی ہوئی تھیں۔ ایک آدھ پرانے کیلنڈر لٹکے ہوئے تھے۔ راجو نے کپڑے اتار کر وہیں ٹانگ دئے اور پھر باپ کے پاس آکر بولا

راجو۔ ماسٹر صاحب نے ایک نئی کتاب بتائی ہے اور کہا ہے اس کو ضرور خرید لو ورنہ ابکے فیل ہو جاؤگے

سدھامل۔ ابھی شروع سال میں پانچ روپیہ کی کتابیں خرید دی تھیں۔ اب یہ نئی کتاب کیسی؟

راجو۔ اس کتاب کی بہت ضرورت ہے۔ ماسٹر صاحب نے سب لڑکوں سے کہا ہے کہ کل لیتے آنا۔

سدھامل۔ کتنے کی لے گی؟

راجو۔ ساڑھے چودہ آنے کی۔

سدھامل۔ بیٹا ماسٹر کو بکنے دو یہ لوگ ایسے ہی کہا کرتے ہیں۔ ہم تم کو پڑھنے کی کیا ضرورت گھر میں کیا کھانے کی کمی ہے۔ میں تو آج کہتا ہوں پڑھنا چھوڑ دو اور اپنا کام دیکھو بھالو۔ میرے کئے اب نہیں ہوتا۔

راجو۔ پتاجی تمہاری تو پیسے کے نام سے جان سوکھتی ہے۔ چودہ آنے کون بہت ہوتے۔ جہاں ہم

سنے دو پیسے بھی مانگے تم کہنے لگے ہو پڑھنا چھوڑ دو۔ پڑھنا چھوڑ دو۔ یہ جو جوڑ جوڑ کر ہزار دل رکھا ہے کس کام آئے گا۔ لعنت ہے ایسے روپیہ پر جو اپنے کام نہ آئے۔ جاہل کی بھی آج کل کوئی عزت ہے؟ بابو بہاری لعل کو دیکھو چھوٹی سی دوکان، معمولی آمدنی مگر اپنے دونوں لڑکوں کو خوب پڑھوا رہے ہیں۔

سدھامل۔ تم ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہو۔ میں نے کب کہا تھا کہ نہیں دونگا۔ کل پرسوں تک لے لینا ابھی میرے پاس نہیں ہے۔

راجو۔ ضرورت آج ہے اور لینا پرسوں تک۔ انکے پاس چودہ آنے پیسے نہیں ہیں۔ اور وہ بھی جب مل جائیں تب یقین آئے۔ وعدہ تو کر لیتے ہو دینے کا نام نہیں لیتے۔

سدھامل۔ پانچ روپے کی کتابیں نہیں منگوادی تھیں؟

راجو۔ اسکے بھی تو منگوادینے کا وعدہ کیا تھا۔

سدھامل۔ بیٹا تم تو سمجھتے نہیں۔ کل ضرور پیسے دیدوں گا۔ میں جو کچھ کرتا ہوں تم ہی لوگوں کی خاطر کرتا ہوں۔ پیسہ یوں ہی جمع ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ کرتا تو آج تمہارے چچا کی ایسی حالت ہوتی۔ چھوٹی سی دوکان۔ آمدنی کم، خرچ زیادہ۔ پیسے پیسے کو محتاج۔

یہ کہکر سدھامل کراہا۔ اتنے میں گوپال عرق کی بوتل لایا۔

سدھامل۔ ذرا میں عرق دیکھوں (سونگھ کر) معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے اس میں پانی ملا دیا ہو۔ کتنے کا لائے ہو؟

گوپال۔ جتنے پیسے آپ نے دئے تھے۔

راجو۔ بس رہنے دو پتاجی۔

سدھامل۔ تھوڑا تھوڑا پینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل پھر کہو کہ ایک بوتل اور منگوا دو۔

راجو۔ ماں کو ڈاکٹر رام بہاری کو دکھا دو۔ ہومیوپیتھک کی دوائیں سستی ہوتی ہیں۔

سدھامل۔ خاک سستی ہوتی ہیں۔ نو پیسے روز سے کم کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ پھر ڈاکٹر کی فیس الگ دینا

پڑتی ہے۔ علاج کرنا ان لوگوں کا کام ہو جس کے پاس اڑانے کو روپیہ ہو۔ اگر ہم یہ کہتے تو آج وہی ذراسی دوکان دس روپیہ آمدنی کی ہوتی۔

یہاں پہنچ کر سدھا مل کراہا پھر بولا۔

بیٹا! علاج سے کچھ نہیں ہوتا۔ صحت ہونا بھگوان کی مرضی پر ہے۔ لالہ خوشحال چند نے ہزار دل روپیہ پانی کی طرح بہا دیا مگر نہ اچھے ہوئے۔ علاج تو ایک بہانہ ہے۔ پھر وہ اچھے بھی ہوئے تو کسی کی تانائی ہوئی دو پیسے کی دوا سے۔ مجھ ہی کو دیکھو۔ مرتا ہوں مگر علاج نہیں کرتا۔

سدھا مل نے کراہ کر اپنی ٹانگ کی کل بدلی۔

گوپال۔ ماں نے پوچھا ہے اب تمہاری ٹانگ کیسی ہے؟

سدھا مل۔ کیسی بتاؤں بیٹا۔ کہدینا ویسی ہی ہے۔

گوپال دوڑتا ہوا چلا گیا۔

سدھا مل۔ یہ عرق چار پیسے کا ہرگز نہیں ہو۔ تین پیسے کا ہے باقی لڑکے نے پانی ملا دیا۔ ذرا ٹھہر گئی ہوتیں کہ راجو آجاتا تب منگاتیں۔

راجو۔ تم کو تو کسی پر اعتبار نہیں۔ سندری کھانا لا۔

سندری اٹھ کر گئی اور تھال لا کر سامنے رکھ دیا۔

راجو۔ یہ کیا؟ آج کچھ پکا نہیں۔

سندری۔ بھیا مصرانی چلی گئی۔

راجو۔ وہ کل ہی کہہ رہی تھی کہ میرا اس گھر میں نباہ ہونا مشکل ہے۔ پتاجی جو نہ کرائیں سو تھوڑا ہے۔

سدھا مل۔ پتاجی ہی کو کہو گے۔ وہ آپ مرتے ہیں۔ مصرانی آپ ہی چلی گئی۔ کوئی میں نے بھگا دیا۔

راجو۔ تم نے۔ ماں نے اور پتاجی نے بھی کچھ کھایا۔

سندری۔ پتاجی نے ایک روٹی کھائی تھی۔ میں نے اور ماں نے کچھ نہیں کھایا۔

راجو۔ پھر تھال اٹھا لیجاؤ۔ اگر پتاجی کو کھلانا منظور ہو گا تو بازار سے پوریاں منگوا دینگے۔

سدھال کچھ سوچ کر بولا " لیتے آؤ۔ کتنی پوریاں۔

سیتلا۔ تم بھی تو بھوکے ہوگے۔ کہیں ایک روٹی میں پیٹ بھرتا ہے۔ سیر بھر منگوا لو۔

سدھال۔ میں اس وقت نہیں کھاؤں گا۔ چار آنے راجو کو دے کر، وہ اسکی پوریاں لے آؤ۔ باسی روٹیاں ملا جلا کر کام چل جائے گا۔ شام کو سندری دال بھات جلدی ہی سے تیار کرے گی۔

راجو۔ چار آنے میں آدھ سیر پوریاں ملیں گی۔ کیا میں کھاؤں گا اور کیا سندری اور ماں کو دوں گا۔ اب کیا بھوکوں مار کر پیسہ جوڑو گے۔

سدھال۔ (ایک کنی اور پھینک کر) لے بھائی اور لے جا۔ سمجھ میں نہیں آتا گھر ہے کہ سرائے۔ ادھر آئے ادھر شور مچا دیا۔ منگا دو، وہ منگا دو مجھ کو لوٹ لو۔ تباہ کر دو۔ مار ڈالو۔ آدمی کچھ نہیں۔ دو چار پیسے جو جمع ہیں انکے پیچھے سب پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی پارسال لڑکی کی رخصتی ہے۔ کہاں سے اتنا روپیہ آئیگا۔

راجو نے اکنی اٹھا کر کوٹ پہنا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیتلا بولی ذرا جا کر موسی کو دیکھ آؤ۔ وہ تم کو پوچھ پوچھ بھیجتی ہے۔ بچاری نے چار برس پکایا اب جو بیمار پڑی تو بھائی کے گھر چلی گئی۔ تم نے روکا تک نہیں۔

سدھال۔ اگر مر جاتی تو؟ مجھ کو تو کریا کرم کرنا پڑتا۔ اتنا کہاں سے آتا۔ کیا تم اپنے میکے سے لاکر کچھ دیدیتیں۔ ہر وقت موسی موسی کیا کرتی ہو۔ وہاں جاؤں اور وہ کچھ مانگ بیٹھی تو؟

سیتلا۔ میری موسی ہوتیں تو یہ بھی کرتی۔

سدھال۔ جیسے کبھی کیا ہے۔ آجتک دس روپے بھی میکے سے نہیں لائیں۔ کہنے کو تو سب میرے ہیں۔ مگر یہ کسی سے نہیں ہوتا کہ کچھ لا کر دیدے۔ جس کو دیکھو وہ اپنا ہی بھلا چاہتا ہے۔ بیٹا ہے تو۔ بیوی ہے تو۔ موسی ہے تو۔

بڈھا بکتا جھکتا دروازے کی طرف چلا۔

سیتلا۔ شام کو دو پیسے کے پان لیتے آنا۔ کل کی طرح بھول نہ جانا۔

راجو نے بازار سے چار آنے کی پوریاں خریدیں۔ ایک پیسے کی بڑی اور ایک پیسے کی روشنائی

کی ٹکیاں لیں۔ دو پیسے بچا کر اپنے پاس رکھے اور گھر کی طرف چلا۔ رستے میں اس کا ایک دوست رام چرن مل گیا۔

رام چرن۔ آج تم نے کلب کا چندہ دینے کو کہا تھا۔

راجو۔ کہا تو تھا۔ مگر تاجی نے آج نہیں دیا۔ کل دینے کو کہا ہے۔

رام چرن۔ دو مہینے کا چندہ چڑھ گیا ہے جلدی ہی دینا نہیں تو نام کٹ جائے گا۔ پھر فیس داخلہ بھی دینا پڑیگی۔

راجو رام چرن سے رخصت ہو کر گھر آیا۔ پوریاں سندری کو دیں۔ اس نے آدھی پوریاں تھال میں لگا کر سامنے رکھدیں۔ راجو کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے بولا۔

سندری یہ باسی روٹیاں تجھ سے نہیں کھائی گئیں۔ ایک روٹی یہ بھی کھالی ہوتی۔ میں ہی نے تاجی سے پیسے مانگے تھے اور مجھ ہی کو یہ بھی کھانا پڑے گی۔ میں پیسے نہ مانگتا تو پھر مزا معلوم ہوتا۔ دن ڈھلے بھوکی پڑی رہتیں۔

راجو یہ کہکر کھڑا ہو گیا کلی کر کے کوٹ پہنتا ہوا کتابیں ہاتھ میں لئے چلا گیا۔ کچھ اگل نگل کر سیتلا نے کھایا۔ جو کچھ باقی بچا سندری نے کھالیا۔

شام کو سدھال جب گھر آنے لگے تو ایک پیسے کے چھوٹے چھوٹے بہت سے پان سے لئے اور سوچا کہ گھر چل کر انکو دو پیسے کے بتاؤں گا۔

غزل

جناب مولٰنا کیفی چریاکوٹی

یہی گم ہو کے ہم کونین کا حاصل سمجھتے ہیں
کہ اس کوچہ کے ہر ذرہ کو اپنا دل سمجھتے ہیں

ہمارے دل پر اپنا نقش کھینچو نوک خنجر سے
سوا اسکے ہی جو کچھ اسکو ہم باطل سمجھتے ہیں

یہی ہے انتہائے وسعت صحرائے ناکامی
جہاں دل بیٹھ جاتا ہے اسے منزل سمجھتے ہیں

وفور شوق نظارہ سے آنکھیں بند کر لینگے
کہ ہم اپنی یہ خلوت آپ کی محفل سمجھتے ہیں

تری آنکھیں پھریں تو عمر مستی کٹ گئی ساقی
ترے کھنچنے کو میکش خنجر قاتل سمجھتے ہیں

میری عمر رواں سے ناخدائے دل یہ کہتا ہے
یہ کشتی آکے ڈوبے گی لب ساحل سمجھتے ہیں

کسی کروٹ جو دم لیتا نہیں تو شام فرقت میں
یہ ہوگی صبح محشر اضطراب دل سمجھتے ہیں

دل بیتاب کو لے کر چلے ہیں سوئے میخانہ
بقدر ظرف ہم ساقی کو دریا دل سمجھتے ہیں

سمجھ میں آ نہیں سکتا کسی سے اور کیا ہم میں
گدا تیرے تجھے کونین کا حاصل سمجھتے ہیں

نظر آتا ہے اس میں ہر طرف اک ذرہ بیگانہ
سیہ بختی کو اپنے آنکھ کا ہم تل سمجھتے ہیں

یہ کیف جوش بیتابی ہے چارہ گر نہ سمجھے گا
تڑپنے لوٹنے کی انتہا بسمل سمجھتے ہیں

بنے جز مرگ کیا چارہ گروں سے ناامیدی میں
جسے آسان ہم سمجھے ہیں یہ مشکل سمجھتے ہیں

اگر نکلے تو اپنی آرزو کو جان سمجھیں گے
نہ نکلے یہ اگر دل سے تو داغ دل سمجھتے ہیں

نہ شوق پائمالی ہے نہ ذوق سرفرازی ہے
خدا جانے میرے دل کو وہ کس قابل سمجھتے ہیں

یہ ملبے زندگانی کے چمک ہیں سوز پنہاں کی
نگاہ برق اس خرمن کا ہم حاصل سمجھتے ہیں

دلِ بیخودی بن آئی جنونِ کارفرما سے
وہ دیوانے ہیں جو اس مست کو غافل سمجھتے ہیں

کمال انسان کا شوق آرزو نے کھو دیا کیفی
یہ دل سینے میں ہم داغ نہ کامل سمجھتے ہیں

لمعاتِ اختر

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

سامنے آنکھوں کے ہر دم جلوۂ جانانہ ہے — روشن اس برق تجلی سے مرا کاشانہ ہے

"بیخودی" ہے اک کیفیت دلِ بیتاب کی — ذوقِ سرمستی مرا اک نعرۂ مستانہ ہے

ہمنشیں اس زخمِ دل کی خودنمائی کو نہ پوچھ — جلوۂ حسنِ ازل جس شمع کا پروانہ ہے

جوشِ غم سے خود بخود گردش میں رہتا ہے مدام — درد سے لبریز میری عمر کا پیمانہ ہے

سن لے اے بلبل قفس میں مجھ سے روداد چمن — بجلیاں گرتی ہیں جس پر وہ مرا کاشانہ ہے

سوزشِ داغِ جگر ہے باعثِ لطفِ حیات — شعلۂ فانوس ہی سوزِ دلِ پروانہ ہے

سبزۂ روئیدہ وجہِ "خانہ ویرانی" نہیں — حسرتیں جس پر برستی ہیں مرا غمخانہ ہے

شکوۂ جورِ بتاں بھی شکوۂ تقدیر ہے — حاصلِ مہر و وفا بس اک دلِ دیوانہ ہے

طائرِ بے پر نہ ہو کیوں آشیاں کا شکوہ سنج — چشمکِ برق اسکو یاں خرمن کا اک اک دانہ ہے

کس طرح پھر اس کو ہو اپنے یگانے کی خبر — آپ اپنی ذات سے دنیا میں جو بیگانہ ہے

دورِ ساغر ہے کہ ہے چکر مری تقدیر کا — ہر گھڑی پاؤں میں میرے لغزشِ مستانہ ہے

داستانِ غم نہیں طولِ شبِ فرقت سے کم — پھر کبھی فرصت میں سن لینا اک افسانہ ہے

نشۂ مے سے غرض ہے "بیخودی" "ہو یا" "فنا" — دیکھ کر کہدے ہر اک اختر کوئی دیوانہ ہے

نوٹ: اشعار نمبر ۵ ۔ ۷ ۔ ۱۳ کو پڑھتے وقت غالب کے اسی مضمون کے اشعار پیش نظر رکھے جائیں تو ان اشعار میں خاص لطف آئیگا۔

مسیح الملک مرحوم کے احباب کی خدمت میں

مکتوب جناب حکیم محمد جمیل خانصاحب

مکرمی تسلیم

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کی وفات کو ڈھائی برس سے زیادہ گذر چکے۔ لیکن وہ یک ایسی تباہ حال قوم اور مصیبت زدہ ملک میں پیدا ہوئے تھے کہ آج ڈھائی سال بعد سوائے اُنکے خاص احباب و اعزا کے شاید انکا نام بھی کسی کو یاد نہ رہا ہوگا۔ مردہ قوموں اور غلام ملکوں میں یہی دستور ہے۔ باوجودیکہ عام مسلمانوں اور ملک کی طرف سے مسیح الملک مرحوم کی یادگار قائم کئے جانے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوا تاہم طبیہ کالج کے ٹرسٹی جو مرحوم کی سب سے بڑی قومی یادگار کے محافظ و امین ہیں، ملک کی عام پستی کو دیکھتے ہوئے اس حقیقت سے غافل نہ تھے کہ نہ صرف مسیح الملک مغفور کی بیش بہا قومی خدمات اور قربانیوں کو مدنظر رکھکر بلکہ ملک و قوم کی آئندہ نسلوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے بھی اسکی ضرورت ہے کہ مرحوم کی روئداد زندگی مرتب کر کے شائع کیجائے۔ چنانچہ طبیہ کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز نے اس کام کا آغاز کرنے کے لئے آٹھ ہزار روپیہ منظور کر لیا ہے اور ایک سب کمیٹی کی نگرانی میں ترتیب اور فراہمیٔ معلومات کا کام شروع کر دیا گیا ہے جس کے ممبران علاوہ میرے حسب ذیل ہیں :-

(۱) جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری

(۲) جناب سید آصف علی صاحب بیرسٹر۔

(۳) جناب لالہ رام پرشاد صاحب سیکرٹری مالیات

جو اسکیم بورڈ نے منظور کی ہے اُس کے چند الفاظ کا حوالہ دے کر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مسیح الملک مرحوم کی سوانح نگاری کا کیا تخیل پیش نظر ہے۔ ہم اُنکی زندگی کو وسیع ترین معنی میں ملک

کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے ہمارا مطمح نظر وہ ہوگا جو اسکیم کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے یعنی

سوانحمری کی صحیح ترتیب وہی ہوگی جس میں ہندوستان کے دور جدید کی داستان ایک جزو لازمی ہو۔ فن طب اور اُس کے متعلقات کے علاوہ کہ اُنکی ترقی کا انحصار حکیم مسیح الملک مغفور کی ذات گرامی پر تھا سیاست، معاشرت، فن تعلیم ما و بیات (؟) یہ سب مرحوم کی روئداد زندگی کی ضروری اور لازمی جزئیات ہیں جو بجائے خود مسیح الملک کی سیرت کے مستقل ابواب قرار دے جائینگے۔ اردو زبان فن سیرت نگاری سے بہت کم آشنا ہے "شبلی" و "حالی" کے سوا کسی اہل قلم نے اس میدان کا صحیح نقشہ نہیں بنایا اور فی الجملہ یہ فن اردو زبان کے لٹریچر میں بہت نیچی سطح پر ہے۔ جدید سیرت نگاری کا بہترین تخیل "حالی" نے حیات جاوید کے صفحات پر پیش کیا ہے۔ اگر مسیح الملک کی سیرت پر قلم اٹھایا جائے تو وہ اسی اصول پر ہونا چاہئے کہ لکھنے والا مسیح الملک کی شخصی زندگی کو اُنکے عہد کی تمام تاریخ سے پر کرے اس طرح کہ اس کتاب کا ہر صفحہ ایک تاریخی آئینہ ہو جس کے اندر مسیح الملک کی شخصیت کا نقش سب سے جدا اور سب میں ملا ہوا نظر آئے۔ یعنی جو شخص مسیح الملک کی زندگی کا ایک ورق پڑھے وہ ساتھ ہی اُس ورق کے اندر ہندوستان کی تاریخ حاضرہ کا ایک صحیح خاکہ بھی دیکھے اور سمجھ سکے کہ زمانہ کی کس فضا میں گردوپیش کے کن حالات میں مسیح الملک کی زندگی بسر ہوئی تھی اور وہ کیونکر قومی حالات اور سیاسیات کی کشمکش میں گذر کرتے تھے۔ اس کے خلاف جو سوانحمری لکھی جائیگی وہ وہی ہوگی جو کتب فروشوں کی دوکانوں پر چار چار آنے فی جلد کے حساب سے بکا کرتی ہے۔ مسیح الملک مرحوم کے نام کی اس سے بڑی توہین کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس عامیانہ انداز میں ان کی سیرت لکھی جائے۔

بلحاظ اس کے کہ جناب کے تعلقات مسیح الملک مرحوم کی شخصی یا پبلک زندگی سے بہت گہرے رہے ہیں۔ میں ملتجی ہوں کہ اس ضروری کام میں آپ ہماری امداد فرمائیں۔ بغیر آپ جیسے حضرات کی امداد کے اس کام کی تکمیل مشکل ہوگی۔ سب سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ جناب مرحوم کے ساتھ اپنے

ذاتی تعلقات کی مختصر مگر واضح روئداد تحریر فرماکر مجھے عنایت فرمائیں یعنی آپ کے اور مرحوم کے تعلقات کی تفصیلات حسب ذیل امور پر حاوی ہوں۔

(الف) آغاز ملاقات کے اسباب۔

(ب) مرحوم کی زندگی کے خاص خاص واقعات جن سے آپ کو ذاتی تعلق رہا ہو یا جو آپ کی نظروں کے سامنے پیش آئے ہوں۔

(ج) مرحوم کے خیالات جن کا اظہار آپ سے یا کسی اور سے آپ کے سامنے کیا گیا ہو۔

(د) مرحوم کے احباب جو آپ کے علم میں مرحوم کے ساتھ مخصوص تعلق رکھتے ہوں۔

(ہ) مرحوم کے خطوط یا اور دیگر تحریریں جو جناب کے پاس ہوں یا جناب کے علم میں دوسرے احباب کے پاس ہوں۔

(و) فن طب و معالجہ کے متعلق خاص خاص واقعات جن کا جناب کو ذاتی علم ہو۔

میں نے ابتدائی مسودات کی تیاری کا انتظام مکمل کر دیا ہے اور فراہمی معلومات کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ آپ جیسے حضرات بورڈ کی اور میری امداد فرمائیں اور اس کام کو ایک قومی خدمت تصور کر کے اپنے عزیز وقت کا بہت قلیل حصہ مجھے عنایت کریں۔

نیازمند

محمد جمیل

۱۶ جون ۱۹۳۰ء

تنقید و تبصرہ

کتب :

تذکرۃ الموضوعات مصنفہ شیخ محمد طاہر پٹنی ہندی متوفی ۹۸۶ھ۔ بزبان عربی مطبوعہ مطبع منیریہ۔ جس کے ذیل میں مصنف کی دوسری کتاب قانون الموضوعات والضعفا بھی شامل کر دی گئی ہے۔ چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ اور صاف ہے۔ دونوں کا مجموعی حجم ۲۰۰ صفحات ہے قیمت فی نسخہ ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ شیخ عبدالجلیل و شیخ صالح بن سلیمان۔ قصبہ سامرود، ڈاکخانہ پلپانہ ضلع سورت بہتر ہے کہ فرمائش بھیجنے والے حضرات پتہ انگریزی میں تحریر فرمائیں۔

شیخ محمد طاہر دسویں صدی ہجری کے اُن نامور مصنفین میں سے ہیں جنکا شہرہ خاک ہند عرب و شام و مصر تک پہنچا تھا۔ فقہ حدیث میں انکی کتاب مجمع بحار الانوار اور ضبط رجال میں مغنی مشہور نام ہیں۔ انکا سلیقہ تحریر اسقدر اچھا اور مختصر ہے کہ اس زمانے سے ابتک برابر علماء اسکو پسند کرتے چلے آتے ہیں۔

موضوع احادیث اور ضعیف اور کذاب راویوں کے متعلق ان کی مذکورۂ بالا دونوں کتابیں اُسی زمانے میں علماء اعلام میں مقبول ہو گئی تھیں چنانچہ شیخ ابن حجر مکی نے جو شیخ طاہر کے استاد تھے انکی تعریف لکھی اور شیخ علی متقی صاحب کنز العمال نے انکو مفید بتایا۔ گزشتہ صدیوں میں امام شوکانی ائمہ حدیث میں ممتاز ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب احادیث الموضوعہ کا ماخذ تذکرۃ الموضوعات کو بنایا۔ مگر یہ کثیر المنفعت اور بے مثل ذخیرہ ابتک شائع نہیں ہوا تھا۔ مولوی عبدالجلیل صاحب سامرودی اور انکے شریک شیخ صالح بن سلیمان نے مل کر اس علمی خدمت پر کمر باندھی اور اس بیش بہا خزانہ کو اپنے صرفہ سے مصر میں محمد منیر عبدہ آغا کے مطبع میں نہایت خوبی کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا۔ اہل علم کی نفع رسانی کے خیال سے اسکی قیمت بھی کم رکھی ہے۔

جو لوگ حدیث کے فن سے دلچسپی رکھتے ہیں میرے خیال میں انکے واسطے یہ کتاب نہ صرف

مفید بلکہ ضروری ہے۔ بیانکو ان بڑی بڑی کتابوں سے جو موضوعات کے متعلق لکھی گئی ہیں بے نیاز کر دیگی۔
شیخ طاہر کے بیان میں ترتیب کی خوبی۔ سلاست اور اختصار تینوں باتیں ہیں اور یہی وجہ ہے
شخص بآسانی کے ساتھ انکی تصنیف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جس تشدید کے ساتھ موضوع حدیثوں اور واضع راویوں کی
گرفت کی تھی اسکو انکے بعد کے علماء اور بالخصوص حافظ جلال الدین سیوطی نے باقی نہیں رہنے دیا اور
بہت سی انکی موضوع قرار دادہ حدیثوں کو مختلف تاویلوں سے صحیح مان لیا۔ وہ تساہل اور تسامح شیخ طاہر
کی اس کتاب میں بھی موجود ہے۔

شیخ طاہر نے اس کتاب کا ماخذ بھی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے اور جملہ احادیث موضوعہ جو انہوں نے
سلسلہ وار بتقسیم ابواب درج کی ہیں ان پر علماء کے مختلف اقوال کو بھی مختصراً لکھتے گئے ہیں

قانون الموضوعات میں ضعفاء اور کذاب راویوں کی فہرست دی ہے اور ائمہ حدیث میں سے
جس نے انکی تضعیف یا تکذیب کی ہے اسکا حوالہ درج کیا ہے۔

نام بنام اور کنیت یا لقب سے جو لوگ مشہور ہیں انکو کنیت اور لقب سے بیان کیا ہے تاکہ اچھی
طرح تمیز ہو جائیں۔

ہندوستانی علماء کو اس لحاظ سے اس کتاب کی اور بھی قدردانی کرنی چاہئے کہ یہ انکے ایک
ہندی بھائی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس سے انکو یہ بھی پتہ لگے گا کہ اس زمانہ میں جبکہ وسط ہند میں علوم حدیث
کا کوئی چرچا نہ تھا سواحل کے علماء بوجہ عربوں کے اختلاط کے انکا کس قدر ذوق رکھتے تھے۔

(ا - ج)

قدیم افسانے - مرتبہ مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ شائع کردہ مکتبہ
ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد (دکن) حجم ۱۰۶ صفحہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ لکھائی، چھپائی
اوسط درجے کی۔ قیمت عہ

مکتبہ ابراہیمیہ دنیا کے ہر ملک اور ہر زبان کے بہترین افسانوں کا سلسلہ شائع کرنا چاہتا ہے

یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس مجموعے میں قدیم مصری، یونانی، رومی، ہندوستانی، ایرانی اور عربی افسانوں میں سے چند چوٹی کے افسانے جمع کر دئے گئے ہیں۔ مؤلف نے ہر زبان کے افسانوں کے متعلق الگ الگ تمہیدیں لکھی ہیں اور ہر ایک کے مصنف کے مختصر حالات بھی دے دئے ہیں، حسنِ انتخاب اور ترتیب کے لحاظ سے یہ مجموعہ بہت قابل قدر ہے۔ البتہ زبان پر جا بجا نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک ادب کے قدردانوں کے لئے یہ کتاب بیحد دلچسپ ثابت ہوگی اور اس سے اردو زبان میں افسانہ نویسی کا معیار بلند ہونے میں بھی مدد ملے گی۔

چینی اور جاپانی افسانے ۔ مرتبہ عبدالقادر سروری صاحب باعانت محمد اتحاد الدین صاحب ومیر خواجہ معین الدین صاحب بم ا، صفحے ۔ قیمت ۹ر دیگر تفصیلات بشرح صدر۔

یہ اس سلسلے کی ساتویں کتاب ہے۔ اگر مکتبہ ابراہیمیہ کل مجوزہ کتابوں کو چھپوانے میں کامیاب ہوگیا تو بہت بڑی بات ہے۔ ہمارے ملک کے بہت کم پبلشر ایسی خوش مذاقی اور حوصلہ مندی سے کام لیتے ہیں۔

گنجینۂ تحقیق ۔ مصنفہ سید محمد احمد صاحب بیخودؔ موہانی ایم۔اے۔ منشی فاضل شیعہ کالج لکھنؤ حجم ۲۴۵ صفحہ، تقطیع ۲۰×۲۶ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔

حضرت بیخودؔ موہانی علاوہ باکمال شاعر ہونے کے بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔ یہ کتاب موصوف کے پانچ تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) آئینۂ تحقیق۔ (جلوۂ غالب) یعنی دیوان غالب (اردو) کی شرحوں پر ایک سرسری نظر۔

(۲) سرمۂ تحقیق۔ بجواب نقد النقد بیخودی

(۳) سرمایۂ تحقیق۔ (حمایت غالب) یعنی آرگس بے حجاب بجواب غالب بے نقاب۔

(۶) آبِ تحقیق۔ شرح قصائد خاقانی پر ایک نظر۔

(۷) آبِ تحقیق۔ حضرت ابو العلا حکیم ناطق صاحب لکھنوی کے تبصرۂ اصلاح سخن پر ایک ناقدانہ نظر۔

اصناف ادب خصوصاً شعر کے نقاد دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ لوگ جو موضوع تنقید کو اصول فن کے لحاظ سے جانچتے ہیں اور خیالات کی منطقی ترتیب پر نظر ڈالتے ہیں، دوسرے وہ جو اس کے اصلی جوہر یعنی لطف اور اثر کو دیکھتے ہیں۔ حضرت بیخود میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ وہ شاعری کی تنقید میں علمی تحلیل سے بھی کام لیتے ہیں اور اسے خالص ادبی معیار پر بھی پرکھتے ہیں جس کی بنیاد محض وجدان صحیح اور ذوق سلیم پر ہے۔ انکا خاص کمال یہ ہے کہ ہر شعر کے معنی میں نئے نئے پہلو دکھاتے ہیں۔ جو خواہ خود شاعر کی نظر میں نہ ہوں مگر شعر کے مفہوم میں موجود ہوتے ہیں۔

ادبی مناظرے کا جو انداز مصنف نے نکالا ہے وہ داد کے قابل ہے۔ انکے دلائل میں زور بھی ہے، شوخی بھی ہے، مخالفوں پر تعریض بھی ہے لیکن تہذیب اور انصاف کا دامن کہیں چھوٹنے نہیں پاتا۔ اس کی مثالیں ہمارے نقادوں کے یہاں بہت کم ملتی ہیں۔

غرض اس کتاب کو لکھ کر حضرت بیخود نے اردو میں تنقید عالیہ کی بنیاد ڈالی ہے اور ہمارے ادب کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ انکی کتاب شائقین ادب کے لئے ایک نعمت ہے جو روز روز نصیب نہیں ہوتی۔

نوائے رضا۔ از سید آل رضا صاحب رضا حجم ۱۱۲ صفحہ تقطیع ۲۰×۲۲/۱۶ کاغذ اعلیٰ درجہ کا لکھائی چھپائی نفیس جلد خوشنما نگین کپڑے کی مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔

یہ حضرت رضا کی غزلوں کا مختصر سا مجموعہ ہے جو ارباب ذوق کی نظر میں اس قابل ہے کہ تعویذ کی طرح ہر وقت پاس رکھا جائے۔

اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو شعر سے اور شعر میں رنگ تغزل سے فطری مناسبت ہے۔ غزل گوئی کے لئے جتنی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ذوق حسن، لذت درد، لطافت احساس وحسن ادا، زبان کی شیرینی اور گھلاوٹ، انداز بیان کی سادگی اور بیساختہ پن یہ سب چیزیں انکے حصے میں آئی ہیں

آج ہمارے شعرا اردو شاعری کو وسعت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ محض حسن وعشق کے مضامین پر جن پر ہماری شاعری کا دار و مدار تھا اکتفا نہیں کرتے بلکہ طبع انسانی کے گوناگوں جذبات کی مصوری اور حیات و کائنات کے مسائل کی تفسیر کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انکی یہ سعی قدر اور داد کے قابل ہے۔ مگر ان میں سے بعض یہ غضب کرتے ہیں کہ جدت کے جوش میں غزل جیسے نازک مرکب پر پیچیدہ مضامین اور ثقیل الفاظ اور ترکیبوں کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔ شاعری کو وسعت دینے کے یہ معنی نہیں کہ اصناف سخن میں جو قدرتی فرق ہے وہ مٹا دیا جائے۔ غزل انسان کے نازک اور لطیف جذبات کو ادا کرنے کا آلہ ہے اس میں ان مضامین کو ٹھونسنا جنھیں خود شاعر کا ذہن اچھی طرح ہضم نہیں کر سکا بڑا ظلم ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ فلسفیانہ اور حکیمانہ مسائل غزل میں نظم نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ اسی وقت جائز ہے جب یہ خیالات شاعر کے دل و دماغ میں اس طرح سرایت کر گئے ہوں کہ جذبۂ بے اختیار کی صورت میں ظاہر ہو سکیں۔ اسی طرح غزل کی زبان سادہ اور بے تکلف ہونا چاہیئے پیچیدہ ترکیبیں استعمال کرنے کا حق صرف غالب جیسے شاعر کو ہے جس کی زبان پر اکثر یہ ترکیبیں خود بخود ڈھلتی چلی جاتی ہیں۔

حضرت رضا کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ باوجود مضامین کی بلندی کے کوئی شعر تغزل کے دائرے سے باہر نہیں جانے پاتا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

ابتدا میں شاعر کے بھائی سید کاظم رضا صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کا نہایت دلچسپ مقدمہ ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اچھے شعر کہنا اور نہ چھپوانا کوئی ایسا جرم نہیں کہ قابل دست اندازی پولیس ہو۔ مگر کاظم صاحب کا دیباچہ پڑھ کر ہمارے خیال کی تردید ہو گئی۔ خدا کرے کاظم رضا صاحب کو بُرے شعروں کی اشاعت روکنے کے اختیارات بھی مل جائیں۔ اگر حکومت اس کے لئے کوئی آرڈی نینس نافذ کرے تو بہتر ہے۔

(ع۔ ح)

رسائل :

طور - دہلی سے مولوی حافظ منظور احمد عثمانی - بی سلے جامعی ہمارے پرانے طالب علم نے مذکورہ بالا نام سے ایک علمی اور ادبی ماہانہ رسالہ ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء سے جاری کیا ہے جس کا پہلا نمبر تنقید کے لئے ہمارے سامنے ہے۔ حافظ صاحب موصوف اس سے پہلے مولانا محمد علی صاحب کے اخبار ہمدرد میں کام کر چکے ہیں اور ذوق سلیم کے ساتھ صحافت کا تجربہ رکھتے ہیں۔ زیر تنقید رسالہ میں مضامین اچھے خاصے ہیں۔ طباعت وغیرہ کے لحاظ سے بھی اچھا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ یہ رسالہ کامیاب ہوگا۔ اور ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو مقبول اور حافظ صاحب کی کوشش کو مشکور کرے۔

ملنے کا پتہ : دفتر رسالہ طور - دہلی

پیام اسلام - یہ علمی اور تبلیغی ماہوار رسالہ مولوی عبدالحق صاحب عباسی کی ادارت اور انجمن اشاعت اسلام جالندھر کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ بڑی تقطیع لکھائی چھپائی عمدہ حجم چار جزو اور قیمت سالانہ صرف ہے

مضامین دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بلا تفریق اور تعصب صحیح دین کی اشاعت کرنا چاہتا ہے مسلمانوں کو خاص کر انکو جو دین کا درد رکھتے ہیں اس رسالہ کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ بلکہ ہر ممکن طریقہ سے اس کی امداد کرنا چاہئے۔

شذرات

انسوس ہے کہ طبیہ کالج دہلی کے اطبا، ویدوں اور طلبہ کو جو اختلافات منتظمین سے چلے آتے تھے انہوں نے اس مہینے نہایت ناگوار صورت اختیار کرلی۔ اس سے زیادہ افسوس یہ ہو کہ یہ آپس کے معاملات جنھیں آپس میں طے ہوجانا چاہیے تھا کوچہ و بازار میں مشتہر ہوگئے۔ ہمارے خیال میں رائے عامہ کو قومی اداروں کے معاملات میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو عدالتی مقدموں میں مجبوراً کرنا پڑتا ہے یعنی جب تک کسی قومی ادارے کا کوئی معاملہ اس کے منتظمین کے سامنے زیر تحقیق ہو اس وقت تک اس کے متعلق رائے زنی کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں معلوم ہے کہ طبیہ کالج کی جماعت منتظمہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کررہی ہے۔ اس لئے ہم ابھی اُس کے فیصلے کے منتظر ہیں۔ خدا کرے یہ فیصلہ حق و انصاف اور مصلحت دونوں چیزوں کے مطابق ہو اور ارباب حل و عقد کی دانشمندی سے مسیح الملک مرحوم کی یہ دولت جسے وہ قوم کی نذر کرگئے ہیں تباہی کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

جامعہ کے جواں سال اور جواں ہمت استاد شفیق الرحمن صاحب قدوائی کو حب وطن اور خدمت قوم کے جرم میں ایک سال قید محض کی سزا ہوگئی اور اب وہ غالباً ملتان کے جیل میں بھیجے جائینگے ہم نے سنا ہے کہ شفیق صاحب جیل میں علاوہ اپنے مقررہ کام کے قیدیوں کو دینداری اور محاسن اخلاق کی تلقین کیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر انہیں اسپرٹ کے چولہے پر چائے اور حلوا تیار کرکے لوگوں کو کھلانے پلانے اور رسالہ جامعہ کے لئے "اقتباسات" مرتب کرنے کی اجازت اور مل جائے تو قید فرنگ اور گلشن منزل میں کچھ فرق نہ رہے۔ سچ ہے۔

قفس کو بلبل باغ وطن گلشن سمجھتے ہیں

جناب ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ العالی کے احباب اور قدردانوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ممدوح کی صحت اچھی ہے اور جیل کی تلخ زندگی سے انکی شیریں مزاجی پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے عزیز اور رفیق محمد غالب صاحب ہر پندرھویں دن اُن سے ملنے گجرات جایا کرتے ہیں اور انکی خیریت کی خبر لاتے ہیں۔ بہت سے مریضوں کو جو ڈاکٹر صاحب کے علاج سے محروم کر دیئے گئے ہیں اس سے تسکین ہو جاتی ہے۔ خدا جلد وہ دن لائے کہ ہم سب اپنے مسیحا کے دیدار سے شاد کام ہوں۔

ہمارے کئی عزیز طالب علم بھی موجودہ سول نافرمانی کی تحریک شروع ہونے کے بعد اپنی تعلیم ترک کرکے ملک و قوم کی خدمت کے لئے چلے گئے تھے اور اب اپنے اپنے شہروں میں رنج اسیری اٹھا رہے ہیں۔ ہم سب کی دعا ہے کہ "سی کلاس" کی شدائد سے قوم کے نونہالوں کی تندرستی اور خوش مزاجی کو صدمہ نہ پہنچے اور یہ جیسے ہنستے کھیلتے جیل گئے تھے ویسے ہی وہاں سے نکلیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ طبیہ کالج کے سکرٹری اور مجلس منتظمہ نے مسیح الملک مرحوم کی سوانح عمری لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ کام ملک کے مشہور اخبار نویس قاضی عبدالغفار صاحب کے سپرد کیا ہے۔ واقعی اس کے لئے قاضی صاحب سے بہتر کوئی شخص ملنا ناممکن تھا۔ قاضی صاحب مسیح الملک مرحوم کی زندگی کے آخری زمانے میں انکے رفیق، مشیر اور ہمراز رہے ہیں اور ان کے سیاسی خیالات اور انکے تعلیمی اور تمدنی نصب العین سے بہ خوبی واقف ہیں۔

قاضی صاحب کا ارادہ محض مرحوم کی زندگی کے حالات لکھنے کا نہیں ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں ان قومی اور ملکی تحریکوں کا ذکر بھی کریں جن سے مسیح الملک مرحوم کو تعلق تھا۔ چونکہ مرحوم کی ذات اس صدی کی ابتداء سے قریب قریب ہر قومی تحریک سے وابستہ رہی ہے۔ یہ کتاب ایک لحاظ سے ہندوستان کی سی سالہ تاریخ بن جائیگی۔

اسی سلسلے میں حکیم محمد جمیل خاں صاحب نے ہمیں ایک گشتی مراسلہ شائع کرنے کے لئے بھیجا ہے جو اس رسالے میں درج کیا جاتا ہے۔ موصوف نے حکیم صاحب مرحوم کے احباب سے یہ درخواست کی ہے کہ جہانتک ممکن ہو قاضی عبدالغفار صاحب کو اس اہتمام الشان کام میں مدد دیں جو انھوں نے اپنے ذمے لیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ سب حضرات جنہیں مرحوم کی زندگی کے واقعات کا علم ہے قاضی صاحب سے خط و کتابت کریں گے اور اس فرض سے سبکدوش ہوں گے جو قانون محبت کی رو سے انکے ذمے عائد ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کو یہ شکایت ہے کہ بعض حضرات جو تحریریں اس سلسلے میں بھیجتے ہیں ان میں صرف مرحوم کے فضائل اور محاسن بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں مرحوم کے حسن سیرت سے قاضی صاحب کما حقہ واقف ہیں۔ انہیں تو ضرورت ہے واقعات اور حالات کی خصوصاً مرحوم کی ابتدائی زندگی کے واقعات کی۔

ہمیں یہ سن کر بہت مسرت ہوئی کہ موقر معاصر رسالہ کامیابی کا ایک خاص نمبر "سوراج نمبر" کے نام سے نکلنے والا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ اور آئندہ سیاست پر مختلف خیالات رکھنے والے مسلمان ارباب نظر کے خیالات جمع کرکے شائع کئے جائیں اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سیاسی مسائل میں مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم واقفیت اور بہت زیادہ بے حسی رکھتے ہیں اسکا نتیجہ یہ ہے کہ گو انفرادی حیثیت سے ہزارہا مسلمان ملک کی تمام مفید سیاسی تحریکوں میں شریک ہوتے ہیں مگر یہ عموماً محض فوری جوش کا نتیجہ ہوتا ہے اور انکی اس سعی میں ترتیب اور تنظیم نہیں ہوتی، اس لئے ان کی مخلصانہ قربانیوں سے ملک کا اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا ہونا چاہئے اور جوش کا دور نکل جانے کے بعد ان کی سیاسی زندگی پر ایسا جمود طاری ہو جاتا ہے کہ گویا ان میں کبھی

وقت بھی ہی نہیں۔

اس لئے اس بات کی شدید ضرورت ہو کہ مسلمان ملک کے سیاسی مسائل پر غور کرنے کی عادت ڈالیں تاکہ وہ اجتماعی حیثیت سے حصول آزادی کی ان راہوں میں سے جن پر مختلف پارٹیاں چل رہی ہیں کوئی راہ اختیار کرلیں اور پھر اس سے قدم نہ ہٹائیں۔ یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ سیاست عملی چیز ہے۔ اس میں نظری غور و فکر سے کام نہیں چلتا۔ قومیں اور ان قوموں کے مختلف دستے اپنا سیاسی پروگرام منطقی مباحثوں کے ذریعے سے نہیں بنایا کرتے بلکہ ملک کی عام حالت سے متاثر ہوکر بیساختہ کوئی طرز عمل اختیار کرلیتے ہیں اور پھر اسکی نظری تاویل آگے چل کر ہوتی رہتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ جبتک انھوں نے کوئی راہ سوچ سمجھ کر اختیار کی ہو اس پر استقلال سے نہیں چل سکتے۔ جب تک سیاسی ہوا تند ہے ان کی کشتی بہتی چلی جاتی ہے لیکن جہاں یہ آندھی رکی اور ان کی کشتی گرداب میں پھنس کر رہ گئی۔ بیشک عمل کا اصل محرک جوش اور خلوص ہے لیکن اس کو راہ پر لگانا عقل کا کام ہے اور یہ غور و فکر کے ذریعے سے انجام پاتا ہے۔

ہمارا منشا ہے ہمعصر سیاست دانوں اور سیاست فہموں کو بہت اچھا موقع دے رہا ہے کہ عام مسلمانوں کو موجودہ سیاسی پیچیدگیوں کے سلجھانے میں مدد دیں اور ان سے جو کام لینا چاہتے ہیں اسکی نوعیت اور مصلحت اچھی طرح سمجھادیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے لیڈروں میں سے جو لوگ اردو میں اپنے خیالات ظاہر کرنے پر قدرت رکھتے ہوں وہ رسالہ کامیابی کی دعوت کو قبول کرکے کسی نہ کسی سیاسی مسلے پر مضمون لکھیں گے اور وہ ارباب نظر بھی جو عملی سیاست سے مناسبت نہیں رکھتے یا مصلحتاً علٰحدہ رہتے ہیں اس نظری مباحثے میں ضرور شرکت کریں گے۔ سب مضامین مدیر کامیابی کے پاس نومبر تک پہنچ جانے چاہئیں۔

ہم اپنے ہمعصر کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ غیر مسلم اہل فکر سے بھی مضامین لکھوائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ مسلمانوں کی سیاسی حالت کے متعلق اُن کے اور بھائیوں کا کیا خیال ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہمعصر کو یہ خیال اس وقت آیا جب اکثر ارباب سیاست نظر بند اور زبان بند ہو چکے ہیں۔ پھر بھی امید ہے کہ جیل خانے کے باہر بھی ایسے لوگ کافی تعداد میں مل جائیں گے جو مسلمانوں کی سیاست پر اچھی طرح روشنی ڈال سکیں گے۔

جرمنی کے بہترین

یعنی

دنیا کے بہترین ٹائپ

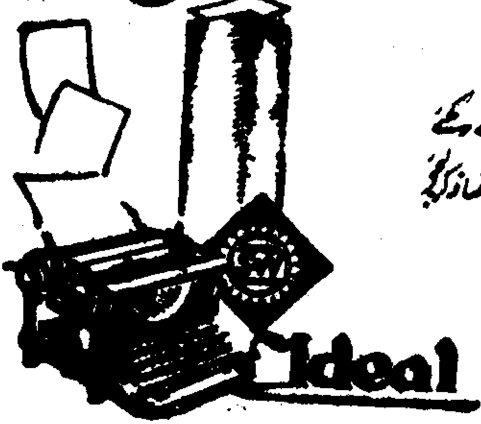


"بجو"

سب سے سفری ٹائپ رائٹر کا جدید ترین نمونہ،
جو سہولتیں اس مشین میں ہیں کسی دوسرے ٹائپ رائٹر
میں نہیں، نہایت خوبصورت پائدار وزن کل ۴ سیر
قیمت انگریزی:- مبلغ ماللعہ - اردو مبلغ للعہ

آئیڈیل

اسی کارخانہ کی بڑی مشین۔ دفتر کے لیے اسے رکھئے
اور اپنے دفتر کی کارکردگی میں ۵۰ فیصدی اضافہ کیجئے
قیمت انگریزی مبلغ ساللعہ
اردو مبلغ اللعہ



ضرورت ہے

مستعد سرگرم مخلص کارکنوں کی

جو ملت بیضا کے آٹھ کروڑ فدائیوں کی مالی حالت کو درست بنانے اور اُن میں صنعت وحرفت کا شوق پید
کرنے اور انہیں باعزت زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے اور مسلمانوں کے خواندہ و ناخواندہ طبقوں میں سے ناداری
بے روزگاری کی شکایت دور کرنے اور اُنکی اقتصادی حالت کو بدل ڈالنے

کے لئے

مخلص اور بہی خواہ قوم مسلم مرد اور خواتین کنویسروں اور ملازموں کی ضرورت ہے تعلیم یافتہ اصحاب سے کر معمولی اَن
پڑھے لکھے تک جن کے دلوں میں مسلم قوم کی مالی حالت درست دیکھنے کی حقیقی تڑپ ہو صرف ایک آنہ کا ٹکٹ بط
خرچ ڈاک ارسال کرکے مفصل پراسپکٹس طلب فرماویں۔
حقیقی کام کرنیوالوں کے لئے زرین مواقع ہیں

حمید اینڈ کو بینکرز ریلوے روڈ - لاہور

مقدس رسول آریوں کے ایک زہریلے رسالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات پر
سخت زہریلے اعتراض کئے ہیں جس کا نام "رنگیلا رسول" ہے اس رسالہ کا مسکت
مدلل اور رنگین جواب مقدس رسول کے نام سے شائع ہوا ہے۔ قیمت ۱۰/

حق پرکاش اس کتاب میں ایک سو انسٹھ سوالات کا معقول اور عالمانہ جواب درج ہے جو سوامی دیانند
نے اپنی مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں قرآن شریف پر کئے تھے آریوں سے آجتک
کا جواب الجواب نہیں ہوسکا اور نہ آئندہ ہونیکی امید ہے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ کاغذ نفیس۔ قیمت عہ/

کتاب الرحمٰن آریوں کی جدید کتاب "کلام الرحمٰن وید ہے یا قرآن" کا مکمل و مدلل جواب جو مولانا ا
ثناءاللہ صاحب نے اپنی خاص نرالی طرز میں لکھا ہے جس کے سامنے مخالفین نے سپر ڈال
قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ: منیجر اہلحدیث امرتسر

مسلسل نمبر ...

جامعہ

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد [illegible] | بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۰ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

وضع حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ جو شخص میرے اوپر قصداً جھوٹ بولے وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنالے" یہ حدیث اتنے صحابہ سے مروی ہو کہ بعض بعض ائمہ حدیث نے اس کے متواتر ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔ لیکن باوجود اس وعید کے بھی ایسے لوگ تھے جو اسی زمانے سے جھوٹی حدیثیں گھڑنے لگے۔ ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں امام طبرانی کی اوسط اور ابن عدی کی کامل کے حوالے سے لکھا ہو کہ مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر جب بنی لیث میں کسی شخص نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا جس کو اس عورت کے سرپرستوں نے نامنظور کر دیا۔ وہ شخص حلہ نبوی کے مشابہ ایک لباس پہنکر وہاں گیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حلہ عطا فرمایا ہو اور اختیار دیا ہے کہ میں تمہاری عورتوں کے بارے میں جو چاہوں حکم دوں۔ اُن لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ کا فرمان سر آنکھوں پر یہ کہہ کر اس کو ایک مکان میں ٹھہرایا اور اپنے دو آدمی تصدیق کے لئے دربار رسالت میں بھیجے۔ آنحضرت سنکر نہایت برہم ہوئے اور ایک انصاری کو حکم دیا کہ جاکر اس قتل کرکے آگ میں جلادو۔ جب وہ انصاری پہنچے تو دیکھا کہ سانپ کے کاٹ لینے سے وہ مرچکا تھا۔ انھوں نے اس کی لاش کو آگ میں جلادیا اور واپس چلے آئے۔

شیخ طاہر جزائری اپنی کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر کے صفحہ ۲۴۶ میں لکھتے ہیں۔

وقد کذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو حیٌ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انکی زندگی ہی میں جھوٹ بولا گیا
وقد کان فی عصر الصحابۃ منافقون و مرتدون	اور زمانہ صحابہ میں منافقین و مرتدین تھے۔

عہد صحابہ | صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیرہ فلیمحہ

مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اسکو مٹا ڈالے

علماء نے اسکی توجیہ یہ لکھی ہو کہ قرآن کی حفاظت کے لئے یہ حکم دیا تاکہ کوئی دوسری چیز اس کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے۔ لیکن درحقیقت یہ وجہ نہ تھی ورنہ آپ یہ حکم دیتے کہ قرآن کو الگ لکھو اور روایتوں کو الگ بلکہ مقصد اس ممانعت کا یہ تھا کہ لوگ روایات میں نہ پڑ جائیں۔ کیونکہ جب روایت کا سلسلہ چلتا ہو تو سچ کے ساتھ جھوٹ بھی پھیلنے لگتا ہو چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ اول ہی کے عہد میں لوگ روایتوں میں اختلاف کرنے لگے اور جب انھوں نے دیکھا تو لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم روایات میں اختلاف کرتے ہو ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کرینگے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو[1]

حضرت ابو بکر نے ایک مجموعہ احادیث بھی لکھا تھا جس میں تقریبًا پانسو حدیثیں تھیں۔ مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہؓ سے لیکر آگ میں جلا دیا کیونکہ انکو خیال ہوا کہ ممکن ہو کہ میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھدی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو۔[2]

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مجموعہ میں جملہ حدیثیں ایسی ہی تھیں کہ انھوں نے لوگوں سے سنکر لکھی تھیں کیونکہ وہ خود دربار رسالت کے رکن رکین تھے اور اپنے کان سے آنحضرتؐ کی باتیں سنتے تھے جن میں انکو شبہ کی گنجایش نہ تھی۔ لیکن چونکہ روایات میں اختلاف اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور امت کو بحیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے انھوں نے اس سے روکدیا تھا اس لئے خود بھی پسند نہ کیا کہ روایات کا مجموعہ چھوڑ جائیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص نے بھی کچھ فرمودۂ نبوی اپنے پاس لکھ رکھا تھا لیکن یہ مجموعہ بھی کسی کو نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ ضائع ہو گیا یا انھوں نے بھی حضرت ابو بکر کی طرح اسکو جلا دیا۔

ساری آفت منافقوں کی وجہ سے تھی جو سنتے کچھ تھے اور بیان کچھ کرتے تھے۔ آنحضرت کے بعد عہد

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ذکر ابی بکر۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ

صحابہ میں منافقین کے ساتھ مرتدین کی بھی جماعت تھی ۔اسی وجہ سے حضرت ابوبکر نے روایت حدیث کی مانعت کی ۔ اور بعض بعض ستند صحابہ نے جو روایتیں کیں ان پر شہادت طلب فرمائی۔ حضرت عمر فاروق نے اپنے عہد میں اور بھی سختی کی ۔ اور لوگوں کو روایت میں پڑنے سے منع فرمایا ۔ اگر کوئی روایت بیان کرتا تو جبتک اس سے گواہ نہ لے لیتے : چھوڑتے لیکن باوجود اس کے روایتیں پھیلیں اور کچھ لوگ اگر سچی روایتیں بیان کرنے والے تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جھوٹ گھڑنے لگے چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباس کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں ۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ۔ بشیر نے کہا کہ کیا بات ہے جو آپ میری حدیثیں نہیں سنتے ۔ فرمایا کبھی وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بیان کرتا تو ہم جھپٹ کر اس کی طرف بڑھتے اور کان لگا کر سنتے ۔ مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب ویابس روایتیں شروع کیں اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا ۔

یہی وجہ تھی کہ اکثر صحابۂ کبار رضوان اللہ علیہم نے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں ۔ حضرت زید بن ارقم سے ابن ابی لیلے نے کہا کہ کوئی حدیث رسول سنائیے ۔ انھوں نے کہا کہ ہم بوڑھے ہو گئے اور بھول گئے ۔ حضرت زبیر سے انکے بیٹے عبداللہ نے فرمائش کی کہ آنحضرت کی کوئی حدیث بیان کیجئے انھوں نے بھی اسی طرح کا جواب دیا ۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکہ تک گیا مگر ایک روایت بھی نہ سنی ۔ امام شعبی کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمر کی خدمت میں ایک سال تک رہا ۔ لیکن انھوں نے کوئی حدیث بیان نہ کی ۔

زمانہ مابعد عہد صحابہ کے بعد سے کذابین اور وضاعین حدیث کی کثرت بڑھتی گئی ۔ علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق اس کے اسباب حسب ذیل تھے

(۱) بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے ۔

(۲) بعض اہل علم کی یادداشتیں ضائع ہو گئیں اور انھوں نے مجبوراً حافظہ سے روایت کی اور جو خیال میں آیا کہہ گئے ۔

(۳) بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دیدیا تھا غلط روایتیں کیں

(۴) ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے سہواً غلط روایت کی اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے بھی اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف سمجھا۔

(۵) زنادقہ نے شریعت کو مٹانے کے لئے جھوٹی حدیثیں گھڑیں۔

(۶) جب مذہبی تفریق پیدا ہوگئی اور سنی۔ شیعہ۔ خارجی۔ قدری جہمی۔ مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے اس وقت ہر ایک فرقہ کے لوگوں نے دوسروں کے مقابلہ کے لئے اپنی اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں۔

(۷) بہت سے عابد اور زاہد لوگ ایسے تھے کہ عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور برے کام سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گھڑتے تھے۔ ابن جوزی کے بیان کے مطابق یہ لوگ شریعت کو ناکمل سمجھتے تھے جس کی تکمیل ان روایات سے کرتے تھے۔

(۸) بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہ تک پہنچا دینا جائز ہے۔

(۹) سلاطین کے مقربین اور حاشیہ نشین انکے حسب منشا۔ روایتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

(۱۰) قصہ گو۔ واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت اور صحابہ کرام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ کیونکہ انکی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ وہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث مکذوب ومجہول روایتیں مسلمانوں میں پھیلیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں حدیثیں بنائیں اور مشرق سے مغرب تک انکو پھیلایا۔ اور ان سے بھی زیادہ اُن لوگوں نے جو اپنے علم او رتقدس کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھانا چاہتے تھے نئی نئی حدیثیں وضع کیں۔

شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ ایک محدث نے آخر عمر میں توبہ کی۔ اس وقت اس نے لوگوں سے کہا کہ ذرا دیکھ بھال کر حدیثوں کو قبول کیا کرو۔ کیونکہ ہم لوگ جب

مدون کئے۔ چنانچہ علوم حدیث میں سے علم الضعفاء والوضاعین بھی ایک اہم علم بن گیا، اس میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ چند مشہور کتب یہ ہیں۔

کتاب الضعفاء	امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ	
"	ابو عبداللہ برقی متوفی ۲۴۹ھ	
"	ابو اسحٰق جوزجانی متوفی ۲۵۹ھ	
"	ابو جعفر عقیلی متوفی ۳۲۲ھ	
"	ابو نعیم استرآبادی متوفی ۳۲۳ھ	
"	ابو الفتح محمد متوفی ۳۴۲ھ	
"	ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ	یہ کتاب کامل کے نام سے مشہور اور ۱۲ جلدوں میں ہے
"	ابن ابی حاتم	چھ جلدوں میں۔

کثرت موضوعات | جب وضاعین کی اس قدر کثرت تھی کہ انکے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے گئے۔ تو ظاہر ہے کہ موضوع احادیث کی کس قدر کثرت ہوئی ہوگی۔ عقیلی کا قول ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں نقل کیا ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔ تذکرۃ الموضوعات میں شیخ محمد طاہر گجراتی لکھتے ہیں کہ جویباری۔ ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار سے زیادہ حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجاء کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب اس کو قتل کرنے کے لئے لے گئے تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا تا رہا ہوں۔

روایات کا تو کیا ذکر ہے بعض بعض وضاعین نے پوری پوری کتابیں روایات کی تصنیف کر ڈالیں جو اول سے آخر تک غلط تھیں۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۸ میں ہے۔

کتب حدیث میں بعض کتابیں ایسی ہیں کہ انکی جملہ روایات موضوع ہیں۔ منجملہ ان کے قضاعی کی کتاب ہے۔ پھر اربعون ودعانیہ۔ ان دونوں میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے "وصایا علی" نامی کتاب میں بھی بجز پہلی حدیث کے باقی سب غلط ہیں۔ انس بصری کی سند جو تین سو

حدیثوں کا مجموعہ ہے جو سر تا سر غلط ہے۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن جعفر نے اپنے آبا کی روایت سے جو حضرت علیؓ تک پہنچائی گئی تھی ایک کتاب نکالی جو ہزار حدیثوں کا مجموعہ تھی۔ اس کی تمام حدیثیں منکر تھیں۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ کتاب "علویات" جھوٹ اور افترا کا مجموعہ ہے۔ اللہ اس کے واضع پر لعنت کرے۔ اس نے جماع اور طریقہ جماع کے متعلق بھی حضرت علی کے نام سے وصیتیں روایت کی ہیں۔

دیلمی نے لکھا ہے کہ ابوالفضل جعفر بن محمد حسینی کی کتاب العروس منکر اور غیر معتبر ہے۔ اور امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق بن ابراہیم نے اپنے باپ اور دادا کی روایت سے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔

کتب موضوعات

جب احادیث کی جانچ پڑتال شروع کی گئی اس وقت ائمہ جرح وتعدیل نے جہاں کذابوں کا پتا لگانے کی کوشش کی وہاں انکی روایتیں بھی چھانٹ کر نکالتے گئے۔ اور جو انکے نزدیک حتمی طور پر وضعی ثابت ہوگئیں ان کے مجموعے تیار کر دیے۔ ان میں سے جو کتابیں مشہور رہیں وہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

کتاب الاباطیل	ابوعبداللہ الحسین ہمدانی متوفی ۵۴۳ھ	
الموضوعات الکبریٰ	ابوالفرج عبدالرحمٰن بن جوزی متوفی ۵۹۷ھ	چار جلدوں میں ہے
کتاب الموضوعات	ابوالحسن کنانی متوفی ۹۶۳ھ	
مختصر الموضوعات	امام سفارینی	
اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ	جلال الدین سیوطی	
تذکرۃ الموضوعات	شیخ محمد طاہر گجرات پاک پٹن کے مشہور ہندی محدث مقتول ۹۸۶ھ	
رسالتان فی الموضوعات	رضی الدین صغانی متوفی ۶۵۰ھ	
الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ	شیخ ابوعبداللہ محمد شامی متوفی ۹۴۲ھ	
	امام شوکانی یمنی متوفی ۱۲۵۰ھ	

کتاب المغنی	حافظ ضیاء الدین موصلی متوفی سنہ ۶۲۳ھ
الموضوعات الصریحہ	عمر بن بدر
الکشف الالہی	محمد سندروسی متوفی سنہ ۱۰۰۶ھ
تذکرۃ الموضوعات	ملا علی قاری متوفی سنہ ۱۰۱۴ھ
اللولو المرصوع	محمد بن خلیل قاوقجی متوفی سنہ ۱۳۰۵ھ

ان وضاعین اور موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی جس کا اندازہ مشکل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی۔ اور حدیثیں بھی جو آپ سے روایت کی گئی ہیں انکا ۹۰ فیصدی حصہ مدنی زندگی سے متعلق ہے جس کی کل مدت دس سال ہے۔ اور ادہر وضاعین وکذابین کی ایک بے شمار فوج ہوگئی جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی تھی بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ یہی تھا۔ ان ہزاراں ہزار وضاعین نے لاکھوں حدیثیں وضع کر ڈالیں۔ اور انکو پھیلا دیا۔ اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلاشبہ صحیح تھیں اس طرح مخلوط ہوگئیں کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہوگیا کہ اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں۔

تنقید حدیث | ائمہ حدیث نے جب حدیثوں کو پرکھنا شروع کیا اور صحیح اور غلط کو الگ الگ کرنے لگے اس وقت دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک خود حدیث کو۔ دوسرے رواۃ کو۔

موضوع حدیث کی شناخت کے لئے انھوں نے حسب ذیل اصول قرار دئے۔

(۱) صحیح تاریخ کے خلاف ہو۔

(۲) رافضی صحابہ کے یا خارجی اہل بیت کے مطاعن میں روایت کرے۔

(۳) حدیث میں ایسا واقعہ ذکر کیا جائے جس کے بیان کرنے والے بہت سے ہوسکتے ہوں مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو۔

(۴) قرآن کے خلاف پڑے۔

(۵) عقل صحیح کے مخالف ہو۔

(۹) چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔

(۱۰) قرینہ یا موقع کے خلاف معلوم ہوتی ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ جھوٹی حدیثیں تراشتے تھے وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے تاکہ کوئی گرفت نہ کرسکے۔ چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بڑے بڑے قانون دانوں کی جرح کے بھی جھوٹے گواہ اپنی شہادتوں میں پورے اتر جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی سچے گواہوں سے زیادہ قابل اعتبار قرار پا جاتے ہیں۔ لہذا یہ اصول جو غلط روایتوں کی پہچان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں تقریباً بیکار رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ائمہ جرح و تعدیل نے دوسری چیزیں یعنی رواۃ کی ثقاہت پر زیادہ دارومدار رکھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ثقاہت ایک باطنی وصف ہے۔ اس کی تمیز کی بنیاد کس پر رکھی جائے۔ رہا ظاہری تقوے اور طہارت تو اس کی بابت خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان جو جرح و تعدیل کے عظیم الشان امام ہیں کہتے ہیں کہ اہل صلاح و خیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم کا قول ہے کہ اہل خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔

ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم۔ زہد۔ عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے بارہ میں بھی کوئی شہادت دے تو میں قبول نہیں کرونگا۔[1]

اس لئے مجبوراً رواۃ کی صداقت۔ ثقاہت۔ اور عدالت کا مدار شہرت اور مقبولیت پر رکھا گیا یعنی ان لوگوں کی روایت لیجائے جن کی ثقاہت اہل علم میں مقبول اور مشہور ہو۔

حدیثیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے دوسری صدی ہجری کے آغاز سے کتابوں میں لکھی جانے لگیں گو اس وقت بھی لوگ جانچ کرتے تھے مگر اصل تنقید حدیث کا زمانہ تیسری صدی ہے۔ بیشتر ائمہ جرح

---

(۱) توجیہ النظر صفحہ ۲۵

وتعدیل اسی عہد میں ہوئے[1] ان ائمہ میں بھی تسامح موجود تھا۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے۔
ابن حنبل۔ ابن مہدی۔ اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایت کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایت میں نرمی۔
ملا علی قاری موضوعات میں لکھتے ہیں۔

ہذا کلہ یظہر للمحدثین من حیث نظرہم الی الاسناد والا فلا سبیل للقطع۔ لتجویز العقل ان یکون الصحیح فی نفس الامر موضوعا والموضوع صحیحا	یہ سب کچھ وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر کرنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

چنانچہ جملہ اصولیین اور ائمہ محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے[2] انھوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی صحیح حسن۔ مقبول یا ضعیف۔ موضوع۔ منکر اور مردود۔ ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے ورنہ روایت کی تو صرف دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں صحیح یا غلط۔
غرض حدیث کی جو تنقید ہوئی ہے اس میں ابھی بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔ علامہ ابن جوزی نے جو حدیث میں کسی قدر متشدد تھے اپنی کتاب الموضوعات الکبریٰ میں سنن اربعہ کی بہت سی حدیثوں بلکہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم کی بھی متعدد حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ علماء نے رفع الزام کے خیال سے انکی تردید کی لیکن دلیل بجز اس کے اور کچھ نہ دی کہ یہ مسلم چلی آتی ہیں۔
حافظ ابن حجر جو باوجود اس کے کہ حدیث میں بہت نرم ہیں، لکھتے ہیں کہ ابن جوزی نے بھی اس

---

(۱) مثلاً احمد بن حنبل۔ یحییٰ بن معین۔ علی بن المدینی۔ امام بخاری۔ مسلم۔ اور ارباب سنن وغیرہ
(۲) شیخ طاہر جزائری لکھتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن کو متواتر کہا گیا ہے درحقیقت ان میں تواتر معنوی ہے۔ کیونکہ صحیح یہ ہے کہ کوئی حدیث متواتر نہیں ہے۔

قدر موضوعات ڈھونڈھی ہیں کہ انکی کتاب کے برابر (یعنی چار جلد کی) ایک دوسری کتاب لکھی جا سکتی ہو۔

موضوعات کا اثر | اگرچہ ائمہ محدثین نے ان مکذوبات سے امت کو بچانے کی کوشش کی لیکن ان کا تسلط دوں پر اس قدر ہو گیا تھا کہ آجتک ہزاروں موضوع حدیثیں مسلمانوں کا دینی سرمایہ بنی ہوئی ہیں اور انکے عقائد و اعمال میں دخیل ہیں۔

یوں تو باب الطہارت سے لے کر باب الحشر والنشر اور باب الجنۃ والنار تک ایک بھی ایسا نہیں ہو جس میں موضوعات نہ ہوں لیکن بعض ابواب ایسے ہیں کہ ان میں صرف موضوعات ہی ہیں یا انہیں کی کثرت ہو۔ مثلاً

صلاۃ تسبیح	ایک حدیث بھی صحیح نہیں
صلاۃ حاجت	"
صلاۃ اسبوع	"
صلاۃ الفیہ	"

تذکرۃ الموضوعات میں ہو کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً ابوطالب مکی کی قوت القلوب یا ثعلبی وغیرہ کی تفسیروں سے جنہوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شب قدر کہدیا لوگوں نے اس میں صلاۃ الفیہ جاری کی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کیں۔ اور عید سے بھی زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہانتک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کر لی جس میں اسقدر فسق و فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نہ نازل ہو جائے سب سے پہلے اسکا رواج بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں ہوا۔ پھر سارے شام اور مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علماء مصلحین نے توجہ کی جن کی کوشش سے یہ بدعت مٹ گئی۔ تاہم اسکا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتدا برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے۔ انھوں نے دین اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم کو تازہ کیا۔ اسی نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کر لی جو مغرب سے مشرق

تک پھیل گئی۔

زیارت قبر نبی — ایک حدیث بھی صحیح نہیں

فضائل ائمہ اربعہ "

فضائل عرب و زبان عربی "

مذمت عجم و زبان عجمی "

فضائل ابدال و اوتاد و قطب و غوث "

صوفیہ کی اکثر مشہور حدیثیں موضوعات کی فہرست میں داخل ہیں مثلاً

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق

من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر

اعدیٰ عدوّک نفسک التی بین جنبیک

ذرۃ من اعمال الباطن خیر من الجبال الرواسی من اعمال الظاہر

القلب بیت الرب

ان للہ سبعین حجاباً من نور ۔ وغیرہ

علماء اور متعلمین کے فضائل میں بھی تمام حدیثیں موضوع ہیں۔ مثلاً

علماء کی سیاہی شہدا کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

ایک فقیہ شیطان کے لئے ہزار عابد سے گراں تر ہے

علماء انبیاء کے وارث ہیں

جو شخص طلب علم کے لئے نکلتا ہے فرشتے اس پر (اس کے پاؤں کے نیچے) اپنے پر پھیلاتے ہیں۔

عالم کی طرف ایک نگاہ ڈالنا ساٹھ سال کے قیام اور صیام سے بہتر ہے۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم

اعلم علان - علم الادیان وعلم الابدان ہو غیرہ

فضائل صحابہ	اکثر حدیثیں موضوع ہیں
مناقب اہل بیت	"
ہدیہ اور تحفہ کی فضیلت	"
نکاح کی فضیلت اور عورتوں کی مدح	"
فضائل درود	"
مدائح نبی صلی اللہ علیہ وسلم	" شلا

لولاک لما خلقت الافلاک

کنت نبیا وآدم بین الماء والطین

انا خاتم النبین ولا نبی بعدی

انا مدینۃ العلم وعلی بابہا

انا افصح العرب والعجم

امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں مغازی - ملاحم اور تفسیر- ہر چند کہ علماء نے اس کی تاویل کی ہے لیکن فی نفسہ یہ قول کسی تاویل کا محتاج نہیں۔ چند حدیثیں ان ابواب میں اگر صحیح ثابت ہوگئیں تو مستثنیات میں ہیں۔

افتراق امت کے متعلق جتنی حدیثیں ہیں موضوع ہیں۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کے ۷۲ فرقے ہوئے اور میری امت کے ۷۳ ہونگے جن میں سے صرف ایک جنتی ہے" اس کی غلطی واقعتاً بھی ظاہر ہے کیونکہ ۷۳ فرقے مسلمانوں کے چوتھے اور پانچویں ہی صدی ہجری میں علماء نے شمار کرئے تھے۔ اس کے بعد سے آجتک سیکڑوں فرقے بنے اور بنتے جا رہے ہیں۔

موضوع صحابہ | اگرچہ ائمہ محدثین اور جملہ اہل تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ روئے زمین میں سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے وہ حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں جنہوں نے مکہ میں ۱۱۰ھ میں

وفات پائی۔ مگران کذابوں اور وضاعوں نے زمانہ مابعد میں بہت سے طویل العمر صحابہ مخترع کرلئے جو انکے یہ لوگ ہیں۔

جبیر بن حرب۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ میر عبدالکریم بن نصر کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ ۷۲۰ھ میں انکی زیارت کی تھی۔

ابوعبداللہ محمد صقلی۔ پانچویں صدی ہجری میں تھے۔ انکے بارے میں بیان کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا تھا۔ لوگ جاکر تبرکاً ان سے مصافحہ کرتے تھے۔

قیس بن تمیم۔ انکی پیشانی پر ایک نشان تھا جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت علی کے خچر نے لات ماری تھی چھٹی صدی ہجری کے آغاز یعنی ۵۰۰ھ میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں گیلان میں رہتے تھے۔

بابا رتن ہندی متوفی ۶۳۲ھ۔ انکی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ ہندوستان میں رہتے تھے۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے انکی زبان سے طرح طرح کی روایتیں امت میں پھیلائی جاتی تھیں بعض لوگ سند عالی کے خیال سے ان ثلاثیات کو کتابوں میں درج کرتے تھے۔ علماء کی ذہنیت اس قدر جامد تھی کہ جب ائمہ حدیث ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو بعض لوگوں نے انکے ساتھ مجادلہ کیا۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدالدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے جب ان خرافات کی تغلیط کی تو علامہ صفدی انکی تردید کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

غزل

میر خورشید علی صاحب رضوی بی۔اے (علیگ)

بوالفضولے لاف کیف و کم زند　　عارف اندر کن فکاں سر خم زند

بادہ خواہم ز جام بیخودی　　تا اساس عقل را برہم زند

ذرہ آسا بر زمین افتادہ ام　　ہمت از عرش معلے دم زند

درد عشق تو دل را ہر زمان　　آسمان بر نوک خار غم زند

داغ سوز عشق تو چوں آفتاب　　روز محشر سر برار تماکم زند

میکند جان رقص بر تار نفس　　دست بر دست از طرب ہر دم زند

تازہ ام از ساز و سامان جہان　　بے نیازی دست بر دوشم زند

گوہر مقصود گردد رائگاں
پنجۂ خورشید بر شبنم زند

عہد عباسی کا ایک نامور شاعر

ابوالعتاہیہ اور اسکی زندگی کے پرلطف حالات

ماخذ: اغانی جلد ۳ صفحہ ۱۲۶، ج ۴ صفحہ ۲۲، ابن خلکان ج ۱ صفحہ ۱، طبقات الشعرا صفحہ ۲۰۹، تاریخ ادب

لغت عربیہ ج ۲ صفحہ ۶۰

دنیا ہمیشہ مٹتی اور سنورتی رہتی ہے، ایک کی ہلاکت دوسرے کے عروج کا باعث ہوتی ہے اسی فلسفہ کو متنبی نے کس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے ؎

بذا قضت الایام مصائب قوم عند قوم فوائد

یعنی زمانہ ہمیشہ یہی کرتا آیا ہے کہ ایک قوم کی مصیبت دوسرے کے فائدے کی باعث ہوتی ہے، ایک کا زوال دوسرے کے لئے عروج کا باعث ہوتا ہے۔

عہد عباسیہ بھی اسی قانون کے ماتحت آج عالم وجود میں روشن تر نظر آرہا ہے، یہ وہ زمانہ ہے کہ عربیت اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، آج ہم اسی عہد کے ایک نامور شاعر کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

ابوالعتاہیہ اس عہد کا ایک نہایت ہی مشہور شاعر گذرا ہے، افسوس کہ اس کے پورے واقعات زندگی ہم تک نہیں پہنچے، سوائے اس وقت کے جبکہ وہ دربار میں حاضر ہوتا ہے، باقی تمام حالات پردہ خفا میں ہیں اور اگر کہیں ہے بھی تو بہت تھوڑا۔

ابوالعتاہیہ کا نام ابواسحاق اسمٰعیل بن القاسم العنزی تھا، سنہ ۱۳۰ھ میں بمقام عین التمر پیدا ہوا، ابوالعتاہیہ اپنی کنیت سے مشہور ہوا شاعر کی یہ کنیت اس وجہ سے ہوئی کہ "حصول جاہ و شرف کے پیچھے یہ مجنون و دیوانہ بنا رہتا"، اس لئے لوگوں نے اسے ابوالعتاہیہ یعنی مجنون و خبطی کا باپ کہنا

شروع کیا، ایک دوسری روایت یوں بھی ہے کہ خلیفہ مہدی کے دربار میں یہ حاضر تھا، خلیفہ نے کہا انت انسان متحذلق معتتہ یعنی تو تو ایک خبطی اور مجنون ہے اسی وقت سے "ابوالعتاہیہ" کی کنیت سے مشہور ہوا۔

آبائی وطن عین التمر تھا قبیلہ عنزہ سے تعلق رکھتا تھا جس وقت حضرت خالد بن الولید نے عین التمر فتح کیا ابوالعتاہیہ کے دادا کیسان ایک یتیم بچے تھے، دیگر لڑکوں کے ساتھ ہی یہ بھی گرفتار ہو کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے گئے، بارگاہ عالی میں اس وقت عباد بن رفاعۃ العنزی موجود تھے حضرت ابوبکر نے تمام لڑکوں سے حسب ونسب دریافت فرمائے، عباد بن رفاعۃ نے جب سنا کہ کیسان قبیلہ عنزہ سے ہے تو حضرت ابوبکر سے عرض کیا کہ کیسان کو بطور ہبہ کے مجھے دیدیجئے، عباد نے کیسان کو لیکر آزاد کر دیا۔ یہ چھوٹ کر اپنے وطن واپس گئے۔

ابوالعتاہیہ کے والد قاسم حجام یعنی پچھنے لگانے کا پیشہ کرتے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آیا اس نوعیت کے پیشے اس قدیم زمانے میں بھی قابل عار سمجھے جاتے تھے، درآنحالیکہ اکثر بڑے بڑے علماء نے اسی قسم کے پیشے اختیار کئے ہیں، بہرحال ابوالعتاہیہ کی نظر میں یہ پیشہ بہت ہی گھٹیا تھا جس سے متاثر ہو کر اس نے ایک موقع پر کہا۔

ألا انما التقوی ہو العز والکرم	وحبک للدنیا ہو الفقر والعدم
ولیس علی عبد تقی نقیصۃ	اذا صحح التقوی وان حاک او حجم

یہ اشعار اکرمکم عنداللہ اتقکم کی تفسیر ہیں جسے ابوالعتاہیہ نے ذاتیات سے بیزار ہو کر بیان کیا۔

ابوالعتاہیہ کی پرورش کوفہ میں ہوئی، یہ کمہار یعنی برتن بنانے کا کام کرتا تھا اور اسی سے اپنی اور اہل وعیال کی زندگی بسر کرتا۔ دماغ تو پہلے ہی سے شاعرانہ تھا۔ چھوٹی سی عمر سے ہی اشعار کہنا شروع کر دیا۔ عنفوان شباب میں یہ مخنثوں کے ساتھ کوفہ کی گلیوں میں مارا مارا پھرنے لگا، جب پوچھا گیا یہ کیا ہے تو کہا اریدان احفظ کلامہم یعنی میرا مقصد انکی گفتگو اور بات چیت معلوم کرنا ہے ابوالعتاہیہ کا رنگ گورا بال گھونگھر والے خوبصورت تھے۔

ابوالعتاہیہ اور بخالت

دیکھا گیا ہے کہ شاعر بالعموم نہایت ہی سخی کریم الخلق اور اپنی دولت کے برباد کنندہ ہوتے ہیں جتنے شعرا گذشتے ہیں سب کا یہی حال تھا، کہ جس طرح وہ حاصل کرتے اسی طرح برباد کرتے، کوئی ایسی مثال نہیں پیش کی جا سکتی کہ شاعر ہو اور زندگی بفراغت بسر کر رہا ہو، کیونکہ شعریت کا اقتضا ہی یہی ہے۔

ابوالعتاہیہ کو ہم اس کے بالکل برعکس پاتے ہیں۔ اگرچہ وہ بالکل غریبانہ زندگی بسر کر رہا تھا لیکن اپنی استعداد اور شاہان وقت کی فیاضیوں کے سبب اس کے گھر میں ہر وقت لاکھوں روپے موجود رہتے اس شخص ذاتی بخالت کی وجہ سے کبھی پیٹ بھر کھانا بھی نہ کھایا اور نہ کسی مستحق یا غیر مستحق کو کھلایا۔

اسکی بخالت کے عجیب و غریب قصے مشہور ہیں، انکا بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ثمامہ نے ایک بار ابوالعتاہیہ کو خشک روٹی کھاتے دیکھا، پوچھا کہ خالی خشک روٹی بغیر کسی سالن کے کیوں کھاتے ہو۔ ابوالعتاہیہ نے کہا تم لوگ بھی تو ایسا ہی کرتے ہو، اس لئے کہ روٹی کا نوالہ دودھ میں ڈبوتے ہو تو اس میں لگتا ہی کیا ہے اس سے تو بہتر ہے کہ خشک ہی روٹی کھالی جائے۔

ابن عیسیٰ خزیمی ابوالعتاہیہ کے پڑوس میں رہا کرتے تھے، ایک نہایت ہی غریب بدحال شخص ابوالعتاہیہ کے مکان سے متصل رہا کرتا تھا، ابن عیسیٰ کہتے ہیں کہ صبح و شام جب جب وہ ابوالعتاہیہ کے دروازے سے گذرتا، ابوالعتاہیہ اس کے لئے دعائیں کرتا اور بس، وہ کہتا کہ اے اللہ تو اس غریب شخص کو دولتمند کر دے تو اسکی غربت پر رحم کر اور اسے غنی کر دے۔" یونہی بیس سال گذر گئے اور وہ مصیبت کا مارا مر بھی گیا۔ لیکن ابوالعتاہیہ کی خست پسند طبیعت نے کبھی یہ بھی گوارا نہ کیا کہ اسے ایک وقت کا کھانا بھی کھلادے یا ایک پائی ہی بطور صدقہ کے دیدے، ہاں دعائیں خوب دیتا رہا۔ ایک روز میں نے پوچھا کہ کیوں بھائی تم تو جانتے تھے کہ یہ شخص بہت ہی غریب اور قابل رحم تھا کبھی اس کی کچھ مدد بھی کی۔ ابوالعتاہیہ نے کہا جی نہیں کیونکہ خطرہ تھا کہ وہ صدقہ خوار نہ ہو جائے اس لئے میں صرف دعائیں دیتا رہا وہ اس کے لئے بہت بہتر تھا۔

ابوالعتاہیہ کے پاس ایک حبشی غلام تھا، ابوالعتاہیہ اُسے صبح و شام صرف ایک ایک ٹکڑا روٹی

تو کمانے کچھ نہ دیتا ہو وہ بھی تنگ۔ ابن عیسیٰ جیبی کہتے ہیں کہ ایک روز غلام پراگندہ حال میرے پاس آیا اور کہا کچھ کھانے کو دیجئے، بھوک سے برا حال ہو رہا ہے، میں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا آج تک مجھے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا، میں نے ایک روز باتوں باتوں میں پوچھا، ابوالعتاہیہ نے اقرار کیا اور کہا جسے قلیل ناکافی، کثیر بھی ناکافی ہوگا نفس پروری اچھی بات نہیں، میں اس غلام کو صبر و قناعت کی تعلیم دیتا ہوں، کیونکہ اگر وہ صابر و شاکر نہ ہوا تو میری دولت بھی برباد کردے گا اور میرے بال بچوں کو بھی ہلاک کردے گا، غلام کچھ دنوں کے بعد مرگیا تو ابوالعتاہیہ نے دو پرانے بوسیدہ کپڑوں میں اسے دفن کردیا، میں نے کہا سبحان اللہ، جس نے تمہاری خدمت میں اپنی زندگی وفاداری کے ساتھ ختم کردی اسے ایسا کفن دیا، ابوالعتاہیہ نے کہا اچھے اور نئے کپڑے زندوں کے لئے ہیں نہ کہ مُردوں کے لئے۔

ایک نہایت ہی پرلطف واقعہ ہے کہ بغداد میں ابوالعتاہیہ نے کسی دوکان سے کچھ کپڑے خریدے اور قیمت کچھ دنوں کے بعد دینے کا وعدہ کیا لیکن مدت گذر گئی اور ادا نہ کیا، ایک روز ابوالعتاہیہ خچر پر سوار بازار سے گذر رہا تھا کہ دوکاندار نے اپنے ایک نوکر سے کہا جا اور ابوالعتاہیہ کے پاس جو کچھ کپڑا وغیرہ ہو سب چھین لے، نوکر نے آکر لگام پکڑ لی، ابوالعتاہیہ نے کہا کیوں کیا کام ہے؟ اس نے جواب دیا میرے آقا نے بھیجا ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس ہو سب چھین لوں کیونکہ آپ نے ابھی تک کپڑوں کی قیمت ادا نہ کی ابوالعتاہیہ ٹھہر گیا، غلام لگام پکڑے کھڑا رہا یونہی گھنٹوں گذر گئے، اس وقت وہاں بہت سے آدمی جمع ہوگئے، جو گذرتا دیکھنے کے لئے ذرا ٹھہر جاتا، لیکن واقعہ کی کسی کو خبر نہ تھی جب ابوالعتاہیہ نے دیکھا کہ بہت سے آدمی جمع ہوگئے ہیں تو یہ اشعار پڑھے۔

واللہ ربک انی لاجل وجہک عن فعالک

لوکان فعلک مثل وجہک کنت مکتفیا بذلک

یعنی (غلام کو مخاطب کرکے) تم تو بڑے خوبصورت ہو اے کاش تمہاری سیرت بھی اچھی ہوتی۔

غلام تھا نوعمر اور خوبصورت یہ سنکر جھینپ گیا اور لگام چھوڑ دی، اس نے واپس آکر اپنے آقا سے کہا بعثتنی الیٰ شیطان جمع علی الناس وقال فی الشعر حتی اخجلنی فہربت منہ، آپ نے مجھے شیطان کے

پاس بیچا جس نے بہت سے آدمیوں کے درمیان مجھے شرمندہ کیا اور میرے بارے میں اشعار کہے!

ایک اور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ثمامہ بن اشرس کو ابو العتاہیہ نے یہ اشعار سنائے ؎

اذا المرأ لم یعتق من المال نفسہ　　تملکہ المال الذی ھو مالکہ

الا انما المال الذی انا منفق　　ولیس لی المال الذی انا تارکہ

اذا کنت ذا مال فبادر بہ الذی　　یحق والا استھلکتہ مہالکہ

ان اشعار میں دولت کی مذمت اور صدقہ و زکوٰۃ کی ترغیب دی گئی ہے اور شاعر نے نہایت ہی زور کے ساتھ کہا ہے کہ اگر تم دولت مند ہو تو جلد از جلد اپنا فرض ادا کردو ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مہالک برباد کردیں "

ابو العتاہیہ نے کہا کہ یہ اشعار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ماخوذ ہیں جو ترغیب زکوٰۃ میں ہے، میں نے کہا کیا وہ حدیث تمہارے نزدیک صحیح ہے، ابو العتاہیہ نے کہا بیشک تو میں نے کہا سب سے پہلے تمہیں فریضہ ادا نہیں کرتے، اتنی دولت کے باوجود ایک حبہ بھی صدقہ یا زکوٰۃ کے نام نہ دیا، نہ خود ہی کھاتے ہو نہ کسی کو کھلاتے ہو، ابو العتاہیہ نے کہا سچ ہے مگر میں گردش زمانہ سے ڈرتا ہوں کہ مبادا کہیں غربت کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ میں نے کہا آپ تو ہمیشہ سے ایسے ہی حریص ہیں کوئی نئی بات نہیں، سوائے عید اور بقرعید کے کبھی گوشت کیا معنی پیٹ بھر کھانا نہ کھایا ہوگا،" ابو العتاہیہ گھبرا گیا اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔

محمد بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز پوچھا کیا زکوٰۃ ادا کر چکے ؟ ابو العتاہیہ نے جواب دیا آخر میرے بال بچے جو کھا رہے ہیں وہ کیا ہے، زکوٰۃ ہی تو ہے، میں نے کہا سبحان اللہ زکوٰۃ فقرا اور مساکین کا حق ہے کہ تمہارے اہل و عیال کا! ابو العتاہیہ نے کہا اگر اپنے اہل کو زکوٰۃ نہ دوں تو اُن سے بڑھ کر غریب اور مستحق دنیا میں کون ہوگا "

غرض یہ زہد و تقویٰ اور یہ بخالت، یہ وعظ و نصیحت اور یہ حالت! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان صفات متضادہ کا حامل ایک ایسا شاعر کیونکر ہوگیا۔ مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شعریت کو اس قسم کی ذات

اور جگ نظری سے کوئی تعلق نہیں، شاعری ایک اعلیٰ چیز ہے، کارلائل کی حقیقت بیں نظر میں شاعر اور نبی دونوں ایک ہی نور کے دو پر تو ہیں،، گوئٹے کہتا ہے قدرت کی بزم تجلی میں شاعر اور صرف شاعر باریاب ہو سکتا ہے "

ممکن ہے ایک متقی اور پرہیزگار بخیل ہو لیکن شاعر اور بخیل! ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ مسئلہ نفسیات کے اعتبار سے نہایت ہی پیچیدہ ہے۔

ابو العتاہیہ اور زندقیت

ابو العتاہیہ کو لوگ زندیق کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مذہب صرف فلسفیانہ حیثیت رکھتا ہے لوگوں کو شکایت ہے کہ اس کے اشعار میں موت کا ذکر تو ہے لیکن حشر ونشر اور مابعد الممات کے واقعات کا کہیں تذکرہ نہیں۔ یہ صحیح نہیں، اس کے اشعار میں اکثر جگہوں میں مابعد الموت کا ذکر ہے، جو لوگ اس کے دیوان کا بہ تمام و کمال مطالعہ کر چکے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کے اشعار میں توحید، حشر ونشر، جنت دوزخ کا کس قدر ذکر ہے۔

اس کا ایک شعر ہے ؎

فلصنی تخلص یوم بعث　　　اذا للنار برزت الجحیم

ایک بار ابو العتاہیہ خلیل بن اسد نوشجانی کے گھر گیا اثنائے گفتگو میں ابو العتاہیہ نے کہا لوگ مجھے زندیق کہتے ہیں، واللہ میرا دین توحید کے سوا کچھ نہیں،، میں نے کہا کچھ اشعار بطور سند کے پیش کیجئے، جس سے معلوم ہو کہ واقعی آپ توحید کے قائل ہیں،، ابو العتاہیہ نے یہ اشعار پڑھے ؎

الا اننا کلنا بائد　　　وای بنی آدم خالد

وبدؤہم کان من ربہم　　　وکل الی ربہ عائد

فیا عجبا کیف یعصی الالہ　　　ام کیف یجحدہ الجاحد

وفی کل شیئ لہ آیۃ　　　تدل علی انہ الواحد

یعنی ہم تمام فانی ہیں اور موت پروردگار عالم کے کون ہے جو ہمیشہ ہمیشہ زندہ ہو سکتا ہے۔ اللہ نے ہم سب کو پیدا کیا ہے اور پھر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا۔ تعجب ہے کہ لوگ اس کی نافرمانی کرتے ہیں، درآنحالیکہ دنیا کی تمام چیزیں اسکی وحدانیت پر دلالت کر رہی ہیں۔

ابوالعتاہیہ اور اسکی شاعری

ابوالعتاہیہ نہایت ہی قادر الکلام تھا، اس کے اشعار اس قدر ہیں کہ آج تک انہیں کوئی شخص جمع نہ کر سکا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ان اصحاب ثلاثہ میں جن کی طبیعت شاعری سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی تھی ایک ابوالعتاہیہ ہی تھا، اس کے اشعار سلیس عام فہم اور زیادہ تر فلسفیانہ پہلو لئے ہوتے ہیں وہ فلسفہ کی پیچیدگیوں کو اور مشکل ترین معنی کو اپنے خداداد جوہر کے بدولت نہایت ہی آسان طریقے سے اشعار میں بیان کر دیتا ہے، ابوالعتاہیہ ہی پہلا انقلاب پرست ہے جس نے شاعری کا قدیم رُخ بدلدیا، اندھی تقلید کو چھوڑا، اس کی جدت پسند طبیعت نے اشعار میں ایک نئی روح پھونک دی، جدید معانی اور نئے نئے الفاظ استعمال کئے اور علم عروض کی سخت پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی تیز طبیعت کے موافق اشعار کہے، درحقیقت اس نے شاعری پر بہت بڑا احسان کیا اور اسکا میدان نہایت وسیع کر دیا۔

ایک روز گھنٹہ بجنے کی آواز سنی تو اس کی آواز پر یہ اشعار موزوں کئے ؎

للمنون دائرات　　　یدرن صرفہا
ہن ینتقیننا　　　واحدا فواحدا

ابوتمام الطائی نے اس کے مخترعات معانی میں سے اس شعر کی بڑی تعریف کی ہے ؎

الناس فی غفلاتہم　　　ورحی المنیۃ تطحن

احمد بن یوسف سے کہتا ہے ؎

الم تران الفقر یرجی لہ الغنی　　　وان الغنی یخشی علیہ من الفقر

موسیٰ بن داؤدی کے بارے میں کہتا ہے ؎

ولما استقلوا باثقالهم وقد ازمعوا للذی ازمعوا
قرنت التفاتی آثارهم واتبعتهم مقلة تدمع

ایک موقع پر وہ کہتا ہے ؎

هب الدنیا تصیر الیک عفوا الیس مصیر ذاک الی زوال

یہ وہ اشعار ہیں جن پر آج تک تمام شعراء سر دھنتے ہیں، ابو العتاہیہ کے یہ چوٹی کے اشعار ہیں، ابو تمام الطائی کہتا ہے کہ آج تک حسن ادا اور بلند معانی کے اعتبار سے ابو العتاہیہ کے ان اشعار کا نہ کسی نے مقابلہ کیا اور نہ آئندہ کوئی کر سکتا ہے۔

یہ دو اشعار بھی بلند معنی کے اعتبار سے قابل صد ستائش ہیں ؎

اذا المرء لم یعتق من المال نفسه تملکه المال الذی هو مالکه
الا انما المال الذی انا منفق ولیس لی المال الذی انا تارکه

کس خوبی سے اس نے ادا کیا ہے کہ وہ شخص جو دولت دنیا کے جمع کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے تو وہ مال کا مالک نہیں ہوتا بلکہ مال اسکا مالک ہو جاتا ہے، اور وہ مال کا غلام، پھر وہ کہتا ہے کہ جان لو کہ مال وہ ہے جسے ہم صرف کریں نہ کہ وہ جس کو جمع کریں اور چھوڑ جائیں۔

ابو العتاہیہ نے ہر ایک عنوان پر طبع آزمائی کی ہے، "زہدیات" تو خاص اسی کا فن ہے، اسکے اشعار میں ضرب الامثال اور حکیمیہ تمثیلیں بہت پائی جاتی ہیں مثلاً ؎

حسبک مما تبتغیه القوت ما اکثر القوت لمن یموت

یعنی تجھے بقدر قوت لایموت ہی کافی ہے، جب یہ معلوم ہے کہ مر ہی جائیں گے تو قوت لایموت سے زیادہ کی ضرورت ہی کیا۔

ابو العتاہیہ کے ہاں ہر قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں، بلند پایہ بھی اور کمتر درجے کے بھی، اصمعی نے ابو العتاہیہ کے اشعار کی مثال نہایت ہی عمدہ پیش کی ہے، وہ کہتا ہے ابو العتاہیہ کے اشعار

لیے ہیں جیسے کسی بادشاہ کا ایک ملک ہو کہ اس میں ہر قسم کی چیزیں موجود ہیں، اعلیٰ بھی اور کمترین بھی، زر وجواہر بھی کنکر پتھر اور ٹھیکری وغیرہ بھی۔

ابوالعتاہیہ دربار میں

ابوالعتاہیہ کو جب اپنی شاعری کا احساس ہوا اور اپنے قادر الکلام ہونے پر اسے کامل اعتماد ہوگیا تو وہ ابراہیم موصلی کے ہمراہ دارالخلافہ بغداد کی جانب روانہ ہوا۔ ابوالعتاہیہ مقام حرہ میں رُکا اس وقت مہدی برسرحکومت تھا، ابوالعتاہیہ کے شعر وسخن کی شہرت ہوئی، اور کچھ ہی دنوں میں دربار خلافت میں باریابی کا موقع بھی مل گیا، ابوالعتاہیہ نے خلیفہ کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ سنایا، مہدی بہت ہی خوش ہوا اور خلعت وانعام سے سرفراز فرمایا۔ خلفا ہادی، رشید، مامون کے ساتھ ابوالعتاہیہ کی بھی دلچسپیاں رہیں، خلفاء نے اس کے اشعار کو بہت پسند کیا چنانچہ جب جب شاعری ترک کی درے کھائے اور جیل خانہ دیکھنا پڑا۔

زہد وتقوے کی طرف ابوالعتاہیہ کا رجحان پہلے ہی سے تھا، ایک بار جو طبیعت میں جوش پیدا ہوا جھٹ کملی کاندھے پر رکھ چلتے بنے، دربار کی آمد ورفت بند ہوئی، ہارون الرشید کو جب معلوم ہوا تو قید کردیا۔

ابوالعتاہیہ نے شاہان وقت سے بڑے بڑے انعامات حاصل کئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دربار میں صرف یہی کامیاب ہوتا، ایک بار ابوالعتاہیہ نے خلیفہ مہدی کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ سنایا تمام شعراء موجود تھے، مہدی نے ستر ہزار درہم انعام دئے، بعض حاسدین کو بہت برا معلوم ہوا شدہ شدہ مہدی کو خبر ہوئی، بہت ہی غصہ ہوا، اس نے بلا کر تنبیہ کی اور کہا جس حسن وخوبی سے ابوالعتاہیہ مدح کرتا ہے، تم لوگ نہیں کرسکتے، تم لوگ ایک قصیدہ کہتے ہو تو پچاس اشعار تو تشبیب میں بھرتے ہیں اور اس کے بعد اگر کہیں نوبت آئی تو چند مدح میں، ابوالعتاہیہ کے اشعار ان خرافات سے پاک ہوتے ہیں۔

خلیفہ ہادی کی بیعت کے وقت ابوالعتاہیہ روپوش ہوگیا، ہادی اس سے ناراض تھا،

ابوالعتاہیہ نے پھر یہ اشعار لکھ کر بھیجے اور عفو کا طالب ہوا ؎

الا شافع عند الخلیفۃ یشفع فیدفع عنا شر ما نتوقع !

یردنی موسیٰ علی غیر عزۃ ومالی اری موسیٰ من العفو

ہادی نے معاف کر دیا اور بلاکر انعامات سے سرفراز کیا، پھر ابوالعتاہیہ برابر دربار میں آنے لگا۔

ابن اعرابی کہتا ہے کہ ایک روز تمام شعراء دربار میں موجود تھے، ہارون الرشید تخت پر جلوہ افروز تھا۔ شعرا اپنے اپنے قصیدے سنا رہے تھے۔ ابوالعتاہیہ بھی کھڑا ہوا اور ایک قصیدہ سنایا، ہارون الرشید جوش طرب سے جھومنے لگا اور کہا احسنت واللہ، اس دن ابوالعتاہیہ کے سوا اور کوئی کامیاب واپس نہ آیا۔

قیصر روم نے جب ابوالعتاہیہ کی شہرت سنی تو ہارون الرشید سے دریافت کیا اور خواہش کی کہ ابوالعتاہیہ اس کے دربار میں آئے، ابوالعتاہیہ نے انکار کر دیا۔ قیصر نے کہا کہ اچھا اس کے چند اشعار ہی لکھ کر بھیج دیجیے تاکہ اسے شاہی عمارتوں اور دربار میں آویزاں کر دیا جائے، ہارون الرشید نے یہ دو اشعار لکھ کر بھیج دیئے ؎

ما اختلف اللیل والنہار ولا دارت نجوم السماء فی الفلک

الا لنقل السلطان عن ملک قد انقضی ملکہ الی ملک

ابوالعتاہیہ کی بدیہہ گوئی اور قادر الکلامی

ابوالعتاہیہ فی البدیہہ اشعار کہا کرتا تھا، وہ کہا کرتا کہ میں ہر شخص سے اشعار میں گفتگو کر سکتا ہوں اسکا قول ہے اکثر اوقات میں قافیہ بندی کا کہا ہوں، جعفر بن یحییٰ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ ابوالعتاہیہ اس عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ فراء (ایک نحو کا امام گذرا ہے) نے بھی تائید کی، ابوالعتاہیہ کے اشعار کا یہ عالم تھا کہ جو دوست اس سے ملنے آتے تھے تو مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں پر جو اس کے ہاں پڑے رہتے، اس کے اشعار لکھ کر لیجایا کرتے۔

ہارون الرشید کو گھوڑے بہت پسند تھے، اور وہ کبھی کبھی شعراء سے ان پر طبع آزمائی کی فرمائش کرتا، ایک روز دربار میں بڑے بڑے شعراء موجود تھے، ہارون الرشید نے اپنے پیارے گھوڑے "مشمر" پر زور آزمائی کی خواہش کی، کسی اور کو جرأت نہ ہوئی، ابو العتاہیہ فوراً اٹھا اور یہ اشعار سنائے ؎

جاء المشمر والافراس یقدمها ۔۔۔ ہوناً علی رسلہ منہا وما انبھرا
وخلف الریح حسری وہی جاہدة ۔۔۔ ومر یختطف الابصار والنظرا

خلیفہ مہدی شکار کے لئے نکلا، سردی پڑ رہی تھی اس دن آسمان بھی ابر آلود تھا، بارش ہونے لگی، تمام آدمی منتشر ہوگئے، صرف چند آدمی مہدی کے ساتھ رہ گئے، خلیفہ بھیگتا بھاگتا ایک دریا کے کنارے پہنچا خلیفہ شدت سردی سے سکڑا جا رہا تھا، خلیفہ کو ایک ملاح کا کمبل اڑھا دیا گیا، ذرا دیر میں تمام خدام تلاش کرتے ہوئے آ گئے، ابو العتاہیہ نے خلیفہ کو اس حال میں دیکھ کر برجستہ کہا ؎

یا لابس الوشی علے ثوبہ ۔۔۔ ما اقبح الاشیب فی الراح

خلیفہ نے سر اٹھایا اور کہا آگے، ابو العتاہیہ نے کہا ؎

لو شئت ایضاجلت فی خامة ۔۔۔ وفی وشاحین و اوضاح

خلیفہ جوش طرب میں جھومنے لگا، اور کہا کچھ اور! ابو العتاہیہ نے ہاتھ باندھ کر کہا جاں بخشی ہو تو عرض کروں اور یہ شعر پڑھا ؎

کم من عظیم القدر فی نفسہ ۔۔۔ قد نام فی جبة ملاح

یعنی کتنے عظیم المرتبت ایسے بھی ہیں کہ ملاح کی کملی میں پڑے ہوئے ہیں۔

خلیفہ بہت خوش ہوا، اور پھر سب لوگ واپس آئے۔

ادباء عصر مجتمع تھے شعر و شاعری کا ذکر ہو رہا تھا، ایک شخص نے کہا ابو العتاہیہ جیسا زہدیات میں مشہور ہے مدحیات میں نہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا ہرگز نہیں ابو العتاہیہ ہر میدان کا شیر مرد ہے دیکھو اس نے ہارون الرشید کی مدح میں کیا اچھا قصیدہ کہا ہے ؎

ہارون یاملزن شیئی من الصدی   انا ما الصدی بالبیق عضت حناجر

تسے کہاہے۔

ومن ذا یفوت الموت والموت مدرک   اذ الم یفت ہارون ضد نیافسر

اہل مجلس نے تحسین کے نعرے بلند کئے۔

یہی نہیں کہ ابوالعتاہیہ نے آسان آسان بحروں کو استعمال کیا بلکہ مشکل ترین فلسفیانہ مضامین کو اُس نے نہایت ہی آسانی سے اپنے مخصوص طرز میں ادا کر دیا، ابوالعتاہیہ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے فلسفیانہ مضامین کو شاعری کا رنگ دیکر پیش کیا۔

عبداللہ بن حسن کہتے ہیں کہ ایک روز ابوالعتاہیہ میرے پاس آیا، میں نے کہا اے ابواسحٰق (ابوالعتاہیہ کی کنیت تھی) کبھی تمھیں الفاظ کے ڈھونڈھنے میں دقت بھی پیش آئی ہے، اور پھر تو یا غریب الفاظ بھی استعمال کرنا پڑا ہے جیسا کہ عام شعراء کا قاعدہ ہے، ابوالعتاہیہ نے جواب دیا کبھی ایسا نہیں ہوا، میں نے کہا شاید اس لئے کہ تم آسان بحروں کو استعمال کرتے ہو، ابوالعتاہیہ نے کہا خوب جس مشکل سے مشکل قافیہ میں کہو میں شعر کہتا ہوں، میں نے کہا اچھا "البلاغ" پر کہو، ابوالعتاہیہ نے ذرا تامل کے بعد پانچ اشعار سنائے، چند پیش کئے دیتا ہوں ؎

ای عیش یکون ابلغ من عیش   کفاف قوت بقدر البلاغ

صاحب البغی لیس یسلم منہ   وعلی نفسہ بغی کل باغ

نبتنی الایام عقلی و مالی   وشبابی و صحتی وفراغ

ایک بار جاحظ کے سامنے ابوالعتاہیہ کے کچھ اشعار پڑھے گئے جبکہ اُس نے یہ شعر سنا ؎

یا للشباب المرح التصابی   روائح الجنۃ للشباب

تو پھڑک گیا، اُس نے کہا کیا خوب اس مصرع "روائح الجنۃ الشبابیٔ" میں کس قدر لطیف معانی ادا کئے گئے ہیں اس کی خوبی کو صرف دل ہی معلوم کر سکتا ہے، زبان اس کے بیان سے قاصر ہے، بہتر معانی وہی ہیں جبکہ دل میں اتر جائیں اور زبان سے پہلے دل اسے قبول کرلے، اس نے کہا:- ابوالعتاہیہ

کے بہترین اشعار میں سے یہ بھی ہے۔

درحقیقت ابوالعتاہیہ کی بلند پایہ شخصیت کو کسی نے سمجھا نہیں، پھر بھی صاحبان ذوق نے اس کی قدر کی اور اسکی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ابوالعتاہیہ خاندان برامکہ کا بھی بہت بڑا مداح تھا۔

جبکہ امین قتل کئے گئے اور مامون کا دور دورہ ہوا تو زبیدہ خاتون نے ابوالعتاہیہ سے چند اشعار کہنے کی فرمائش کی تاکہ انھیں مامون کے پاس بھیجے، ابوالعتاہیہ نے یہ اشعار کہے ؎

الا ان صرف الدہر یدنی ویبعد   ویمتع بالالاف طورا و تیفقد

اذا بقی المامون لی فالرشید لی   ولی جعفر لم یفتقد و محمد

مامون ان اشعار کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا اور شاعر کی بہت تعریف کی، پوچھا کس نے کہا ہے کہا گیا ابوالعتاہیہ نے، مامون نے ابوالعتاہیہ کو دس ہزار درہم بطور انعام کے دینے کا حکم دیا اور زبیدہ خاتون کا خاص خیال کرنے لگا۔

ابوالعتاہیہ خلفا، ہادی، مہدی، ہارون اور مامون کے زمانے تک زندہ رہا، ہر ایک نے اس شاعر کی قدر کی، ہارون کے خزانے سے علاوہ تحفہ تحائف کے پچاس ہزار درہم سالانہ نقد ملا کرتے تھے۔

ابوالعتاہیہ کی وفات

ابوالعتاہیہ سوداوی المزاج تھا، امر دین میں بہت غور و فکر کیا کرتا۔ آخر عمر میں زہد و اتقا کی طرف بالکل ہی مائل ہوگیا اور دنیا کو چھوڑ دیا، شعر کہنا اس نے کئی بار چھوڑا، لیکن شاہان وقت کے دباؤ سے مجبوراً پھر شروع کر دیتا، ابوالعتاہیہ خلیفہ مہدی کی ایک لونڈی عتبہ پر عاشق ہوگیا تھا، اس کے بارے میں اس نے بہت اشعار کہے، مصیبت بھی اٹھائی اور قید خانہ بھی دیکھا، الغرض اسکی زندگی بھی عجیب زندگی تھی، اسکی لوح حیات کو دیکھتے ہوئے اس کے نامہ اعمال پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اسکی زندگی کا خاکہ غالب مرحوم کا یہ شعر کس حسن و خوبی کے ساتھ ادا کر رہا ہے ؎

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بلقتا ہے جب مرض الموت میں گرفتار ہوا تو اس سے فارق کر ہو اگر اس کے کان میں یہ شعر پڑھے

سیعرض عن ذکری وتنسی مودتی ویحدث بعدی للخلیل خلیل

اذا ما انقضت منی من الدہر لیلة فان غنا. الباکیات قلیل

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اسے اپنی موت کا احساس ہوگیا تھا، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ عنقریب لوگ مجھے بھلادیں گے اور میرے بعد دوسرے دوست پیدا کریں گے اور رونے والی عورتیں بھی تھوڑی ہی دیر میں مجھ پر رونا چھوڑ دیں گی۔

جب اسے یقین ہوگیا کہ موت بالکل ہی قریب ہے تو نہایت ہی حسرت سے یہ اشعار پڑھے ؎

الہی لا تعذبنی فانی مقر بالذی قد کان منی

فمالی حیلة الا رجائے لعفوک ان عفوت وحسن ظنی

وکم من زلة لی فی الخطایا وانت علی ذو فضل ومن

اذا فکرت فی ندمی علیہا عضضت انالی وقرعت سنی

ان اشعار میں وہ اقرار گناہ کرتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں نہایت ہی عاجزی کے ساتھ عفو کا طالب ہوا ہے۔

ابو العتاہیہ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے ۲۱۰ھ یا ۲۱۱ھ یا ۲۱۲ھ اور بعض کا قول ۲۱۳ھ بھی ہے۔

ابن خلکان کہتا ہے کہ ابو العتاہیہ نے وصیت کی کہ میری قبر پر یہ شعر کندہ کر دیا جائے۔

ان عیشا یکون اخرہ الموت لعیش معجل التنغیص

بہ روایت اغانی اس نے ان اشعار کے لئے وصیت کی ؎

اذن حتی تسمعی اسمعی ثم عی وعی

انا رہن بمضجعی فاحذری مثل مصرعی

عشت تسعین حجة اسلمتنی لمضجعی

کم ترالمی ثابت شا فی دیار التنزع
لیس زاد سوی التقی فخذی منہ اودعی

ان اشعار میں ابوالعتاہیہ نے اپنی عمر بھی بیان کر دی، نہایت ہی بیچارگی کے عالم میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں میں گوشۂ قبر ہی آباد کرنے کے لئے آیا تھا۔ ۹۰ سال زندہ رہا اور اب دنیا سے جا رہا ہوں، لوگوں کو یہ جان لینا چاہئے کہ زاد آخرت صرف اتقا، اور پرہیزگاری ہے۔

ابوالعتاہیہ، ابراہیم موصلی، ابوعمر الشیبانی، ان تین عظیم الشان ہستیوں کا ایک ہی دن خاتمہ ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ابوالعتاہیہ کا مذہب

ابوالعتاہیہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو جوہر متضاد پیدا کئے ہیں، دنیا کی تمام چیزیں حادث اور فانی ہیں ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام، وہ فنا کے یہ معنی بیان کرتا ہے کہ انتقال جواہر الی جواہر ایک جوہر دوسرے جوہر میں منتقل ہو جاتا ہے، بالکل نیست نابود نہیں ہوتا، وہ کہتا ہے کہ بقول غالب ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

معرفت ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ ایک عطیہ خداوندی ہے، ابوالعتاہیہ پر تشیع غالب تھا، لیکن وہ تفضیلت کا قائل نہ تھا، وہ خلیفہ وقت کے ساتھ بغاوت کو ناجائز قرار دیتا۔

شعرا میں ابوالعتاہیہ کا درجہ

ہم اب تک ابوالعتاہیہ کو شاعر کی حیثیت سے ایک بلند پایہ شاعر ثابت کرتے چلے آئے ہیں لیکن کسی شخص کو بالکل معصوم بنا دینا کسی طرح جائز نہیں، بلکہ ہم پر لازم ہے کہ تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں۔

شعرا کی مجلس میں اسے "کثیر الساقط المرذول" کا لقب دیا جاتا ہے، کیونکہ یہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم و مغفور کی طرح بازاری اور عام الفاظ بہت استعمال کرتا، مولانا مرحوم کی مثال ابوالعتاہیہ

الفاظ معنا بالکل درست چسپاں ہو جاتی ہے ، ابو ہلال عسکری نے کتاب الصناعتین میں ابوالعتاہیہ کے اشعار پر سخت تنقید کی ہے ، اور کہا ہے کہ ابوالعتاہیہ بارد یعنی ٹھنڈے اور بیجان الفاظ بہت استعمال کرتا ہے اس نے مثالاً چند اشعار بھی پیش کئے ہیں ۔

ابوالعتاہیہ نے ابونواس سے پوچھا دن بھر میں کتنے اشعار کہتے ہو ، ابونواس نے جواب دیا ایک یا دو ، ابوالعتاہیہ نے کہا سو دو سو اشعار کہہ لیتا ہوں ، ہاں کوئی تعجب نہیں اس لئے کہ تم ایسے اشعار کہتے ہو جیسے ؎

یا عتب مالی ولک　　　یالیتنی لم ارک

ابونواس نے کہا اگر میں چاہوں تو ایسے ہزاروں اشعار روزانہ کہہ کر رکھ دوں ، دیکھو میں ایسے اشعار کہتا ہوں ؎

من کف ذات حرنی زی ذی ذکر　　　لہا محبان لوطی وزنار

کیا تم ایسا کہہ سکتے ہو؟ کبھی نہیں ۔

اسکا یہ مطلب نہیں کہ ابوالعتاہیہ کا شاعری میں کوئی درجہ ہی نہیں ، نہیں بلکہ وہ بہت بڑا شاعر ہے ، وہ الفاظ اگرچہ بارد استعمال کرتا ہے ، لیکن معانی کے اعتبار سے اس کے اشعار بہت ہی بلند ہوتے ہیں ۔

قرۃ العین

عہد طفولیت، وطن و خاندان | "قرۃ العین" یا زرین تاج ۱۸۱۵ء میں شہر قزوین ایران میں پیدا ہوئیں۔ اُنکے والد حاجی محمد صالح قزوین کے ایک نامور مجتہد تھے۔ جن کا علمی تبحر تمام ایران میں مسلم تھا۔ ان کے چچا حاجی ملا تقی بھی ملک کے ممتاز علماء میں مانے جاتے تھے۔ ملا تقی نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو آج بھی مشرقی ایران میں مستند سمجھی جاتی ہیں۔ انکے علاوہ قرۃ العین کے دو اور چچا بڑے عالم تھے جو اگرچہ شہرت نہیں رکھتے ہیں تاہم انکے علمی فضل و کمال سے چشم پوشی نہیں کیجا سکتی۔

غرض قرۃ العین ایسے عالم خاندان میں جس کا ہر رکن فضل و کمال میں یکتائے روزگار تھا پیدا ہوئیں بچپن ہی سے قدرت نے اس خاتون کو ذہن رسا اور فکر بلند عطا فرمائی تھی جس سے اس نے پوری طرح کام لیا۔ قرۃ العین کی عالی دماغی میں اسکی عالی خاندانی بھی بہت کچھ مدد معاون ثابت ہوئی۔

قرۃ العین کے گھر میں صبح و شام علمی چرچوں کے سوا اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ قرۃ العین کے خاندان کے لوگ جمع ہو جاتے علمی مباحث چھیڑتے جس میں قرۃ العین نہایت دلچسپی اور شوق سے حصہ لیتیں فصاحت و بلاغت سے ایسے ایسے دلائل پیش کرتیں کہ بڑے بڑے عالم متحیر ہو جاتے۔ قرۃ العین کی قابلیت پر نہ صرف اُنکے خاندان کو فخر تھا بلکہ تمام شہر قزوین اس فاضل خاتون پر نازاں تھا۔

تعلیم و تربیت | قرۃ العین بچپن ہی سے زیور ذکاوت و ذہانت سے آراستہ تھیں جس زمانے میں مشرق میں عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا اور تعلیم نسواں اچھی نظروں سے نہیں دیکھی جاتی تھی اُس زمانے میں قرۃ العین ایک سرگرم طالب علم تھیں، وہ چاہتی تھیں کہ اپنے زمانے کے تمام علوم میں کافی دستگاہ حاصل کریں۔ قرۃ العین کو علم کے ساتھ ایک خاص مناسبت تھی۔ پھر غور و خوض کی عادت اور شوق و محنت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا لیکن اس خاتون کے راستے میں رکاوٹیں بھی بہت سی تھیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ پردے کا رواج تھا جس کی وجہ سے صنف نازک

کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا مشکل امر تھا۔ اس لئے سوائے والد اور چچا کے کوئی شخص قرۃ العین کو تعلیم نہیں دے سکتا تھا۔ اور وہ زیادہ پڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر خود اُسے علم کی وہ پیاس تھی جو بجھتی ہی نہ تھی۔ بالآخر اس نے کسی نہ کسی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت لے لی۔ حصول تعلیم میں اس خاتون کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے علم و فضل کا شہرہ نہ صرف قزوین ہی میں پھیل گیا بلکہ تمام ایران اس کے غلغلے سے گونج اٹھا اور یہ عصمت مآب خاتون صنف نازک کے لئے باعث فخر و ناز بن گئی۔

اساتذہ | قرۃ العین کی طالب علمی کا زمانہ وہ ہے جب شیخ احمد احسائی کی علمی شہرت سرزمین ایران میں پھیل چکی تھی۔ شیخ کے علمی تبحر کا یہ عالم تھا کہ تمام ممالک اسلامی کے طلبہ اس سرچشمۂ فیض سے اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔

شیخ احمد احسائی کے چار خاص عقیدے تھے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معراج روحانی تھی نہ کہ جسمانی۔

۲۔ مرنے کے بعد انسان کی روح خدا ہی کے حضور میں رہے گی۔

۳۔ جس طرح خدا گزشتہ زمانوں میں مصلحان ربانی اور ہادیان آسمانی بھیجتا رہا ہے اب بھی بھیجتا ہے، اُس نے اپنی سنت قدیمہ کو نہیں بدلا اور نہ یہ فیض جاری بند ہوا ہے

۴۔ اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ آخری امام (امام مہدی) ہزار سال سے کسی غار میں پوشیدہ ہیں اور قرب قیامت کے زمانے میں معلم اعظم کی حیثیت سے ظاہر ہونگے شیخ نے کہا کہ امام مہدی کسی غار سے نکلنے کی بجائے عام قانونِ قدرت کے مطابق بطن مادر سے متولد ہوں گے۔

چنانچہ اس خیال نے تمام شیعی دنیا میں ایک ہلچل ڈال دی۔ شیخ نے اپنے ان عقائد کی کافی نشر و تبلیغ کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد شیخ کے معتقدین میں شامل ہوگئی۔ مگر شیخ کے پیرؤوں کو اپنے ان عقیدوں کی بنا پر جان سے ہاتھ دھونا پڑا کیونکہ مجتہدین نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں میں ان عقائد کی ترویج ہو۔ تاہم ہزارہا کی تعداد میں لوگ شیخ کے مریدوں میں داخل ہوگئے اور یہ گروہ "نو فرقہ

شیخیہ" کے نام سے موسوم ہوگیا. مگر یہ لوگ خود اپنے آپ کو شیخ احمد کی نسبت سے "احمدی" سمجھتے تھے.

قرۃ العین کو ابتدائی تعلیم انکے والد اور چچا نے دی پھر سید کاظم رشتی نے انکو اعلیٰ تعلیم دی جب قرۃ العین ۱۳-۱۴ برس کی ہوئیں اس وقت انکے دو چھوٹے چچا فرقہ شیخیہ میں شامل ہوئے اور شیخ احمد احسائی کی کتابوں کو نہایت غور و فکر سے مطالعہ کرتے تھے اسی زمانے میں قرۃ العین نے بھی شیخ کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور روز بروز اس خاتون کی توجہ "فرقہ شیخیہ" کی طرف ہونے لگی۔ ان کے خیالات نے قرۃ العین کے اندر ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس خاتون کا حقیقی استاد شیخ احمد احسائی کی تصانیف تھیں۔

شادی اولاد اور سفر کربلا | جب قرۃ العین اٹھارہ برس کی ہوئیں تو انکی شادی انکے چچیرے بھائی سے ہوئی. جن کا نام ملا محمد تھا اور وہ قزوین میں مجتہد تھے. مگر اس مناکحت کا انجام اچھا نہیں ہوا کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ ملا محمد "فرقہ شیخیہ" کا جانی دشمن تھا او علی روس الاشہاد فرقہ شیخیہ پر کفر کا فتویٰ دیتا تھا اور قرۃ العین فرقہ شیخیہ کے متبعین میں سے تھیں۔ ۲۰ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے انکے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں تھیں مگر اس باکمال خاتون کی توجہ زیادہ تر اپنے علمی مشاغل کی طرف رہی. چنانچہ علمی ذوق کی بنا پر انھوں نے اپنے وطن سے رخصت ہو کر کربلا کا دور دراز سفر اختیار کیا تاکہ وہاں جا کر سید کاظم رشتی سے ملیں جو ان دنوں شیخ احسائی کے جانشین اور فرقہ شیخیہ کے امام تھے۔ قرۃ العین کو تین دن کے فاصلے پر پہنچکر سید کاظم کے انتقال کی خبر ملی اول اول قرۃ العین کو اس خبر نے بحر تاسف میں ڈبو دیا. لیکن اس اولوالعزم خاتون کی ہمت اس خیال سے مضبوط ہوگئی کہ سید اپنے پیرووں کے لئے کوئی نہ کوئی ہدایت نامہ چھوڑ گئے ہوں گے چنانچہ قرۃ العین نے سید کی تصانیف کا مطالعہ بڑی جانفشانی سے شروع کیا۔ دوران مطالعہ میں اُن کی زبان سے یہ الفاظ وجد و سرور کی حالت میں نکل جاتے تھے کہ "دیکھو تو سہی شیخ اور سید کیا کچھ ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں. حقیقت میں انھوں نے ہمارے لئے ہدایات کا ایک بے پایاں خزانہ چھوڑا ہے"

مسند تدریس | جب سید کاظم کا انتقال ہوا تو انکا کوئی جانشین نہیں تھا جو انکے شاگردوں کو درس دیتا. اس وقت قرۃ العین آکر مسند تدریس پر رونق افروز ہوئیں اور انھوں نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ سید کاظم

ہی کے طریقہ پر جاری رکھا۔ چنانچہ سید مرحوم کے شاگرد جوق جوق درس میں شریک ہونے لگے اس خاتون کے تدریس کے راستہ میں ایک زبردست رکاوٹ پردے کی رسم تھی لیکن اس نے سب طلبہ کو اجازت دی کہ وہ اس کے درس میں شریک ہوں اور اسکے خیالات سے مستفید ہوں۔ چنانچہ سیکڑوں طلبہ اس کے درس میں شریک ہونے لگے۔

تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک کمرے میں پردہ لٹکایا جاتا جس کے ایک طرف یہ خاتون، اور دوسری طرف شاگرد ہوتے۔ دوران تعلیم میں نہایت الحاح وزاری سے مصلح موعود کے ظہور کی دعائیں مانگیں جاتی تھیں جس کے انتظار میں تمام ایران خصوصاً شیخی حضرات شب و روز رہتے تھے۔ قرۃ العین کو موعود کے آنے کا اس قدر یقین تھا کہ ہر وقت اپنے شاگردوں کو اُس پر ایمان لانے کے لئے تیار کرتی رہتی تھیں۔

ظہور باب | اسی زمانے میں اس خاتون کی ملاقات ملا حسن بشرویہ سے ہوئی جو تلاش موعود کے لئے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ قرۃ العین نے اُن سے بتاکید کہہ دیا تھا کہ جونہی تم کو موعود کی اطلاع ملے مجھے فوراً خبر دو۔ الغرض ملا حسن بشرویہ شیراز پہنچے اور باب سے ملے جنھوں نے ملا بشرویہ پر ظاہر کیا کہ "میں ہی قائم آل محمد یا امام مہدی منتظر ہوں"۔

اسی وقت چند نشانات معلوم کرنے کے بعد ملا حسن بشرویہ باب پر ایمان لائے اور اس کے بعد ہی ملا علی بسطامی بھی آکر اس کے حلقے میں شامل ہوگئے۔ اس لحاظ سے ملا بسطامی دوسرے شخص ہیں جو باب پر ایمان لائے۔ باب نے انکو کربلا مبلغ بناکر روانہ کیا۔ چنانچہ ملا بسطامی نے آکر کربلا میں اعلان کیا کہ "لوگو! خدا کی بادشاہت آگئی یعنی باب مہدی موعود ظاہر ہوگیا"۔ قرۃ العین کو جب اس اعلان کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ملا علی بسطامی سے ملاقات کی اور باب کے متعلق تمام معلومات حاصل کیں اور سجدۂ شکر بجا لائیں۔ اور سب سے پہلے اپنے شاگردوں کو باب پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ سب شاگردوں نے اس نئے مذہب کو اختیار کیا۔ اب ایک نئی شان سے بابیت کی تبلیغ و اشاعت شروع ہوئی۔ قرۃ العین کچھ مدت کربلا میں پردے کے پیچھے لکچر دیتی رہیں وہ حدیث و قرآن

کی تفسیر بڑی خوبی و فصاحت کے ساتھ بیان کرتی تھیں ایک انبوہ کثیر سننے کے لئے جمع ہو جاتا تھا لوگ جوق جوق نئے مذہب میں داخل ہونا شروع ہوئے۔

باب کا دعویٰ | ۱۸۴۴ء میں میرزا علی محمد نے یہ دعویٰ کیا کہ "میں مہدی موعود ہوں میں ایلیا کے مانند آنے والے مسیح موعود کا مبشر ہوں۔ ایک ظہور اعظم ہونے والا ہے جس کی آمد آمد کی بشارت دینے کے لئے میں مبعوث ہوا ہوں،، باب کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی رُشد و ہدایت کے لئے "مشیت اولیٰ" ہمیشہ کسی نہ کسی انسانی صورت میں ظہور فرماتی رہی ہے۔ اور وہی صورتیں پیغمبر کہلاتی ہیں حضرت آدم سے لیکر حضرت محمد صلعم تک جتنے پیغمبر گذرے ہیں، اگرچہ ہم انھیں جدا جدا تصور کرتے ہیں اور انکی صورتیں بھی مختلف تھیں لیکن فی الحقیقت وہ سب ایک تھے اور "مشیت اولیٰ" ہی سب کے پردے میں بولتی تھی اسی طرح "مشیت اولیٰ،، کے آخری مظہر یعنی محمد صلعم کے ۱۲۷۰ برس بعد "مشیت اولیٰ" نے میرزا محمد علی میں ظہور کیا ہے اور باب اس کے ذریعے سے بولتی ہے۔ یہ سلسلہ ادیان ربانی ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور اُن ظہورات کی کوئی حد نہیں۔ باب نے لوگوں سے کہا کہ "میں محمد صلعم کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہوں اور خاص وقت پر میرا ظہور ہوا ہے،، انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک الہامی کتاب "بیان،، نامی پیش کی اور کہا "میں مظہر اللہ کی بشارت کے لئے آیا ہوں" اس اعلان نے تمام ایران میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور مجتہدوں نے نئے خیالات کی زبردست مخالفت کی۔ کتنے نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اترنا پڑا، کتنی دلہنیں رانڈ ہو گئیں الغرض تعصب اور تقلید نے جس طرح مجتہدوں کے غصہ کی آگ کو بھڑکا دیا تھا اُسی طرح باب کی تعلیمات نے بابیوں کے اندر قربانی کا ایک عجیب و غریب جذبہ بھر دیا تھا۔ وہ شمع مذہب کے پروانوں کی طرح جان دیتے تھے۔

تبلیغ بابیت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا | ابتدا، میں قرۃ العین اس نئے مذہب کی تبلیغ کربلا میں کرتی رہیں سیکڑوں آدمی اس خاتون کی جادو بھری تقریر سے متاثر ہو کر بابی ہو رہے تھے۔ یہ کامیابی مجتہدین کربلا کو ناگوار گذری اور انھوں نے حاکم شہر سے شکایت کی کہ یہ عورت کفر و الحاد پھیلاتی ہے جس قدر جلد ہو سکے اس کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا جائے۔

قرۃ العین کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ گورنر ان کی گرفتاری کے درپے ہیں چنانچہ وہ فوراً کربلا سے بغداد روانہ ہو گئیں۔ بغداد پہنچکر انھوں نے سب سے پہلے مفتیٔ شہر سے ملاقات کی اور نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے خیالات اور مذہب کا اظہار کیا۔ لیکن اصلی سوال یہ تھا کہ آیا یہ خاتون عراق میں ان نئے خیالات کی نشر و اشاعت کر سکتی ہے یا نہیں ؟

یہ سوال گورنر بغداد کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے باب عالی کو لکھا چنانچہ جواب آنے تک علماے عراق کے درمیان ایک زبردست بحث و مباحثہ کا دروازہ کھولدیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماے بغداد کی محفلوں میں اس نئے مذہب کا چرچا ہونے لگا۔ بالآخر باب عالی سے حاکم بغداد کو حکم ملا کہ اس نے مذہب کی نشر و اشاعت حکومت عثمانیہ کے اندر ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔

چنانچہ گورنر بغداد نے نہایت احترام و اکرام کے ساتھ سرکاری سپاہیوں کی نگرانی میں اس خاتون کو سرحد ایران و عراق پر چھوڑ دیا جہاں سے وہ کرمان شاہ کو روانہ ہوئی اثنائے راہ میں نئے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کرتی ہوئی کرمان شاہ جا پہنچی۔ قرۃ العین کی آمد نے کرمانشاہ کے مجتہدین میں ایک زبردست مخالفانہ لہر پیدا کر دی لیکن اس باہمت خاتون کے ارادوں میں ذرہ برابر تزلزل نہ پیدا ہوا۔ اس خاتون نے کچھ مکانات کرایہ پر لے کر اپنے شاگردوں کو ٹھہرایا اور خود نشر و اشاعت میں مشغول ہو گئی۔ اسکے سحر انگیز بیانات میں کرمان شاہ کے باشندے جوق جوق شریک ہونے لگے۔ کرمان شاہ کے رئیس العلما ر آغا عبداللہ نے گورنر کو ایک اس مضمون کا عریضہ ارسال کیا کہ

"یہ دعوت یہاں بہت بڑی تکلیف کا موجب ہو رہی ہے جہاں تک آپ سے ممکن ہو جلد اسکو یہاں سے دور کیجئے"

اس خط کے بعد گورنر نے چند عورتیں قرۃ العین کے حالات معلوم کرنے کے لئے روانہ کیں انھوں نے آکر اطلاع دی کہ آج تمام ایران اس فاضل خاتون کی علمی قابلیت اور خداداد کمال کی شہرت سے گونج رہا ہے۔ چنانچہ گورنر نے رئیس العلما ر کو جواب میں تحریر کیا کہ "میں بغیر معقول وجہ کے اس خاتون کو یہاں سے نہیں نکال سکتا ہوں۔ بسم اللہ آپ آگے بڑھئے مناظرہ کر کے اس کو لاجواب کیجئے تب ایک معقول وجہ

اُس سے نکالنے کی مل سکتی ہے " آغا عبداللہ نے اس چیلنج کو بظاہر تو مان لیا لیکن ایک ماہ کمزوری کا بہانہ کر کے مناظرہ کو ٹالتے رہے۔ مگر ایک عرصے کے بعد آغا عبداللہ نے قرۃ العین کے والد اور رشتہ داروں سے کہلا بھیجا کہ وہ اسکو واپس بلالیں اس واقعہ کی خبر قرۃ العین کو کسی طرح ہوگئی چنانچہ وہ اپنے شاگردوں کی معیت میں ہمدان کو روانہ ہوئیں اور ہمدان کے قریب بھائی سے ملاقات کی جو انکو واپس بلانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن قرۃ العین بابیت کے نشر واشاعت کا پختہ ارادہ کر چکی تھیں چنانچہ مجبور ہوکر انکا بھائی قزوین واپس ہوا۔ قرۃ العین نے ہمدان میں وہ فصیح و بلیغ لکچر دئے کہ بڑے بڑے عالم بابی مذہب کے حلقہ بگوش ہوگئے اس کی کامیابی نے ہمدان کے مجتہدین کے دلوں کو غصہ اور تعصب سے بھر دیا چنانچہ انہوں نے حاکم ہمدان کو لکھا کہ اگر آپ اس نوجوان عورت کو نئے خیالات سے نہ روکیں گے تو بغاوت کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہمدان کے قیام میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا جو قرۃ العین اور اس کے ساتھیوں کے لئے مضر ہو۔

قیام ہمدان میں قرۃ العین نے ایک مجتہد کو ۰۰ صفحات کے مدلل خط میں بتایا کہ باب کے دعوی اور انکے پیغام کی حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ قاصد جس وقت یہ خط لیکر پہنچا اس وقت گروہ علما یہ مشورہ کر رہا تھا کہ بابی تحریک کو کس طرح دبایا جائے۔ سب سے بڑے عالم نے خط کو کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ پہلے ہی صفحہ سے وہ خط کا مطلب سمجھ گئے اور غصے سے بیتاب ہوگئے۔ انہوں نے قرۃ العین کو گالیاں دینا شروع کیں قاصد نے کہا کہ مدلل جواب دیجئے گالیاں دینا دائرہ تہذیب سے خارج ہے بس اتنا کہنا تھا کہ تمام علما غریب قاصد پر ٹوٹ پڑے اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ پولیس نے اطلاع پاکر ان لوگوں کے ہاتھ سے اس غریب کو چھڑایا اور اس کو قرۃ العین کے گھر لے گئے۔

قرۃ العین نے جب اپنے شاگرد کو بیہوش دیکھا تو انکے دل پہ ذرہ برابر بھی خوف کا اثر نہ ہوا بلکہ جلال کے ساتھ آگے بڑھیں اور اپنے شاگرد کو ان الفاظ سے خطاب کیا۔

"ملا ابراہیم! اٹھو! اٹھو تم کتنے خوش نصیب ہو تم پر خدا کی رحمت و سلامتی ہو کہ تم نے یہ تکلیف اپنے مولا کی راہ میں گوارا کی اٹھو! چلو اور خدمت امر میں ایسے مصروف ہو جاؤ

جیسے مجروح ہو جانے سے پیشتر تھے۔ امر کی خدمت میں پھر مشغول ہو جاؤ"

ان سحر انگیز الفاظ سے ملا ابراہیم ہوش میں آگئے اور اٹھ بیٹھے

اس کے بعد قرۃ العین نے نہایت فصیح و بلیغ طریقے سے اپنے شاگردوں کو ان الفاظ سے خطاب کیا "یہی وقت ہے کہ تم کو جوش و خروش کے ساتھ خدا کی راہ میں بہادری دکھانی چاہیئے۔ ہر ایک ظہور کے وقت یعنی جب کوئی معلم آسمانی دنیا میں ظاہر ہوا تو جن لوگوں نے ابتداءً اُسے قبول کیا اور اس کی تعلیمات کو مانا انھوں نے ہشاش بشاش چہروں کے ساتھ تمام تکالیف اور اذیتوں کو برداشت کیا یہانتک کہ ان فداکاروں نے اپنی جانیں قربان کر دیں کیا تم تاریخی واقعات کو بھول گئے مسیح کے حواریوں نے کیا کیا؟ کیا تمہیں یاد نہیں کہ اصحاب محمد صلعم نے کیا کیا؟ سوچو انھوں نے کس طرح اپنی روح اور جانیں اپنے مالک اپنے خدا کی راہ میں نثار کیں۔ اب وقت ہے کہ تم اور میں بلکہ ہم سب مل کر انھیں کے قدم بقدم چلیں اور نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ شہادت کے میدان میں کود پڑیں"

اب قرۃ العین نے ایک اور دلاورانہ عزم صمیم کیا کہ محمد شاہ، شاہ ایران کو بابی بنالیں۔ چنانچہ اس ارادہ کو مدنظر رکھ کر ہمدان سے طہران کو روانہ ہوئیں۔ اس ارادہ کی اطلاع قرۃ العین کے والد کو ملی انھوں نے اس ڈر کے مارے کہ کہیں تمام خاندان پر مصیبت نہ ٹوٹ پڑے اپنی بیٹی کو واپس بلانے کے لئے آدمیوں کو روانہ کیا انھوں نے جاکر قرۃ العین کو واپس کیا اور قزوین لے آئے۔

خاندان والوں کی مخالفت اور ترک وطن

قرۃ العین کا پورا خاندان بابی تحریک کا جانی دشمن تھا۔ اس لئے قرۃ العین کی تمام کارروائیوں نے اس کے تمام خویش واقارب کو اس سے برانگیختہ کر دیا تھا۔ اور خاندان کے ہر رکن کی نظر میں اسکا وجود کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

خاص طور پر قرۃ العین کا شوہر اور چچا اس تحریک کے نہایت شدید مخالف تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر ملا محمد نے قرۃ العین کو طلاق دے دی اور اس کے چچا ملا تقی کو جب اپنی بھتیجی کا خیال آتا تو خون کے آنسوں روتا۔ بیخودی از خود رفتگی اور غصے کی حالت میں بابی تحریک کو گالیاں دیتا اور اپنی تقریروں میں بابی مذہب پر لعنت و تبرا کرتا۔ اس بدگوئی سے بیزار ہو کر ایک شخص میرزا صالح نے ۱۸۴۷ء میں

ملاتقی کو قتل کر دیا اور اپنے جرم کا صاف صاف لفظوں میں اقرار کیا اور کہا کہ یہ میرا ذاتی فعل ہے میں ہی اسکا ذمہ دار ہوں۔ اس واقعہ سے قرۃ العین کے خاندان والے برہم ہو گئے اور خود ملا محمد نے اپنے باپ کے خون کا دعویٰ قرۃ العین پر کیا لیکن تحقیقات میں یہ بالکل بے جرم ثابت ہوئیں۔ مگر اس واقعہ کے بعد قرۃ العین کو اپنا وطن عزیز ترک کرنا پڑا۔ چنانچہ اب وہ قزدین کو چھوڑ کر خراسان کی طرف روانہ ہوئیں۔

بابیت کی نشر و اشاعت کے لئے بڑے بڑے شہروں کا دورہ

قزدین کی سکونت چھوڑنے کے بعد قرۃ العین نے خراسان کا تبلیغی دورہ کیا اور وہاں سے بدشت و ماژندران میں اپنے فصیح و بلیغ بیانات سے لوگوں کو مسحور کر دیا۔ یہاں اس خاتون کی ملاقات بابی مذہب کے دو مبلغین ملاحسین اور محمد علی بارفروش سے ہوئی۔ ماژندران میں لوگوں کا ایک انبوہ کثیر صبح و شام اس کے پاس جمع ہوتا تھا اور نئے امر کے متعلق سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع کر دیتا تھا۔

جس وقت یہ خاتون مدلل تقریر کرتی اور ہادیان ربانی اور اصول مذہب کے متعلق بیان کرتی لوگ ساکت و صامت رہ جاتے اور بعض وقت زار زار روتے۔

مگر یہاں بھی ملاؤں اور عمال شہر نے انھیں چین سے نہ رہنے دیا۔ کچھ مدت تک دیہات میں بابیت کی نشر و اشاعت کرتی رہیں۔ اسی زمانے میں بابیوں اور شاہی فوج میں ماژندران میں اور اس کے نواح میں لڑائی ہوئی اس دوران میں قرۃ العین نے قصبہ نور میں سکونت اختیار کی۔ لڑائی کے بعد باشندگان نور نے قرۃ العین کو حکومت کے حوالہ کیا اور یہ وہاں سے پابہ زنجیر طہران بھیج دی گئیں یہ عہد حکومت ناصر الدین شاہ قاچار کا تھا جب قرۃ العین شاہ قاچار کے سامنے پیش کی گئیں تو اُن کی مدلل تقریر نے شاہ کے قلب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس نے احترام و اکرام کے ساتھ حکم دیا کہ یہ رہا کر دی جائیگی" مگر چونکہ بابیوں اور شاہی فوج کی لڑائی کو ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا تھا اس لئے قرۃ العین کوتوال شہر کے گھر میں نظر بند رکھی گئیں۔

اس نظر بندی کے زمانے میں بھی یہ خاتون اپنے کام سے غافل نہیں رہی کسی نہ کسی طریقے سے

اپنے ہم مذہبوں سے ملتی رہتی اور مزید براں تقریب جشن کے موقعوں پر کوتوال کے گھر عورتوں کو اپنے پُر زور بیانات سے مسحور کر دیتی اور سبھوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

بابیوں کا قتل عام

انھیں دنوں میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا جس نے بابیوں پر مصیبت کے پہاڑ توڑ دیے ۱۸۵۲ء میں شاہ ناصر الدین قاچار موسم گرما میں اپنے عالیشان محل نیاوران واقع کوہ البرز کے دامن میں مقیم تھا۔ ۱۵ اگست بروز اتوار تفریح کے لئے سوار ہو کر نکلا اتنے میں تین نامعلوم اشخاص عرضی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھے شاہ نے گھوڑا روکا اور قریب آنے کی اجازت دیدی جب نزدیک آئے تو ایک نے پستول نکال کر شاہ کو نشانہ بنایا۔ لیکن وار خالی گیا۔ اتنے میں دوسرے ساتھی نے ارادہ کیا کہ شاہ کو گھوڑے سے گھسیٹ کر نیچے گرائے اور گلا کاٹ دے لیکن اتنے میں فراش آگے بڑھا اور قاتل کو مار ڈالا۔ بہرحال شاہ صاف بچ گیا۔ اس کی خوشی میں قاآنی نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں ؎

آخر شوال خسرو شد سوار از بہر صید — آسمانش در عنان و آفتابش در رکاب
کز کمیں ناگہ بروں جستند وافگندند زود — تیرہائے آتشیں سوی خسرو مالک رقاب

ایک دوسرے قصیدے میں یہی شاعر اس واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے کہ :

آخر شوال را ہر سال زیں پس عید کن — چاکران شاہ را دعوت نما از ہر کراں
ہی بگو شاہد بیا زاہد برو خازن ببخش — ہی بگو ساقی بدہ چنگی بزن مطرب بخواں
عید قربانِ جشن کن نام ہمچو گوسفند — دشمنان را سر ببرد راہ شاہ کامراں

الغرض اس واقعہ نے بابیوں کی زندگی دوبھر کر دی۔ صرف بابی ہونا ہی قتل کے لئے کافی تھا۔ لوگوں نے کتنے بے گناہ غریبوں کا خون بہایا۔ ایک طرف پکڑ دھکڑ تھی دوسری طرف سولی اور جلاد کی بے رحم تلوار تھی جو انسانی خون کو بے دریغ بہاتی جاتی تھی۔

سزا کا کوئی طریقہ باقی نہیں بچا تھا جس کا استعمال بابیوں پر نہ کیا گیا ہو، قید شکنجہ تاریک کوٹھریاں اسکے سوا تھیں مزید براں لوہے کی سلاخیں گرم کر کے انکے جسموں پر لگائی جاتی تھیں مگر بابی اُف

تک نہ کرتے نہایت ہشاش بشاش چہروں کے ساتھ سزاؤں کو جھیلتے تھے اور اپنی جان دینا فخر سمجھتے تھے جتنے بڑے بڑے علماء و فضلا بابی خیالات و عقائد کے تھے سب موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ اس بابت گروہ میں ہم کو ایک شجاع خاتون بھی نظر آتی ہے جس کو دنیا قرۃ العین کے نام سے یاد کرتی ہے۔

قرۃ العین کی ثابت قدمی

قتل ہونے سے ایک روز پیشتر قرۃ العین کے پاس کوتوال شہر آیا اور کہا کہ کل تم دربار میں بلائی جاؤ گی اور تم سے پوچھا جائے گا کہ تم بابی ہو کہ نہیں ہو صرف "نہیں" کہنے سے تمھاری جان بچ سکتی ہے۔ میں تمھارے لئے یہ ایک خوش خبری لایا ہوں اس پر عامل ہو کر اپنی جان کو بچاؤ اور پھر جو بھی عقیدہ رکھو تمھاری مرضی پر موقوف ہے۔

اس کے جواب میں قرۃ العین نے نہایت ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ کہا "میں سمجھتی ہوں کہ کل کا دن میرے لئے نہایت ہی مبارک دن ہوگا۔ کیونکہ کل مجھے اپنی صداقت کے امتحان گاہ میں داخل ہو کر ثابت کرنا ہے کہ حق و صداقت کے لئے مرنا ہی انسان کے لئے بقائے دوام ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ میں ضمیر کی آزادی چاہتی ہوں اور اس آزادی کے لئے جان عزیز تک قربان کر دوں گی"، کوتوال شہر نے بہت کچھ سمجھایا لیکن یہ دلاور خاتون اپنے ارادے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹی اور اس نے اپنے عہد پر ثابت قدم رہ کر حیات جاوید حاصل کی۔

زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے مذہب کی نشر و اشاعت کرنا

بابی علماء کے ساتھ یہ خاتون دوسرے دن دربار شاہی میں پیش کی گئی جب اس سے مذہب کے متعلق پوچھا گیا تو اس خاتون نے نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ اپنے عقائد ظاہر کئے اور اس کے بعد بابی اصولوں کو اس شرح و بسط اور خوبی سے بیان کیا کہ تمام وزراء و امراء و علماء اور خود شاہ ایک محویت کے عالم میں تھا۔ تمام دربار میں سناٹا چھا گیا۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک یہی حالت رہی آخر نہایت افسوس و رنج کے ساتھ دربار کو اس خاتون کے لئے موت کی سزا تجویز کرنا پڑی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ خاتون جلا دی گئی اور بعض کہتے ہیں کہ گلا گھونٹ کر ایک تاریک کنوئیں میں پھینک دی گئی اور وہ اوپر سے پتھروں سے بھر دیا گیا۔

علمی قابلیت و زور خطابت

قرۃ العین اپنے زمانے کی ایک زبردست عالم و فاضل خاتون تھی۔ تذکرۃ الخواتین

یہ مصنف لکھتا ہو کہ "پدرش یک تن از اعیان قزوین بود و او نیز فضلے بکمال داشت وایں دختر در علوم وبہ دانش احادیث وتاویل کایات قرآنی بانصلے وافر بود" لارڈ کرزن اپنے "سفرنامہ ایران" میں بابی فرقہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شاعرہ قزوین زرین تاج یا قرۃ العین جس نے پردہ کی چہار دیواری سے نکل کر اور مذہبی مشن لیکر تبلیغ کے لئے ایران کے دور دراز حصوں کا دورہ کیا اسکا عالمانہ اور جانبازانہ افسانہ جدید تاریخ ایران کے صفحات پر نہایت ہی دلچسپ ہو۔

قرۃ العین ایک زبردست خطیبہ تھی۔ بابیت کی نشرواشاعت کیلئے جہاں جہاں اس خاتون نے دورہ کیا وہاں کے لوگوں کو اپنی جادو بھری خطابت سے مسحور کر دیا کرتی تھی چنانچہ اسکے دلائل اور زور خطابت کے سامنے بڑے بڑے متکلمین و واعظین کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ جس شہر میں جاتی تھی لوگ اس کی تقریر سننے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوجاتے۔ قوت خطابت سے ان لوگوں کو جو بابیت کے خلاف ہوتے تھے مسکت ولاجواب کر دیتی تھی۔ اس خاتون کی فصاحت و بلاغت کا شاہکار وہ تقریر ہے جو اس نے سزائے موت سے پیشتر شاہی دربار میں کی تھی جس کی وجہ سے تمام دربار پر ایک سکتے کا عالم تھا۔ علما، وزرار اور امرا بت بنے بیٹھے تھے۔

شاعرانہ قابلیت | قدرت نے جہاں قرۃ العین کو بہت سی صفات دینے میں فیاضی سے کام لیا تھا اسے شاعری کا زبردست ملکہ بھی بخشا۔ لیکن تعصب کا بھلا ہو کہ اس کی وجہ سے اس فاضل خاتون کا بہت سا کلام دیگر تصانیف کے ساتھ تلف ہوگیا۔ آپکی شاعری کو پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہو کہ یہ خیالات ایک مظلوم گروہ کی خاتون کے ہیں اس کی شاعری میں بہت سے جدید خیالات پائے جاتے ہیں۔ کلام موتیوں کی لڑی کے مانند مسلسل و مربوط ہو۔ اب ذیل میں ہم قرۃ العین کے کلام کا مختصر انتخاب پیش کرتے ہیں۔ جس سے اس کے کمال سخنوری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہو۔

(۱)

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

از پے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بہ خانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو

میرود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

دور دہان تنگ تو عارض عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

ابرو و چشم و خال تو صید نمودہ مرغ دل
طبع بہ طبع دل بہ دل مہر بہ مہر و خو بہ خو

مہر ترا دل حزیں بافتہ بر قماش جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار و پو بہ پو

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

(۲)

طلعات قدس بشارتے کہ جمال حق شدہ برملا
بزن اے صبا تو بساحتش گروہ غمزدگان صلا

ہلہ اے طوائف منتظر زعنایت شہ مقتدر
مہ مستتر شدہ مشتہر تنبہاً متجلّلا

شدہ طلعت صمدی عیاں کہ بپا کند علم بیان
زگمان و ہم بجہانیاں جبروت اقدس اعتلا

بسریر عزت و فخر شان بنشستہ آں شہ بے نشان
بزد آں صلا ببلاکشاں کہ گروہ مدعی الولا

چو کسے طریق مرا رود کنمش ندا کہ خبر شود
کہ ہر آنکہ عاشق من شود زہد زمحنت و ابتلا
کسے ار نکرد اطاعتم نگرفت حبل ولایتم
کنمش بعید ز ساحتم وہمش بقرب بلا
صمدم ز عالم سرمدم احدم ز منبع لا مدم
پئے ابل افتادہ آمدم وہم اسے طقبلا
قبات نار مشیبی انا ذا الست بر بکم
بگذر بساحت قدسیاں بشنو صفیر بلے بلے
منم آں ظہور سہینے منم آں نیت سے بنی
منم آں سفینۂ ایمنی ولقد ظہرت مجلجلا
شجر مرقع جاں منم ثمر عیاں و نہاں منم
ملک الملوک جہاں منم دلی البیان وقد علا
شہدائے طلعت تارمن بدوید سوئے دیار من
سر و جاں کنید نثار من کہ منم شہنشہ کربلا

(۳)

لمعات وجہک اشرقت زشعاع طلعتک اعتلا
دچہ رو الست بکم نزنی بزن کہ بلے بلے
بجواب طبل الست تو زولا چو کوس بلیٰ زوند
ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم و حشم بلا
من و عشق آں مہ خوبرو کہ چو زد صلائے بلیٰ براو
بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا

چو شنید نالۂ مرگ من پی سازمن تدو رگ من
نفشی الی لبہر دلا وبکی ملق مبلبلا
چہ شوہ کہ آتش حیرتے زنیم تقلہ طور دل
فتکلتہ و دکلکتہ مندکہ کا متسزلزلا
پی خوان دعوت عشق او ہمہ شب زخیل کروبیاں
رسد این صفیر ہمینی کہ گروہ غمزدہ الصلا
توکہ فلس ماہی حیرتے چوزنی زبحر وجود دم
بہ نشیں چو ملو ملی و دم بدم بشنو خروش نہنگ لا

(۴)

جذبات شوقک احبت بسلاسل الغم دا لیلا
ہمہ عاشقان شکستہ دل کہ دہند جان برہ ولا
اگر آن صنم زرہ ستم پی کشتن من بیگنہ
لقد استقام بہ سیفہ فلقد رضیت بما رضی
سحران نگار ستمگرم قدمے نہاد بہ بسترم
واذا رائیت جمالہ طلع الصباح کانہا
زچہ چشم فتنہ شعار او زچہ زلف غالیہ بار او
شدہ نافہ لی بہمہ ختن شدہ کافری بہمہ خطا
توکہ غافل از می وشاہدی پی مرد عابد و زاہدی
چہ کنم کہ کافر وجاحدی زخلوص نیت اصفیا
تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری
اگر آن نکوست تو در خوری وگر این بداست مرا سزا

به مراد زلف معلق پی اسب و زین عشرتی
همه عمر خنگ مطلق ز نفیر فارغ و بے نوا
بگذر ز منزل ما و من بگزین بملک فنا وطن
فاذا فعلت بمثل ذا فلقد بلغت بما تشا

نوٹ :- اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے۔

اردو اور فارسی کتب:

۱۔ تذکرۃ الخواتین (فارسی)
۲۔ مشاہیر نسوان (اُردو) محمد عباس ایم۔ اے
۳۔ تذکرۂ خواتین (")
۴۔ رسالہ زمانہ (")
۵۔ رسالہ کوکب ہند (")
۶۔ تحفۂ طاہرہ (مجموعۂ نظم قرۃ العین)(فارسی) اسفندیار بختیاری

English Books:

1, The new History of the Bab
By. E. G. Brown.
2, Life and Teachings of Abbas Effendi
By. M. R. Phelp.
3, Encyclopaedia of Religion
(Bab and Babism)

سلطنت مغلیہ کے وزرا کی فہرست

انڈیا آفس کے کتب خانہ میں صدہا ایسی کتابیں ہیں جن کے نام بھی غالباً پردہ تاریکی میں ہیں۔ وہ کونسی علم کی شاخ ہے جس کے متعلق یورپ میں مواد نہیں ہے۔ ہندوستان کے تاریخی مواد کے متعلق جو معلومات انگریزی نہیں بلکہ فارسی زبان سے حاصل ہوسکتی ہے وہ بھی ہم کو ہندوستان میں اس قدر بہتا نہیں ہوسکتی جس قدر برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانہ سے میسر آسکتی ہے۔

میرا مضمون تاریخ ہند نہیں تھا۔ دکنی اردو کے فراہمی مواد کے سلسلہ میں بعض فارسی مخطوطے بھی نظر سے گزرے ان میں سے ایک تاریخی کتاب مصنفہ ابوالمفاخر نظام الدین محمد ہادی الحسنی الصفوی الملقب بشاہ مرزا والمخاطب بمرزا مہدی خاں صفوی ہے جو ۱۱۴۲ھ میں مرتب ہوئی ہے اور ۱۱۵۱ھ میں مصنف تاریخ نادری نے اس کا اضافہ کیا ہے۔

اس کتاب میں تیمور سے لیکر عالمگیر ثانی تک بادشاہوں کا ذکر ہے اس میں خاصکر حسب ذیل امور کا اظہار رہوا ہے۔

(۱) والدین کا نام (۲) تاریخ ولادت معہ مقام ولادت (۳) تاریخ جلوس (۴) مدت عمر (۵) ممالک مفتوحہ (۶) اسماء وزرا سلطنت (۷) اولاد (۸) اسباب انتقال و مرض (۹) تاریخ وفات (۱۰) مقام مرقد۔

دیباچہ کی عبارت کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

"ایں جدولست متضمن مجملی از احوال دولت اشتمال سلطنت مآل حضرت صاحب قران امیر تیمور گورگان انار اللہ برہانہ . . . . بعضی از اخلاف آنحضرت قدر قدرت کہ زینت آرائے سریر سلطنت و زینت افزاز تخت و خلافت ہندوستان شدہ اند تا زمان فیض نشان رضوان مکان بادشاہ عالیجاہ رسید، قطب الدین محمد معظم شاہ عالم بہادر کہ احقر خاندان

مصطفوی یادگار دودمان مرتضوی ابوالمفاخر نظام الدین محمد ہادی الحسنی الصفوی الملقب
بشاہ مرزا و المخاطب بہ مرزا مہدی خاں صفوی از کتب سیر و تواریخ کہ بنظر رسیدہ بود
بعد استخراج و استنباط برنہج سطور ذیل مرسیم و ترقیم نمود و بالہام ملک جمید تاریخ اتمام
این ارقام کہ رقم زدہ کلک تیرہ فام احقر انام است مجموعہ مرزا مہدی خاں صفوی گردید
وزرا سلطنت کے ساتھ معتمدین و مقربان سلطنت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ذیل میں انکی صراحت
بدیہ ناظرین کیجاتی ہے۔

۱۔ امیر تیمور ۔ امیر شیخ نورالدین ۔ امیر شاہ ملک ۔ تردی بیگ ۔ امیر بردق ۔ خواجہ یوسف ۔ امیر خداداد
امیر شمس الدین ۔ یوسف الدین ۔ امیر اودو ۔ ازعنوان شاہ ۔ غمش آغا ۔

۲۔ جلال الدین میران شاہ ۔ ابابکر مرزا ۔

۳۔ سلطان محمد مرزا ۔ مرزا الغ بیگ ۔

۴۔ ابوسعید مرزا ۔ ×

۵۔ عمر شیخ مرزا ۔ امیر محمدی کوکلتاش

۶۔ بابر ۔ امیر نظام الدین ۔ امیر شاہ منصور ۔ سلیمان مرزا ۔ خواجہ کلاں بیگ ۔

۷۔ ہمایوں ۔ ×

۸۔ اکبر ۔ خان خاناں منعم خاں ۔ بہادر خاں ۔ خواجہ جہاں ۔ مرزا عبدالرحیم ۔ خان اعظم کوکہ ۔ مرزا خواجہ
عبدالحمید مخاطب آصف خاں ۔ خواجہ مظفر علی مخاطب مظفر خاں ۔ راجہ ٹوڈرمل ۔ شاہ منصور
وغیرہ

۹۔ جہانگیر ۔ شریف خاں مخاطب امیرالامرا ۔ مرزا غیاث بیگ مخاطب اعتمادالدولہ ۔ جعفر بیگ قزوینی
مخاطب آصف از لغز مذکور وزارت بہ اعتمادالدولہ و از انتقال اعتمادالدولہ وزارت بخواجہ
ابوالحسن و وکالت و تفویض جمیع مہمات بہ آصف خاں خلف اعتمادالدولہ

۱۰۔ شاہجہاں ۔ آصف خاں خلف اعتمادالدولہ ۔ افضل خاں بعد ایں بہ اسلام خاں و از تغیر اسلام خاں

سعداللہ خاں و از انتقال خان مذکور بہ میر جملہ مخاطب معظم خاں و از تغیر میر جملہ جعفر خاں ۔

۱۱۔ عالمگیر = معظم خاں میر جملہ ۔ بعد ازاں فاضل بیگ خاں بعد انتقال این جعفر خاں ۔ بعد ازاں اسد خاں

۱۲۔ شاہ عالم ۔ آصف الدولہ اسد خاں ۔ منعم خاں المخاطب معظم خاں بعد رحلت این ہدایت اللہ خاں پسر عنایت اللہ خاں ۔

۱۳۔ معز الدین جہاندار شاہ ۔ اسد خاں امیر الامراء

۱۴۔ فرخ سیر = اسد خاں ۔ ذوالفقار خاں پسر اسد خاں ۔ حسین علیخاں ۔ قطب الملک عبداللہ خاں ۔ نظام الملک آصف جاہ

۱۵۔ محمد شاہ = نظام الملک آصف جاہ ۔ غازی الدین خاں خلف ایضاً

۱۶۔ احمد شاہ = غازی الدین خاں ۔

۱۷۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی = غازی الدین خاں پسر غازی الدین خاں ۔

تعجب ہے محمد شاہ کے وزراء میں برہان الملک کا نام کیوں نہیں لکھا گیا حالانکہ ان کی وزارت مشہور ہے ۔ چونکہ ہم کو اس کے متعلق کوئی تنقید کرنی نہیں ہے بلکہ بجنسہٖ نقل مقصود تھی جو پیش کر دی گئی ۔ ممکن ہے کسی تاریخ ہند کے شائق کے لئے کارآمد ہو ۔

ہندوستان کا سیاسی بحران

ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے اس ملک کی بابت بہت کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسکا سمجھنا خود اپنی دنیا کا سمجھنا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں اس مرض کی جملہ علامات موجود ہیں جس میں آج کل دنیا مبتلا ہے۔ اصل میں اس کا زہر دنیا کے جسم میں انیسویں صدی کے زمانہ بیکری میں داخل ہو گیا تھا اور اب ہر جگہ پھوٹ نکلا ہے۔ اس مرض کا نام "استعماری ملیریا" رکھا جا سکتا ہے۔ دن بدن اس کی حالت بدتر ہوتی جا رہی ہے، اور وہ دن دور نہیں ہے جبکہ بالکل ہی نازک ہو جائے۔ اگرچہ یہ مرض یقینی طور پر مہلک نہیں کہا جا سکتا لیکن تاریخ میں اس کے لئے کوئی علاج نہیں۔ اس قدر شدت سے یہ کبھی ظاہر بھی نہیں ہوا تھا، اور ہندوستان خاصکر اس کا شکار ہو رہا ہے۔

پس مناسب ہو گا کہ ہندوستان کی صورت حال پر نظر ڈالی جائے۔ خود اس کی خاطر سے نہیں بلکہ اس لئے کہ ہندوستان میں اس مرض کی مکمل ترین مثال مل سکتی ہے۔

اسکی بیماری ڈیڑھ سو سال سے ہے لیکن اخیر کے چند سال فیصلہ کن ثابت ہو رہے ہیں۔ اگرچہ پہلے بھی اندرونی مادہ کئی بار پھوٹ نکلا ہے، لیکن عطار خانہ شاہی کے خاص مرہم سے جس کے اجزا میں فولاد اور خون تھا دبا دیا گیا۔ جنگ عظیم کے بعد سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جنگ عظیم نے انسانوں کو ہلاک کیا لیکن نئے نئے خیالات پیدا کئے۔ ان خیالات نے دنیا کے توازن میں خلل ڈال دیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے محکوم قوموں کو جدوجہد آزادی پر کمربستہ کر دیا ہے۔ زمانے کے اثر اور نشر و اشاعت کی آسانی سے یہ بہت سرعت سے پھیل گئے جہاں زمانے کے اثر سے یہ نہ پھیل سکے وہاں ہم نے انکو مغربی تعلیم، مغربی علوم، مغربی طرز کے شہروں، مغربی سامانوں، ریلوں، تاربرقیوں، اخباروں اور ہسپتالوں وغیرہ کو رواج دے کر پھیلا دیا۔ ہمیں یہ کرنا پڑا کیونکہ اس میں ہمارا فائدہ تھا۔ اور غیر ترقی یافتہ قوموں کو اپنا محکوم بنانے میں فائدہ ہی ہمارے مد نظر بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہم اہل مغرب کا خیال ہے کہ ہماری ملک گیری محکوموں کو متمدن بنانے کیلئے ہے، اور یہ عجیب و غریب عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف ہماری تہذیب، تہذیب کہی جانے

کی سعی ہو۔ یعنی بالفاظ دیگر، تہذیب صرف انہیں عادات و خصائل کے ذریعہ قائم رہ سکتی ہے جو ہم ہے مشینوں کا استعمال معلوم کرنے کے بعد سے چند پشتوں کے اندر اپنے میں پیدا کرلئے ہیں۔

اہل مغرب کی لگائی ہوئی آگ ایسی طرح بھڑک اٹھی جنگ عظیم کی اتھل پتھل نے تمام مادہ پرست آتشیں سطح کے اوپر آگئے، اور اس کے آثار ہندوستان اور دوسرے ان تمام ممالک میں جو ہمارے صد سالہ دور استعماریت کے مال غنیمت بن چکے تھے، بےچینی، ناراضگی، اور وطنی تحریکوں کی صورت میں ظاہر ہونے لگے۔

جب (اختتام جنگ سے پہلے ہی) ہندوستان کی بےچینی نے خطرناک شکل اختیار کرنی شروع کی تو مسٹر مانٹیگو یہاں کے حالات کی تحقیقات کے لئے بھیجے گئے۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔

(ہندوستان میں) بار بار اس امر کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے کہ یورپ میں برطانیہ آزادی کی حمایت میں لڑ رہی ہو اور یہ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو اس شئے سے محروم نہیں کر سکتی جس کے لئے وہ خود یورپ میں لڑ رہی ہے اور جس کی حمایت میں ہندوستان کا روپیہ اور خون بھی (پانی کی طرح) بہایا جا رہا ہے۔

یہ جملہ نہ صرف ترجمان ہے تمام مشرق کا بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اتحادیوں کو جنگی پروپگنڈا میں لاپروائی برتنے کا کتنا بڑا جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

ہندوستان کی شورش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مسٹر مانٹیگو کی سفارش پر مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات نافذ کی گئیں۔ جن سے ہندوستانیوں کو حکومت میں مزید اختیارات مل گئے۔ انکو صوبہ کی حکومتوں میں مقامی قسم کے فرائض سپرد کر دئے گئے۔ اگرچہ تمام اہم فرائض کی انجام دہی حکومت برطانیہ نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھی۔ ساتھ ہی یہ وعدہ کیا گیا کہ دس سال بعد بذریعہ کمیشن معاملات پر از سر نو غور کیا جائیگا۔ تاہم مہاتما گاندھی کی سرکردگی میں اعلان بغاوت کر ہی دیا گیا۔ یہ بغاوت مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد فرو ہو گئی۔ اور ہندوستان خاموشی سے دس سالہ امتحان کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگا۔

جب موعودہ کمیشن آیا تو اس میں کوئی ہندوستانی نہ تھا۔ چنانچہ جوں جوں ۱۹۲۹ء گذرتا گیا ہندوستان میں دوبارہ بےچینی بڑھتی گئی۔ خاصکر اس لئے کہ یہ امر بین طور پر مترشح ہو رہا تھا کہ کمیشن صرف معمولی مراعات

کی مشکل کریں گے ۔ ہندوؤں نے صاف صاف ظاہر کر دیا کہ اگر ان کو وسیع اختیارات نہ ملے تو وہ بڑی مشکلات
پیدا کر دیں گے ۔ بالآخر انھوں نے الٹی میٹم دیدیا کہ اگر جنوری ۱۹۳۰ء تک سوراج نہ ملا تو وہ سول نافرمانی قانون
شروع کر دینگے ۔ اس کے جواب میں حکومت بالکل خاموش رہی ۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا ۔ یکم جنوری گذر گئی،
سول نافرمانی قانون شروع ہو گئی اور ہندوستان جنگ کی طرف بڑھتا جا رہا ہے ۔

۱۹۰۹ء میں برطانیہ نے ہندوستان کے واقعات کا لحاظ کیا اور مراعات سے اس کو مطمئن کرنے کی
کوشش کی ۔ اس سے کم از کم اتنا ہوا کہ قومی تحریک کا زور گھٹ گیا ۔ یہ کام ۱۹۲۹ء میں بھی مراعات سے
ہو سکتا تھا لیکن تحریک اس وقت تک اتنی جڑ پکڑ اور وسیع ہو گئی تھی کہ خاصی بڑی بڑی مراعات سے ہی
کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا ۔ اس صورت حال کا انگریزوں نے نہ صرف مردانہ وار مقابلہ کیا، بلکہ عقائد سے جان چرائی ۔
انھوں نے یہ بحث چھیڑ دی کہ آیا ہندوستان مزید اختیارات حکومت دئے جانے کے "قابل بھی
ہے یا نہیں — ایک سوال جس کا جواب ضروری نہیں کہ ہندوستان کے موافق ہی ہو، لیکن بالکل
ہی بے محل سوال ۔

کیونکہ مہاتما گاندھی نے دور جدید اور ایک تاریخی تحریک کے نمائندہ کی حیثیت سے ایک
ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جس میں نظری بحث کی گنجائش نہیں — ہندوستان اپنی قسمت کی
باگ اپنے ہاتھ میں لینے کا مطالبہ کر رہا ہے، اس میں خواہ وہ حق بجانب ہو یا نہ ہو ۔ اور یا تو اس کا مطالبہ
پورا کیا جائے یا اسے بزور شمشیر دبایا جائے

انگلستان کا حقیقت حال سے مردانہ وار مقابلہ نہ ہوا اور گذشتہ سال کچھ نہ کرنا استعماریت کا اصل الاصول ہے
ریمزے میکڈانلڈ کر ہی کیا سکتے تھے ؟ اگر انھوں نے مفید مطلب مراعات پیش کی ہوتیں، جس کے معنی یہ
تھے کہ انگلستان اس شے کے ایک بڑے حصہ سے دست بردار ہو جائے جس کو اس نے ایک صدی سے
بھی زیادہ عرصہ تک لڑ کر حاصل کیا اور اپنے قبضہ میں رکھا ۔ تو مزدور پیشہ حکومت کی شکست یقینی تھی ۔ قدامت
پسندوں نے مزدور جماعت کی غداری سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوتی، جس کے نتائج
مزدور جماعت کے لئے مہلک ثابت ہوتے ۔

دنیا میں پروپگینڈا بہت ہی موثر حربہ ہے۔ اس میں نقص یہ ہو کہ یہ ایک کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ پروپگینڈا کے ذریعہ پبلک کو ہر مقصد کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی اس کے اثر کو اگر مقصد بدل جائے، اتنی آسانی زائل نہیں کیا جا سکتا۔ استعماریت پسند انگریزوں کی پشتہا پشت سے پڑھی جانیوالی تحریروں کا اثر ایک سال میں دور ہونا ممکن نہیں انگریزی قوم کے لئے ہندوستان قومی عز و وقار کی نفسیاتی علامت بن چکا ہے۔

یہ انکی وہ فرائض زندگی یاد دلاتا ہے کہ جن سے دست بردار ہونے میں ان کی ہتک ہو۔ چونکہ عملی طور پر خارجی معاملات میں وہی بات حق سمجھی جاتی ہے جس پر انسانوں کی ایک کافی جماعت یقین رکھتی ہو۔ یہ امر خارج از بحث ہو کہ استعماریت پسند انگریزوں نے جو خیالات پھیلائے ہیں وہ دل کو فریب دینے والے اور عامیانہ ہیں۔ اور سفید فام قوموں نے ترویج تمدن کا جو فرض اپنے ذمہ عاید کر رکھا ہے وہ خود غرض لوگوں کی چالوں کی پردہ پوشی کے لئے ہے۔ کیونکہ وہ اعلیٰ وارفع غرض ـــ جس کے لئے ہم نے اپنے آپ کو انیسویں صدی میں وقف کر دیا تھا۔ اور ان بیکس قوموں کو جو ہم سے اپنی ترقی میں مدد لینا نہیں چاہتی تھیں ـ پیس ڈالتے تھے ـــ ہماری آمدنی یوماً فیوماً بڑھاتا تھا۔ اور جہاں ہمیں اس قدر فائدہ تھا وہیں ہمارے جذبات ایثار و ہمدردی میں ہیجان پیدا ہوتا تھا۔ ایسا کوئی ملک بھی تمدن سے مستفیض نہیں کیا گیا جو مالی فائدہ یا فوجی اہمیت نہیں رکھتا۔ "سفید فام انسان کا فرض" ایک قابل رشک فریضہ ہو، جیسا کہ اس امر سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شہنشاہی حکومت اس قوم سے آمادہ پیکار ہو جاتی ہے جو اس کو اس کے فرض سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ امریکہ فلپائن کو آزاد نہ کرنے کے جو خاص وجوہ بتاتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہو کہ اگر فلپائن کو اگر چھوڑ دیا گیا تو اس پر جاپان قابض ہو جائیگا۔ ممکن ہو یہ تمام باتیں تاریخی اعتبار سے صحیح ہوں۔ لیکن جس بات کو لوگ صحیح مانتے ہوں اسی کی تردید تو مشکل ہے۔

پس جو انگریز ہندوستان میں انگلستان کے اقتدار پر ضرب لگائیگا وہ انگریزی سیاسی عقیدہ کی بنیادوں پر ضرب لگائے گا۔ نیز اپنے آپ کو معرض خطر میں ڈالیگا اور غالباً اسکی کوششیں بالکل لاحاصل ثابت ہوں گی۔ بلاشبہ مسٹر میکڈانلڈ ایسا کر کے اپنے سیاسی وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔

اگر مسٹر میکڈانلڈ کو یہ خوف نہ بھی ہوتا جب بھی ایک امر جس پر انکا کوئی قابو نہیں ہے ان کی راہ میں حائل ہوتا۔ فرض کرلو کہ ایک اشتراکی، ایک زمانہ شناس اور ایک حامی آزادی کی حیثیت سے مسٹر میکڈانلڈ کے جذبات وعقائد کا یہ تقاضا ہو کہ وہ ہندوستان کو آزادی کامل دیدیں تو بھی وہ ایسا کرنے کی جرات نہ کرتے۔ ایک صدی کے اندر ہندوستان میں انگریزی سرمایہ سے جو کچھ تجارتی واقتصادی ترقی ہوئی ہے اس نے دونوں ملکوں میں ایسے اقتصادی تعلقات پیدا کردیے ہیں جو فوراً منقطع نہیں کیے جاسکتے۔ ایسا کرنے سے انگلستان کا سارا انتظام معاشی تزلزل میں پڑجائے گا۔ خاصکر اس وقت کہ تھوڑے سے صدمے سے وہ بالکل درہم برہم ہوسکتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیاسی تعلقات کے منقطع ہونے سے یہ بھی ضرور منقطع ہوجائینگے۔ بالفاظ دیگر سیاسی حیثیت سے آزاد ہندوستان میں برطانوی سرمایہ عرصہ دراز تک غیر محفوظ حالت میں رہیگا۔ جو امتیازی درجہ اس کو اس وقت حاصل ہے وہ تو یقیناً باقی نہیں رہیگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ بالکل ہی ضائع ہوجائے۔ درجہ نوآبادیات اس خطرہ کو کم کرسکتا ہے، دور نہیں کرسکتا۔ اور یہ ہے خلاصہ المیہ استعماریت کا۔ جس جگہ وہ جڑ تھام لیتی ہے اپنی جڑیں اتنی دور تک پہنچادیتی ہے کہ پھر نہیں نکال سکتی۔ اور جہاں وہ اس طرح جڑ تھام لیتی ہے کہ پھر نکل نہ سکے وہاں اپنی بربادی کا سامان کرتی ہے۔

بہرکیف گزشتہ سال برطانیہ نے حقیقت حال کا مقابلہ کرنے سے جان چرائی اور کچھ نہ کیا۔ لیکن اب جبراً قہراً ایسا کررہی ہے جبکہ حالات پہلے سے زیادہ خراب ہوچکے ہیں۔ اس وقت وہ اتنی مراعات سے کام چلاسکتی تھی جو انتہاپسندوں کے سوا سب کو مطمئن کردے جس کے معنی یہ تھے کہ اکثریت مطمئن ہوجاتی۔ درجہ نوآبادیات نہیں بلکہ کچھ اس کے قریب قریب، جو مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات سے نمایاں طور پر بہتر ہوتا دے سکتی تھی۔ لیکن اب اختلاف کی خلیج وسیع ہوگئی ہے جن رعایتوں سے یہ ایک دو سال قبل رفع ہوسکتی تھی، اب بیکار ثابت ہونگی۔ اب یا تو اور بھی بڑی بڑی مراعات دیجائیں یا قومی تحریک کو بزور قوت دبایا جائے۔ دبانا، اچھی طرح دبانا، بہت بڑے پیمانہ پر طاقت کا استعمال کئے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ ممکن ہے جنگ ہی کرنی پڑے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا۔ اگر بغیر جنگ کے بھی قوم پرست دب گئے تو بھی اصلی آزمایش

صرف عارضی طور سے ملتوی ہوگی۔ اور جب دوبارہ اس کا وقت آئیگا تو کہیں زیادہ تلخ ہوگی۔ انگلستان کے لئے اور بھی زیادہ ناگزیر ہوتا جا رہا ہے کہ وہ انھیں دو صورتوں میں سے ایک انتخاب کرتے۔ یا تو لڑے۔ یا کسی قسم کی رعایت نہ کر کے ہندوستان کو ضائع کردے۔ کیونکہ چند سال قبل جو کچھ ممکن تھا۔ یعنی مسلسل مفاہمت باہمی رضامندی سے۔ جس سے نہ تو ہندوستان میں دشمنی کا تخم جڑ پکڑتا نہ انگلستان کو غیر ضروری خطرات پیش آتے۔ اب بعد از وقت ہے۔ اور یہ بھی استعماریت کے خصائص میں داخل ہے۔ اسکا کام ہمیشہ دیر سے ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ اپنی حفاظت کے خیال سے اس کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ ایک استعماری سلطنت ۱۹۳۰ء میں بمشکل اپنی قسمت کو مردانہ وار مقابلہ کرسکتی ہے۔

یہ مسئلہ ہندوستان اور انگلستان سے وسیع تر ہے۔ یہ مسئلہ استعماریت کا ہے، انیسویں اور بیسویں صدیوں اور انکے نتائج کا ہے، یا بالفاظ دیگر تاریخ کا ہے۔ آج یہ مسئلہ ہندوستان کا ہے، کل چین کا تھا، پرسوں مصر کا تھا، اور ممکن ہے کل پھر مصر کا ہو۔ چند دن قبل یہ ترکی اور مراکش کا تھا اور عرب کا تو تقریبا برابر ہی رہتا ہے۔ عنقریب ہی یہ جزائر فلپائن میں پیدا ہونیوالا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ میکسکو اور لاطینی امریکہ وغیرہ میں کیا ہو۔ ہر ایک کا مسئلہ تفصیلات میں مختلف ہے مگر نوعیت سب کی یکساں ہے۔ وہ ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں۔

محکوم ممالک اپنے آپ پر حکومت کرنے کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ یہ سوال مطلق اہمیت نہیں رکھتا۔ غالباً وہ اس کے قابل نہیں ہیں۔ تقریباً ہر ملک اس کے ناقابل ہے۔ بعض مضبوط ترین خودمختار ممالک بھی۔ اس میں بہت کم شبہ ہے کہ ہندوستان اگر یک بیک آزاد کردیا جائے تو مختلف صوبوں اور فرقوں میں خانہ جنگی شروع ہوجائے گی۔ یہ یقینی ہے کہ اہل فلپائن خود اتنی اچھی طرح حکومت نہیں کرسکتے جتنی امریکہ ان پر کر رہا ہے۔ یہ امر صریح ہے کہ نکاراگوا پر قبضہ کرکے اس کو امریکہ نے بیشمار انقلابات سے بچا لیا نیز یہ بھی کہ چین میں ایک بین الاقوامی ریسیوری[1] کا قیام ہم نے ہمیشہ سے چاہا، ان مسلسل خانہ جنگیوں کو روک دیتا جو اب اس ملک کو تباہ کر رہی ہیں۔ یہی ان دلائل کی بابت بھی کہا جاسکتا ہے جو ملک گیری

[1] Receivership

کی ساخت میں انسانی ہمدردی کی رو سے پیش کیجاتی ہیں یعنی کم متمدن ممالک کو بلاشبہ صفائی حفظان صحت، سڑکوں اور اسکولوں سے نیز مشین کے ذریعہ زیادہ دولت پیدا کرنے کے قابل بن جانے سے بہت زیادہ فائدہ پہنچتا ہے، آیا یہ فوائد جو محکوموں کو حاصل ہوتے ہیں ان نقصانات سے کم ہیں یا زیادہ جو ملکی دولت کے باہر نکل جانے سے انکو پہنچتا ہے، یہ دوسرا سوال ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک علیحدہ سوال ہے کہ ملکی تمدن کی بربادی کسی قیمت پر بھی گوارا کیجاسکتی ہے یا نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر غیر ملکی تسلط فوراً اٹھالیا گیا تو یہ فوائد بہت کچھ کم ہوجائیں گے۔

مگر جیسا کہ کہا جاچکا ہے، یہ دلائل خواہ دلچسپ ہوں صورت حال میں تبدیلی نہیں پیدا کرتے۔ مثلاً ہندوستان پر انکا کیا اثر پڑتا ہے؟ اسکے باوجود بھی قومی تحریک قومی جذبات کے مظہر کی حیثیت سے ایک بڑے لیڈر کی رہنمائی میں برابر بڑھ رہی ہے۔ نظری بحثوں کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ ہی برطانیہ پر ان کا کوئی اثر پڑتا۔ یہ ہندوستان کی بغاوت کو ایک واقعہ کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور ہے خواہ وہ بغاوت اسی سال انتہا پر پہنچ جائے یا ۱۹۳۵ء میں۔ چین میں اب بھی اسی قدر انتشار اور بدنظمی ہے جس قدر یہ بات پندرہ سال پیشتر تھی۔ تاہم اس نے اپنی کھوئی ہوئی آزادی کے دوبارہ حاصل کرنے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہی بل بوتے سے کام لینے کو خواہ نتیجہ تنزل ہی کیوں نہ ہو اغیار کی مدد سے ترقی کے معراج کمال تک پہنچنے پر ترجیح دینا انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ممکن ہے یہ ایک اچھا خاصہ ہو جبتک کوئی اپنے بازو کے کس بل سے کام لیتا ہے، کم از کم خودمختار ضرور رہتا ہے کہ جو چاہے سو کرے بصورت دیگر بالکل بے بس ہوتا ہے

بہرکیف، دنیا کی محکوم قوموں کا آزادی کے لئے مصمم ارادہ کرلینا ایک امر واقعہ ہے۔ نتیجہ کا انحصار بالکل طاقت پر ہے۔ چین اس لئے جیت رہا ہے کہ دول مغرب اور جاپان اپنی طاقت کو اس کے خلاف استعمال کرنے سے معذور ہیں۔ اگر ہندوستان نے فتح حاصل کی تو اس کا سبب یہ ہوگا کہ برطانیہ قوت کا کافی استعمال نہیں کرے گی یا نہ کریگی۔ اگر ہندوستان کو شکست ہوئی تو اسکا سبب یہی ہوگا کہ برطانیہ قوت کا کافی استعمال کرے گی۔ اس صورت میں اگر امرتسر کی طرح کوئی دوسرا واقعہ پیش آیا تو ہندوستان

کے سلئے کوئی وجہ شکایت نہ ہونی چاہئے۔ سچ یہ ہے کہ صدائے احتجاج اس موقع پر منطق کے خلاف ہوگی کیونکہ ایک بار جب سلطنت سے اعلان جنگ کر دیا گیا تو بقائے سلطنت کی قیمت امرتسر ہو گی۔ خواہ ہندوستان ہو یا کوئی دوسرا ملک۔ محکوم ممالک بالعموم امرتسر ہی سے محکوم بنائے گئے ہیں اور امرتسر ہی سے محکوم رکھے جاتے ہیں۔ جو انگریز لبرل ہندوستان کی آزادی کی حمایت نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی ہزار دل ہندوستانیوں کے قتل عام سے جھجکتا ہے، وہ بھی منطق کے خلاف کرتا ہے۔

اس معاملہ میں فیصلہ صرف جذبات پر منحصر نہیں ہے۔ مقابلہ صرف حیوانیت اور انسانیت کا نہیں ہے بلکہ حیوانیت اور اس شے کا ہے جو بین الاقوامی سیاسیات میں انسانیت کی قیمت ہوتی ہے۔ یعنی طاقت، جاہ و حشمت اور دولت کا زیاں۔ برطانوی وزیر اعظم کے لئے ہندوستان کی بابت فیصلہ کرنا کوئی نظری معاملہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا اثر برطانوی تجارت کے توازن اور برطانوی مزدوروں کے ذریعہ معاش پر پڑتا ہے۔ یہی قصہ کم و بیش ہر اس سلطنت کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ماتحت ممالک میں بےچینی ہو۔ یہ بات اچھی ہو یا بری ہم نے اپنے آپ اور اپنے مقبوضات کو ایک دوسرے سے وابستہ کر لیا ہے۔ ہمیں تجارت، اپنی مصنوعات کی نکاسی اور پیداوار خام کے لئے ان کی ضرورت ہے۔ ہم نے ان ممالک میں اپنا سرمایہ لگا دیا ہے، جس کے ضائع ہو جانے سے ہمیں نہایت سخت نقصان کا اندیشہ ہے جو بعض حالتوں میں مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف یہ سوال بھی ہے کہ آیا ہم اپنی مدد کر سکتے ہیں یا نہیں، اور آیا ہم اپنے ملکی مقبوضات پر تسلط قائم رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ نیز اگر یہ ممکن ہے تو کس قیمت پر۔ کیونکہ جملہ فوجی اخراجات ان محکوم ممالک سے حاصل کی ہوئی منفعت سے پورے ہونے چاہئیں جن کو محکوم بنانے کے لئے فوج کا استعمال کیا جائے۔

یہ دنیا کا سخت ترین پیلک مسئلہ ہے۔ اُنیسویں صدی کا شاندار رومان یعنی فتوحات ملکی کے لئے سفید فام قوموں کا وطن سے خروج اب ایک بے قدر حقیقت بن گیا ہے۔ اس میں بڑی حد تک صرف دکھاوے کی شان تھی، وہ اب نہیں رہی، اور اب جو کچھ رہ گیا ہے محض پیچ در پیچ ہے۔ تاہم

اس کی قیمت اب بھی ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ جیسا کہ چین اور ہندوستان کے معاملے سے ثابت ہوتا ہے، ہم شتر مرغ کی طرح اپنے سر ریت میں چھپا کر قیمت ادا کرنے سے بچ نہیں سکتے۔ اس طرح تو اس میں کمی بھی نہیں کرا سکتے بلکہ ہم اسے سود در سود کے ساتھ ادائگی پر مجبور ہونگے جو ممکن ہے تباہ کن ثابت ہو۔ بہترین صورت ہمارے لئے یہ ہے کہ قوت فیصلہ سے کام لینے پر آمادہ ہوں، پھر فیصلہ کریں کہ آیا بہتر سے بہتر شرائط پر جو طے ہو سکیں معاملہ کرلیں۔ یا جو کچھ اس وقت حاصل ہے اسے کسی حالت میں نہ چھوڑنے کا عہد کرلیں، نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ تاریخ کا ایک نہایت ہی جرأت آزما معاملہ ہے جس کا ہمیں تصفیہ کرنا ہے۔

غزل

از جناب جلیل احمد صاحب جلیلؔ قدوائی

ہیں کچھ ایسے بے سروساماں ہم — ایک بھی رکھتے نہیں ارمان ہم
ہم کو مت چھیڑو کہ مثل شمع صبح — دو گھڑی کے اور ہیں مہمان ہم
تم کو چاہیں گے نہیں اسکے سوا — جانتے کچھ عہد اور پیمان ہم
دل ہے نور عاشقی سے فیض یاب — مانتے ہیں آپ کا احسان ہم
تیری تصویر خیالی تیرے بعد — رکھتے ہیں پیش نظر ہر آن ہم
کچھ تو ہم سے سرگرانی ہے ضرور — یہ بھی کیا رکھتے نہیں پہچان ہم
کچھ تو ہے جو اس جبیں پر ہے شکن — ہاں اب اتنے بھی نہیں انجان ہم
ہو بھی کچھ رونق اگر باہر تو ہو — ہیں مگر اندر بہت ویران ہم
خوئے انسانی کوئی ہم میں نہیں — اور کہلاتے ہیں پھر انسان ہم

اس دل بیتاب کے ہاتھوں جلیلؔ
آج کل ہیں کس قدر حیران ہم

ڈھونس

(روسی سے ترجمہ)

نمر نوف انجنیر "گ" اسٹیشن پر اترا جس مکان کی پیمائش وغیرہ کے لئے وہ بلایا گیا تھا وہاں تک پہنچنے کے لئے تیس چالیس کوس کا راستہ گھوڑے گاڑی پر طے کرنا تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ اگر گاڑی چلانے والا سست اور گھوڑا مریل نہ ہوا تو تیس کوس کا بھی فاصلہ نہ ہوگا لیکن چلانے والا سپنے ہوا در گھوڑا ننا آ بچا س کوس کا اندازہ بھی دراصل کم ہے۔

"آپ کو معلوم ہے یہاں ڈاک کی گاڑی کہاں سے چلتی ہے؟" انجنیر نے اسٹیشن کے

سپاہی سے پوچھا۔

"کیسی؟ ڈاک کی؟ یہاں سو کوس چلے جائیے کہیں کتا تک ڈھونڈھے نہ ملے، ڈاک کی گاڑی کا کیا ذکر ہے؟ . . . . مگر آپ کو جانا کہاں ہے؟"

"مجھے جیف کی نو، جنرل نو توف کی ریاست میں جانا ہے"

"خیر" سپاہی نے جمائی لے کر کہا، "آپ اسٹیشن کے پچھواڑے چلے جائیے، وہاں احاطے میں کبھی کبھی کسان آتے ہیں جو مسافروں کو لیجایا کرتے ہیں" انجنیر نے ٹھنڈی سانس بھری اور اسٹیشن کے پچھواڑے پہنچا، وہاں بہت تلاش کی تو اسے ایک موٹے خاکستری رنگ کے کپڑے اور چھال کے جوتے پہنے ہوئے نہایت تندرست کسان ملا جس کے منہ پر چیچک کے داغ تھے اور اداسی چھائی تھی، بہت حجت اور پس و پیش کے بعد دونوں میں معاملہ طے ہو گیا

"خدا جانے تیری گاڑی کس ڈھنگ کی ہے!" انجنیر نے گاڑی پر بیٹھتے ہوئے تیور چڑھا کر کہا۔ "اس میں تو اگلے پچھلے حصے میں تمیز کرنا مشکل ہے . . . ."

گھوڑی جوان تھی مگر لاغر، ٹانگیں کچھ باہر کی طرف مڑی ہوئی، کان جا بجا کٹے ہوئے، بھدرے

جب گاڑی والے نے سوار ہو کر اس کے ایک چابک مارا تو اس نے صرف اپنا سر ذرا جھٹکا، جب گاڑی والے نے دل کھول کر خوب گالیاں دیں اور دوسرا چابک لگایا تو گاڑی کی ہر چول نے فریاد کی صدائیں بلند کیں، اور اسے بخار کی سی کپکپی آ گئی۔ تیسرے چابک پر گاڑی کشتی کی طرح ڈگمگائی، اور چوتھے پر اپنی جگہ سے ہلی۔

"کیا ہم سارا راستہ اسی انداز سے طے کریں گے؟" انجنیر نے پوچھا، اسے خوب ہچکولے لگے تھے اور وہ حیرت میں تھا کہ روسی گاڑی والے کچھوے کی سی پرکون چال چل کر گاڑی کو اس طرح کیونکر ہلاتے ہیں کہ انسان کے اندر جو کچھ ہوتا ہے باہر کی طرف آنے لگتا ہے۔

گاڑی والے نے اسے تسکین دلائی: "پہنچ جائیں گے صاحب پہنچ جائیں گے۔ گھوڑیا جوان ہے، ہوشیار ہے، ایک دفعہ دوڑنے میں لگا لگا دے تو پھر روکے نہیں رکتی . . . ہے . . . کم بخت!"

گاڑی اسٹیشن کے احاطے سے نکلی تو سورج ڈوب چکا تھا۔ انجنیر کے دائیں طرف ایک بے پایاں تاریک، سردی سے ٹھٹھرا ہوا میدان تھا . . . اس کو پار کرتا تو ضرور دنیا کے سرے تک پہنچ جاتا۔ اس مقام پر جہاں وہ آسمان سے مل کر اس میں غائب ہو گیا تھا، خزاں کی سرد شام کا چراغ آہستہ آہستہ گل ہو رہا تھا، رستے کے بائیں طرف اندھیرے میں کچھ ٹیلے سے دکھائی دے رہے تھے، اور یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ پچھلے سال کے کھلیان ہیں یا کوئی گانو، سامنے انجنیر کو کچھ نظر ہی نہیں آ سکتا تھا، کیونکہ گاڑی والے کی چوڑی بے ڈھنگی پیٹھ ادھر کے کل منظر کو چھپائے ہوئے تھی۔ ہر سو خاموشی تھی، اور سردی بلکہ ٹھٹھرن

"یہاں بھی کیا قبرستان کی سی خاموشی ہے" انجنیر نے اوورکوٹ کا کالر اٹھاتے ہوئے سوچا نہ آدمی نہ آدم زاد، وقت بھی اچھا نہیں۔ کوئی چھاپا مارے اور کپڑے تک اتروائے تو کسی کو خبر بھی نہ ہو چاہے اطلاع کے لئے توپ ہی کیوں نہ داغی جائے . . . اور گاڑی والا بھی کچھ قابل اعتبار نہیں معاذاللہ کیا پیٹھ رکھتا ہے! ایسا آغوش فطرت میں پلا ہوا انسان اگر چھو بھی لے تو ہم جیسوں کی روح

سی جاتے۔ اور ان کی سمجھ بھی جانوروں کی سی ہے، خطرناک ۔"

"کیوں میاں" انجینیر نے پوچھا۔ تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا؟ کلم"

"اچھا، کلم، یہ تو بتاؤ یہ جگہہ ہے کیسی؟ خطرناک تو نہیں؟ کسی کو ستاتے تو نہیں ہیں"

"خدا کا فضل ہے، یہاں کچھ نہیں ہوتا، اور ستائیں بھی تو کس کو؟"

"یہ تو اچھی بات ہے کہ یہاں کوئی ستایا نہیں جاتا . . . لیکن میں نے بہرحال احتیاطاً تین پستول لے لئے ہیں" انجینیر نے جھوٹ موٹ کہا "اور تم تو جانتے ہوگے پستول کے ساتھ مذاق کرنا برا ہے، ایک اکیلا آدمی پستول لے کر دس ڈاکوؤں کا مقابلہ کرسکتا ہے . . . ."

اندھیرا چھا گیا تھا۔ گاڑی اچانک کانپ اٹھی، اس کی چولوں نے آہیں اور فریادیں بلند کیں، اور وہ بائیں کو مڑنے لگی، مگر اس طرح گویا یہ حرکت اس کی مرضی کے خلاف ہے۔

"یہ شخص مجھے آخر لئے کدھر جارہا ہے؟" انجینیر نے سوچا "ابھی تک تو سیدھے چلے جارہے تھے، اور اب ایکبارگی بائیں کو۔ یہ آثار تو کچھ اچھے نہیں، بدمعاش مجھے کسی گڈھے یا غار میں لیجائے گا اور پھر . . . ایسے بھی تو آخر واقعے ہوا کرتے ہیں" اس نے گاڑی والے سے مخاطب ہوکر کہا:

"ہاں میاں، تو تم کیا کہہ رہے تھے، یہاں کوئی خطرہ نہیں؟ نہیں تو افسوس ہوتا ہے . . . مجھے تو ڈاکوؤں سے لڑنے کا شوق ہے ویسے تو میں دیکھنے میں دبلا بیمار سا معلوم ہوتا ہوں، مگر مجھ میں طاقت ایک پورے بیل کی ہے . . . ایک بار مجھ پر تین ڈاکوؤں نے حملہ کیا . . . اور تم کیا سمجھتے ہو کیا ہوا۔ ایک کو تو میں نے ایسا پکڑ کے جھٹکا کہ اس کا دم نکل گیا سمجھے، اور باقی دو میری وجہ سے قید کرکے سائبیریا بھیج دے گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا مجھ میں یہ طاقت آ کہاں سے جاتی ہے . . . تمھارے جیسے ہٹے کٹے آدمی کو ایک ہاتھ سے پکڑتا ہوں اور . . . اور اس کی کھال بس کھنچ کر ہاتھ میں آجاتی ہے"

کلم نے پھر کر انجینیر کی طرف دیکھا، اس کے سارے چہرے پر جھرّیاں پڑگئیں اور اس نے گھوڑی کے ایک چابک مارا۔

"ہاں میاں" انجینر نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا نہ کرے مجھ سے بھڑ جانا کسی کی قسمت میں لکھا ہو۔ علاوہ اس کے کہ ڈاکو کے ہاتھ یا پیر ٹوٹ ٹاٹ جائیں۔ اسے عدالت میں بھی جواب دہی کرنی ہوگی . . . مجھے سارے جج اور پولیس کے افسر اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں سرکاری ملازم ہوں، بہت بڑا آدمی . . . . میں اس وقت سفر کر رہا ہوں اور . . . سرکار دیکھتی رہتی ہے کہ کہیں مجھے کوئی ضرر نقصان تو نہیں پہنچا۔ تمام رستے پر ہر جگہ جھاڑیوں کے پیچھے سپاہی وغیرہ چھپے ہیں . . . ٹھ . . . ٹھ . . . ٹھرا!" انجینر نے ایکبارگی بڑے زور سے چلاکر کہا۔ "یہ تو آخر کہاں پہنچ گیا؛ مجھے کہاں لئے جاتا ہے؟"

"کیا آپ کو نظر نہیں آتا؛ جنگل ہے!"

"واقعی جنگل ہے" انجینر نے دل ہی دل میں کہا۔ " . . . مگر میں بھی کیا سہم گیا! مگر خیر اپنی گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دینا چاہئے . . . اس نے خود ہی محسوس کر لیا ہوگا کہ میں ڈر کے مارے مرا جاتا ہوں۔ وہ بار بار پھر کر مجھے دیکھ کیوں رہا ہے؟ ضرور اس نے کچھ سوچ رکھا ہے . . . پہلے بہت مزے مزے سے جا رہا تھا گھوڑا ایک قدم رکھنے کے بعد پھر کہیں دوسرا اٹھاتا تھا، اور اب دیکھو کیسا ہوا کی طرح اڑا چلا جاتا ہے!"

"سنو تو، کلم، تم گھوڑی کو ایسا بھگا کیوں رہے ہو؟"

"میں اسے نہیں بھگا رہا ہوں، خود ہی بھاگی چلی جاتی ہے . . . . اور یہ ایک مرتبہ بھاگنا شروع کرے تو پھر کسی طرح روکے نہیں رکتی . . . اور خود یہ بھی اتنا تیز دوڑنے سے خوش نہیں۔"

"میاں کیوں بیکار باتیں بناتے ہو! صاف ظاہر ہے جھوٹ بول رہے ہو لیکن میری رائے مانو تو اتنا تیز نہ چلاؤ۔ روکو گھوڑی . . . سنا؛ روکو!"

"کیوں؛"

"کیوں؛ اس لئے کہ اسٹیشن سے میرے پیچھے چار دوست اور آرہے ہیں۔ وہ ہمیں پکڑ لیں تو اچھا ہے . . . انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس جنگل تک پہنچنے سے پہلے وہ مجھے پکڑ لیں گے

... اسے ساتھ سفر کرنے میں اور زیادہ لطف رہے گا . . . بڑے تندرست ہٹے کٹے لوگ ہیں ... ہر ایک کے پاس ایک ایک پستول ہو . . . یہ تم نے مجھے بار بار گھوم کر دیکھنا کیا شروع کیا ہے، گویا تم سے ایک جگہ پر بیٹھا ہی نہیں جاتا ؟ ہیں ؟ اور میں . . . مجھ میں دیکھنے کو کچھ نہیں . . . کوئی تماشے کی بات نہیں . . . شاید تم ان پستولوں کو . . . کہو تو تمھیں نکال کر دکھا دوں . لو . . .

انجینیر نے ایسی صورت بنائی گویا جیب میں کچھ ٹٹول رہا ہے، اور اس وقت ایسا واقعہ پیش آیا جس کا اسے بزدلی کی وجہ سے مطلق اندیشہ نہیں تھا کلم اچانک گاڑی پر سے کود پڑا اور گھنی جھاڑیوں کی طرف سرپٹ بھاگا۔

" بچاؤ! " وہ چلایا " بچاؤ! لیجا ملعون، گھوڑیا گاڑی، سب لیجا، بس میری جان سلامت چھوڑ دے! بچاؤ! "

جاتے ہوئے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی، اور خشک ڈالیوں کے چٹ پٹ ٹوٹنے کی آواز — پھر ہر طرف خاموشی ہوگئی۔ انجینیر کو ایسی سخت سزا کا گمان نہ تھا، اس نے سب سے پہلے گھوڑی کو روکا پھر گاڑی پر ذرا اور آرام سے بیٹھا اور سوچنے لگا۔

" بھاگ گیا . . . سہم گیا، بیوقوف . . . پھر، اب کیا ہو ؟ اکیلا تو میں آگے جا نہیں سکتا، کیونکہ رستہ نہیں جانتا، اور یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے اس گھوڑی کو زبردستی چھین لیا . . . اب کیا ہو؟ کلم! کلم! "

" کلم! " جنگل کی گونج نے جواب دیا۔

اس خیال سے کہ اسے اندھیرے جنگل میں ایک پوری جاڑوں کی رات کاٹنی ہوگی اور اپنی آواز کی گونج، بھیڑیوں کے میانے اور مریل گھوڑیا کے ہنہنانے کے سوا اور کچھ نہ سنائی دیگا۔ انجینیر کا بدن کانپ اٹھا، جیسے بخار ہو۔

" کلم میاں " اس نے چلا کر کہا، " کلم، پیارے دلارے کلم، تم کہاں ہو؟ "

دو گھنٹے تک وہ اسی طرح چلاتا رہا، آخر میں جب اسکا گلا بیٹھ گیا اور اس نے جنگل میں رات

بسر کرنے پر اپنے دل کو راضی کر لیا تو ہوا کے ایک ہلکے جھونکے نے کسی کے کانکھنے کی آواز اس کے کان تک پہنچائی۔

"کلم، کیا نہیں ہو، میاں! آؤ چلیں!"

"ما... مار ڈالو گے"

"ارے بھائی میں تو مذاق کر رہا تھا! خدا گواہ ہے، محض مذاق تھا! میرے پاس پستول بھلا کہاں سے آئے؟ میں تو بس ڈر کے مارے جھوٹ موٹ کہہ رہا تھا! آؤ، میرے حال پر رحم کرو اور آگے چلو۔ میں ٹھٹھرا جاتا ہوں!"

کلم، غالباً یہ سوچ کر کہ سچ مچ کا ڈاکو اب تک گھوڑیا گاڑی لے کر چمپت ہوا ہوتا جنگل سے نکلا اور ڈرتا ڈرتا گاڑی کے پاس آیا۔

"ارے تم ڈر کس بات سے گئے؟ میں... میں تو مذاق کر رہا تھا اور تم ڈر گئے... آؤ بیٹھو!"

"حضور، خدا آپ کو سلامت رکھے" کلم نے گاڑی پر چڑھتے ہوئے جھلا کر کہا "مجھے معلوم ہوتا تو سو روپے میں بھی آپ کو لانے پر راضی نہ ہوتا۔ میرا ڈر کے مارے دم نکلتے نکلتے رہ گیا...."

کلم نے گھوڑی کے چابک مارا۔ گاڑی کو لرزہ سا آیا۔ کلم نے پھر چابک لگایا اور گاڑی ڈگمگائی۔ چوتھے چابک کے بعد جب گاڑی جگہ سے ہلی تو انجنیر نے کوٹ کا کالر چڑھا کر کان تک اس سے ڈھک لئے اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اب اسے نہ رستہ خطرناک معلوم ہوتا نہ کلم۔

(انتون چیخوف)

ادبی خطوطِ غالبؔ

تنقید

جناب مرزا محمد عسکری بی اے لکھنوی کی اخاذ طبیعت نے اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی سے ادبی خطوط غالب کا ایک نسخہ تیار کرکے شائع فرمایا ہے جس کی ضخامت ۱۸ × ۲۲ کی تقطیع پر ۲۰۸ صفحات ہیں۔ کتاب کے شروع میں مرزا غالب مرحوم کی ایک تصویر بھی دی گئی ہے جو بہت صاف ہے اور انکے چہرے کے خدوخال کو نمایاں طور پر واضح کرتی ہے۔ اس کے بعد تمہید کے عنوان سے آپ نے ۴۸ صفحات کا ایک مقدمہ تحریر کیا ہے جو بجائے خود دلچسپ اور مفید معلومات سے مملو ہے۔ بعد ازاں ادبی خطوط غالب یعنی ایسے خطوط جن میں مرزا نے نکات ادبیہ حل کئے ہیں، اشعار کے معنی سمجھائے ہیں اور شعراء کے متعلق رائے زنی کی ہے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ۱۷۶ صفحات پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح کل ۹۶ خطوط ہیں جو ادبی خطوط کے تحت میں آئے۔ آخر میں ایک ضمیمہ دیا گیا ہے جو مرزا غالب کے اُن مکتوب الیہم کے حالات پر مشتمل ہے جن کے نام عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ میں خطوط ہیں اور یہ ضمیمہ کتاب کے ۲۰۸ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے اور کاغذ بھی سفید اور دبیز لگایا گیا ہے۔ ٹائیٹل پیج بھی عمدہ ہے اور ان محاسن کے باوجود قیمت صرف عہ رکھی گئی ہے جو ہمارے نزدیک بہت کم ہے اور ہم کو یہ مصرع یاد دلاتی ہے۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

لائق مرتب نے اپنا ماخذ صرف اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی کو قرار دیا ہے حالانکہ بقول حالی مرحوم "بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو مطبع مجتبائی میں چھپ کر شائع ہو گئے ہیں" اور جیسا کہ راقم نے سنا ہے اس کی بنا پر یہ عرض کرنے کی جرأت کیجاتی ہے کہ بہت سے خطوط لالہ سری رام ایم اے مولف خمخانہ جاوید نے بھی جمع کئے تھے جن کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی اور اگر لالہ سری رام آنجہانی اپنی وفات سے قبل امراض مزمنہ سے مہلت پاتے تو وہ ضرور

ان کو چھپوا دیتے۔ بہر حال قابل مرتب اگر زیادہ کد و کاوش سے کام لیتے تو مطبع مجتبائی کے چھپے ہوئے خطوط یقیناً اور لالہ سری رام کے جمع کردہ خطوط غالباً ان کو مل جاتے اور یہ مجموعۂ خطوط غالب زیادہ مکمل اور مفید ثابت ہوتا۔ مطبع مجتبائی کی نسبت لائق مرتب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ عود ہندی اول اول مطبع مجتبائی میرٹھ میں چھپی لیکن مولانا حالی نے جو مطبع مجتبائی کا ذکر کیا ہے وہ میرٹھ کا نہیں بلکہ دہلی کا مشہور مطبع معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ اشاعت کے وقت مرزا صاحب ان دونوں ماخذوں سے بھی استفادہ حاصل کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

لائق مرتب نے اپنے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ”خط نویسی نثر نگاری کی ایک مستقل صنف ہے اور یہی وہ صنف ہے جس میں کاتب تحریراً مافی الضمیر، اپنا کیرکٹر، اپنے اخلاق و عادات، دوسروں کے متعلق اپنی حقیقی رائیں، اپنی سوسائٹی کا چربہ، الغرض کہ ہر وہ چیز جو اس کے قلم سے تراوش کرے صحیح طور پر دنیا کے سامنے ظاہر کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے ․ ․ ․ ․ پس اگر ہم کو کسی شخص کو جانچنا ہے تو اس کی اس قسم کی تحریروں سے اس کو جانچ سکتے ہیں جن میں وہ اپنے اور دوسروں کے حالات صحیح اور من و عن لکھنے پر مجبور ہوتا ہے اور یہ بات سوائے خطوں کے دیگر اقسام نثر میں نہیں پائی جاتی“

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ”خطا نویسی دنیا کی اکثر زبانوں میں موجود ہے۔ موجودہ زبانوں میں علاوہ عربی و فارسی کے لاطینی، انگریزی، فرنچ، جرمن وغیرہ میں ایسی مستقل کتابیں خطوط و رسائل کی موجود ہیں جن سے مصنف کی اعلیٰ انشا پردازی کے علاوہ اُس کے اخلاق و عادات اور اُس کے ماحول کا بھی پورا پتہ چل جاتا ہے۔ زبان لاطینی میں ہاریس اور سسرو، انگریزی میں ملٹن، بیکن، کوپر، گولڈ اسمتھ، بائرن، لارڈ چیسٹر فیلڈ، کوئن وکٹوریہ وغیرہ فرانسیسی میں والٹیر، ڈیڈرو وغیرہ کے خطوط ایسی تصانیف ہیں جو اُن زبانوں میں نثر کے معرکۃ الآرا کارنامے سمجھے جاتے ہیں“

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ”جب رنگ بدلا اور نثر اردو میں زمانۂ موجودہ کا رنگ پیدا ہوا تو منشی امیر احمد مینائی اور اکبر وغیرہ نے خطوط تحریر کئے جن میں تقلید فارسی اور مقفیٰ و مسجع روش کو چھوڑ کر عبارت میں سادگی بے تکلفی اور شگفتگی پیدا کی مگر ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو مرزا غالب کی تحریروں کے مقابلہ میں

پیش کی جاسکے وہ ہم کہاں جیا، توں کے مفہوم سے کلی تعلق ہے۔ فی الواقع اگر کوئی مرزا غالب مرحوم کے عادات اطوار اور ذاتی حقیقی باتوں سے واقف ہونا چاہے تو اُس کو اُن کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اُن کے یہ خطوط اردو نثر میں لاجواب ہیں۔ آجتک کسی سے اُن کی ہمسری توکیا پوری پوری تقلید بھی نہیں ہوسکی۔ لیکن مرزا غالب مرحوم کا جو مقصد تھا وہ اِن خطوط سے پورا ہوگیا یعنی لمبے لمبے القاب و آداب اور خیریت گوئی اور خیر و عافیت طلبی زائد و بیکار شے ہوگئی تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا ہوگیا۔ لوگ مطلب کو اس انداز سے ادا کرنے لگے کہ اُس کے سمجھنے میں دشواری نہ رہی۔ دقیق استعارے اور مشکل اور نامانوس لغات کو ترک کر دیا اور ہر تحریر میں مکتوب الیہ کا مرتبہ نظر میں رہنے لگا اور جہانتک ممکن ہوتا ہے تحریر کو طول نہیں دیا جاتا بلکہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کیجاتی ہے کہ سادگی اور لطافت ہاتھ سے نہ جانے پائے اور یہی منشاء اصلی مرزا مرحوم کا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مرزا اس طرز کے موجد و مخترع تھے اور انکے بعد ہم سب لوگ اُن کے مقلد ہیں۔ تعجب ہے کہ مرزا جو شعر و سخن میں مشکل پسند واقع ہوئے تھے خط نویسی میں آسان پسند ہوگئے۔ یہ اجتماع ضدین کیسا؟ ہمارے نزدیک اسکی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ عام شاہراہ پر چلنا کبھی پسند نہ کرتے تھے۔ چونکہ اردو میں سب لوگ آسان فہم اشعار کہا کرتے تھے اس لئے انھوں نے دشوار راہ اختیار کی اور چونکہ خط نویسی اُس وقت تک عام طور پر فارسی زبان میں ہوتی تھی اور دقیق و پیچیدہ عبارت لکھی جاتی تھی لہذا مرزا نے اس کو ترک کیا اور علی الرغم جمہور سادگی اور شگفتگی پیدا کی۔ دوسرے ہر نیم روز کے لکھنے کی خدمت اور بعد ازاں پیرانہ سری اور ضعیفی نے مجبور کیا کہ وہ فارسی کے بجائے اُردو میں خطوط لکھیں اور آسان طریقہ اختیار کریں چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

" زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی، حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب　　اب عناصر میں اعتدال کہاں "

مرزا نے سنہ ۱۸۵۰ء سے اردو میں خط کتابت شروع کی تھی یعنی اب سے اسّی سال پیشتر۔ اس اُردو

خطوط نویسی کو اختیار کرنے کے وجوہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا نے آج سے اسی برس قبل اس امر کا اندازہ کر لیا تھا کہ اب ملک میں کس قسم کی انشا پردازی کا رواج ہوگا در اصل انہوں نے اپنے برادران وطن کے لئے وہ بے نظیر اور بے بہا نمونہ چھوڑا جس کی صرف تعریف ہی تعریف کی جاسکتی ہے۔ اگر مرزا یہ کام شروع نہ کرتے تو بے شک پچاس سال بعد یعنی اس صدی کے آغاز سے یہ سلسلہ خود بخود شروع ہو جاتا کیونکہ اس وقت تک انگریزی کا رواج عام ہو گیا تھا اور طرز تحریر میں مبالغہ سے قطع نظر صرف سادگی اور آسان پسندی کو جگہ دیجانے لگی تھی۔ تاہم مرزا کی اداشناسی کی تعریف نہ کرنا ظلم ہے۔ بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن کو عام لوگ پسند تو نہیں کرتے مگر سوسائٹی کے دباؤ سے خواہ مخواہ پرانی روش کو نبھائے جاتے ہیں اور اس کے خلاف چلنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ مرزا غالب نے خلاف جمہور یہ طرز اختیار کیا اور لطف یہ ہے کہ اس نے نکتہ چینی اور اعتراض کی بجائے لوگوں سے خراج تحسین وصول کیا اور کسی ایک شخص نے بھی اس وقت سے آجتک اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ بلکہ سرسید، مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، مولنا حالی وغیرہم نے خطوط نویسی میں مرزا کی پیروی کی ہے اور کیا عجب ہے کہ سرسید نے جو سادہ زبان علمی و تاریخی و اخلاقی مضامین میں استعمال کی وہ مرزا کے خطوط کی سادگی ہی دیکھکر اختیار کی ہو۔ اور پھر اُنکے رفقائے کار نے بھی انکی تقلید کی ہو۔

الحاصل مرزا کی ظرافت اور اُنکا انداز بیان قابل رشک ہے۔ اُن کے تمام خطوط خواہ اُن میں کوئی ادبی مسئلہ حل کیا ہو یا نہ کیا ہو یا زباندانی کے متعلق کوئی بات کہی ہو یا نہ کہی ہو سراور آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں لیکن لائق مرتب خاص طور پر مستحق داد ہیں کہ اُن کی دوررس نظر نے مرزا غالب کے جواہر پاروں کو انتخاب کر لیا اور ادبی خطوط کی اشاعت سے زبان و ملک کی ایک خدمت ادا کی۔ مرزا کے یہ جواہر پارے عام خطوط میں اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا مشکل سے ان سے مستفیض ہو سکتا تھا۔ اب علحدہ کتابی شکل میں جمع ہو کر یہ عام و خاص ناظرین کے لئے نہایت مفید و کارآمد ہو گئے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ مرزا کے قدردان جو ملک کے اس گوشہ سے اُس گوشہ تک پھیلے ہوئے ہیں ادبی خطوط غالب کی ضرور زیارت کرینگے اور بطور تبرک اپنے پاس رکھیں گے۔

جامع ادبی خطوط غالب نے ایک شکایت کی ہے اور بجا کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تاریخ تحریر خط کو ایک غیر ضروری جزو سمجھ کر حذف کر دیا گیا ہے اور اس سے تمام خطوط گڑبڑ ہو گئے ہیں۔ مثلاً ایک ہی شخص کے نام سنہ ۵۹ء سے ۶۶ء کے خطوط کے بعد سنہ ۶۱ء سے ۶۲ء کے خطوط نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی قسم کی کوئی ترتیب جس سے عمدہ نتیجہ مستنبط ہو نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنے اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے ایک نقشہ بھی مرتب کیا ہے اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الواقع تاریخ تحریر خط نہایت ضروری شے ہے اور اس کو حذف نہ کرنا چاہئے تھا۔

لائق مرتب نے اپنے مقدمہ میں نہایت قابلیت کے ساتھ مرزا کے خطوط کی خوبیاں اور صفات بیان کی ہیں اور یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے ادبی خطوط میں کن کن خطوط کو شامل کیا ہے۔ ترتیب خطوط بھی نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ رکھی گئی ہے۔ خطوں کے ضروری مضامین کا خلاصہ شروع میں درج کر دیا گیا ہے اور اس خلاصہ کی تفصیل بھی خطوں کے مضمون کو پیراگراف میں تقسیم کر کے ظاہر کر دی گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ خط نمبر ۶۵ کے بعد سے یہ خلاصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ نہیں معلوم اس کی کیا وجہ ہے؛ ہمیں امید ہے کہ آئندہ یہ غلطی یا سہو بھی رفع کر دیا جائیگا۔

قابل مرتب نے جہاں جہاں ضرورت سمجھی ہے حاشیہ میں نوٹ لکھ کر مضامین خطوط کو زیادہ واضح اور صاف کر دیا ہے۔ ہمیں لائق مرتب معاف فرمائیں اگر ہم خط نمبر ۲۶ کے حاشیہ سے اختلاف ظاہر کریں۔ میر انیس اور مرزا غالب دونوں بشر تھے اور دونوں سے غلطی سرزد ہونا ممکن ہے۔ چونکہ مرزا غالب نے اس شعر پر

ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

اعتراض وارد کیا ہے کہ "کلام ادق سہل ممتنع کے منافی ہے۔ پھر یاد نہ ہونا اور حافظہ پر نہ چڑھ جانا ہرگز سہل ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کلام ادق کلام مغلق کو کہتے ہیں . . . . . . قابل مرتب نے یہ حاشیہ لکھا ہے کہ۔

"میر انیس مرحوم کا یہ شعر مرزا صاحب کے اعتراض بیجا کا گھائل ہے . . . . کلام ادق سے یہاں یہ مراد ہے کہ ہرچند باعتبار لفظ کلام بہت سہل مگر بہ لحاظ معنی بہت دقیق اور باریک ہو" اسی طرح لکھا ہے کہ "سبق یاد

نہ ہونے سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کلام یاد نہ ہوسکے بلکہ یہ مطلب ہو کہ اُس کی نقل دشوار ہے۔

لایق مرتب نے یہ لکھ کر کہ "یہاں یہ مطلب ہو،، اس کو گویا تسلیم کر لیا کہ عام طور پر جو معانی مرتب صاحب نے بیان کئے ہیں وہ ان الفاظ کے نہیں لئے جاتے بلکہ وہی معانی لئے جاتے ہیں جو مرزا غالب مرحوم نے بیان کئے ہیں۔ مرزا کے مکتوب الیہ نے سہل ممتنع کی تعریف دریافت کی ہے اور یہ شعر بطور مثال لکھا ہو۔ ظاہر ہے کہ مرزا کا جواب جو انھوں نے لکھا ہے وہی ہونا چاہیئے تھا۔ اُن کو ہرگز علم نہ تھا کہ کس کا شعر ہے اور اعتراض کی خاطر شعر پر اعتراض نہیں کیا گیا بلکہ حقیقۃً یہی اعتراض وارد ہوتا ہے چنانچہ خط کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ سہل ممتنع کی صفت وہ تھی جو فقیر اوپر لکھ آیا۔ اس شعر سے مجھ کو کچھ علاقہ نہیں ہے اگر مرزا کو یہ اطلاع ہوتی کہ یہ شعر میر انیس کا ہے تو وہ غالباً مکتوب الیہ سے پورا بند حاصل کرتے اور اُس وقت ممکن ہے کہ یہی معانی جو لائق مرتب نے اس شعر کو پہنائے ہیں پیدا ہو سکتے۔ بحالت موجودہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح شیکسپیر کے غلط الفاظ میں معانی پہنائے جاتے ہیں اسی طرح قابل مرتب نے بھی میر انیس کے شعر کو وہ معانی عنایت کئے ہیں جو بظاہر اس میں نہیں پائے جاتے اور یہ جذبہ بلحاظ تقلید یورپ ہر طرح قابل داد و تحسین ہے۔

ہم کو اس کتاب کی نسبت ایک شکایت یہ ہو کہ خطوط کے مضامین کی فہرست نہیں دی گئی بعض اوقات کسی ایک خط کا مضمون یاد رہتا ہے لیکن جب اس کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو بہت دشواری ہوتی ہے۔ اگر آئندہ اس قسم کی کمی کو دور کر دیا جائے تو کتاب کی خوبی میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ ہم یہاں یہ بھی مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ اگر آئندہ انڈکس تیار کر دیا جائے تو نہایت مناسب اور بہتر ہوگا کیونکہ ناظرین کے لئے سہولت اور کفایت وقت دونوں خوبیاں بہم ہو جائیں گی۔

لایق مرتب نے ایک اور جدت کی ہے اور وہ نہایت تعریف کے قابل ہے یعنی مرزا غالب مرحوم کے مکتوب الیہم کے حالات زندگی فراہم کر کے یکجا تحریر کئے ہیں۔ اس سے کتاب اور زیادہ مفید اور کارآمد ہو گئی ہے۔ فی الواقع اس بات کی ضرورت تھی کہ مکتوب الیہم حضرات کس درجے اور کس حیثیت کے آدمی تھے اور اُنکا مذاق طبیعت کیا تھا تاکہ جو خطوط مرزا نے ان کے نام تحریر کئے ہیں اُن کے لفظ لفظ سے

سے اختلاف ہے۔ مثلاً صاحب عالم مارہروی مرزا غالب سے ایک سال بڑے تھے۔ انکا سنہ ولادت ۱۲۱۱ھ تھا اور مرزا کا سنہ ولادت ۱۲۱۲ھ تھا۔ کہیں ان کی جو شامت آئی تو انھوں نے لکھدیا کہ میرا سنہ ولادت تاریخ کے لفظ سے نکلتا ہے مرزا کے پاس جب یہ خط پہنچا تو انھوں نے اپنی خداداد ظرافت کی بموجب یہ شعر لکھ کر بھیجا ؎

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا ۔۔۔۔۔۔ ان کی تاریخ میرا تاریخا

اس لفظ تاریخا سے مرزا کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ نکلتا ہے۔ بعض دیگر آرا بھی جو مرزا غالب نے اپنے خطوط میں ظاہر کی ہیں قابل غور اور لائق داد ہیں مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے،" دوسرے خط میں لکھتے ہیں "بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے" تیسرے خط میں لکھتے ہیں "فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔" چوتھے خط میں لکھتے ہیں "غیاث الدین رامپور میں ایک ملائے مکتبی تھا۔ ناقل نا عاقل، جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا۔" یہ نکات ادبی جواہرات سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اس قسم کے سیکڑوں نکتے ادبی خطوط غالب میں پنہاں ہیں۔

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ سرکار نظام سے جامعہ کی امداد کا جو وعدہ ہوا تھا وہ پورا ہوگیا۔ یکمشت عطیہ وصول ہوگیا اور ماہوار رقم بھی ملنے لگی۔ ہمیں امید ہے کہ جامعہ کے بہی خواہ حضور نظام، اراکین کونسل اور اہل حیدرآباد کے شکریے میں ہمارے ہم زبان ہوں گے۔

جامعہ کی مستقل عمارت کے لئے دلی کی نواح میں زمین لینے کی کوشش بہت دن سے جاری تھی۔ اب یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ انشاء اللہ زمین ملتے ہی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ اور تھوڑے دنوں میں جامعہ کی چھوٹی موٹی بستی شہر سے دور کسی گاؤں کے قریب بس جائے گی۔

جامعہ کے پیش نظر رہبات کی تنظیم اور اصلاح کا جو مقصد ہے اس میں اس تبدیل مکان سے بڑی سہولت ہو جائے گی۔ یوں بھی بڑے شہروں کی فضا کسی درسگاہ کے لئے زیادہ موزوں نہیں ہوتی۔ قرولباغ وسط شہر سے کسی قدر دور ہے مگر پھر بھی شہر کی تند و پرشور زندگی کا اثر یہاں پہنچ ہی جاتا ہے اور ہمارے نزدیک ہمارے کام کے لئے سکون و اطمینان کی اشد ضرورت ہر بارج ہوتا ہے۔ اپنے نئے مکان میں پہنچ کر ہم زیادہ یکسوئی سے اپنا کام انجام دے سکیں گے۔

ہماری جماعت کے مخلص اور سرگرم رکن حافظ فیاض احمد صاحب اس مہینے کے شروع میں جامعہ سے الگ ہو کر کانگرس کی تحریک میں شریک ہو گئے تھے۔ موصوف کو زیادہ تر قومی تحریک کے اسلامی پہلو سے دلچسپی ہے اس لئے وہ اس وقت محض شراب فروشی کی مخالفت اور کھدر کی ترویج کا کام نہایت با امن طریقے سے انجام دے رہے تھے۔ غالباً ”زمانۂ امن“ میں ان کی جد و جہد تمام وفاداران سرکار کی متحدہ

کوشش سے بھی قانون کی زد میں نہ آسکتی۔ مگر "زمانۂ جنگ" کا قانون، اگر اسے قانون کہئے، کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اس کی رو سے حافظ صاحب جو ہم جامعہ والوں کو حسن محاسبی پر مجسم قانون نظر آتے تھے، کسی "دفعہ" کے ماتحت قانون شکنی کے مجرم قرار پائے اور انہیں چار مہینے کی قید محض کی سزا ہوگئی۔ ہم تو اسے بڑی بے انصافی سمجھ کر شکایت کرنے والے تھے مگر قانونی بصیروں کی قطعی رائے ہوئی کہ "سستے چھوٹے"، حالانکہ "چھوٹے" کا لفظ اس موقع پر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ حافظ صاحب کی ذات سے جامعہ کے اتنے کام وابستہ تھے کہ انکا ایک عرصے کے لئے ہم سے علٰحدہ ہونا ہم لوگوں پر بہت گراں تھا مگر ان کا خلوص اور جوش دیکھ کر انکے ارادے کی مخالفت کی ہمت نہ ہوئی اور مخالفت تھی بھی بیکار، جس کے دل میں کسی بڑے کام کے لئے ایثار اور قربانی کی لگن ہو اور وہ عزم و ثبات بھی رکھتا ہو اس پر لوگوں کے سمجھانے کا اثر اور الٹا ہوتا ہے

حافظ صاحب کے چلے جانے سے ہمارے کاموں میں جو دقتیں پیدا ہوگئی ہیں اور خود حافظ صاحب اور انکے بچوں کو جو تکلیف پہنچی ہے اسکا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم انکے جوش جنون کی شکایت کرتے مگر حرف شکایت کسی طرح زبان قلم تک نہیں آتا۔ اپنے عقیدے کی خاطر سختیاں جھیلنے والے ہم میں اتنے کم ہیں کہ جس کسی کو اس امتحان میں پورا اترتے دیکھتے ہیں بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے۔

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو

ہمارے ملک کے نامور مورخ اور معلم جادو ناتھ سرکار صاحب نے الہ آباد یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس جلسے میں صوبہ متحدہ کے گورنر جو یونیورسٹی کے چانسلر ہیں تشریف نہیں لائے حالانکہ وہ شہر میں موجود تھے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کی عمارت پر سوراج کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

پروفیسر سرکار کا خطبۂ صدارت طرز ادا کے لحاظ سے دلچسپ اور دلنشیں اور مضمون کے لحاظ سے اہم

سلسلے میں ڈھلا ہوا تھا جو یونیورسٹیوں کے خطبوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہندوستان میں اب پندرہ سولہ یونیورسٹیاں ہیں اور ان سب کا جلسہ تقسیم اسناد ہر سال ہوتا ہے جس میں خطبۂ صدارت بھی دیا جاتا ہے۔ آسانی کے لحاظ سے اس خطبے کے لئے چند مسائل مخصوص کر دئے گئے ہیں جن پر ہر صدر یا نائب صدر کم و بیش مقررہ الفاظ میں اظہار خیال کرتا ہے۔ اس سے ایک تو یہ فائدہ ہے کہ صدارت کرنے والوں کو خطبۂ صدارت لکھنے میں زیادہ دماغ سوزی نہیں کرنا پڑتی اور دوسرے ایک ہی طرح کے خیالات ایک ہی طرح کے الفاظ میں بار بار دہرانے سے یہ امید ہوتی ہے کہ کچھ دن میں سننے والے انھیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں گے پروفسر سرکار نے بھی ان "متفق علیہ" خیالات کو نہایت خوبی سے رسم و آئین کی پوری پوری پابندی کے ساتھ بیان کر دیا۔

مقررہ آئین کے مطابق پروفسر سرکار کا خطبہ یہاں سے شروع ہوا کہ یونیورسٹی علم و تعلیم کا مرکز ہے۔ اسکا مقصد نوجوانوں کی عام ذہنی تربیت اور رہبری ہے خصوصاً ان میں "معقولیت اور وسعت نظر" پیدا کرنا۔ پھر معقولیت کی یہ تعریف کی گئی کہ عقل کو جذبات سے برتر سمجھنا۔ ہر چیز کو عقل کے معیار پر جانچنا حق کو ہر ملک و قوم کی ملک جاننا۔ دوسری قوموں سے اتحاد عمل کے لئے تیار رہنا اور صبر کی عادت ڈالنا — اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا کہ سیاسی قوت عرصۂ دراز کے ضبط و انضباط کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اور وسعت نظر کا مفہوم یہ قرار دیا گیا کہ قومیت کے تنگ دائرے سے نکل کر خدا کی وسیع دنیا پر نظر ڈالنا، اس حقیقت کو تسلیم کرنا کہ انسانی فضائل سب قوموں میں مشترک ہیں۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے قوموں کے اختلافات مٹتے جاتے ہیں اور وہ ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک ہوتی جاتی ہیں۔ آخر میں خاتمہ اس پر ہوا کہ انسان کے عمل کو روزانہ اخبار کے معیار پر نہیں پرکھنا چاہئے بلکہ صدیوں کی تاریخ کی میزان میں تولنا چاہئے، عارضی کاموں کے جادو سے مسحور نہیں ہونا چاہئے بلکہ دائمی قدروں کی خدمت میں ثبات قدم اور خلوص کے ساتھ مصروف رہنا چاہئے۔

پروفیسر سرکار کے خطبۂ صدارت میں جو باتیں کہی گئی ہیں اور دوسروں کے خطبہ ہائے صدارت میں ہر سال کہی جاتی ہیں ان کی صحت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ ان میں حقیقت کا صرف ایک پہلو دکھایا جاتا ہے۔ دوسرے پہلو کی طرف سے ہمیشہ چشم پوشی کی جاتی ہے۔ اسے کون تسلیم نہ کریگا کہ یونیورسٹی کا مقصد "معقولیت اور وسعت نظر" کی تعلیم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا "معقولیت" کے معنی صرف عقل کو جذبات سے برتر سمجھنے کے ہیں۔ اعلیٰ جذبات کو ادنیٰ پر ترجیح دینا اس میں داخل نہیں۔ کیا اس لفظ کا مفہوم صرف معقول لوگوں سے اتحاد عمل کرنا اور صبر سے کام لینا ہے نامعقول لوگوں سے قطع تعلق کرنا اور نامعقول چیزوں سے اکتا جانا اس میں نہیں آجاتا۔ کیا وسعت نظر سے مراد صرف یہی ہے کہ عالمگیر برادری کا نام رٹا جائے اور عالمگیر انصاف کو دل سے بھلا دیا جائے" بین الاقوامیت" کی تسبیح پڑھی جائے اور بین الاقوامی مساوات کا بھولے سے نام نہ لیا جائے؟ کیا قوموں کو "تاریخ" کے امتحان کی تیاری کے لئے فوری فرائض سے آنکھ بند کر لینا جائز ہے؟ ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں اور انصاف کا تقاضا ہر شخص سے اس میں یونیورسٹی کے والس چانسلروں کے لئے کوئی استثنا نہیں یہی ہے کہ دونوں پہلوؤں کو دکھائے۔

اگر پروفیسر سرکار کو یہ منظور تھا کہ "قومیت" کی واقعی برائیوں کی طرف توجہ دلائیں تو ان کا فرض تھا کہ پہلے اس کی اچھائیوں کا ذکر کر دیں۔ یہ یک طرفہ تقریر لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ پروفیسر صاحب ایک بے تعصب عالم کی حیثیت سے مسند درس پر جلوہ افروز نہیں بلکہ ایک سیاسی پارٹی کے رکن کی حیثیت سے پلیٹ فارم پر قومی تحریک کے خلاف تقریر کر رہے ہیں۔

دار المصنفین کے موقر رسالہ معارف اکتوبر ۱۹۳۰ء میں تلخیص و تبصرہ کے عنوان سے حضرت ابراہیم کے شہر اُور کے حالات میں یہ فقرہ لکھا گیا ہے۔

"عربی زبان کے بعض قدیم خرافات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ریگستانی آندھی نے قوم عاد کے

شہر کو برباد کر دیا۔

عربی زبان کی سب سے قدیم بلکہ سب سے پہلی کتاب قرآن مجید ہے جس میں بار بار تصریح کے ساتھ یہی کہا گیا ہے کہ قوم عاد آندھی کے عذاب سے ہلاک ہوئی۔ سورۂ الحاقہ میں ہے

وَاَمَّا عَادٌ فَاُہْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ الآیہ

معارف نے جو اسلام اور اسلامی علوم کی حمایت کا مدعی ہے اس فقرہ کو شائع کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ وہ کس کو خرافات قرار دے رہا ہے۔

اس کہنے سے کہ یہ ایک "غیر مسلم" کے مضمون کا خلاصہ ہے اس سنگین جرم کی نوعیت میں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اگر وہ کافر تھا تو تم تو مسلمان ہو۔

مدیر معارف مولوی سید سلیمان صاحب کی بےخبری میں اگر یہ فقرہ چھپ گیا ہے تو بھی اس کی مسؤلیت سے وہ بری نہیں ہو سکتے اور اگر انہوں نے دیکھ بھال کر شائع کیا ہے تو ذمہ داری اور بھی سخت ہے۔

فان کنت لاتدری فتلک مصیبۃ وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

جرمنی کے بہترین

یعنی

دنیا کے بہترین ٹائپ



"بجو"

کے سفری ٹائپ رائٹر کا جدید ترین نمونہ
جو سہولتیں اس مشین میں ہیں کسی دوسرے ٹائپ رائٹر
میں نہیں۔ نہایت خوبصورت پائدار وزن کل ۴ سیر
قیمت انگریزی:- مبلغ مالـــہ - اردو مبلغ للعـــہ

آئیڈیل

اسی کارخانہ کی بڑی مشین دفتر کے لئے اسے رکھئے
اور اپنے دفتر کی کارکردگی میں ۵۰ فیصدی اضافہ کیجئے
قیمت انگریزی مبلغ مائـــۃ
" اردو مبلغ اسا



جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۰

بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۵ع

نمبر ۶

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ - ڈی

جلد ۱۵	بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

تعلیم جدید

فن تعلیم پر موجودہ زمانے کی بہترین تصانیف کو پڑھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے نظریہ میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے تعلیم کے دو بڑے مصلح لوک (Locke) اور روسو (Rousseau) گزرے ہیں۔ دونوں کی شہرت حق بجانب ہے کیونکہ دونوں نے اپنے زمانے کی بہت سی عام غلطیوں کو مسترد کیا۔ لیکن ان میں سے ایک نے بھی اپنے خیال کو اس حد تک نہیں پہنچایا جہاں تک موجودہ زمانے کے تقریباً تمام ماہرین تعلیم پہنچے ہیں۔ مثلاً دونوں اس تحریک کے حامی ہیں جو آزاد خیالی اور جمہوریت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن دونوں نے اپنے پیش نظر محض ایک متمول اور اونچے خاندان کے لڑکے کی تعلیم کو رکھا ہے جس کے لئے ایک شخص اپنی تمام زندگی وقف کر دیتا ہے۔ خواہ اس طریقہ تعلیم کے نتائج کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، کوئی شخص موجودہ زمانے کی ذہنیت لئے ہوئے اس پر سنجیدگی سے غور کرے گا کیونکہ محض تعداد کا حساب لگانے سے یہ بات مہمل معلوم ہوتی ہے کہ ہر بچہ ایک معلم کے تمام وقت پر حاوی ہو جائے اس لئے یہ نظام تعلیم محض ایک ایسی جماعت میں رائج ہو سکتا ہے جس کو خاص حقوق اور مراعات حاصل ہوں ایسے نظام تمدن میں جس کی بنا عدل ہو، اس کا وجود ناممکن ہے۔ ممکن ہے کہ موجودہ زمانے کا ہر شخص عملاً اپنے بچوں کے لئے خاص فوائد اور آسائشوں کا متلاشی ہو۔ لیکن اس کے نزدیک اس مسئلہ کا حل اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ایسا طریقہ تعلیم رائج نہ ہو جو سب کے لئے کھلا ہو یا کم از کم ان سب کے لئے جن میں اس سے مستفید ہونے کی صلاحیت ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ خوش حال لوگ، موجودہ صورت حال ہی میں ان تمام تعلیمی مواقع اور فوائد سے دستکش ہو جائیں جو اس وقت سب لڑکوں کو حاصل نہیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ تمدن کو انصاف پر قربان کر دیا جائے لیکن

میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم مستقبل کے لئے جس نظام تعلیم کے رواج کو اپنا منتہائے نظر بنائیں وہ ایسا ہو کہ ہر لڑکے اور لڑکی کو بہترین مواقع حاصل ہوں۔ بہترین نظام تعلیم جمہوری نظام ہونا چاہئے۔ گو یہ فوراً ممکن الحصول نہیں۔ اس بات کو آج کل سب لوگ تسلیم کرلیں گے۔ اس معنی میں، میں جمہوریت کو پیش نظر رکھوں گا۔ میں جس چیز کی تعریف کروں گا اس میں صلاحیت ضرور ہو گی کہ وہ عام اور عالمگیر ہو سکے، اگرچہ افراد کو یہ نہیں چاہئے کہ اپنے بچوں کو مروجہ خرابیوں کا شکار بننے دیں اگر ان میں اتنی دانشمندی اور موقع ہے کہ وہ انکے لئے کوئی بہتر صورت پیدا کرسکیں۔ لیکن لوک اور روسو کی تصنیفات میں سے جمہوریت کی یہ ابتدائی شکل بھی مفقود ہے اگرچہ روسو امرا Aristocracy کے نظام کا قائل نہ تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ اس کی مخالفت سے تعلیم کے میدان میں لازماً کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

تعلیم اور جمہوریت کے مسئلہ میں صراحت کی بہت ضرورت ہے۔ سب کو بالکل یکساں حالت پر لانے کی کوشش انسانی ترقی کے لئے مہلک ہے۔ بعض لڑکے اور لڑکیاں دوسروں سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بعض استادوں کی تعلیم دوسروں سے بہتر ہوتی ہے یا انکی فطری قابلیت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہر طالب علم کو یہی چند بہترین استاد تعلیم دیں۔ اگر اعلیٰ تعلیم تمام لوگوں کے لئے مناسب بھی ہو، اور مجھے اس امر میں شبہ ہے، تب بھی یہ ناممکن ہے کہ موجودہ صورت حال میں سب اس کو حاصل کرسکیں۔ اس لئے اگر جمہوریت کے اصول پر آنکھیں بند کرکے عمل کیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلیگا کہ کوئی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرے۔ اگر اس رائے کو قبول کر لیا جائے تو سائنس کی ترقی کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور آج سے ایک سو برس بعد تعلیم کا عام بہت کم ہو جائے گا۔ اس وقت ترقی کو محض ایک بے جان مساوات کی خاطر قربان نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں تعلیمی جمہوریت کی طرف بہت احتیاط سے قدم اٹھانا چاہئے تاکہ اس کے حصول کی کوشش میں ان قیمتی نتائج کو ہاتھ سے نہ کھو بیٹھیں جو اس وقت معاشرتی ناانصافی کے ساتھ منسلک ہیں۔

لیکن ہم کسی طرح اس طریقۂ تعلیم کو قابل اطمینان نہیں سمجھتے جس کو عالمگیر نہیں بنایا جاسکتا۔ ذی ثروت گھرانوں کے بچے، علاوہ اپنی ماں کے، ایک دایہ یا ایک خادمہ اور بالعموم باقی تمام نوکروں کی خدمات سے

فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے اس قدر خدمت اور توجہ کی ضرورت ہے جو کسی نظام معاشرت میں بھی، سب بچوں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ بات بہت مشکوک ہے کہ احتیاط سے پرورش پائے ہوئے بچوں کو دوسروں کی ضرورت سے زیادہ محتاج بن کر واقعاً کوئی فائدہ ہوتا بھی ہے یا نہیں لیکن بہر حال کوئی خیر پسند شخص بھی محض چند لوگوں کے لئے خاص مراعات کو جائز نہیں سمجھتا۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی خاص وجہ ہو مثلاً دماغی کمزوری یا غیر معمولی ذہانت۔ موجودہ زمانے میں دانشمند والدین جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنے بچوں کے لئے کوئی ایسا طریقہ تعلیم منتخب کرتے ہیں جو فی الواقع سب کے لئے عام نہیں۔ اور تجربہ کی خاطر اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کو نئے طریقوں کو آزمانے کی آزادی اور مواقع ہوں لیکن وہ منہاج تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ اگر اس سے عمدہ نتائج مترتب ہوں تو اس کو سب کے لئے عام کر دیا جائے، ایسا نہیں جو بنفسہ محض چند خوش قسمت لوگوں کے لئے مخصوص ہو۔

حسن اتفاق سے زمانہ حال کی نظری اور عملی تعلیم کے بعض عمدہ ترین عناصر کا آغاز جمہوری حیثیت سے ہوا ہے مثلاً میڈم مانٹسوری نے اپنا کام شہر کے بدترین محلوں کے "نرسری سکولوں" سے شروع کیا۔ اعلیٰ تعلیم میں غیر معمولی قابلیت کے طلبہ کے لئے خاص مواقع بہم پہنچانے لازمی ہیں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں کہ کسی بچے کو بھی ایک ایسے نظام تعلیم سے نقصان پہنچے جو سب کے لئے موزوں ہو۔

زمانہ حال کی تعلیم میں ایک اور تحریک (رجحان) ایسی ہے جس کا تعلق جمہوریت سے ہے۔ لیکن اس میں شبہ کی زیادہ گنجائش ہے یعنی تعلیم کو بجائے "نمائشی" بنانے کے زیادہ "کارآمد" بنایا جائے۔ ویبلن (veblen) نے اپنی کتاب Theory of the leisure class. (بے کار جماعت کا نظریہ) میں بہت دقت نظر کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ "نمائشی" (Ornamental) چیزوں کا طبقہ امرا (aristocracy) سے کیا تعلق ہے۔ لیکن ہمیں اس جگہ اس تعلق کے محض تعلیمی رخ سے بحث ہے۔ مردوں کی تعلیم میں یہ مسئلہ "قدیم ادبی" (classical) اور "جدید" تعلیم کی بحث کی شکل اختیار کرتا ہے۔ عورتوں کی تعلیم میں یہ اس حیثیت کا جزو ہے کہ عورتوں کو تعلیم دے کر "شریف" (Gentlewomen) بنایا جائے یا ان کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ اپنی مدد آپ کر سکیں۔ لیکن عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ مساوات صنفی کی خواہش کی وجہ سے بالکل بگاڑ دیا گیا ہے۔ لوگوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ عورتوں کو وہی تعلیم دی جائے جو لڑکوں کو دی جاتی ہے خواہ وہ تعلیم

بذات خود اہمیت ہے۔ اس لئے خود معلمات کا یہی مقصد رہا ہے کہ لڑکیوں کو اس قسم کے "بے قاعدہ" علوم پڑھائیں جو بے سمجھے چم جماعت لڑکوں کو پڑھائے جاتے ہیں، اور انھوں نے اس خیال کی سخت مخالفت کی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم میں کچھ چیزیں ایسی ہونی چاہئیں جو انہیں ماں کے فرائض ادا کرنے کے لئے تیار کریں۔ اس قسم کے مختلف خیالات کی وجہ سے یہ تحریک جس کا میں ذکر کر رہا ہوں عورتوں کی تعلیم میں اس قدر واضح نہیں ہے اگرچہ (Fine Lady) کی ترتیب کے نصب العین کا زوال اس رجحان کی بہت نمایاں مثال ہے۔ مسئلہ کی وضاحت کے خیال سے میں فی الحال محض مردوں کی تعلیم کا ذکر کروں گا۔

بہت سے تعلیمی مباحث جن میں بہت سے اور مسئلے پیدا ہوتے ہیں ایک حد تک ہمارے اسی سوال پر منحصر ہیں۔ لڑکے زیادہ تر ادبیات (literature) کی تعلیم حاصل کریں یا سائنس کی؟ علاوہ اور وجوہات کے ایک وجہ یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ ادبیات زیادہ تر "نمائشی" ہیں اور سائنس مفید۔ کیا بچوں کی تعلیم کو جلد سے جلد کسی پیشہ یا تجارت کی تعلیم میں منتقل ہو جانا چاہئے؟ یہاں بھی زیبائش اور افادے کی بحث برمحل ضرور ہے لیکن فیصلہ کن نہیں۔ کیا بچوں کو صحیح تلفظ اور تقریر اور عمدہ آداب مجلس سکھانے چاہئیں یا یہ محض "امرا" کی زندگی کے تکلفات ہیں۔ کیا آرٹ کا مذاق، آرٹسٹ کے علاوہ اور کسی شخص کے لئے کوئی وقعت رکھتا ہے؟ کیا ہجوں کو تلفظ کا تابع ہونا چاہئے؟ یہ اور اس قسم کی اور بہت سی بحثیں ایک حد تک مفید اور نمائشی تعلیم کی بحث کا جزو ہیں۔

تاہم میرا خیال ہے کہ یہ تمام بحث سرے ہی سے بے حقیقت ہے۔ جوں ہی ہم الفاظ کے معنی معین کرتے ہیں، بحث ختم ہو جاتی ہے اگر ہم "کارآمد" کے وسیع معنی لیں اور "نمائشی" کو محدود معنوں میں استعمال کریں تو "کارآمد" کی فتح ہے۔ اگر اس کا برعکس کریں تو دوسرے فریق کو کامیابی ہوتی ہے۔ اس لفظ کے وسیع ترین اور صحیح ترین معنی میں، ہر عمل اس وقت "کارآمد" یا "مفید" ہوتا ہے جب اس کے نتائج اچھے ہوں۔ اور ان نتائج کو "مفید" کے علاوہ کسی اور معنی میں "اچھا" ہونا چاہئے ورنہ یہ "مفید" کی صحیح تعریف ہی نہیں ہوتی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ مفید عمل وہ ہے جس کے نتائج مفید ہوں یا

"مفید ہونے" کا اصل منشا یہی ہے کہ وہ کسی ایسے نتیجہ کو پیدا کرتا ہے جو محض "مفید" ہی نہیں بعض دفعہ نتائج کے ایک لمبے سلسلہ کی ضرورت ہے قبل اس کے کہ ہم اس آخری نتیجہ پر پہنچیں جس کو دراصل "اچھا" کہا جاسکتا ہے۔ ہل مفید ہے کیونکہ وہ زمین کو کھودتا ہے۔ لیکن زمین کھودنا بجائے خود کوئی مفید کام نہیں۔ وہ اس لئے مفید ہے کہ اس کی وجہ سے بیج بوئے جاسکتے ہیں۔ یہ اس لئے مفید ہیں کہ اناج پیدا ہوتا ہے جو اس لئے مفید ہے کہ آدمی کو زندہ رکھتا ہے۔ لیکن زندگی میں کوئی قدر واقعی ہونی چاہئے۔ اگر وہ محض کسی دوسری زندگی کے لئے ایک وسیلہ ہو تو وہ ہرگز مفید نہ ہوگی۔ زندگی حسب حالات اچھی یا بری ہوسکتی ہے۔ اس لئے اگر وہ اچھی زندگی کا وسیلہ ہو تو مفید ہوسکتی ہے۔ غرض کہیں نہ کہیں ہمیں ان پیہم فوائد کے سلسلے سے نکل کر کوئی ایسی چیز تلاش کرنا چاہئے جس میں یہ زنجیر لٹکائی جاسکے ورنہ زنجیر کی کسی کڑی میں بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

جب "مفید" کی تعریف اس طرح کی جائے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تعلیم کو مفید ہونا چاہئے یا نہیں۔ یقیناً تعلیم کو مفید ہونا چاہئے کیونکہ تعلیم کا عمل مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ لیکن ان لوگوں کا جو مفید تعلیم کے حامی ہیں صرف یہی مطلب نہیں۔ انکا اصرار تو اس امر پر ہے کہ تعلیم کا نتیجہ مفید ہونا چاہئے صاف صاف الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہے کہ تعلیم یافتہ آدمی وہ ہے جو مشینیں بنانا جانتا ہے اگر ہم یہ پوچھیں کہ مشینوں کا کیا فائدہ ہے تو اسکا بالآخر یہی جواب ہوگا کہ وہ جسمانی ضروریات اور آرائش کے لئے بنائی جاتی ہیں مثلاً خوراک، لباس، مکان وغیرہ، اس طرح یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ "مفید" تعلیم کے حامی اس معنی میں قابل اعتراض ہیں کہ وہ محض جسمانی ضروریات کو قابل قدر سمجھتے ہیں۔ انکے نقطہ نظر سے "مفید" چیز وہ ہے جو ہماری جسمانی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرے۔ اگر اسکا یہی مقصد ہے تو مفید تعلیم کا حامی یقیناً غلطی پر ہے اگر وہ اس رائے کو بطور تعلیم کے مقصد اعلیٰ کے بیان کرتا ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ بطور ایک سیاست داں کے اس کی یہ رائے ایسی صورت حال میں درست ہو جب کہ دنیا میں بہت سے لوگ فاقہ کشی کر رہے ہیں، کیونکہ اس وقت جسمانی ضروریات کی تشفی اور سب چیزوں سے زیادہ فوری توجہ کی محتاج ہے۔

بحث کے دوسرے رُخ پر غور کرنے کے لئے بھی اسی تجزیہ کی ضرورت ہے۔ دوسرے فرض کو "نمائشی" کہنے سے خود بخود "مفید تعلیم" کے حامیوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ کیونکہ "آرائش" یا زیور

کو عموماً ایک سطحی چیز سمجھا جاتا ہے۔ لفظ "نمائشی" کا استعمال اس تصور کے لئے بالکل حق بجانب ہے جو ہمیشہ "شریف مرد" یا "شریف خاتون" کا سمجھا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے "شرفا" ایک مہذب لہجہ میں گفتگو کرتے تھے، مناسب موقعوں پر ادب عالیہ سے عبارتوں کا حوالہ دیتے تھے فیشن کے مطابق لباس پہنتے تھے، آداب مجلس سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ کس موقع پر ڈوئل (Duel) لڑنے سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوگا۔ Rape of the Lock میں ایک شخص کا ذکر ہے۔

"اپنی عنبر کے رنگ کی بلاس دانی پر فخر کرتا تھا اور اپنے جھڑا و بید کی عمدگی پر"۔

اس شخص کی تعلیم نہایت محدود معنی میں "نمائشی" ہوئی تھی۔ اور ہم میں سے شاید کوئی بھی آمادہ و تسند نہیں جو ان کمالات پر قانع ہو سکے۔ "نمائشی تعلیم" کا مدعا، پرانے معنوں میں "امرائی تعلیم تھا۔ اس کے لئے یہیں سے یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ایک جماعت ایسی ہے جس کے پاس کافی دولت ہو اور اسے کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ میں بڑے بڑے "جنٹلمین" اور "لیڈروں" کا ذکر پر لطف معلوم ہوتا ہے۔ ان کی سوانح اور انکے دیہاتی مکانات سے ہمیں ایک قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے جو ہم اب اپنی اولاد کے لئے مہیا نہیں کرتے۔ لیکن ان کی خوبیاں جب وہ واقعی بھی ہوتی تھیں، بہت اعلیٰ نہ تھیں۔ اور بہرکیف ان پر بے حساب خرچ ہوتا تھا۔ ہوگارتھ (Hogarth) کی کتاب "گن لین" (Gin Lane) سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے لئے سوسائٹی کو کس قدر قربانیاں اور صرف کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں کوئی شخص بھی اس قسم کی "نمائشی" تعلیم کی حمایت نہ کرے گا۔

لیکن دراصل یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔ اصل بحث یہ ہے کہ آیا ہمیں تعلیم دیتے ہوئے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ دماغ کو ایسے علوم سے بھر دیا جائے جو براہ راست عملی طور پر مفید ہوں یا اس قسم کا دماغی سرمایہ بہم پہنچانا چاہئے جو بذات خود اچھا ہو؟ یہ علم کہ ایک فٹ میں بارہ انچ ہوتے ہیں اور ایک گز میں تین فٹ مفید ہے۔ لیکن یہ نفسہٖ مفید نہیں۔ ان ملکوں میں جہاں پیمائش کے لئے میٹرک سسٹم استعمال کیا جاتا ہے یہ علم بالکل غیر مفید ہے۔ ہیملٹ کے ڈراما کے مطالعہ اور محاسن شناسی سے عملی زندگی میں

کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا سوائے اس شاذ صورت کے جب کوئی شخص بچے کو قتل کرنے پر آمادہ ہو۔ لیکن اس سے انسان کو ایک ایسی دماغی ملک حاصل ہوتی ہے جس سے محروم ہونا قابل افسوس ہے اور جو اس کو ایک معنی میں زیادہ عمدہ اور بہتر انسان بناتا ہے۔ وہ شخص جو فائدہ کو تعلیم کا واحد مقصد نہیں سمجھتا اسی قسم کے علم کو ترجیح دیتا ہے۔

تعلیم اور اس کے مخالفوں کی بحث میں تین مختلف اور بڑے بڑے مسائل الجھے ہوئے ہیں پہلے تو امرا اور جمہوریت پسندوں کا مباحثہ ہے۔ اول الذکر تو یہ چاہتے ہیں کہ حاکم جماعت کو اپنی اپنی مرضی کے مطابق فرصت کے اوقات بسر کرنا سکھایا جائے اور محکوم جماعت کو اس قسم کی محنت کرنی سکھائی جائے جو دوسروں کے لئے مفید ہو۔ جمہوریت پسند اس کی مخالفت کرنے میں صفائی اور وضاحت سے کام نہیں لیتے۔ ایک طرف وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ امرا کو ایسی چیزیں سکھائی جائیں جو بے فائدہ ہیں اور دوسری طرف ان کو اس بات پر اصرار ہے کہ مزدوروں کی تعلیم صرف مفید چیزوں تک محدود نہ ہو۔ اس لئے جہاں ہم پبلک سکولوں کی قدیم وضع کی ادبی تعلیم کی مخالفت پاتے ہیں وہاں دوسری طرف جمہوریت پسندوں کا یہ تقاضا ہے کہ مزدوروں کو لاطینی اور یونانی سیکھنے کے موقعے دئے جائیں۔ یہ طرز خیال، اگرچہ نظری حیثیت سے کسی قدر مبہم ضرور ہے، لیکن عملاً یہ بالکل درست ہے۔ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیں، ایک کارآمد دوسرا نمائشی، اس لئے انکی خواہش ہے کہ ان لوگوں کو جو اب تک محض نمائشی رہے ہیں زیادہ کارآمد علوم پڑھائے جائیں اور ان جماعتوں کو جو محض کارآمد ہیں زیادہ دلچسپ اور پر لطف علوم کی تعلیم دی جائے لیکن جمہوریت، بذات خود اس بات کا فیصلہ نہیں کرتی کہ ان دونوں اجزا کو کس تناسب سے تعلیم میں شامل کیا جائے۔

دوسری بحث ان دونوں فریقوں میں ہے جن میں سے ایک محض مادی ساز و سامان کا خواہاں ہے اور دوسرا دماغی لطف اندوزی کا۔ بہت سے خوش حال انگریز اور امریکن لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کو جادو کے زور سے الزبتھ کے عہد میں منتقل کردیا جائے تو ان کی یہی خواہش ہوگی کہ وہ دوبارہ اس

زمانے میں آجائیں شیکسپیر اور راسکے اور سر فلپ سڈنی کی محبت، عمارتوں کی خوبصورتی موسیقی کی نفاست وغیرہ انکے موجودہ زمانے کے حمام خانوں، چائے اور قہوہ، موٹر کاروں اور آسائش کی چیزوں کا بدل نہیں ہوسکتیں جن سے اس زمانے میں لوگ محروم تھے۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے بجائے اس کے کہ قدیم زمانے کی روایات انکے خیالات کو متاثر کریں اگر تعلیم کا اصلی مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مختلف قسم کی چیزیں بنائی جائیں ممکن ہو کہ وہ طب اور علم حفظان صحت کو اپنے نصاب میں شامل کرلیں لیکن انکے لئے ادب اور آرٹ اور فلسفے میں کوئی کشش نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نشاۃ ثانیہ Renaissance کے ادبی نصاب پر جو حملہ کیا گیا اس کے محرک زیادہ تر یہی لوگ ہوئے۔

میرے خیال میں یہ ناانصافی ہوگی کہ ہم اس خیال کی مخالفت میں محض یہ دعوے پیش کردیں کہ دماغی سرمایہ مادی چیزوں سے زیادہ قیمتی اور قابل قدر ہے۔ یہ دعوے صحیح ضرور ہے لیکن پوری صداقت پر حاوی نہیں۔ کیونکہ اگرچہ مادی اشیاء کی بذات خود کوئی بڑی قیمت نہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مادی خرابیاں اور نقائص اس قدر مضر اور تکلیف دہ ہوسکتے ہیں کہ بہت سی دماغی خوبیاں انکا بدل نہیں ہوسکتیں۔ فاقہ کشی اور بیماریاں، اور انکا ہر وقت کا خوف بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد پر اس وقت سے حاوی رہا ہے جب سے انسانوں میں پیش بینی کی قابلیت پیدا ہوئی۔ بہت سے پرندے بھوک سے مرجاتے ہیں لیکن جب خوراک کافی ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں کیونکہ ان کو مستقبل کی فکر نہیں۔ برخلاف اس کے وہ کاشتکار جو ایک قحط کی مصیبت سے زندہ بچ گئے ہیں ہمیشہ اس کی یاد اور اس کے اندیشے کا شکار رہتے ہیں۔

انسان اس بات پر راضی ہو کہ محض قوت مالایموت کی خاطر ہر روز گھنٹوں محنت کرے تاکہ فاقہ کشی کی موت سے محفوظ رہے لیکن حیوان شکم پوری کرنا چاہتے ہیں جب کبھی انہیں خوراک میسر ہو خواہ اس کا نتیجہ موت ہو۔ اس لئے موجودہ صورت حال یہ ہو کہ اکثر لوگ ایک بالکل محروم مسرت زندگی پر صابر ہیں کیونکہ اس کے علاوہ اور کسی طرح کی زندگی ان کو نصیب ہی نہیں ہوسکتی لیکن اب صنعت و حرفت سے

انقلاب اور اس کے دور رس نتائج کی وجہ سے پہلی مرتبہ یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی دنیا کو وجود میں لایا جائے جہاں ہر شخص کو خوشی اور آرام سے زندگی بسر کرنے کا ایک معقول موقع حاصل ہوگا۔ اگر ہم چاہیں تو جسمانی اور مادی تکالیف کو بہت کم کر سکتے ہیں۔ نظم و انتظام اور سائنس کی مدد سے یہ ممکن ہے کہ دنیا کی تمام آبادی کے لئے قیام و طعام کا سرانجام ہو سکے۔ یہ نہیں کہ ہر شخص عیش کی زندگی بسر کر سکے بلکہ اس حد تک کہ کوئی بہت تکلیف اور مصیبت نہ اٹھائے۔ بیماری کا دفعیہ ممکن ہے اور کہنہ امراض کو بہت شاذ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آبادی کے اضافہ کو پیداوار کی زیادتی کے ساتھ متناسب رکھا جائے۔ وہ بڑے بڑے خوف جو نسل انسانی کے غیر شعوری دماغ پر ہمیشہ سے حاوی رہے ہیں اور جن کی وجہ سے ظلم اور سختیاں اور جنگیں وقوع میں آئی ہیں، اس قدر کم کئے جا سکتے ہیں کہ ان کی کوئی اہمیت نہ رہے۔ یہ سب چیزیں انسانی زندگی کے لئے اس درجہ اہم ہیں کہ ہم ہرگز اس تعلیم کی مخالفت نہیں کر سکتے جو ان کی تحصیل کا وسیلہ ہو سکے۔ اس قسم کی تعلیم میں عملی سائنس ایک جزو اعظم ہوگی۔ ہم اپنے "جہان نو" کی تعمیر طبیعیات اور نفسیات اور عضویات کے بغیر نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ہم اس میں لاطینی اور یونانی، ڈانٹے اور شیکسپیر، باخ اور موزارٹ کو کوئی جگہ نہ دیں۔ کارآمد تعلیم کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ میں نے اس پر بہت زور دیا ہے کیونکہ میں اس کا شدومد سے حامی ہوں۔ تاہم اس مسئلہ کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ فرصت اور صحت حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہے اگر ہم ان کا صحیح استعمال کرنا نہ جانیں؟ مادی خرابیوں کے خلاف اس شدت سے جنگ نہیں کرنی چاہیے (بلکہ کوئی جنگ بھی نہیں کرنی چاہیے) کہ لوگ امن اور صلح کے فنون کو بھول جائیں یا ناکارہ ہو جائیں۔ دنیا میں جو چیزیں خیر مطلق ہیں ان کو شر کے خلاف جنگ کرنے میں ضائع نہیں کر دینا چاہیے۔

اب میں اس بحث کے تیسرے مسئلہ پر آتا ہوں۔ کیا یہ درست ہے کہ محض بیکار علم در اصل قابل قدر ہوتا ہے؟ کیا درست ہے کہ کوئی علم بھی جو بذات خود قابل قدر ہے بے کار ہو؟ میں نے اپنی جوانی میں کافی عرصہ لاطینی اور یونانی کی تحصیل میں صرف کیا ہے۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ وہ بالکل ضائع ہوا۔ اس ادبی تعلیم نے مجھے ان مسائل کے حل میں مطلق مدد نہیں دی جن سے مجھ کو بعد کی زندگی میں دوچار ہونا پڑا

میری ادب قدیم سے واقفیت معمولی طالب علموں کی طرح کبھی اس قابل نہیں ہوا کہ ان سے مطالعہ سے لطف اندوز ہو سکوں میں نے بعض ایسی چیزیں ضرور سیکھیں جیسے مثلاً یہ کہ "duplex" کا ماحصل مصدر کیا ہے اور یہ میں اب تک نہ بھول سکا! اس قسم کے علم میں بس اتنی ہی قدر قدرتی ہے جتنی اس امر میں کہ ایک گز میں تین فٹ ہوتے ہیں۔ اور مجھے اس سے مطلق کوئی فائدہ نہیں ہوا سوائے اس کے کہ میں نے اس کو اس مثال میں استعمال کیا ہے۔ برخلاف اس کے میں نے سائنس اور ریاضی میں جو کچھ سیکھا وہ میرے لئے نہ صرف عملاً بہت مفید ہوا ہے بلکہ اس کی قدر ذاتی بھی بہت بڑی ہے۔ کیونکہ اس سے مجھ کو غور و فکر کے لئے موضوع حاصل ہوئے۔ اور اس ناقابل اعتبار دنیا میں حقیقت کی جانچ کے لئے ایک کسوٹی ہاتھ آئی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک ذاتی ذوق کا معاملہ ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ادب قدیم سے مستفید ہونے کی صلاحیت اور طبیعت آجکل کے لوگوں میں اور بھی زیادہ شاذ ہے۔ فرانس اور جرمنی کا ادب بھی قابل قدر ہے ان کی زبانیں آسانی سے سیکھی جا سکتی ہیں۔ اور عملاً مختلف طریقوں سے مفید ہیں۔ اس لئے لاطینی اور یونانی کے مقابلے میں فرانسیسی اور جرمنی زبانوں کی تحصیل صریحاً زیادہ ضروری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے علوم کی اہمیت کو کم کروں جو براہ راست عملی طور پر کارآمد نہیں۔ لیکن ہم یقیناً جائز طور پر یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے علوم سوائے ان لوگوں کے جو ان میں خاص مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور سب کو اس طرح پڑھائے جائیں کہ ان پر محض وسائل کے حصول مثلاً گرامر سیکھنے میں بہت زیادہ وقت اور محنت نہ صرف ہو۔ انسانی علم کا ذخیرہ اور انسانی مسائل کی پیچیدگی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے ہر نسل کو اپنے منہاج تعلیم پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ تاکہ وہ اپنی تعلیم میں نئی اور ضروری چیزوں کے لئے جگہ نکال سکے۔ ہمیں باہمی داد و ستد کے ذریعے جدید و قدیم میں توازن قائم رکھنا چاہئے۔ تعلیم کے "انسانی" (humanistic) عناصر کو قائم رکھنا چاہئے لیکن ان کو اس قدر سادہ بنا دینا چاہئے کہ دوسرے عناصر کے لئے جگہ نکل سکے جن کے بغیر اس جہان نو کی تعمیر ناممکن ہے۔ جس کی ایک جھلک ہم کو سائنس نے دکھائی ہے۔

میں یہ خیال بعید از کار نہیں جانتا کہ تعلیم کے "انسانی عناصر" کا دائرہ "عناصر" سے کسی طرح کم اہم نہیں اگر تخیل کی زندگی کو پوری نشو و نما دینی ہے تو ادب عالیہ تاریخ عالم موسیقی اور نقاشی اور فن تعمیر سے ایک حد تک واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور محض تخیل کی بدولت ہی انسان اس امر سے آشنا ہوتا ہے کہ دنیا کیا سے کیا بن سکتی ہے اس کے بغیر "ترقی" محض بے جان اور عملی ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن سائنس بھی تخیل کو ابھار سکتی ہے۔ جب میں نوعمر تھا تو میرے تخیل کو وسعت اور پرواز دینے میں علم ہیئت اور علم الارض نے بہت زیادہ مدد کی بہ نسبت انگلستان، فرانس اور جرمنی کے ادب کے جن کے بہت سے اعلیٰ ترین نمونے میں نے بغیر کسی دلچسپی کے استادوں کی زبردستی سے پڑھے تھے۔ تاہم یہ بھی ایک ذاتی معاملہ ہے۔ کسی طالب علم کو ایک ماخذ سے تحریک ہوتی ہے۔ کسی کو دوسرے ماخذ سے۔ میں صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ بالعموم جب کسی مضمون کو حاصل کرنے کے لئے ایک مشکل فن یا اصطلاحی واقفیت کو حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو یہ بہتر ہوگا کہ وہ مضمون کارآمد ہو۔ سوائے اس صورت کے جب خاص مہارت حاصل کرنے والے طالب علموں کی تعلیم مدنظر ہو یورپ کے "نشاۃ ثانیہ" کے دور میں جدید زبانوں ادب عالیہ کا کوئی بڑا ذریعہ نہ تھا۔ لیکن اب ان میں اعلیٰ ادب موجود ہے۔ اب یونانی کی تہذیب عالیہ سے وہ لوگ متاثر ہو سکتے ہیں جو یونانی نہیں جانتے اور نہ ہی رومن تہذیب سوا اس کی میرے نزدیک کوئی بڑی قدر نہیں۔ اس لئے میرے خیال میں اُن لڑکوں اور لڑکیوں کو جن میں ادبی تعلیم کے لئے کوئی خاص میلان اور قابلیت نہیں ہے خالص اعلیٰ اور انسانی مضامین اس طرح پڑھانے چاہئیں کہ ان میں بہت وقت اور ذرائع کی ضرورت نہ ہو۔ بعد کے سال عموماً سائنس اور ریاضی کی مشکل تعلیم کے لئے وقف ہونے چاہئیں لیکن جہاں کہیں فطری قابلیت کا رجحان کسی اور جانب ہو اس کا احترام کرنا چاہئے۔ کیونکہ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اٹل آہنی قاعدے نہ بنائے جائیں۔

اب تک ہم اس امر سے بحث کرتے رہے ہیں کہ تعلیم کا نصاب کیا ہونا چاہئے۔ اب میں ان مسائل کی طرف رجوع کرتا ہوں جن کا تعلق کچھ تو طریقۂ تعلیم سے ہے اور کچھ اخلاقی تعلیم اور سیرت

کی بحث ہے یہاں ہمیں سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ نفسیات اور اخلاق سے بحث ہے
ابھی کچھ عرصہ پہلے تک نفسیات کو لوگ محض ایک نظری علم سمجھتے تھے اور اس کا عملی زندگی کے معاملات
سے کچھ واسطہ نہ تھا لیکن اب یہ صورت حال نہ رہی۔ مثلاً اب نفسیات صنعت و حرفت علیحدہ ہے
نفسیات امراض علیحدہ ہے۔ نفسیات تعلیم علیحدہ ہے۔ اور ان سب کو بہت عملی اہمیت حاصل ہے۔ ہمیں امید
ہوتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہماری زندگی کے اداروں پر نفسیات کا بیش از بیش اثر پڑیگا
کم از کم تعلیم پر اس کا جو زبردست اثر پڑا ہے وہ بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

سب سے پہلے ہم ضبط (ڈسپلن) کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ ضبط کا تصور جو پرانے زمانے
میں رائج تھا وہ بہت سیدھا سادھا تھا۔ بچہ کو کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دیا جاتا تھا جو
اسے ناپسند ہوتا، یا کسی ایسے کام سے روکا جاتا تھا جو اسے مرغوب ہوتا۔ اگر وہ حکم عدولی کرتا
تو اس کو یا تو جسمانی سزا دیجاتی یا، آخری حربہ کے طور پر، محض روٹی اور پانی پر تنہا قید رکھا جاتا
مثلاً آپ The Fairchild Family میں وہ باب پڑھیئے جس میں بتایا گیا ہے کہ ننھے ہنری
کو لاطینی زبان کس طرح پڑھائی گئی۔ ان کو یہ بات سمجھائی گئی کہ وہ اس وقت پادری نہیں بن سکیگا
جب تک لاطینی نہ سیکھے گا لیکن باوجود ان وسیع دلائل کے بچہ نے اسقدر دل لگا کر اس پر محنت
نہیں کی جتنا کہ اس کا باپ چاہتا تھا۔ پس اس کو ایک تنگ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ کھانے کے لئے
اس کو محض روٹی اور پانی دیا گیا۔ اور بہنوں سے بات چیت کی ممانعت کر دی گئی اور ان کو کہدیا
گیا کہ تمہارے بھائی کو ذلیل کیا گیا ہے تم اس سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔ پھر بھی ایک بہن نے اسے
کھانا لاکر دیا۔ خادم نے اس کی شکایت کر دی۔ اور اس کو بھی سرزنش کی گئی۔ کچھ عرصہ تک قید
میں رہنے کے بعد دکھایا جاتا ہے، لڑکے کو لاطینی سے شغف ہوگیا۔ اور وہ بہت زیادہ جانفشانی
سے کام کرنے لگا۔ اس کا مقابلہ چیخوف کی کہانی سے کیجئے جس میں اس نے اپنے چچا کا قصہ
بیان کیا ہے جس نے کوشش کی تھی کہ ایک بلی کے بچے کو چوہے پکڑنا سکھائے بلی کے بچے کے
کمرے میں ایک چوہا لاکر چھوڑ دیا لیکن اس کی شکار کی جبلت ابھی تک پختہ نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے

اس نے چوہے کی طرف کوئی توجہ نہیں اس پر اس نے بلی کے بچے کو خوب مارا۔ اگلے دن پھر یہی قصہ پیش آیا۔ اور بہت دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر پروفیسر صاحب کو یقین ہو گیا کہ وہ بچہ بالکل احمق ہے اور اس کو تعلیم نہیں دیجا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ بلی کا بچہ بڑا ہوا تو اگرچہ اور سب لحاظ سے یہ دوسری بلیوں کی طرح تھا مگر جب کبھی کسی چوہے کو دیکھتا تو خوف کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا اور بھاگ جاتا۔ چیوف آخر میں کہتا ہے کہ مجھے بھی بلی کے بچے کی طرح میرے چچا ہی نے لاطینی پڑھائی تھی"۔ ان دونوں کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ضبط کے کیا معنی لئے جاتے تھے اور اب اس کے خلاف کیا ردعمل ہوا ہے۔

لیکن جدید مسلم یہ نہیں چاہتا کہ ضبط کو بالکل ترک کر دے۔ وہ اس کے لئے نئے طریقے اختیار کرتا ہے۔ اس موضوع پر ان لوگوں کو بہت غلط فہمی ہوتی ہے جنھوں نے جدید طریقوں کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ میں ہمیشہ یہی سمجھا کرتا تھا کہ میڈم مونٹسوری بغیر کسی ضبط کے کام چلاتی ہیں۔ اور مجھ تعجب ہوتا تھا کہ وہ کیسے ایک پورے کمرے کے بچوں کا انتظام کرتی ہوں گی۔ جب میں نے ان کے طریقوں کا خود نوشتہ حال پڑھا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کے نظام تعلیم میں ضبط کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اور اس کے ترک کرنے کی متعلق کوشش نہیں۔ جب میں نے اپنے بچے کو صبح کے وقت کے لئے ایک مونٹسوری اسکول بھیجنا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی عادات زیادہ منتظم اور تربیت یافتہ ہو گئی ہیں۔ اور وہ بخوشی اسکول کے قواعد کی پابندی کرنے لگا لیکن اسے کسی بیرونی دباؤ کا مطلق احساس نہ تھا۔ اسکول کے قواعد ایسے ہی ہیں جیسے کھیل کے قواعد اور ان کی تعمیل اپنی خوشی اور آرام کے لئے کیجاتی ہے۔ پرانا خیال یہ تھا کہ ناممکن ہے کہ بچے خود کچھ سیکھنے کی کوشش کریں۔ اس لئے انہیں خوف دلا کر پڑھنے پر مجبور کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ خیال محض طریقہ تعلیم سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا۔ اگر نصاب کو موزوں مدارج میں تقسیم کیا جائے مثلاً لکھنا پڑھنا وغیرہ۔ تو ہر جز ایک معمولی بچے کو خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ اور جب بچے اپنے پسندیدہ کاموں میں مشغول ہوں تو

بیرونی دباؤ کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ بچہ اس قسم کے چند سیدھے سادے قاعدے کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کہ اسے دوسرے بچوں کے کاموں میں خوامخواہ دخل نہیں دینا چاہئے۔ ایک وقت میں ایک آلہ استعمال کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ قاعدے مناسب ہیں۔ اس لئے ان پر عمل کرانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس طرح بچے میں ضبط نفس پیدا ہوتا ہے جس میں کچھ تو اچھی عادتیں شامل ہیں۔ اور کچھ یہ عملی احساس کہ مستقل اور دیرپا فائدہ کے لئے وقتی میلان کو روکنا فہترین مصلحت ہے۔ یہ سب کو ہمیشہ سے معلوم ہے کہ کھیلوں میں اس قسم کا ضبط نفس سیکھنا آسان ہے لیکن مدت تک لوگوں کو یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوا کہ تحصیل علم کو بھی اس قدر دلچسپ بنایا جا سکتا ہے کہ یہی صلاحیت اس میں وجہ تحریک بنجائے۔ اب ہمیں یہ معلوم ہے کہ ایسا کرنا ممکن ہے اور ایسا ہو کر رہے گا نہ صرف چھوٹے بچوں کی تعلیم میں بلکہ تعلیم کی ہر منزل میں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آسان کام ہے۔ اس تعلیمی مسئلے کو دریافت کرنے کے لئے غیر معمولی ذہانت درکار ہے۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے استادوں میں غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے صحیح قسم کی تعلیم کی اور کافی صبر اور ہمدردی کی ضرورت ہے جو بالعموم استادوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کا بنیادی اصول بالکل صاف اور صریح ہے یعنی یہ کہ صحیح ضبط بیرونی دباؤ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ایسی دماغی عادتوں اور تربیت یافتہ میلانات سے حاصل ہوتا ہے۔ جو خود بخود برے کاموں کے بجائے پسندیدہ اعمال کی رغبت دلائیں۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ اب تک ایسے تعلیمی طریقوں کو معلوم کرنے میں جو اس خیال پر مبنی ہیں کس قدر کامیابی ہوئی ہے۔ اس کے لئے میڈم مونٹسوری ہر طرح مبارکباد کی مستحق ہیں۔

تعلیمی طریقوں کی تبدیلی پر اس بات کا بہت اثر پڑا ہے کہ لوگوں کو اب انسان کے فطرتاً آلودہ گناہ ہونے کا اعتقاد نہیں رہا۔ پرانا خیال جواب تقریباً بالکل ترک کیا جا چکا ہے یہ تھا کہ ہم سب "غضب الٰہی کے مستحق" اور مورد پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہماری فطرت میں بدی

بھری ہوئی ہے ہم میں اسوقت تک نیکی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک نہ ہم مستحق رحمت الٰہی ہوجائیں اور یہ تبدیلی زیادہ سرعت کے ساتھ ہوتی ہے. اگر بچہ کو اکثر سزا دیتے رہیں! موجودہ زمانہ کے اکثر لوگوں کو یقین ہی نہیں آسکتا کہ ہمارے آبا واجداد کی تعلیم پر اس خیال کا کس قدر گہرا اثر پڑا تھا. ڈین سٹینلی نے جو ڈاکٹر آرنلڈ کی سوانح عمری لکھی ہے اس سے ان کے خیال کی تصحیح ہوجائے گی. یہ ڈاکٹر آرنلڈ کے ایک محبوب شاگرد تھے. ان کو .Tom Brown's schooldays کا نہک ہیرو آرمعتبر سمجھنا چاہئے. وہ میرے عزیز تھے. اور انہوں نے بچپن میں مجھے "ویسٹ منسٹر ایبے" (Westminster Abbey) کی سیر کرائی تھی. ڈاکٹر آرنلڈ ہمارے ہاں کے پبلک سکولوں کا مصلح اعظم تھا جن کو انگلستان کی مخصوص عظمت وشان کا مظہر سمجھا جاتا ہے. اور جو اب بھی ان ہی کے اصولوں کے مطابق چلائے جاتے ہیں. اس لئے ڈاکٹر آرنلڈ کے ذکر کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ماضی بعید کا ذکر ہے. ان کا ذکر گویا....... ایسے اصولوں کا ذکر ہے جو اب بھی اونچی جماعتوں کے انگریزوں کی تربیت پر حاوی ہیں. ڈاکٹر آرنلڈ نے بید سے پیٹنے کے قاعدے کو بہت کم کردیا. اور اس کو محض چھوٹے بچوں کے لئے جائز رکھا. اور جیسا کہ ہمیں اس کے سوانح نگار نے بتایا ہے. وہ اس کو صرف "اخلاقی جرائم مثلاً جھوٹ، شراب نوشی اور پختہ کاہلی" کی سزا کے طور پر استعمال کرتے تھے. لیکن جب ایک آزاد خیال اخبار نے یہ رائے ظاہر کی کہ بید سے سزا دینا. ایک ایسی توہین اور ذلت ہے جس کو یک قلم موقوف کردینا چاہئے. تو ان کو نہایت غصہ آیا. انہوں نے اسکا اخبار کے ذریعہ جواب دیا:

"مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ تحریک کس جذبہ کا اظہار ہے. اس کی ابتدا آزادی ذات کے اس مغرور تصور سے ہوتی ہے جو خلاف عقل اور خلاف شرع عیسوی ہے. اور جس کا اصلی سرچشمہ بربریت ہے پہلے ایک مرتبہ عہد شجاعت کی لعنتوں کے ساتھ یورپ پر نازل ہوئی تھی. اور اب دوبارہ مفسد راہوں کی آفات کی ہم کو دھمکی دیتی ہے...... ایک ایسے زمانے میں جب گناہ اور قصور کرنے پر مردانہ وار احساس تقصیر و ذلت تقریباً مفقود ہے. یہ کہاں تک قرین عقل ہے

کہ لوگوں میں یہ عجیب غریب خیال پھیلایا جائے کہ جسمانی سزا ہتک آمیز ہے؟ اس سے زیادہ اور کیا چیز انسانی مزاج کے اس عجز وانکسار ،بنجیدگی اور سادگی کی مخالف اور باطل کرنیوالی ہو سکتی ہے جو عیسائی مذہب کا بہترین زیور اور زمانہ طویل کی بہترین ضامن ہیں؟"

اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ان کے معتقدین کے شاگرد جو پبلک سکولوں میں تعلیم پاکر نکلتے ہیں ہندوستان کے باشندوں کو چابکوں سے مارنا جائز سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے مزاج میں "عجز وانکسار" کی کمی ہو ا

ایک اور عبارت ہے جس کا کچھ حصہ مسٹر سٹریچی نے اپنی کتاب "عہد وکٹوریہ کے مشاہیر" (Eminent Victorians) میں نقل کیا ہے۔ لیکن وہ اسقدر برمحل ہے کہ میں اس کو نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر آرنلڈ تعطیلات میں وطن سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اور کومو (Como) کی جھیل کے خوبصورت نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کی اس لطف اندوزی نے جو شکل اختیار کی وہ اس خط سے ظاہر ہے جو انھوں نے وہاں سے اپنی بیوی کو لکھا تھا۔

" اپنے گرد وپیش کی حیرت میں ڈالنے والی خوبصورتی کو دیکھنا۔ اور پھر اخلاقی عیوب کو خیال کرنا کس قدر دہشت انگیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان کوئی وسیع خلیج حائل نہیں جو ان کو جدا کرتی ہو۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل متصل ہیں بلکہ ہم میں سے ہر ایک کے نہایت قریب ہیں۔ خدا کرے اخلاقی بدی کا احساس بھی مجھ میں اتنا ہی مستحکم ہو جتنی حسن فطرت سے میری لطف اندوزی۔ کیونکہ خدا کا علم جو نجات کا باعث ہے۔ ہم سب سے زیادہ بدی کے گہرے احساس میں پوشیدہ ہے۔ اخلاقی خوبیوں کو سراہنا کافی نہیں۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ہم ایسا کریں اور پھر بھی خود اس پر کاربند نہ ہوں۔ لیکن اگر ہم بدی سے دراصل نفرت کرتے ہیں، نہ ان لوگوں سے جو بد ہیں، بلکہ اس بدی سے جو ان میں سرایت کر گئی ہے، اور سب سے زیادہ یقین اور صراحت کے ساتھ اس بدی سے جو خود ہمارے دلوں میں ہے، تو اس وقت ہم میں خدا اور عیسیٰ مسیح کے جذبات ہوں گے اور ہماری روح خدا کی روح کے ہم آہنگ ہو گی۔ لیکن یہ دیکھنا اور کہنا کتنا آسان ہے اور اس کو کرنا اور

اس کا احساس رکھنا کتنا مشکل ہے ان سب باتوں کا کون اہل ہے؟ کوئی نہیں سوائے اس شخص کے جو اپنی نا اہلیت کو محسوس کرتا ہے اور اس پر رنجیدہ ہوتا ہے......"

کس قدر دردناک ہے یہ منظر کہ یہ مرد شریف جو طبعاً نیک دل ہے، اس غضب ناک کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس حالت میں بے دھڑک بچوں کو زدوکوب کرتا ہے۔ اور پھر یہی خیال ہے کہ وہ محبت کے مذہب پر عامل ہے۔ اگر ہم اس فریب خوردہ شخص کا خیال کریں تو ہمیں افسوس اور ہمدردی ہوتی ہے۔ لیکن یہی بات رنج اور اندوہ کا باعث ہے۔ اگر ہم یہ خیال کریں کہ اس نے دنیا میں "اخلاقی برائیوں" کے خلاف یہ فضا پیدا کر کے کسقدر بیرحمانہ سلوک کا طریقہ رائج کر دیا۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان "اخلاقی برائیوں" میں اس کے نزدیک وہ سستی اور کاہلی بھی شامل ہے جو بچوں میں عادت بنجائے۔ میں یہ خیال کر کے کانپ اٹھتا ہوں کہ دنیا میں نیک اور انصاف پسند لوگ کس قدر جنگوں اور مظالم اور سختیوں میں اس غلط فہمی سے شامل ہوئے ہیں کہ وہ "اخلاقی برائیوں" کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ مگر غنیمت ہے کہ اب معلم بچوں کو "شیطانی فتنے" نہیں سمجھتے۔ بالغوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے۔ خصوصاً مجرموں کے ساتھ، اس میں اب بھی اس خیال کو بہت دخل ہے لیکن بچوں کی پرورش گاہوں اور مدرسے سے یہ تصور بالکل خارج ہو گیا ہے۔

ایک اور غلطی ہے جو ڈاکٹر آرنلڈ کی غلطی کے بالکل برعکس ہے۔ یہ اسقدر مضرت رساں تو نہیں لیکن حقیقت امر کے لحاظ سے غلطی ہی ہے یعنی یہ یقین کہ بچے فطرتاً نیک ہوتے ہیں اور محض بڑوں کی خرابیاں دیکھکر خراب ہوتے ہیں۔ اس روایت کا سلسلہ روسو (Rousseau) تک پہنچتا ہے۔ ممکن ہے کہ نظری طور پر اس کا یہ خیال ہو لیکن جو شخص اس کی کتاب ایمل (Emile) کو پڑھے گا اسکو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں طالب علم کو بہت کافی اخلاقی تربیت کی ضرورت ہے قبل اس کے کہ وہ ایسا مجموعۂ کمالات بن سکے جیسا کہ اس تعلیم کا مقصد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بچے فطرتاً نہ "نیک" ہوتے ہیں نہ "بد"۔ وہ محض چند جبلتیں اور (Reaflexes) لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اور انہی میں سے رفتہ رفتہ، ماحول کے اثر سے، عادتیں پیدا اور مستحکم ہوتی ہیں جو ممکن ہے عمدہ ہوں ممکن ہے خراب

ان عادات کا انحصار زیادہ تر ماں اور دایہ کی دانشمندی پر ہے۔ کیونکہ ابتدا میں بچہ کی فطرت بہت آسانی سے ساتھ اثر پذیر ہوتی ہے۔ بچوں کی بہت بڑی تعداد میں ایک عمدہ شہری بننے کا ملکہ بھی ہے۔ اور مجرم بننے کا مادہ بھی۔ نفسیات کے محقق اصول کی رو سے نیکی کی تعلیم دینے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ ہفتہ میں چھ دن زدوکوب کرتے رہو۔ اور اتوار کے دن وعظ و تلقین کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس مقصد کے حصول کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ ہمیں شبلہ کے اس خیال سے خوامخواہ اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ پہلے زمانے کے معلم بچوں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے تھے ورنہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنے عرصہ تک کیوں ان پر بے ضرورت سختی کرتے رہے۔ ایک صحت مند بچہ کو خوش رکھنا کچھ مشکل بات نہیں۔ اور اگر بچوں کے جسم اور دماغ کی صحیح طور پر پرورش کی جائے۔ تو ان میں سے اکثر کی صحت اچھی رہے گی۔ بہترین نمونے کے انسان پیدا کرنے کیلئے یہ بالکل لازمی ہے کہ بچوں کی زندگی خوش و خرم گذرے۔ اگر بچے یہ محسوس کریں کہ وہ اپنی تعلیم کے ذریعے ایسی باتیں سیکھ رہے ہیں جو ان کے لئے مفید اور قابل قدر ہیں تو ان میں سستی کی وہ عادت نہ پڑ سکی جسے کہ ڈاکٹر آرنلڈ ایک قسم کی "اخلاقی خرابی" شمار کرتے تھے۔ لیکن اگر ان کو جو علوم پڑھائے جائیں وہ بیکار ہوں۔ اور پڑھانے والے بیرحم جابر معلوم ہوں تو بچوں کا رویہ قدرتاً ایسا ہی ہوگا جیسا چوت کے افسانے میں بلی کے بچے کا ہر نئی بات کے سیکھنے کی طبعی خواہش کو جو ہر معمولی بچہ میں ہوتی ہے۔ اور ان کی چلنے اور بولنے کی کوشش میں ظاہر ہوتی ہے تعلیم میں قوت محرکہ بنانا چاہیئے۔ ہمارے زمانے کی ایک بڑی تعلیمی ترقی یہی ہے کہ ہم نے بید کے بجائے اس خواہش کو حصول علم میں قوت محرکہ بنایا ہے۔

اب میں اس آخری امر پر آتا ہوں جس کا تعلیمی تحریکات کے اس ابتدائی بیان میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یعنی زمانہ طفلی پر زیادہ توجہ۔ اس کا بہت قریبی تعلق اس تبدیلی سے ہے جو کیرکٹر کی تربیت کے متعلق ہمارے خیال میں ہوئی ہے۔ قدیم خیال یہ تھا کہ نیکی کا انحصار قوت ارادی پر ہے۔ یہ فرض کیا جاتا تھا کہ ہم بری خواہشات بھری ہوئی ہیں۔ اور ہم ان کو

ایک گا تم بالذات قوت یعنی قوت ارادی کے ذریعہ قابو میں رکھتے ہیں۔ یہ صریحاً نا ممکن سمجھا جاتا تھا کہ بری خواہشات کی بیخ کنی ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ ان کو قابو میں رکھیں۔ صورت حال بالکل ایسی ہی تھی جیسی پولیس اور مجرم کے تعلقات میں ہوتی ہے کوئی شخص یہ نہ سمجھتا تھا کہ سوسائٹی کا وجود بغیر مجرموں کے ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی باقاعدہ اور کارکن پولیس موجود ہو کہ اکثر لوگ جرم کرنے سے خوف کھائیں اور جو چند مجرم ہوں ان کو پکڑ لیا جائے۔ اور قرار واقعی سزا دیجائے۔ موجودہ زمانے کے ماہرین جرائم جو نفسیات سے واقف ہیں اس خیال پر قانع نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جرم کرنے کا میلان اکثر صورتوں میں مناسب تعلیم کے ذریعے روکا جا سکتا ہے۔ اور جو بات سوسائٹی کے لئے درست ہے وہی افراد کے لئے درست ہے۔ بچوں کو بالخصوص خواہش ہوتی ہے کہ ان کے ساتھی اور ان کے بڑے ان کو پسند کریں۔ ان کے میلانات بالعموم ایسے ہوتے ہیں کہ ماحول کے اثر سے، ان کی اچھی یا بری سمت میں تربیت کی جا سکتی ہے، علاوہ بریں اس عمر میں ان کے لئے نئی عادات حاصل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور اچھی عادتیں بہت سے نیک کاموں اور باتوں کو جزو طبیعت بنا دیتی ہیں۔ برخلاف اس کے پرانی قسم کی "نیکی" جو بری خواہشات کو اپنے حال پر چھوڑ دیتی ہے اور محض ان کے اظہار کو روکنے کے لئے قوت ارادی کو کام میں لاتی تھی۔ برے چال چلن کو روکنے اور اس پر قابو رکھنے کے لئے قابل اطمینان ذریعہ ثابت نہیں ہوئی، بری خواہشات مثل اس دریا کے جس کو بند کر دیا گیا۔ کوئی دوسرا طریقہ اظہار نکال لیتی ہے جو قوت ارادی کی نظر سے اوجھل ہوتا ہے۔ وہ شخص جس نے جوانی کے زمانے میں اپنے باپ کے قتل کی خواہش کی ہوگی۔ آئندہ چلکر اپنے بیٹے کو زدوکوب کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں اخلاقی عیوب کی بیخ کنی کر رہا ہوں۔ وہ نظریے جو بیرحمی کو جائز قرار دیتے ہیں بالعموم کسی ایسی خواہش سے پیدا ہوتے ہیں جس کو قوت ارادی نے اس کے قدرتی راستہ سے ہٹا کر زمین دوز کر دیا ہے۔ اور وہ پھر کسی ناقابل شناخت شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً گناہ سے نفرت یا کوئی اور بظاہر قابل احترام جذبہ۔ لہذا قوت ارادی کے ذریعے

بری خواہشات کو دبانا اگرچہ بعض موقعوں پر ضروری ہوتا ہے. لیکن وہ نیکی کے حصول کا کارگر ذریعہ نہیں.

یہ بحث ہم کو تحلیل نفسی کے میدان کی طرف لیجاتی ہے تحلیل نفسی کی تفصیلات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو مجھے ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں اور ان کے لئے کافی شہادت موجود نہیں۔ لیکن اس کا عام منہاج عمل میرے خیال میں بہت اہم ہے اور اخلاقی تربیت کے صحیح طریقوں کی دریافت، اس کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس علم کے بہت سے ماہر زمانہ طفلی کو جو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں وہ میرے نزدیک مبالغہ سے خالی نہیں. ان کی گفتگو سے یہ خیال ہوتا ہے کہ تین برس کی عمر تک بچہ کی سیرت بالکل قطعی طور پر پختہ ہوجاتی ہے. لیکن یہ واقعہ نہیں۔ تاہم یہ مبالغہ قابل معافی ہے کیونکہ ان کی نیت بخیر ہے۔ زمانہ ماضی میں نفسیات اطفال کی طرف سے غفلت کی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جو خالص عقلی اور دماغی طریقے رائج تھے۔ ان کی وجہ سے نفسیات اطفال کیطرف توجہ کرنا ہی ناممکن تھا۔ مثلاً نیند کو لیجئے۔ سب ماؤں کی خواہش ہوتی ہے کہ بچہ سوئے کیونکہ یہ صحت اور آرام دونوں کے لئے مفید ہے۔ انہوں نے بچوں کو سلانے کا ایک طریقہ نکال لیا ہے۔ یعنی جھولے کو ہلانا اور لوریاں دینا لیکن جب مردوں اس مسئلہ پر تحقیق کی نظر سے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ بالکل ہی غلط ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ کبھی کبھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن اس سے بُری عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہر بچہ کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی ناز برداری کی جائے کیونکہ اس سے اس کے احساس خودی کو تقویت ہوتی ہے۔ اگر وہ یہ محسوس کرلے کہ نہ سونے سے لوگ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں تو وہ بہت جلد یہ طریقہ اختیار کرلے گا۔ اس کا نتیجہ صحت اور سیرت دونوں کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہاں بڑی چیز ہے کہ صحیح عادات کی بنا پڑے یعنی نیند کا تعلق چارپائی کے ساتھ قائم کیا جائے۔ اگر یہ لازمی تعلق مناسب طور پر قائم ہوگیا ہے تو بچہ ہرگز پلنگ پر لیٹ کر نہیں جاگے گا سوائے اس کے کہ وہ بیمار ہو یا اور کوئی تکلیف ہو۔ لیکن اس تعلق کو پیدا کرنے کے لئے ایک حد تک ضبط کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات محض بچوں کی ناز برداری سے حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ اس سے تو

جاگنے کا تعلق آرام اور خوشی کے جذبات کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ دوسری اچھی اور بری عادتوں کی ساخت میں بھی انہیں امور کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ سارا علم ابھی تک اپنی ابتدائی حالت میں ہے۔ لیکن اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور آیندہ چلکر اور زیادہ ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کیریکٹر کی تربیت پیدائش ہی کے وقت سے شروع ہو جانی چاہئے۔ اور اس کے لئے جاہل ماؤں اور دائیوں کی بہت سی باتوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ باقاعدہ تعلیم اس وقت سے پہلے شروع ہوسکتی ہے جس کا پہلے خیال تھا کیونکہ اس کو خوشگوار بنایا جاسکتا ہے۔ اور بچہ کی قوت تو یہ پر زد نہیں پڑتا۔ ان دونوں باتوں کو لحاظ نظریہ تعلیم میں گذشتہ چند سال کے اندر اندر ایک انقلاب عظیم برپا ہوگیا تھا۔ اور اس کے اثرات بہت مفید ثابت ہوئے ہیں اور آیندہ زمانہ میں ان کا نفع اور زیادہ معلوم ہوگا۔ اس لئے میں ابتدا میں تفصیل کے ساتھ اس بات پر بحث کروں گا کہ بچپن میں سیرت کی تربیت کس طرح کی جائے اور پھر اس کے بعد بڑی عمر کی تعلیم کا ذکر کروں گا۔

آثارِ عرب

یعنی مشرقی اور مغربی ممالک میں عربوں کی مشہور تعمیر کردہ شہر اور عمارتیں
زمانہ جاہلیت سے لیکر عہد اسلام ۸۹۷ھ ۱۴۹۲ء تک

ماخذ: مناجۃ الطرب فی تقدمات العرب، معجم البلدان، نفح الطیب، آثار الاندلس، اندلس کا تاریخی جغرافیہ (اردو) مرتبہ محمد عنایت اللہ صاحب بی اے ناظم شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

عربوں نے فن تعمیر میں اس قدر ترقی کی اور یہ فن ان کی وجہ سے اسقدر مشہور ہوا کہ آج ایشیا نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی عرب اس فن کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ جس قدر خوبصورتی اور مضبوطی عربوں کی عمارتوں میں پائی جاتی ہے دنیا کے کسی قوم کا فن تعمیر اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا، یہی نہیں بلکہ عربوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں جس قدر شہر آباد کئے نہریں کھدوائیں اور رفاہ عام کے کام کئے کسی قوم کا بلند سے بلند تمدن بھی اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتا، آج ہمارے پیش نظر صرف عربوں کے تعمیر کردہ شہر اور عمارتوں کا نقشہ ہے، ہم اس فن پر کسی قسم کی بحث نہیں کرسکتے بلکہ عربوں نے ایام جاہلیت اور اسلام میں جتنی عمارتیں تعمیر کیں۔ شہر آباد کئے، ان کی تعداد اور ان کی خصوصیات مجملاً بیان کریں گے، اس فن پر بحیثیت فن کے حکمار نے بہت کافی بحث کی ہے اور ہمارے لئے صرف یہی کام ہو کہ ان کی فہرست پیش کردیں،

اس مضمون میں ان شہروں کی تعداد اور عمارتوں کا بیان جہانتک ہماری ناچیز معلومات کا تعلق ہے کرتے ہیں۔ اس مضمون کی ترتیب میں ہمیں سب سے زیادہ نوفل

آفندی الطرابلسی کی کتاب مناجتہ العرب فی تقدمات العرب سے مدد ملی ہے اور اگر ہمیں ان کی کتاب نہ ملتی تو یہ کام ہماری طاقت سے باہر تھا۔ بہر حال جوہوں نے اپنی ترقی کی چھ سات منزل میں جو کچھ کیا ہم ان کو ایجازاً پیش کرتے ہیں



ایام جاہلیت کی تعمیرات

مدینہ مارب مورخین ذکر کرتے ہیں کہ اس شہر کو عبدالشمس نے آباد کیا جس کا لقب "سبا" تھا، یہ شہر زیادہ تر "سبا" ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ یمن کا دارالسلطنت تھا، مارب کے حکمرانوں میں سے ملکہ سبا بھی تھی جس کا نام "بلقیس" تھا، اور جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئی تھی، یہ شہر نہایت ہی قدیم ہے اور سد مارب کے ٹوٹنے سے قبل عربوں کا بہت بڑا مسکن رہا،

سد مآرب دو پہاڑوں کے درمیان ایک بہت بڑا بند تھا، چونکہ پہاڑوں سے پانی آکر مدینہ مآرب کو نقصان پہنچایا کرتا اس لئے یہ زبردست بند تیار کیا گیا، اس سے اور بھی زراعتی فائدے بھی تھے، ایک مدت تک یہ بند قائم رہا، اور آخر جس وقت یہ بند ٹوٹا ہے شہر کو سخت نقصان پہنچا، ملک یمن میں عام تباہی پھیل گئی، باشندوں نے ترک وطن کیا، اور عرب کے مختلف مقامات میں جا کر آباد ہوگئے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شکست سد مآرب ہی غیر آباد سرزمین عرب کی آبادی کا باعث ہوا،

مورخین کہتے ہیں کہ اس بند کو بھی عبدالشمس بانی مدینہ مآرب ہی نے بنوایا تھا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلکہ سبا نے بنوایا تھا، اور کچھ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ لقمان بن عاد نے بنوایا، اہل عرب سد مآرب کو عجائبات عالم میں سے شمار کرتے ہیں، اس کی تعمیر کی تاریخ صحیح طور پر معلوم نہیں

قصر خورنق

اس قصر کو ایک رومی کاریگر "سنمار" نے نعمان اکبر بن امرأالقیس لخمی کے لئے تعمیر کیا تھا یہ قصر کوفہ کی پشت پر واقع ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت اس کی تعمیر تکمیل کو پہنچ چکی، نعمان نے کاریگر کو ایک بلند مقام سے گرا کر مار ڈالا تاکہ کوئی دوسری عمارت اس کے مثل کوئی اور شخص تعمیر نہ کرا سکے، اسکا یہ واقعہ ضرب المثل بن گیا، چنانچہ کہا جاتا ہے "جوزی جزاء سنمار"

یعنی سنمار کا سا بدلہ دیا گیا،

اس واقعہ سے تیس سال بعد جبکہ ایک روز بادشاہ نعمان اکبر اپنے اسی محل میں بیٹھا تھا
اس نے اپنی تمام مال و دولت سامنے رکھکر دیکھی، نعمان اس منظر سے بہت متاثر ہوا اس نے کہا "کیا ہوگا،
جبکہ اس کے مالک غیر ہو جائیں گے" دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر
گیا، دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے، آخر نوبت باینجا رسید کہ ترک دنیا پر آمادہ
اس نے اپنے تمام خدمت گاروں سے کہا "تم لوگ اپنے اپنے گھر جاؤ" نصف رات گذر چکی
تھی، فضا میں بالکل سکون تھا، بادشاہ چپکے سے اٹھا، شاہی کپڑے اتار دئے، اور گیروے
رنگ کا ایک کرتہ پہن لیا، ایک معمولی کمل کاندھے پر رکھا اور اس قصر شاہی سے نکل کر جنگل کی راہ لی
پھر اسے کسی نے نہ دیکھا،

اس قصر کی خوبصورتی تمام عرب یمن میں مشہور تھی، ایک مشہور شاعر ایک واقعہ میں
کہتا ہے، ؎

فاذا انتشیت فاننی	رب الخورنق والسدیر
واذا صحوت فاننی	رب الشویھۃ والبعیر

یعنی جس وقت میں نشہ شراب میں سرشار ہوتا ہوں تو گویا میں قصر خورنق اور سدیر
کا بادشاہ ہوں، اور جسوقت نشہ اترا اور میں نے اپنے اوپر نظر ڈالی تو وہی اونٹ بکری والا
حافظ رحمۃ اللہ نے بھی کہا ہے ؎

چو بیخود گشت حافظ کے شمارد   بیک جو ملک کیکاؤس کے را

قصر سدیر

یہ بھی نعمان اکبر کا ایک محل تھا،

حصن الصنبر

یہ قلعہ امرأ القیس بن نعمان اعور کا بنوایا ہوا تھا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سنمار کا واقعہ

اسی سے متعلق ہے،

قصر غمدان

صنعاء یمن کے پشت پر بادشاہ شرحبیل بن عمر نے بنوایا تھا، یہ قصر نہایت ہی خوبصورت بڑا اور پائدار تھا، اس قصر کے سات حصے ہے، اس میں عجیب عجیب نادر چیزیں تھیں، اس کی تعمیر میں چار قسم کے پتھر لگے تھے، سرخ، سفید، زرد اور سبز، مکان کے ہر دو حصہ میں ۴۰ ستون لگے تھے، اسی قصر کو سیف بن ذی یزن نے لیا تھا،

مارد اور ابلق

یہ دونوں مشہور قلعے سموال بن عادیا غسانی عرب کے مشہور یہودی شاعر کے تھے جس کے فخریہ اشعار عرب کے بچہ بچہ کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے، سموال بن عاد اپنی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے "ابلق" کے بارے میں کہتا ہے ؎

لنا جبل الحیلۃ من نجیرہ　　منیف یرد الطرف وھو کلیل

رسا اصلہ تحت الثری وسما بہ　　الی النجم فرع لا ینال طویل

یعنی ہمارے پاس اسقدر مضبوط اور بلند قلعہ ہے کہ اس کی بلندی تک نگاہ نہیں کام کر سکتی، اس کی بنیاد تحت الثری میں ہے اور بلندی ایسی کہ گویا آسمان سے باتیں کر رہا ہے، ایں وہی شخص داخل ہو سکتا ہے جسے ہم پناہ دیں،

ملکہ زباء (جس کا واقعہ مشہور ہے) نے ایک بار ان کا محاصرہ کیا لیکن بے سود، ہزار کوشش کی لیکن فتح نہ کر سکی، عاجز آکر اس نے محاصرہ اٹھا لیا، اس نے کہا "تمرد مارد وعز الابلق" یہ جملہ بطور مثل مشہور ہو گیا،

صرح الغدیر

شاہان غسان کی یادگار تھی، ثعلبہ بن عمرو بن جفنہ غسانی نے بنوایا تھا، یہ قصر اطراف حوران میں واقع تھا،

قناطر، اذرح، قسطل

یہ سب جبلہ بن الحرث بن ثعلبہ کے بنوائے ہوئے تھے،

حفیر، مصغہ، قصر ابیر و معان

یہ بھی جبلہ بن الحرث کے تعمیر کردہ مکانات تھے

قصر الفضا، صفات العجلات، قصر منار

عمرو بن الحرث کے بنوائے تھے، نواح دمشق میں اس کی اکثر یادگاریں تھیں،

قصر سویدا، قصر حارب

نعمان بن عمرو کے بنوائے ہوئے تھے،

قصر برقع

اس قصر کو جبلہ بن الحرث نے ایک بڑے میدان میں تعمیر کرایا تھا،

جبلۃ الادہمیہ

جبلہ بن الایہم آخری غسانی تاجدار نے اس شہر کو آباد کرایا تھا، جبلۃ الایہم حضرت عمر بن الخطاب کے عہد میں موجود تھا، اور اسلام بھی لایا لیکن جب قیصر روم کے پاس گیا، تو عیسائی ہوگیا، شہر جبلہ (سلطان ابراہیم ادہم جو کہ ایک صوفی منش آدمی تھے) کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ یہ اسی شہر میں مدفون ہیں،

یہ سب ایام جاہلیت کی تعمیریں تھیں جن میں سے اکثر دست برد زمانہ سے فنا ہوگئیں بلکہ اب ان کے کھنڈر تک باقی نہیں،

عہد اسلامی کی مشہور عمارتیں اور شہر

باختلاف سرزمین ہم عہد اسلامی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مشرق، مغرب،

عربوں کی مشرقی عمارتیں اور شہر

ابتدائے اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بہت سی عمارتیں، مساجد، دارالامارۃ

بیت المال، قید خانے، اور مہمان خانے تعمیر کرائے گئے۔ یہ تعمیریں اسوجہ سے مشہور ہیں کہ عہد اسلامی کی سب سے پہلی تعمیریں تھیں، عہد فاروقی میں مساجد کی تعداد بقول صاحب روضۃ الاحباب چار ہزار تک پہنچ گئی تھی، حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عمال کو حکم دیا تھا کہ ہر ایک شہر اور گاؤں میں ایک ایک مسجد تعمیر کیجائے، یہ مساجد آج "جوامع عمری" کے نام سے مشہور ہیں، گو وہ اپنی اپنی اصلی حالت میں نہیں رہیں،

جامع اقصیٰ

عہد فاروقی کی یہ مشہور مسجد بیت المقدس میں عین اس جگہ واقع ہے، جسے "ہیکل سلیمان" کہتے ہیں، یہ مقام نہایت ہی متبرک ہے، حضرت عمرؓ نے اس جگہ خود اپنے دست مبارک سے مٹی ہٹائی تھی، اور مسجد کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا، اس کی محرابیں نہایت ہی خوبصورت ہیں، اس مسجد میں ایک نہایت ہی خوبصورت لکڑی کا منبر ہے جس میں ہاتھی دانت کا کام نہایت ہی عمدہ کیا گیا ہے، چونکہ یہ مسجد بہت ہی مشہور ہے اس لئے کسی تفصیل کی محتاج نہیں

"بصرہ"

عہد اسلامی کا یہ سب سے پہلا شہر ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آباد کرایا تھا، پہلے اس جگہ بالکل میدان تھا، اس کی آبادی کا سبب یہ ہوا کہ اہل فارس اور اہل ہند کے درمیان سلسلہ مواصلت منقطع کر دیا جائے، کیونکہ بندرگاہ "ابلہ" کے قریب خلیج فارس میں اہل ہند اور فارس کے جہاز لنگر انداز ہوا کرتے تھے، سیاسی حیثیت سے اس جگہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، ۱۴ھ میں عتبہ بن غزوہ اس کام کے لئے مقرر کئے گئے، شہر نہایت ہی قاعدہ کے ساتھ آباد کیا گیا، مربد بصرہ مشہور جگہ تھی، جہاں بڑے بڑے شعراء اور ادباء جمع ہوا کرتے تھے، اور شعر و سخن پر طبع آزمائی کرتے رہتے، بڑے بڑے آئمہ فن اس سرزمین میں پیدا ہوئے، اور اسی سرزمین میں محو خواب ہیں، اس شہر کی عظمت اگرچہ بہت بڑھی لیکن دار الخلافہ بننے کا شرف اسے حاصل نہ ہوا، تعجب تو یہ ہے کہ خلفاء نے ہمیشہ یہاں بہت ہی سخت سخت عمال دگورنر بھیجے، جیسے

حجاج بن یوسف، زیدبن ابیہ (امیہ)

کوفہ

اس شہر کو بھی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے بعض فوجی مصالح کی بنا پر آباد کیا تھا، اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ شہر کوفہ اس جگہ آباد کیا گیا جس کی آب و ہوا عربوں کے مزاج کے موافق حضرت سلمان اور حضرت حذیفہ نے جو کہ گویا محکمہ تعمیرات کے افسر تھے۔ اسکو حضرت عمر کے حکم سے آباد کرنا شروع کیا، نعمان بن منذر شاہ عرب کی اکثر عمارتیں اسی شہر کے گرد و نواح میں واقع تھیں، یہاں کی زمین نہایت ہی سرسبز و شاداب اور سرخ رنگ کی ہے، دریائے فرات سے صرف ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہے، عربوں نے اس شہر کو اسقدر پسند کیا کہ وہ اسے خد العذراء (رخسار دوشیزہ) کہنے لگے، اس شہر نے بصرہ سے زیادہ ترقی کی، ابتدا، یہاں کی آبادی فوجی تھی، لیکن بعد میں ترقی ہوئی اور یہاں بڑے بڑے آئمہ عصر گذرے، عہد فاروقی میں صحابہ اور تابعین کا ایک گروہ یہاں تعلیم و تعلم میں مصروف تھا،

اس کی آبادی ۱۷ھ میں شروع ہوئی، حضرت عمر شہروں اور عمارتوں کا نقشہ خود بھیجا کرتے تھے، چنانچہ حکم دیا کہ چالیس ہزار آدمیوں کے لئے مکان تعمیر کئے جائیں، ہر قبیلے کے مکانات جدا جدا ہوں، شارع عام چالیس چالیس ہاتھ چوڑی ہو، چھوٹی سڑکیں تیس تیس ہاتھ یا بیس ہاتھ، گلیوں کی چوڑائی سات ہاتھ، جامع مسجد ایک مربع چبوترہ پر تعمیر کیجائے جسمیں بیک وقت چالیس ہزار آدمی باجماعت نماز ادا کرسکیں، مسجد کے چاروں طرف ایک وسیع زمین چھوڑدی جائے،

جامع مسجد کے سامنے ذرا فاصلہ پر ایک دوسو ہاتھ لمبا سائبان بنوایا گیا جس کے ستون سنگ رخام کے تھے، یہ ستون نوشیرواں کی عمارتوں میں سے نکال کر لائے گئے تھے مسجد کے سامنے ذرا فاصلہ پر ایوان حکومت تعمیر کیا گیا تھا

فسطاط

فتح اسکندریہ کے بعد جتنے بھی یونانی وہاں آباد تھے، تمام نے ترک وطن کیا، حضرت عمرو بن العاص نے فاروق اعظم کو لکھا کہ یونانی مکانات چھوڑ کر چلے گئے، چونکہ دریائے نیل سامنے میں حائل تھا اسلئے حضرت عمر نے اسکندریہ کو صدر مقام بنا ناپسند نہ فرمایا، حضرت عمرو بن العاص اسکندریہ سے چلکر قصر الشم میں پھر واپس آئے، یہاں ان کا خیمہ اپنی اسی حالت میں موجود تھا، حضرت عمرو بن العاص وہیں ٹھہر گئے، اور ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جامع مسجد خاص اہتمام سے بنائی گئی، کہا جاتا ہے کہ اس کے قبلہ کی تعیین ۸۰ صحابہ نے کی، یہ مسجد ۵۰ گز لمبی اور ۳۰ گز چوڑی تھی، اس شہر نے بہت جلد ترقی کرلی، حضرت امیر معاویہ کے عہد میں ۴۰ ہزار اہل عرب کے نام درج رجسٹر تھے، مورخ قضاعی لکھتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں ۳۶ مسجدیں ۸ ہزار سڑکیں ۱۱۷۰ احمام تھے، علامہ بشاری تو اسے بغداد سے بھی بڑھا دیتے ہیں،

موصل

پہلے یہ مقام ایک معمولی گانوں کی حیثیت رکھتا تھا، یہاں ایک قلعہ اور چند عیسائیوں کے معبد تھے، اور بس، عہد فاروقی میں اس نے ایک عظیم الشان شہر کی صورت اختیار کرلی ہرثمہ بن عرفجہ نے سنگ بنیاد رکھا، سب سے پہلے ایک شاندار مسجد تعمیر کی گئی اور پھر باقاعدہ اس کے چاروں طرف قبائل عرب آباد کئے گئے یہ شہر سیاسی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا تھا کیونکہ یہی مشرق و مغرب کا دروازہ اور جائے اتصال ہے، اور غالبًا اسی مناسبت سے اس کا نام "موصل" رکھا گیا، یاقوت حموی صاحب معجم البلدان لکھتے ہیں کہ دنیا میں سیاسی حیثیت سے اہم ترین شہر تین ہیں، نیشاپور جو کہ مشرق کا دروازہ ہے، "دمشق" جو کہ مغرب کا دروازہ ہے، اور تیسرا موصل جو مشرق اور مغرب دونوں کا دروازہ ہے یعنی اگر کوئی شخص مشرق کیجانب یا مغرب کیجانب کہیں بھی جانا چاہے، اس کو یہاں سے ضرور گذرنا پڑے گا،

"جیزہ"

یہ چھوٹا سا شہر دریائے نیل کے غربی جانب فسطاط کے مقابل واقع ہے، عمرو بن العاص اسکندریہ کی فتح کے بعد جب فسطاط واپس آئے تو تھوڑی سی فوج حفاظت کے لئے یہاں رہنے دی، جب فسطاط آباد ہوا تو حضرت عمرو بن العاص نے ان لوگوں کو بلانا چاہا، لیکن ان لوگوں کو وہاں کا منظر اس قدر بھا گیا کہ اس مقام کا چھوڑنا پسند نہ کیا، آخر حضرت عمر کو اطلاع کی گئی، آپ نے مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجازت دیدی اور ساتھ ہی حکم دیا کہ وہاں اُن کی حفاظت کے لئے ایک قلعہ تعمیر کیا جائے ۲۲ھ میں قلعہ تعمیر ہو گیا، لیکن قبیلہ ہمدان نے کہا کہ "ہم نامردوں کی طرح قلعہ کی پناہ میں رہنا نہیں چاہتے، ہمارا قلعہ ہماری تلوار ہے" چنانچہ یہ لوگ قلعہ کے باہر ہی آباد ہو گئے، اور اس طرح یہ معمولی سی جگہ تھوڑے دنوں میں ایک بڑا مقام ہو گیا،

"عہد اموی"

اس عہد میں دمشق نے خاص ترقی حاصل کی تھی، اور درحقیقت خالص عربی تمدن اسی شہر میں پایا جاتا تھا، اور اپنے انتہائی ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے اسی شہر میں دفن بھی ہو گیا بغداد اور اندلس کے اسلامی تمدن کچھ کچھ تو ضرور خارجی اثر سے متاثر تھے،

جامع اموی

حضرت امیر معاویہ نے جب شام کو مرکز قرار دیا، اس حصہ ملک نے بہت ترقی کی، یہاں کی تلواریں مشہور تھیں، آبنوس پر ہاتھی کے دانت کا کام نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا سونے کے پانی کا کام ایسا اچھا ہوتا تھا کہ دنیا میں کہیں بھی ایسا عمدہ نہیں ہو سکتا تھا، کہا جاتا ہے کہ جب تیمور لنگ نے دھاوا مارا تو یہاں سے بہت سے صنعت گروں کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا،

ولید بن عبدالملک جب تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے ایک بے نظیر جامع مسجد کی بنیاد رکھی، جو کہ جامع اموی کے نام سے مشہور ہوئی، یہ مسجد ۵۰۰ فٹ لمبی اور ۵۰۰ فٹ چوڑی ہے،

اس میں بہت ہی بڑے بڑے مختلف رنگ کے پتھروں کے ستون لگائے گئے ہیں، اس کی چھت میں ۔۔ قیمتی قندیلیں سونے اور چاندی کی زنجیروں میں آویزاں تھیں، ماہ رمضان میں اس کی زینت دوبالا ہوجاتی، اس ماہ مبارک میں بارہ ہزار قندیلیں جلتی تھیں،

مسجد میں ائمہ اربعہ کے اعتبار سے چار محرابیں تیار کی گئیں۔ ۵، موذن بیک وقت اسکے تین بلند میناروں پر اذان دیا کرتے تھے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسکی تعمیر پر ۱۳۰ لاکھ دینار صرف ہوئے تھے یہ مسجد ۸۶ھ میں تعمیر ہوئی تھی، اور آج تک اپنی اسی شان وشوکت سے قائم ہے،

"رملہ"

سلیمان بن عبدالملک نے تعمیر کرایا تھا، القدس سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے،

رصافہ ہشام

ہشام بن عبدالملک نے بنوایا تھا،

ہاشمیہ

عبداللہ سفاح العباسی نے دولت بنی امیہ کے زوال کے وقت انبار کے قریب بنوایا تھا، جرہ کے بعد یہی مقام عبداللہ سفاح کا دارالسلطنت قرار پایا،

عہد عباسیہ

بغداد

یہ مقام دریائے دجلہ کے شرقی جانب آباد ہے، اسے مدینۃ السلام بھی کہتے ہیں، کیونکہ دجلہ کو بھی وادی السلام کہتے ہیں، اس شہر کو جعفر منصور عباسی نے ۱۴۵ھ میں باقاعدہ آباد کیا، اور دارالسلطنت بنایا، مورخین کہتے ہیں کہ یہاں ایک بت تھا جسے "بغ" کہتے تھے مشہور روایت یوں ہے کہ اہل فارس اس کی پرستش کرتے تھے، چنانچہ زندہ شخص اس بت کے نام پر چھوڑ سے جاتے، اور اس شخص کو "بغداد" یعنی "بغ کا عطیہ" کہتے تھے، یہ شہر اسی نام سے مشہور ہوگیا، اسی بناء پر فقہاء نے اس

نام کو مکروہ بتایا ہے،

آیندہ یہ شہر اہل اسلام کا مسکن و ماوی بنگیا، اور اس قدر ترقی کی کہ شاید ہی کسی شہر نے اتنی ترقی کی ہو۔ یہ شہر دولت عباسیہ کا مستقل دار الخلافہ رہا،

بغداد کے محلہ کرخ میں شاہی عمارتیں اور حکومتی دفاتر تھے، ابن زریق بغدادی کہتے ہیں

استودع اللہ فی بغداد لی قمرا ۔ بالکرخ من فلک الازرار مطلعہ

بغداد کا ایک محلہ رصافہ تھا، ہارون رشید نے یہاں شاہی عمارتیں تعمیر کرائیں، کرخ کے بعد یہ حصہ خوب آباد ہوا، یہانتک کہ دولت عباسیہ زوال پذیر ہوگئی،

خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ بغداد میں ہارون الرشید کے زمانے میں کبوتروں کی تعداد ۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی، یونان کا خزانۂ علم حکمت منتقل ہوکر سب سے پہلے یہاں آیا، اور اسی مقام سے ساری دنیا میں پھیلا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یونان کے دنیا کا سب سے پہلا دار العلم بغداد تھا،

"قصر عیسیٰ"

عیسیٰ بن علی بن عبداللہ بن عباس نے بنوایا تھا، ہاشمیوں کا یہ سب سے پہلا قصر تھا جو کہ انھوں نے بغداد میں تعمیر کرایا تھا، آج اس کے نشانات تک مٹ گئے۔

"قصر قیروان"

ابراہیم بن الاغلب نے اس شہر کو ۱۸۰ھ میں بنوایا، یہاں بنو الاغلب آباد تھے، یہاں ایک مسجد تھی اس میں ایک صومعہ تھا جو کہ اینٹ کا بنا ہوا چند ستونوں پر قائم تھا، اس کے سات طبقے تھے، یہ نہایت ہی مستحکم اور خوبصورت تھا، صاحب معجم البلدان کہتے ہیں لم یری احکم منھا ولا احسن منظرا۔ یعنی اس سے بڑھکر خوبصورت اور مستحکم عمارت کہیں نہیں دیکھی گئی،

دیگر بلاد

ہارون الرشید نے تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہی شہر ادنہ اور طرسوس کو از سر نو آباد کیا

جو کہ اسوقت تباہ ہو چکے تھے، ایک شہر قاطون کی بھی تعمیر شروع کی جسے اس کے لڑکے معتصم باللہ نے مکمل کیا، اور دارالخلافہ بنایا معتصم باللہ نے اس کا نام بدلکر سرمن رای رکھا جو کہ آخر میں سامرا ہوگیا، جبکہ واثق باللہ خلیفہ ہوا تو اس نے اپنا دارالخلافہ بغداد ہی کو منتخب کیا، سامرا اس کے بعد برباد ہوگیا، اور آج اس کے کھنڈر اپنی مٹی ہوئی عظمت پر رو رہے ہیں، کل من علیہا فان،

مشرق کی عربی تعمیرات کا حال تو آپ سن چکے، اب ذرا مغربی ممالک کی بھی سیر کیجئے، کہ عربوں نے وہاں کیا کیا کام کئے۔

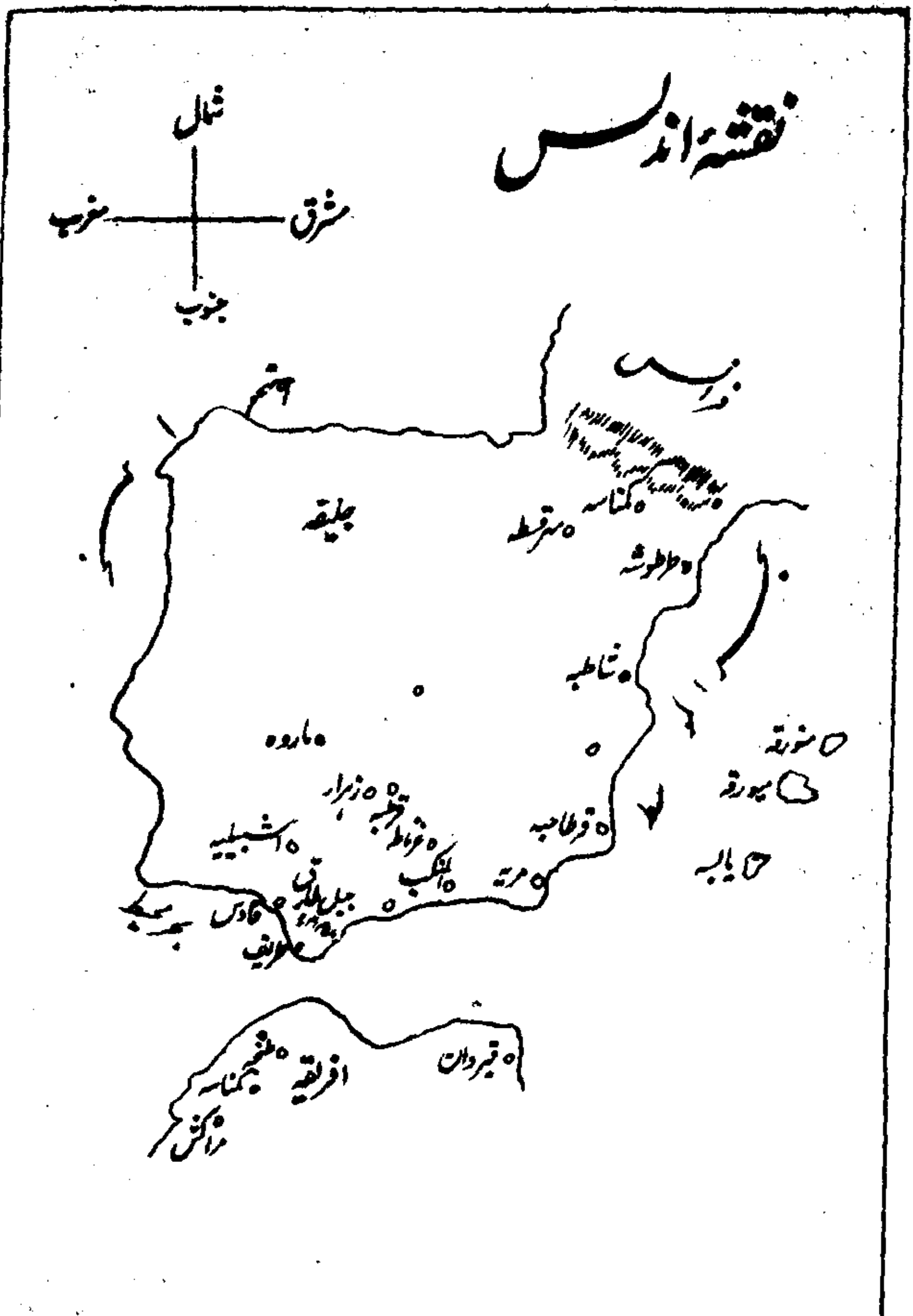
خلافت امویہ اندلس

مشرق میں جس وقت تک خلافت امویہ تباہ ہوئی، عبدالرحمن اول نے بھاگ کر اندلس میں پناہ لی، اور وہاں ایک چھوٹی سی حکومت قائم کرلی، جو کہ آیندہ چلکر ایک عظیم الشان طاقتور سلطنت بن گئی، عبدالرحمن نے تو خلافت کا دعوی نہ کیا، بلکہ صرف "امیر" کا لقب اختیار کیا، عبدالرحمن الناصر نے البتہ امیرالمؤمنین کا لقب اختیار کیا،

عربوں کو اندلس بہت بھاگیا، وہاں ان کی تمدنی زندگی بہت ترقی کرگئی، چنانچہ انھوں نے مشرق سے تقریبًا تمام تعلقات منقطع کرلئے، یہانتک کہ بوجہ فتنہ و فساد حج بیت اللہ کی بھی ممانعت کردی، امام رازی کہتے ہیں کہ اندلس تمام شہروں کے وسط میں واقع ہے، اللہ تعالی نے اس کو بہت ہی سرسبز و شاداب مقام بنایا چشمے ابلتے ہیں، نہریں جاری ہیں، حشرات الارض بہت ہی کم ہیں، بیشتر ہوا معتدل رہتی ہے، ہر قسم کے میوے ہر موسم میں مل سکتے ہیں"

قرطبہ

ابن سعید نے اپنی کتاب الحلیۃ الذہبیہ میں اندلس کے تمام شہروں کے نام تفصیل سے لکھے ہیں، قرطبہ کی بہت تعریف کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ قرطبہ زہرا زاہرہ کی عمارتیں نہایت ہی شاندار تھیں، سڑکوں پر اس قدر روشنی ہوتی تھی کہ ایک شخص اس روشنی میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک جاسکتا تھا، درانحالیکہ ان کے درمیان بقول شنقندی دس میل کا طویل فاصلہ تھا،



نقشہ اندلس
شمال
مشرق
مغرب
جنوب
جلیقہ
سرقسطہ
طرطوشہ
شاطبہ
ماردہ
زہرا
قرطبہ
غرناطہ
اشبیلیہ
مالقہ
جبل الطارق
قادس
قرطاجنہ
مریہ
منورقہ
میورقہ
یابسہ
طنجہ
افریقہ
قیروان
مراکش

جو عمارتیں وہاں اس عہد میں ایک دوسرے سے متصل بنا ہوتی تھیں، ان کا طول آٹھ فرسنگ اور عرض دو فرسنگ تھا، (یعنی لمبائی چوبیس میل اور چوڑائی چھ میل)
ابن بشکوال کہتے ہیں کہ یہ شہر نہایت ہی شان سے آباد کیا گیا، شہر میں جگہ جگہ باغات تھے نہریں جاری تھیں، خوبصورت خوبصورت حوض تھے، عمارتوں میں شیریں پانی کی نہریں جاری تھیں، اور چھت کے نلوں کے ذریعہ خاص مہندسی (انجینیرنگ) طریقے سے ہر ایک حوض اور تمام قصر ایک دوسرے سے ملا دئے گئے تھے، پانی عمارتوں کی بالائی حصہ میں بھی پہنچایا جاتا، کہیں کہیں سونے اور چاندی کے نل بھی استعمال کئے گئے تھے،
ان قصور میں پشتی بان ایسے بلند اور وسیع تھے کہ مشرق اور مغرب میں کہیں ان کا ثانی نہ تھا، قرطبہ کے قصور اور باغات میں کامل، مجدد، حائر، روضہ، زاہر، معشوق، مبارک، رشیق، قصر السرور، تاج، اور بدیع سب سے زیادہ مشہور رہے،
ابن بشکوال کہتے ہیں کہ قرطبہ کا قدیم ترین قصر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے چلا آتا تھا، یہ عمارت نہایت ہی شاندار تھی، یہاں یونانیوں، رومیوں، اور قوطیوں کے بہت سے ایسے آثار پائے جاتے تھے جن کی تعریف نہیں ہوسکتی، عربوں نے اسے بہت ہی ترقی دی، کہا جاتا ہے کہ قصر کے وہ دروازے جنھیں اللہ تعالیٰ نے مظلومین کے لئے کھول رکھا تھا، ان میں سے ایک کی کرسی اس قدر بلند تھی، کہ کہیں بھی ویسی دیکھی نہ گئی، تمام دروازے لوہے کے تھے جن میں کڑے لگے ہوئے تھے، ایک کڑے میں انسان کی صورت بنی ہوئی تھی، اس کو ابو محمد شہرا ربونہ واقع فرانس سے لائے تھے، دروازہ باب الجنان اور اس بلند دروازے کے سامنے دریا کے رُخ پر وہ دو مشہور مسجد تھیں جن میں امیر ہشام بیٹھکر مقدمات فیصل کرتے تھے،
امیر عبدالرحمن نے سب سے پہلے جو قصر بنوایا تھا، اس کا باغ نہایت ہی وسیع تھا، جس میں طرح طرح کے درخت دور دراز ملکوں سے خاص طور پر منگا کر لگائے تھے، ابن سعید کہتے ہیں کہ انار سفری جو کہ اندلس کے تمام میوہ جات پر فوقیت لے گیا کہ اس سے بہتر کہیں بھی نہیں پایا جاتا تھا،

اسی باغ کا تھا، اس باغ کا نام "رصافہ ہشام" رکھا گیا، کیونکہ یہ انار رصافہ ہشام شام سے لایا گیا تھا، اور شیرینی میں بالکل اس کے مشابہ تھا،

سلاطین بنو امیہ نے قرطبہ کی اکثر عمارتیں دمشق کے بالکل مشابہ بنوائی تھیں، بلکہ ایک محلہ بالکل دمشق کے طرز پر آباد کیا گیا،

"قرطبہ" کے باہر جو قصور تھے ان میں سید ابی یحییٰ بن ابی یعقوب کا بنوایا ہوا ایک قصر نہایت ہی مشہور تھا، یہ قصر بیچ دریا میں محرابیں قائم کرکے نہایت ہی صنعت کے ساتھ بنا گیا تھا،

"قرطبہ" قرطبہ ہی تھا، آجتک کسی شہر نے اتنی ترقی نہیں کی، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے[۵]

بأربع فاقت الامصار قرطبة　　　منهن قنطرة الوادی وجامعها

هذان ثنتان والزهراء ثالثة　　　والعلم اعظم شیء وهو رابعها

یعنی قرطبہ" چار چیزوں میں دنیا کے تمام شہروں پر فوقیت لے گیا، ایک وہاں کا پل دوسرے جامع مسجد، تیسرے قصر زہرا، اور چوتھے اعظم ترین شی یعنی علم،

اندلس کے حالات واقعات پر جسقدر شرح و بسط سے کتابیں لکھی گئیں، علماء کا خیال ہے کہ ممالک اسلامیہ کے کسی شہر کے متعلق اتنی کتابیں آج تک نہیں لکھی گئیں، علامہ مقری نفح الطیب میں اندلس کے متعلق تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" بغداد کی طرف نظر ڈالئے، جو دنیا بھر میں سب سے بڑا دار السلطنت، تمام فضائل کا معدن اور وہ مقام ہے جہاں کے باشندوں نے علوم و معارف کے لوار کو سب سے پہلے بلند کیا، انہیں لوگوں نے علوم و فنون کی چھان بین کی، یہیں کے رہنے والوں کو خوبی اخلاق، ذہن وذکا اور فکر کا مادہ حاصل تھا، اب بصرہ کو دیکھئے جو تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے، جو باوجود ان باتوں کے سوائے ایک احمد ابن طاہر کی کتاب کے میری نگاہ سے اور کوئی کتاب مشتمل باخبار بغداد نہیں گذری اگرچہ بھی کتابیں اہل بغداد نے تصنیف کی ہیں، ان میں بغداد کا خاص طور پر تذکرہ نہیں، بلکہ دیگر شہروں کی طرح ضمنی طور پر اس کا بھی تذکرہ آگیا ہے، یہی حالت بصرہ کی ہے، اور مردم خیز سرزمین کوفہ

کا بھی یہی حال ہو، باقی رہے ممالک الجبال، خراسان، طبرستان، جرجان، کرمان، سجستان، سندھ، ارمینیہ، رے آذربیجان، یہ بہت بڑے بڑے ممالک ہیں لیکن ان کے حالات میں کوئی بھی ایسی کتاب نہیں جو کہ جامع ہو،"

حمص

جبکہ بنو امیہ کی حکومت مشرق میں زیر و زبر ہوگئی، اور اندلس میں بنو مروان صاحب حکومت ہوئے تو انہوں نے حب وطن کے جوش میں جتنے بھی شہر وہاں آباد کئے، یا قصور تعمیر کرائے، ان میں سے اکثر کے نام وہی رکھے، جو کہ ان کے مشرقی وطن شام میں تھے، "حمص" بھی اسی یاد میں آباد کیا گیا،

قصر الشراجیب

مقام شلب میں ایک مشہور محل تھا، یہ قرطبہ کے سلسلہ تعمیر میں تیار کیا گیا، معتمد بن عباد اندلسی اس قصر کی تعریف کرتے ہوئے نہایت ہی حسرت اور یاس سے اس کی طرف دیکھتے ہیں

وسلم علی قصر الشراجیب عن فتی لہ ابدا شوق الی ذلک القصر

قصر السرور اور مجلس الذہب

یہ دونوں قصر شہر سرقسطہ میں بنائے گئے، نہایت ہی خوبصورت اور شاندار تھے ابن ہود تو ان دونوں کی خوبصورتی دیکھکر وجد میں آگئے، ؎

قصر السرور ومجلس الذہب بکما بلغت نہایۃ الطرب

"طلیطلہ"

اندلس کا یہ علاقہ مشہور ترین علاقوں میں سے تھا، اس شہر کا نام قیصر نے اپنی زبان میں "زلیطلۃ" (خوش رہنے والا) رکھا تھا، عہد بنی امیہ میں طلیطلہ خاص مدینۃ الاملاک کہا جاتا تھا، یہاں بہتر۷۲ بادشاہ گذرے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عیسی علیہ السلام اور ذوالقرنین نے اس زمین کو اپنے قدموں سے مشرف کیا تھا، اسی مقام پر حضرت طارق کو حضرت

سلیمان علیہ السلام کا مائدہ ملا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ مائدہ زمرد کا تھا، اور ولید بن عبدالملک کے سامنے اس کی قیمت کا اندازہ ایک لاکھ دینار کیا گیا تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مائدہ اس وقت روم میں ہے، حضرت طارق کو طلیلہ میں بہت ہی دولت ہاتھ آئی تھی، منجملہ ان کے ایک سوستر تاج اور بکثرت سونے اور چاندی کے مرصع ظروف ایک شاہی عمارت میں بند پائے گئے تھے۔

عہد اسلامی میں یہ شہر بہت ترقی کر گیا، مامون بن ذوالنون نے اس شہر کو خاص طور پر ترقی دی، کسی شاعر نے تعریف کی ہے، ؎

زادت طليطلة على ماحدثوا　　بلدة عليه نضارة ونعيم

الله زينه فوشح حضره　　نهر المجرة والغصون نجوم

مامون بن ذوالنون نے اس شہر میں بڑے بڑے اہل ہنر اور یگانۂ روزگار علماء و حکماء جمع کر لئے تھے، مامون نے ایک نہایت ہی عمدہ قصر بنوایا تھا، اسے بہت ہی آراستہ کیا، اس قصر میں ایک جھیل تھی، جس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا گنبد نما کمرہ تھا۔ یہ کمرہ ستونوں پر قائم تھا جن پر چاندی کے پترے مڑھے ہوئے تھے، اور سونے کے پانی کی گلکاری کی گئی تھی، ہندسی و انجینئرنگ طریقے سے پانی نلوں کے ذریعہ اس کمرہ کے گنبد تک پہنچایا گیا تھا، اور وہاں سے پانی کمرہ کے چاروں طرف چادر کی صورت میں زوروں کے ساتھ گرتا، ایسا معلوم ہوتا کہ گویا چاندی کی چادر تان دی گئی ہے، یہ مقام گرمیوں میں نہایت ہی پر لطف ہوتا، خصوصاً اسوقت اسکا منظر قابل دید ہوتا جبکہ پانی کی چادر تنی ہوتی، اور اسکے اندر شمعیں جلتی ہوتیں

"عین الذہب"

نہایت ہی سرسبز و شاداب مقام تھا، کسی شاعر نے وہاں کی تعریف کرتے ہوئے ایک جرعہ آب کے لئے تین قسمیں کھاتا ہے۔

دبأبي وبأبي وبأبي　　جرعة من ماء عين الذهب

"مرج الفضہ"

یہاں کے حوض نہایت ہی خوبصورت اور مضبوط بنائے گئے تھے،

مدینۃ الزہراء

اس شہر کو عبدالرحمن الناصر نے ۳۲۵ھ میں آباد کیا، چالیس سال میں اس کی آبادی تکمیل کو پہنچی، عبدالرحمن نے اس شہر میں بہت سے باغات لگوائے، عجائب خانے اور عمارتیں تعمیر کرائیں نہایت ہی بہتر چڑیا خانہ بنوایا، بہت سے کارخانے صنعت و حرفت کے کھلوائے، جنگ کے متعلق ہر طرح کے آلات یہاں بنتے تھے۔

مورخین عبدالرحمن الناصر کی بہت تعریف کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمن نہایت ہی مدبر، شاندار اور منتظم بادشاہ تھا، اسے عمارتوں کا بہت شوق تھا اس نے تہذیب اور تمدن کو بہت ہی بلند کیا، شہر آباد کئے، عمارتیں بنوائیں، تجارت اور زراعت کو نئے نئے وسائل بہم پہنچائے، گویا اسوقت اندلس میں رحمت کی بارش ہو رہی تھی، اندلس کی آمدنی بڑھکر چون لاکھ دینار ہو گئی تھی، اور دیگر ذرائع سے سات لاکھ ۶۵ ہزار،

اندلس میں اسوقت ۸۰ تو بڑے بڑے شہر تھے، اور تین سو چھوٹے چھوٹے، گاؤں اور اور قصبات کی تعداد بارہ ہزار تھی، بڑی بڑی نہریں تھیں جن کے کنارے زراعت ہوتی تھی،

قرطبہ زہراء اور زہراء میں سڑکوں پر اسقدر روشنی ہوتی کہ اس روشنی میں دس دس میل چلے جاتے تھے، زہراء اسقدر خوبصورت تھا کہ اگر وہ ابتک اپنی اسی شان سے باقی رہتا، تو آج بھی لاثانی اور عجوبہ روزگار رہتا، اس کی آبادی کا سبب ایک زہرا نامی خوبصورت کنیزہ تھی، عبدالرحمن اس سے بہت محبت کرتا تھا، زہراء کی فرمائش پر بادشاہ نے شہر زہراء اور قصر زہراء تعمیر کرایا،

زہراء قرطبہ سے چند میل کے فاصلہ پر جبل عروس کے دامن میں آباد کیا گیا، پہلے یہ تمام بالکل جنگل تھا، جنگل صاف کرایا گیا، اور اس جگہ زیتون اور بادام کے درخت لگائے گئے، یہاں

کا بہار کا موسم نہایت ہی خوشگوار اور فرحت بخش ہوتا،

اس شہر کی عمارتوں میں چار ہزار سنگ رخام کے عمدہ ستون لگائے گئے تھے، یہ قیمتی ستون متعدد مقامات سے لائے گئے تھے، چند شہر روم سے کچھ بادشاہ قسطنطنیہ نے بطور تحفہ کے دیئے تھے، پندرہ ہزار سے زیادہ دروازے ایسے تھے جن پر لوہا اور تانبا چڑھایا گیا تھا، ابن حیان کہتے ہیں کہ الزہرا میں روزانہ ایک ہزار چار سو لدو خچر اور چار سو اونٹ کام کرتے تھے، جن میں ایک ہزار خچر توکرایہ کے تھے، اور بقیہ الناصر کے، خچروں کا کرایہ تین مثقال فی خچر یومیہ ادا کیا جاتا، ہر تیسرے دن ایک ہزار خچر چونا صرف ہوتا بعض لوگوں نے زہرا کا سالانہ صرفہ تین لاکھ دینار لگایا ہے دو نہایت ہی عمدہ حوض تھے، ایک خاص شاہی محل میں تھا، نہایت ہی گراں قیمت مطلا اور مذہب تھا، یہ حوض احمد یونانی قسطنطنیہ سے ایک اسقف ربیع نامی کے ہمراہ لایا تھا، لوگوں کا قول ہے کہ حوض اسقدر گراں قیمت تھا کہ اس کی قیمت کا اندازہ ہی نہ ہو سکتا تھا، یہ حوض شاہی محل میں بمقام مونس رکھا گیا، اس کے چاروں طرف شیر، ہرن، ہاتھی، عقاب، شاہین اور طاؤس کی شکلیں نہایت ہی مناسبت سے نصب کی گئی تھیں، یہ شکلیں سونے کی تھیں جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے ان کی تعداد بارہ تھی، یہ تمام دار الصنعۃ قرطبہ کی بنی ہوئی تھیں، ان کے منہ سے پانی فوارے کے مانند نکلتا تھا، یہ پانی چھوٹی چھوٹی خوبصورت نہروں کے ذریعہ قرطبہ سے لایا گیا تھا، ان نہروں کے بند عجیب صنعت سے بنائے گئے تھے، یہ پانی خاص ہندسی (انجنیرنگ) طریقہ سے تمام محلوں کے ہر ایک بلند سے بلند حصہ میں پہنچایا گیا تھا، چھوٹی چھوٹی خوبصورت نہروں کا ہر طرف بہنا، بلند بلند برجوں اور عمارتوں پر پانی کا پہنچنا، عمارتوں کی ہیئت تعمیر اور یہ حوض، یہ تمام چیزیں ایسی تہیں کہ جسے دیکھکر ہر شخص متحیر رہجاتا، اور بغیر تعریف کئے نہیں رہ سکتا تہا

ان چیزوں کے بننے میں کل چودہ ماہ کی قلیل مدت صرف ہوئی تھی، نہریں جس روز پانی لایا گیا، الناصر نے قصر ناعورہ میں تمام اراکین سلطنت کو دعوت دی، اور تمام کاریگروں اور ہندسین (انجنیروں) کو ان کی امید سے بڑھکر بڑے بڑے انعامات دیئے،

جامع زہرا

یہ مسجد بھی عالم اسلام کی عظیم ترین مسجدوں میں سے ہے، بقول ابن فرضی ایک ہزار کاریگر اس میں روزانہ کام کرتے تھے، اس میں تین سو معمار، دو سو نجار اور پانسو مزدور تھے، اس کی بنیاد کے بھرنے میں اڑتالیس دن صرف ہوئے تھے، تمام مسجد میں سنگ سرخ کا بہترین فرش تھا، وسط صحن میں ایک خوبصورت فوارہ تھا، امیر المومنین الناصر نے اس مسجد کے لئے ایک نہایت ہی نفیس منقش ممبر بنوایا، یہ ممبر ۲۲ر شعبان یوم پنجشنبہ ۳۲۹ھ میں مسجد میں رکھا گیا، اور اسی دن بوقت مغرب سب سے پہلی نماز جماعت اس مسجد میں ہوئی، قاضی ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ نے نماز پڑھائی، دوسرے دن خلیفہ نے نماز جمعہ ادا کی،

قصر زہرا

یہ قصر مدینہ زہرا کے وسط میں تعمیر کیا گیا، یہ عمارت اپنی جلالت اور فخامت کے اعتبار سے دنیائے اسلام میں یکتا تھی، جن جن سیاحوں نے اسے دیکھا اس کی خوبصورتی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے، انھوں نے کہا کہ اس قصر کے مشابہ دنیا میں کوئی بھی عمارت نہیں، اور نہ وہم و خیال میں آسکتی ہے، صاف و شفاف کمرے، جنہیں بیٹھکر باغوں کی سیر کی جاسکتی، خوبصورت خوبصورت گنبد جن کی مضبوطی صنعت اور حسن منظر کی کہیں مثال نہیں، سنگ مرمر پر سونے کا بہترین کام، غرضکہ اس کی خوبصورتی کو جنت الفردوس کی خیالی تصویر بھی نہیں پہنچ سکتی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ زہرا میں ۱۳۷۵۰ خدمت گار رہتے، روزانہ تیرہ ہزار پونڈوں کا گوشت علاوہ مچھلیوں کے صرف ہوتا، قصر میں چھوٹی اور بڑی عمر کی عورتوں اور ماماؤں کی تعداد ۶۳۱۴ تھی، نہروں میں جو طرح طرح کی مچھلیاں پلی تھیں ان کے کھانے کے لئے نہر میں روزانہ بارہ ہزار روٹیاں چھ بوری چنے روزانہ ڈالے جاتے تھے،

زہرا کے خدمت گاروں کا بیان ہے کہ ۲۵ سال تک ان لوگوں کو ۳ لاکھ دینار سالانہ تنخواہ ملتی تھی،

قصر زہرا کی تعمیر کے لئے قرطاجنہ، تونس، اور افریقہ سے پتھر لائے گئے تھے، عبد اللہ بن یونس معماروں کا مستری، اور علی بن جعفر الاسکندرانی پتھر لایا کرتے تھے، بادشاہ ہر چھوٹے بڑے پتھر کے عوض دس دینار فی پتھر دیا کرتا، بعض مورخین لکھتے ہیں کہ ہر چھوٹے پتھر کی قیمت تین دینار اور ستون کی آٹھ دینار دیجاتی تھی، کہتے ہیں کہ ۱۰۱۳ ستون افریقہ سے ۱۹ سرزمین فرانس سے منگائے گئے تھے، قیصر روم نے ۱۴۰ ستون بطور تحفہ دئے تھے، کچھ پتھر اندلس ہی کے تھے، سفید اور سیاہ رنگ کے ابری پتھر ریہ سے، سبز اور گلابی رنگ کے پتھر افریقہ کے کنیسہ اسفاقس سے لائے گئے تھے،

عبدالرحمن الناصر کا شغف تعمیر

الناصر کو عمارتوں کا اس قدر شوق تھا کہ ایک بار مسلسل تین جمعوں میں شریک نہ ہو سکے، عمارتیں خود ان کے زیر اہتمام تعمیر ہو رہی تھیں، اس لئے شرکت نماز کا موقع نہ ملتا تھا، قاضی منذر نے ایک مرتبہ خطبہ کے وقت دنیا داروں کی بہت مذمت کی اور نہایت ہی پراثر خطبہ دیا، الناصر سر جھکائے سنتا رہا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وہ سمجھ گیا کہ قاضی منذر کا روئے سخن کس کی طرف ہے،

الناصر اگرچہ وعظ سے بہت متاثر ہوا، لیکن وہ دل میں قاضی منذر کے اس طرز خطاب سے ناراض ہو گیا، چنانچہ اس نے جامع مسجد میں نماز ادا کرنا ترک کر دیا، ایک روز الناصر کے بیٹے الحکم نے کہا کون سی چیز مانع ہے جس سے آپ خاموش ہیں، قاضی منذر کو علیحدہ کر دیجئے، اور ان کی جگہ دوسرا قاضی مقرر فرما دیجئے، الناصر الحکم کی یہ بات سنکر بہت ناراض ہوا، اور بھڑک کر کہا، کیا منذر ابن سعید ایسے صاحب علم وفضل آدمی کو معزول کر دیا جائے، یہ نہیں ہو سکتا، چاہے خود تمہیں کو ولیعہدی سے معزول کرنا پڑے"

ایک روز قاضی منذر الناصر کے پاس گئے، دیکھا کہ بادشاہ عمارتوں کے خیال میں محو ہے آخر رہا نہ گیا، وعظ ونصیحت شروع کی، بادشاہ سنتا رہا، جب قاضی منذر خاموش ہوئے تو الناصر

نے کہا ہے

ہم الملوک اذا ارادوا ذکرھا	من بعدھم فبالسن البنیان
اوما تری الھرمین قد بقیا دکم	ملک محاہ حوادث الازمان
ان البناء اذا تعاظم شانہ	اضحے یدل علی عظیم الشان

یعنی بادشاہ اپنے بعد اپنی عمارتوں اور بنائی ہوئی چیزوں کو بطور یادگار چھوڑ جاتا ہے، جو کہ اس کے بعد اس کا نام زندہ رکھتی ہیں، دیکھو اہرام مصری دنیا میں باقی ہیں اور بنانے والے کا نام زندہ ہے، لیکن مرور ایام سے کتنی سلطنتیں دنیا سے مٹ گئیں، بیشک جب کوئی بڑی چیز باقی رہجاتی ہے، تو وہ کسی بہت بڑے اور عظیم الشان ہستی پر دلالت کرتی ہے"

کہتے ہیں کہ الناصر نے جب ایک چھوٹے خوبصورت کمرے کی آرایش و زیبایش میں بہت تکلفات کئے، دیواریں اور چھت تمام مرصع، سونے اور چاندی کی اینٹیں استعمال کی گئیں تو ایک روز اپنے تمام عمائدین سلطنت کے ساتھ بیٹھا اور عمارتوں کا تذکرہ ہونے لگا، ہر ایک نے تعریف کی قاضی منذر وعظ و نصیحت کرنے لگے، بادشاہ بہت شرمندہ ہوا، اور حکم دیا کہ مرصع چھت اتار دیجائے اور سونے چاندی کی اینٹیں نکال لی جائیں،

اس کے علاوہ مجلس الزہرار، البہو را، الکامل، ودمنیف، قصر ناعورہ وغیرہ بھی مشہور عمارتیں تھیں،

"الزاہرہ"

منصور محمد بن ابی عامر کی عمارتوں میں سے مشہور عمارت تھی، ابن خلدون لکھتا ہے کہ منصور نے اپنے لئے ایک شہر آباد کیا، اس کا نام زاہرہ رکھا یہی شہر منصور کا دارالسلطنت ہوا، یہ قرطبہ کے ایک سمت دریا کے کنارے واقع ہے، دو برس کی قلیل مدت میں یہ شہر آباد کیا گیا، او[illegible] میں منصور یہاں آگیا، دفاتر حکومت کی بڑی بڑی عمارتیں، خدم و حشم اور ملازمین سلطنت کے مکانات، فوجی دفاتر اور ان کے متعلقات عدالتیں، غرض ہر ایک شعبہ کے لئے علیحدہ علیحدہ

عمارتوں کا ایک سلسلہ تہا کہ دیکھنے والے دنگ رہجاتے، کہتے ہیں کہ قصر زاہرہ یعنی شاہی محل پر روزانہ بارہ ہزار رطل گوشت (۴۰ تولہ کا ایک رطل ہوتاہے) علاوہ چڑیوں اور مچھلیوں کے صرف ہوتا تہا

یہاں کے دارالصنعتہ سے سالانہ بارہ ہزار ڈھالیں قصر زاہرہ اور اہالی زاہرہ کے لئے تیار ہوا کرتی تھیں،

ایک روز منصور قصر میں بیٹھا تھا، اس نے نظر اٹھائی اور عمارت کے حسن کو دیکھا، آب رواں پر نظر ڈالی، نغمۂ طیور سنا، جس طرف دیکھا قصر میں حسن ہی حسن نظر آیا، یکایک رقت طاری ہوئی، آنسو جاری ہوگئے اور آہ بھر کر کہا، "اے زاہرہ! افسوس کاش میں اس ظالم کو سزا دے سکتا جس کے ہاتھوں سے بہت جلد تو برباد ہونے والا ہے"، خدمتگاروں نے کہا حضور کیا فرماتے ہیں تو کہا میں ایسا ہی دیکھ رہا ہوں، گویا ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ زاہرہ کا نام میری آنکھوں کے سامنے مٹ رہا ہے" چنانچہ منصور کی وفات کے بعد ایسا ہی ہوا،

"اشبیلیہ"

وادئ کبیر کے کنارے اندلس کا بہترین شہر تھا، تجارت کی گرم بازاری تھی، یہاں کی تمام زمین سُرخ تھی، زیتون اور انجیر بہت پیدا ہوتے، صاحب منہاج الفکر کہتے ہیں کہ اشبیلیہ دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں سے تھا، یہاں کے باشندے سیر و تفریح کے مشاغل میں مشہور تھے، یہاں بھی بکثرت شاہی عمارتیں تھیں"

"مریہ"

اندلس کے نہایت ہی مالدار شہروں میں اس کا بھی شمار تھا، یہاں "دیبا" نہایت ہی خوبصورت بنا جاتا تھا، کئی کارخانے تھے کہتے ہیں کہ صرف ریشمی کپڑے بننے کے لئے آٹھ سو کرگھے تھے، دیبا بننے کے ایک ہزار اسقلاطون، جرجانی، صفہانی، اور عتابی کپڑوں نیز شیشے کی جوڑیاں اور عمدہ عمدہ پردوں کے بننے کے بہت سے کارخانے تھے، سامان حرب اور جہاز بنانے کے

بھی کئی کارخانے تھے، اندلس میں یہ سب سے زیادہ تجارتی شہر تھا،

"مالقہ"

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ یہاں مٹی کے برتنوں پر سونیکا کام نہایت ہی عمدہ ہوتا تھا، یہ برتن دور دور بھیجا جاتا تھا، یہاں کی جامع مسجد بہت متبرک خیال کیجاتی تھی مسجد کا صحن نہایت ہی خوبصورت تھا، ایک اور بڑی عمارت تھی جس کو دارالصنعۃ کہتے تھے، اب اس کی جگہ دوکانیں ہیں،

یہ شہر دولت غرناطہ کے عہد میں بہت بڑا مقام تھا، مسلمانوں نے ۹۲ھ میں جب فتح کیا تو اسے بہت ترقی دی، شریف ادریسی لکھتے ہیں کہ مالقہ ایک اچھا اور آباد شہر ہے، عمارتیں بہت ہیں، گرد و پیش کے میدان وسیع ہیں، بازار آباد ہیں، وسائل زندگی بہت ہیں، یہاں انجیر کے باغات اسقدر ہیں کہ یہاں سے مصر و شام عراق، بلکہ ہندوستان تک انجیر جاتے ہیں،

"جامع مسجد اقلیش"

اس مسجد کی کرسی میں جو پتھر استعمال کئے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا طول ایک سو گیارہ بالشت ہے،

"الحمراء"

شہر غرناطہ کی سطح پہاڑی پر ایک مشہور قلعہ تھا، یہ قلعہ سرخ پتھروں کا تھا، اسی لیئے اسکو الحمرا یعنی لال قلعہ کہتے تھے، محمد بن الاحمر نے اسی قلعہ میں ایک عالیشان قصر بنوایا تھا جو بہت مشہور رہے، یہاں کے نو محل بہت ہی عمدہ تھے، کہتے ہیں کہ الحمرا کی دیواروں پر ایسے عمدہ بیل بوٹے بنے تھے، کہ دیکھکر خدا کی قدرت یاد آتی، اس میں ایک سو باون قسم کے پھول تھے، ہر ایک دوسرے سے مختلف، دیواروں پر کشیدہ کار پردے، چمڑے کی بنی ہوئی زیبائش کی چیزیں لٹکتی رہتی تھیں، کھڑکیوں کے شیشوں پر سنہرے حروف میں قرآنی آیتیں لکھی تھیں، دروازے دس دس فیٹ بلند تھے،

ایک دوسرا مشہور قصر قصر الاس سفرا کے لئے تھا، اس میں بڑے بڑے ہال تھے، ایک صحن تھا، جسے قفا السود کہتے تھے، اس میں بارہ شیر سنگ خام کے بنے ہوئے تھے، یہ شیر پانی کے بڑے بڑے برتنوں کو اٹھائے ہوئے تھے، ایک حوض دمشق کے حوض کے مشابہ تھا، الحمرا کے قریب ایک شاہی باغ تھا جسکا نام جنت العریف تھا، صاحب احاطہ لکھتے ہیں کہ صرف بادشاہ کی سیر کے لئے سو باغات تھے،

جی تو چاہتا ہے کہ اندلس کے کھنڈروں پر دل کھولکر روئیے، لیکن مضمون کی طوالت مجبور کر رہی ہے کہ اسے اسی جگہ ختم کر دیا جائے،

اب خلافت فاطمیہ افریقہ اور سلطنت مراکش کی مشہور عمارتوں کا مختصراً ذکر کرتا ہوں،

"خلافت فاطمیہ افریقہ"

جسوقت کہ بغداد اور اندلس کی اسلامی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں، افریقہ میں خلافت فاطمیہ کی بنیاد ابو عبداللہ کے ہاتھوں رکھی گئی، ابو عبداللہ نے مہدویت کا دعوی کیا، مذہب اسماعیلیہ کی بنا یہیں سے پڑی،

"مہدیہ"

ابو عبداللہ المہدی نے اسے بھی آباد کیا تھا، اس کا نام "محدیہ" رکھا تھا، یہاں بھی ایک قلعہ تھا، خوراک کا سامان اسی جگہ رکھا جاتا تھا،

"مسیلہ یا محمدیہ"

ابو عبداللہ المہدی نے اسے بھی آباد کیا تھا، اس کا نام محمدیہ رکھا تھا، یہاں بھی ایک قلعہ تھا خوراک کا سامان اسی جگہ رکھا جاتا تھا،

"القاہرہ"

کافور اخشیدی کے بعد جب مصر میں المعز لدین اللہ کا دور دورہ ہوا تو اسکے وزیر جوہر نے جو کہ فوج کا افسر بھی تھا، قاہرہ کی بنیاد رکھی، اور مشہور اسلامی عربی یونیورسٹی جامع ازہر کو قائم کیا،

صبیہ میں جو کچھ سامان تھا سب یہاں منتقل کر دیا گیا، صلاح الدین یوسف بن ایوب نے اپنے عہد میں یہاں ایک قلعہ اور ایک نہایت ہی عمیق کنواں بنوایا تھا جس کی گہرائی تین سو قدم تھی، اس کی تہ میں لوگ زینے کے ذریعے بآسانی پہنچ سکتے تھے،

سلطنت مراکش

دولت فاطمیہ کے بعد مراکش میں یوسف بن تاشفین کے ہاتھ سے اس سلطنت کی بنیاد رکھی گئی،

مراکش

اس شہر کی بنیاد یوسف بن تاشفین بانی سلطنت مراکش نے ۴۵۴ھ میں رکھی تھی، اولاً صرف ایک مسجد اور چند مکانات تعمیر کئے گئے، آہستہ آہستہ آبادی ترقی کرتی گئی، اور یہ دارالسلطنت بنگیا، خزانہ اور سامان جنگ رکھا جانے لگا، یہ شہر نہایت ہی خطرناک جنگلوں کو کاٹ کر آباد کیا گیا تھا، اس جنگل میں چور ڈاکو اور درندے رہا کرتے تھے، مسافر اور گرد و نواح کے باشندے جب اس جنگل سے گذرتے تو کہتے، "مراکش یعنی بھاگ چلو" یہ جگہ آباد ہونے کے بعد اسی نام سے مشہور ہوئی،

"مغادر"

یہ شہر ۱۱۷۵ھ میں آباد کیا گیا،

"مکناسہ"

یہ شہر مراکش کے قریب ہی آباد ہوا، اسے مکناسۃ الزیتون بھی کہتے ہیں، یہ نہر فلفل پر واقع تھا، سلاطین مراکش اپنا اکثر وقت یہیں گذارتے تھے، کسی شاعر نے یہاں کے مناظر کی تصویر کھینچی ہے

انظر الی مکناسۃ الزیتون   بین الاباطح والجبال الجون

وکأن فلفل بینهن مهند   یهتز بین تعطف و سکون

حسن کی دنیا

از رشحات فکر حضرت کیفی دتاتریہ

دیر و حرم میں کس لئے بیٹھا کرے کوئی — خالق کو خلق میں ہی نہ دیکھا کرے کوئی
حسن ازل کی ہر کہیں ظاہر ہے آب و تاب — ہاں شرط ہو کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
ہر ذرہ ذرہ آئینہ دار جمال حق — دریا کو بند کوزے میں پھر کیا کرے کوئی
مشاطۂ ازل نے جہاں کو سجا دیا — اس کا مشاہدہ نہ کرے یا کرے کوئی
دیکھے ہلال کا جو افق میں یہ بانکپن — ابروئے ناز پھر نہ اشارا کرے کوئی
افشاں جبیں چرخ پہ کیا کہکشاں کی ہے — اختر شمار اس کا نظارا کرے کوئی
ہے حسن ڈال ڈال تو خوبی ہے پات پات — کانٹوں میں کیوں گلوں کو گھسیٹا کرے کوئی
قطرے میں بحر ذرے میں خورشید دیکھ لے — پیدا نظر یہ نگاہ تو پیدا کرے کوئی
دنبالہ نوک خار ہے چشم غزال کا — مژگاں سے شانہ کاری صحرا کرے کوئی
یہ تیرہ خاکدان ہے بنے خلد کا سماں — گر چشم دل کو گرم تماشا کرے کوئی
تسنیم حسن کا ہے رواں چشمہ رات دن — کیا خواہش صراحی و صہبا کرے کوئی
اب وقت ہے کہ پھول گل و یاسمن کے ہوں — کب تک مرو‌ں کو رات کے زیبا کرے کوئی
محدود ہے یہی گل و سنبل تک اک عالم — زیبا نہیں کہ نازش بے جا کرے کوئی
یہ بھی تو زلف و رخ کے تصدق میں ہیں جو ہیں — وابستہ کیوں پھر اس سے دل اپنا کرے کوئی
ہم نے یہ کب کہا کہ جو انسان ہو حسیں — اسکی طرف سے آنکھ کو اندھا کرے کوئی
اپنا تو یہ یقیں ہے ہر شے میں حسن ہے — موئے میان سے کیوں لے باندھا کرے کوئی
وہ شے ہے کونسی کہ میسر نہیں یہاں — کس چیز کی جہاں میں تمنا کرے کوئی

سکرِ خمار جس کے ہو درپے وہ کیا سرور — کیوں آرزوئے ساغر و مینا کرے کوئی
خود بند باس میں نہیں چھنتا تو کیا ہے یہ — کیوں بڑھ کے اپنی حد سے تمنا کرے کوئی
کشتِ امید سبز نہ ہو جوئے اشک سے — پایاب کیوں نہ سر کا پسینا کرے کوئی
کیا کہہ رہا تھا اور کدھر جا پڑا خیال — یہ شانِ محویت ہے نہ شکوا کرے کوئی
کب نوک دار کر لک حرفِ ازل بنی — کیوں انس ہر کسی کو چڑھایا کرے کوئی
پیکِ خیال کی بھی ہو حرکت جسے گراں — کیا چشمِ شوق سے اُسے دیکھا کرے کوئی
ہے نظریہ جو حسن کا وہ ناقص الاساس — اس پر نہ قصرِ وہم بنایا کرے کوئی
خط کا تناسب اور توازن ہو رنگ کا — جو کچھ بھی حسن ہے اسے پیدا کرے کوئی
چند آڑے ترچھے تنکے نشیمن میں ہیں فقط — ہاں ! ہے کہ اسکی نقل کا دعویٰ کرے کوئی
مکتوبِ فن ہو فن جو ہے نیچر کا نقل ہو — کیا فرق اصل و نقل کا انشا کرے کوئی
پھر بھی جو بھی نقل کے ماہر ہیں اہلِ فن — انکی ہے پیروی کا ارادہ کرے کوئی
قدرت نے جو دیا تمھیں رعنائی کا سبق — ہے یہ بھی شاذ اسکا ادا کرے کوئی
دنیا بھری پڑی ہے مناظرِ حسن سے — ہو دل کا تزکیہ جو نظارا کرے کوئی
بدخلقیوں نے خلق کو بدنام کر دیا — وہ شے ہے ورنہ حسن کہ پوجا کرے کوئی
بویا غرض کا بیج جو اس حسن زار میں — ثمرہ عمل کا اپنے سمیٹا کرے کوئی
بندہ جو نفس کا ہے نہ ہو بندہ حسن کا — کیوں ننگِ خلق حسن کو رسوا کرے کوئی
جو شے ہے وہ نظر میں ہے اپنی تو دلفریب — اس کو جنون جو سمجھا ہے سمجھا کرے کوئی
فطرت کا حسن شانِ جمالی کا ہے شہود — پیدا تو ایسی حسن کی دنیا کرے کوئی

کیفی تو اس کی خوبیٔ ذاتی پہ ہے فدا
ناطورۂ سخن کو سنوارا کرے کوئی

تازیانۂ عبرت

از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب

اتنا تو سوچ مسلم دل میں ذرا خدارا
اس کشمکش میں کیونکر ہوگا ترا گذارا

یا تو ترے ہی بل پر چلتی تھی ساری دنیا
یا تو ہی ڈھونڈتا ہے اب اور کا سہارا

یا تو کرم پہ تیرے تھیں کل جہاں کی نظریں
یا ہو رہا ہے تیرا خود بھیک پر گذارا

سب آگے بڑھ رہے ہیں تو پیچھے ہٹا ہے
ہاں اب ذرا سنبھل کر۔ دیکھ آگیا کنارا

غیرت سے منہ کو موڑا قسمت نے ساتھ چھوڑا
سب چھوڑ بیٹھے تجھکو ہمت جو تھی تو ہارا

کیا یونہی اپنے گھر سے نکلا تھا ہاتھ خالی
یا دیدیا ہے تونے غیروں کو مال سارا

ہمت نہیں ہے تجھ میں جھوٹی ہے دھاک تیری
ہو جائے گا کسی دن یہ راز آشکارا

جو آفتاب عزت تھا تیرے سر پہ تاباں
وہ دور ہوتے ہوتے اب رہ گیا ہے تارا

وہ دن بھی تجھکو غافل ہیں یاد یا نہیں ہیں
مشرق کا جا ملا تھا مغرب سے جب کنارا

فرحت کو بھی تو آخر کچھ تم سے واسطہ ہے
تم ہی کہو وہ کیونکر پھر چپ رہے بچارا

بہر خدا یہ سوچو۔ تم خود بدل گئے ہو
یا کچھ بدل گیا ہے شاید خدا تمہارا

تنقید و تبصرہ

تعلیم الاسلام ۔ مصنفہ مولوی سید معین الدین صاحب مترجم نپولین بونا پارٹ۔ چھوٹی تقطیع۔ کاغذ کتابت وطباعت اوسط حجم ۶۰ صفحے۔ قیمت ۴؍ فی نسخہ۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب نظامی پریس بک ایجنسی۔ بدایوں۔

اس کتاب میں مصنف نے اسلام کی خوبیاں بیان کی ہیں اور اسکی اخلاقی تعلیمات کی برتری ثابت کی ہے اور صفائی اور اختصار کے ساتھ لکھا ہے اگرچہ یہ تعلیمات قرآن کریم کے کسی عمیق مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہیں اور نہ دینی یا علمی اصول پر ترتیب دی گئی ہیں مگر اسی کی آیات سے ناصحانہ اور معلمانہ طریقہ سے اخذ کر کے لکھی گئی ہیں۔ اس لئے عوام الناس کے واسطے مفید ہیں۔

مہاجرین حصۂ دوم ۔ مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۳۶۴ صفحات قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ۔

یہ کتاب دار المصنفین کی تصنیف سیر الصحابہ کے سلسلے کی کڑی ہے۔ پہلے حصہ کے بقیہ مہاجرین کے حالات اس حصہ دوم میں لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی سابقہ حصہ کی طرح صاف اور سلیس اردو میں بسط و تفصیل کے ساتھ مستند کتب تاریخ سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے۔

اردو شہ پارے جلد اول ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی لنڈن۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ۔ تقطیع بڑی حجم ۳۵۶ صفحے۔ مجلد قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب جس کے متعلق یہ تجویز ہے کہ تین جلدوں میں لکھی جائے اس کی یہ پہلی جلد ہمارے پاس تنقید کے لئے موصول ہوئی ہے۔ اس میں اردو ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے تک کے شاعروں اور نثر نگاروں کے شہکاروں سے دلکش اور اہم انتخابات درج کئے گئے ہیں۔

اردو زبان کی تاریخ کے متعلق دکن میں جو کوششیں ہو رہی یہ کتاب انکا ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس میں نہایت جستجو سے مشرق و مغرب کے کتب خانوں کی ورق گردانی کرکے انتخابات مہیا کئے گئے ہیں۔ بعض بعض تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ اردو زبان کی تاریخ کے متعلق یہ کتاب اہمیت رکھتی ہے۔

تذکرہ ریختی ۔ مؤلفہ سید تمکین کاظمی طباعت اور کتابت اوسط۔ کاغذ چکنا۔ حجم مع مقدمہ ۱۴۰ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ امداد باہمی۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد عیش کی یادگار ریختی بھی ہے یعنی زنانی زبان میں شاعری بہت سے لوگ ایسے تھے جو تعیش پسند طبقے کے لئے اس قسم کی شاعری کرتے تھے۔ ان میں جان صاحب نے خصوصیت کے ساتھ نام اچھالا۔ اور انکا دیوان ظریفوں کے لئے دلچسپی کا سامان بن گیا۔ سید تمکین صاحب نے اس کتاب میں ریختی کے ۴۳ شعرگویوں کے تذکرے بڑی کوشش سے فراہم کرکے مرتب کئے ہیں کتاب دلچسپ ہے۔ مقدمہ جو چالیس صفحوں میں لکھا گیا ہے ایک خشک بحث ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔

سلیقۂ تحریر ۔ نوشتہ مولوی محمد مسلم صاحب ایم اے۔ ایم او ایل۔ پروفیسر سینٹ کولمبیاز کالج۔ ہزاری باغ۔ صوبہ بہار۔ تقطیع خورد۔ حجم ۱۶۰ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عہ۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

مولوی محمد مسلم صاحب نے اردو انشاپردازی اور مضمون نگاری کی تعلیم کے لئے ایک زمانہ ہوا ایک رسالہ تعلیم التسوید کے نام سے شائع کیا تھا جو ملک میں مقبول ہوا۔ اب انھوں نے اسی رسالہ کو نظرثانی کرکے مفید اضافوں کے ساتھ مذکورۂ بالا نام سے شائع کیا ہے۔ اردو لکھنے والوں کو تحریر کا ڈھنگ سکھانے کے لئے میرے علم میں اب تک اردو زبان میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔

گائے اور اس کی تاریخی عظمت ۔ مصنفہ اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی چھوٹی تقطیع لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم ۶۰ صفحے۔ قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب عبرت نجیب آباد ضلع بجنور

محترم اکبر شاہ خاں نے اس چھوٹے سے رسالہ میں گائے کی تاریخی کیفیت نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم میں دکھائی ہے۔ انکا زاویہ نگاہ ہمیشہ سے محققانہ اور مصلحانہ ہے۔ انھوں نے اس رسالے میں گائے پرستی اور اس کی عظمت کی وجوہ تاریخ سے بیان کی ہیں۔ اور یہ بھی دکھایا ہے کہ وید اور

پرانوں کے بعد میں ہندوستان میں ہندو گائیں ذبح کرتے تھے۔ قربانی چڑھاتے تھے۔ کھاتے تھے۔ کھلاتے تھے۔ اور اس سے یہاں نوازی کہتے تھے۔ زمانہ مابعد میں زراعتی طبقہ میں گاؤ پرستی کا شرک پھیل گیا۔ مسلمانوں میں اکبر بادشاہ نے اس مشرکانہ عقیدہ اور عمل کو اور فروغ دیا۔ اس کے بعد موجودہ عہد میں گاؤ ہندو مسلم افتراق کے لئے آلہ کار بنائی گئی۔ یہ رسالہ پراز معلومات اور دلچسپ ہے۔

وید اور اس کی قدامت ۔ مصنفہ اکبر شاہ شاہ خانصاحب۔ چھوٹی تقطیع حجم چار جزو۔ قیمت ۴؍

ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب عبرت۔ نجیب آباد۔

اس رسالہ کا مضمون اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مصنف نے تاریخ کی روشنی میں دکھایا ہے کہ قدامت وید کا دعویٰ کس قدر غلط ہے۔ یہ رسالہ نہایت محققانہ ہے اور اگرچہ قامت میں کہتر ہے لیکن قیمت میں بہتر ہے۔

سفر حج کے متعلق مفید معلومات ۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے پبلسٹی لاہور نے حجاج کی آسانی کے لئے سال گذشتہ کی طرح امسال بھی یہ رسالہ شائع کر دیا ہے جس میں سفر حج کے متعلق جملہ ضروری معلومات کرائے۔ اخراجات وغیرہ درج کئے گئے ہیں جن کا جاننا قاصدین حرم کے لئے ازبس ضروری ہے جو لوگ سفر حج کا ارادہ رکھتے ہوں وہ اس رسالہ کی ایک کاپی مذکورہ بالا پتہ سے ضرور منگالیں جو انکو طلب کرنے پر مفت ملیگی۔ ہم مذکورہ پبلسٹی آفس کے شکرگزار ہیں کہ وہ حاجیوں کی راہنمائی کے لئے یہ معلومات شائع کرتی ہے۔ کاش جی۔ آئی۔ پی ریلوے بھی اس قسم کے رسائل شائع کرتی۔ کیونکہ بمبئی سے حج کو جانے والوں کی تعداد بہ نسبت کراچی کے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ناز و نیاز

از حضرت جگر مراد آبادی

ملا کے آنکھ نہ محروم ناز رہنے دے
تجھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے

میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر
یہ چشم مست ابھی نیم باز رہنے دے

یہ تیر ناز ہیں تو شوق سے چلائے جا
خیال خاطر اہل نیاز رہنے دے

ترے ہی شیوۂ عاشق کشی کی تجھکو قسم
اسی طرح مژہ ہائے دراز رہنے دے

ہٹا نہ سینۂ عاشق سے رخ کسی جانب
نگاہ ناز کو نشتر نواز رہنے دے

گلے سے تیغ ادا کو جدا نہ کر قاتل
ابھی یہ منظر ناز و نیاز رہنے دے

قتیل غمزۂ خوں ریز ہوں قصور معاف
اشارۂ نگہ دلنواز رہنے دے

خدا نے دی ہے یہ نعمت تو رکھ اسے بے عیب
غرور حسن کو تا حدِ ناز رہنے دے

لٹائے دولت کونین اور میرے لئے
بس اک تبسم عاجز نواز رہنے دے

بجھا نہ آتش پنہاں کرم کے چھینٹوں سے
دل جگر کو مجسم گداز رہنے دے

اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ کی چند قابل توجہ فروگذاشتیں

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی جانب سے " اردو زبان اور ادب " کے نام سے ایک رسالہ گذشتہ سال شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ ہے جس کو کمیٹی مذکور کے صدر سید ضامن علی صاحب ایم اے صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے مرتب فرمایا ہے۔ یہ رپورٹ بعض مخصوص وجوہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے اول تو یہ کہ ہندوستان کے عظیم الشان طول و عرض میں اردو زبان کی تنہا یہی ایک اکیڈیمی ہے، دوسرے یہ کہ اردو کی ترقی کے لئے گویا یہ ایک دستور العمل ہے جس پر نہ صرف ممبران اکیڈیمی بلکہ تمام ہمدردان اردو عمل کرینگے اس لئے اس رپورٹ میں کسی قسم کی غلطی یا فروگذاشت کا ہونا نامناسب ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر چند امور کا اظہار کیا جاتا ہے جو میری تحقیقات کے لحاظ سے بحث طلب ہیں۔

(۱) صفحہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے

" دکن میں اردو نہ محض پورے طور پر بولی جاتی تھی بلکہ رفتہ رفتہ ادبی زبان ہو گئی تھی اور ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ فارسی اور ریختہ کا زبردست شاعر تھا "

اس صراحت سے عام طور پر یہ سمجھا جائے گا کہ اردو زبان دکن میں ریختہ کے نام سے موسوم تھی حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں ولی اورنگ آبادی کے پہلے کسی نے بھی اس لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں اردو کو عام طور سے دکھنی یا ہندی سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ خاور نامہ میں کمال خاں رستمی کہتا ہے۔

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر بولیا معجزہ یو کمال خاں دبیر

مثنوی پھول بن میں ابن نشاطی کہتا ہے :-

اسے ہر کس کے تئیں سمجھا کون توں بول
دکھنی کے باتاں ساریاں کوں کھول

گلشن عشق میں نصرتی کہتا ہے:-

آ دیکھا ہو حد سون کباب
دکھنی بول اتنا جو دکھنی کتاب

میران یعقوب کہتے ہیں :-

" اپنی حیات کے وقت منجے ارشاد کئے تھے جون شمائل الاتقیا کتاب کون ہندی زبان میں لیاوے تا ہر کسی کو سمجھاوے "

ان عادل شاہی اور قطب شاہی نمونوں سے واضح ہو سکتا ہے عام طور سے دکن میں اردو کو دکھنی یا ہندی کہا جاتا تھا بلکہ اس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد بھی جنوبی ہند میں اردو کو انہی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ مولانا باقر آگاہ متوفی ۱۲۲۰ھ اپنے تصنیف ریاض الجنان میں لکھتے ہیں :-

" بعضے علماء ان مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس باب میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ پس تصنیف ہونا اس کا ہندی زبان میں معلوم۔ مگر یہ کہ ولی ویلوری و شیدائے حیدرآبادی دکھنی زبان میں۔۔ نسخے منظوم لکھے ہیں "

باقر آگاہ کی دیگر تصنیفات سے بھی ان ہی ناموں کا پتہ چلتا ہے :-

نہ تھا شان میرے کا یہ اقتضا
کہ ہندی زباں کا کرے اصطفا

ولے بعض یاروں کا ایما ہوا
سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا

(رسالہ فرقہائے اسلام)

ہے دکھنی میں مجکو مہارت بتی
کہ النصر منکم کہے نصرتی

کیا نظم دکھنی میں فائز اسے — سخن میں نہ تھی راہ ہرگز اسے

(قصہ رضوان شاہ)

۱۱۴۴ھ کے بعد قاضی بدرالدولہ متوفی سنہ ۱۲۸۰ھ نے بھی لفظ اردو یا ریختہ کا استعمال نہیں کیا بلکہ ہندی سے موسوم کرتے ہیں :-

"لیکن دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے . . . . . . اور کسی کو خواہشمند ہی نہیں پایا تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا" (فوائد بدریہ)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن میں دکھنی یا ہندی کا استعمال ضرور ہوا ہے ریختہ کا نام کسی نے نہیں لکھا۔

دکن میں سب سے پہلے ولی اورنگ آبادی نے لفظ ریختہ کا استعمال کیا ہے چنانچہ کہتا ہے :-

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو — رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

میرا خیال ہے کہ جس طرح جنوبی ہند میں اردو کا نام دکھنی رکھا گیا تھا اسی طرح شمالی ہند میں وہ پہلے پہل ریختہ سے موسوم ہوئی۔ ولی نے بھی اسکا استعمال اپنے سفر دہلی کے بعد کیا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ دکھنی شعرا کے قطع نظر شمالی ہند کے شعرا نے اس لفظ کا استعمال عام طور سے کیا ہے۔ میر کہتا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے — معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن تھا

قائم کہتا ہے :-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بہ زبان دکھنی تھی

اثر کہتا ہے :-

ریختہ نے یہ تب شرف پایا جبکہ حضرت نے اسکو فرمایا

شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں لکھا ہے :-

" در شعر فارسی پیروی مرزا صائب است در ریختہ ولی را استاد میداند "

میرے خیال کی تائید مولانا باقر آگاہ کے رائے سے بھی ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنی مثنوی گلزار عشق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

" ہندوستان (شمالی ہند) میں مدت تک زبان ہندی کہ اسے برج بھاکا کہتے ہیں رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان کی اصل اصول اور مرجع فنون فروع و اصول ہے پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص اس کے کھونے لگے سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی ہوئی "

آگے چل کر اسی دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

" مخفی نہ رہے تمام ریختہ گویوں میں سودا اعتبار نمایاں پایا . . . . بعضے اس قدر اس کے باب میں دفتر اغراق کا کھولتے ہیں کہ اس بیچارے کو سب شعرائے ریختہ گو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں "

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے شمالی ہند میں کس وقت سے ریختہ کا نام زبان کے لئے استعمال ہوا ؟

یہ فارسی لفظ ہے جس کے مختلف معنی لئے گئے ہیں جن کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ وہ کلام جو دو یا زیادہ زبانوں سے مخلوط ہو۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے اولاً امیر خسرو نے اس لفظ کو اردو میں

موسیقی کی اصطلاح قرار دیا تھا۔ چنانچہ مولانا مخدوم علاءالدین نے اپنے مرشد بہاءالدین کی سند پر امیر خسرو کی خدمات موسیقی کے ذکر میں ریختہ کے متعلق بیان کیا ہے :-

"و اصطلاح دیگر آں کہ ہر فارسی کہ با مضمون خیال ہندی مطابق باشد ظاہر دو زبان را در یک ال و یک لا ربست نمودہ باشند و انضمام و اتصال وادہ سرایند آں را ریختہ گویند"

معلوم ہوتا ہے کچھ عرصہ بعد شمالی ہند میں یہ لفظ جو موسیقی کی اصطلاح قرار دیا گیا تھا زبان کا نام ہو گیا۔ مگر جنوبی ہند میں عام طور سے وہ دکھنی اور ہندی سے موسوم تھی نہ کہ ریختہ سے۔ اس پوری تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ دکن میں اردو زبان ریختہ کے نام سے نہیں پکاری جاتی تھی۔

(۲) صفحہ ۱۲ پر بیان کیا گیا ہے :-

"دکن میں ریختہ کی شاعری کو روز افزوں ترقی ہوتی رہی علاوہ نظم کے نثر کی جانب بھی بعض نے جہانگیر کے عہد حکومت میں توجہ کی اسی عہد میں شجاع الدین نوری ہاشم برہان پوری کاظم علی رام راؤ اور سیوا نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ غواصی نے طوطی نامہ نخشبی کا ترجمہ کیا جس کا ایک مصرعہ ریختہ میں اور ایک فارسی میں ہے"

اس تحریر میں کئی ایک امور صحت طلب ہیں :-

(الف) شجاع الدین نوری کے مرثیوں کے اڈنبرا میں ہونے کا فٹ نوٹ دیا گیا ہے یہ بیان نصیر حسین خاں صاحب خیال کے مضمون سے اخذ کیا گیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اڈنبرا یونیورسٹی کے مرثیوں میں شجاع الدین نوری کا ایک بھی مرثیہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

(ب) ہاشم برہان پوری کو نوری اور کاظم علی کا ہمعصر خیال کیا گیا ہے یہ غلط فہمی اڈنبرا یونیورسٹی کے کیٹلاگ کے غلط اندراج کے باعث پھیلی ہوئی ہے جس میں ہاشم کو جہانگیر کے عہد کا

مخطوطہ کا ہونا ۱۱۰۰ھ میں موجود ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر مرثیوں کے مطالعہ کرنے سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ہاشم جو ہاشم علی برہان پوری ہے ولی کا ہمعصر ۱۱۶۹ھ میں زندہ تھا غرضکہ جو مرثیے اڈنبرا میں ہیں وہ ۱۱۶۹ھ والے ہاشم علی کے ہیں نہ کہ ۱۰۲۹ھ کے ہاشم کے۔ یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے ہاشم برہانپوری نے شیخ احمد سرہندی کا مرید تھا جس کا فارسی دیوان انڈیا آفس میں ہے کبھی اردو شاعری بھی کی ہے یا نہیں یہ ایک جداگانہ بحث ہے اس لئے نظر انداز کی جاتی ہے۔

(ج)۔ غواصی نے نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ کیا تھا جس کا ایک مصرعہ ریختہ اور ایک فارسی تھا۔ یہ بیان غالباً تذکرہ میر حسن سے ماخوذ ہے جس میں اس نے صراحت کی ہے:۔

"غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است زبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریختہ کہانی۔" (ص ۱۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ یہ بیان اصلیت سے بہت دور اور خلاف واقعہ ہے طوطی نامہ غواصی کو دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے یہ بیان کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے۔

میرا خیال ہے مولوی عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اردو نے کسی مضمون کے ضمن میں میر حسن کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ طوطی ناموں کے متعلق ہم نے تفصیل کے ساتھ ایک مضمون قلمبند کیا ہے جو نیرنگ خیال لاہور (جولائی ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ بطور ثبوت طوطی نامہ غواصی کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

رتن خاص دریاے لولاک کا — جھلک لامکاں نور افلاک کا
محمد نبی سید المرسلیں — سدا روشن اُتے دنیا ہور دیں

جن اس جواہراں کے سمندر کا گہیر — ہے غواص اس دور میں بے نظیر
سو لیو جواہراں کا رلیا نا ہے بہار — جو ملک ہندوستان میں ایک شہار

سمجھتے ہیں جو تھا کوئی سوداگر ایک وجاہت سنے پاک صورت میں نیک

جہاں میں جھلکتا اچھو جم مدام بحق محمد علیہ السلام

غواصی اگر تون ہے سچا غواص

لگا عشق اپنا خدا سات خاص

---

(۳) فہرست کتب کے جو ضمیمے دئے گئے ہیں ان میں اردوئے قدیم کے کتابوں کی صراحت بہت کچھ اصلاح اور ترمیم طلب ہے۔ اس کے دیکھنے سے قدیم کتابوں کے متعلق صحیح معلومات حاصل نہیں ہوتی بلکہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔

ذیل میں ایک فہرست دیجاتی ہے جس سے اسکی تصدیق ہوسکتی ہے۔

شمار	نام کتاب مع صراحت صفحہ	صراحت غلطی	صحت
۱	دیوان ریختہ سلطان محمد صفحہ ۶۰	ملنے کا پتہ غلط ہے	جیساکہ درج کیا گیا ہے یا انڈیا آفس میں ہے۔ صحیح نہیں ہے وہاں اسکا کوئی نسخہ نہیں ہے۔
۲	سیف الملوک غواصی صفحہ ۶۰	تاریخ تصنیف ۱۰۴۵ھ غلط ہے	دراصل صحیح تاریخ ۱۰۳۵ھ ہے
۳	قصہ چندر بدن صفحہ ۶۰	یہ عزیز کی تصنیف ہے	دراصل مقیمی کی تصنیف ہے نہ کہ عزیز کی
۴	طوطی نامہ غواصی	ملنے کا پتہ غلط ہے	جیساکہ ذکر کیا گیا ہے پیرس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے بلکہ برٹش میوزیم میں دو نسخے ہیں۔
۵	خاور نامہ	کمال خاں کا تخلص رسمی غلط ہے	دراصل رستمی تخلص ہے۔

شمار	نام کتاب مع صراحت صفحہ	صراحت غلطی	صحت
۶	علی نامہ صفحہ ۶۲	سالارالملک کے کتب خانہ کا وجود نہیں ہے اس لئے ملنے کا پتہ درست نہیں ہے۔	انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے علاوہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے
۷	مثنوی پھول بن صفحہ ۶۲	تاریخ تصنیف غلط ہے	صحیح سنہ [illegible] ہے۔
۸	مراثی منشی شجاع الدین نوری صفحہ ۶۴	ملنے کا پتہ	اڈنبرا میں کوئی مرثیہ انکا نہیں ہے
۹	مثنوی یوسف زلیخا ہاشمی	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔
۱۰	قصہ فیروز شاہ صفحہ ۶۶	اسکا وجود ہی غلط ہے	کوئی کتاب اس نام کی نہیں ہے۔
۱۱	یوسف زلیخا امین صفحہ ۶۶	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں اسکا کوئی نسخہ نہیں ہے بلکہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں ہے۔
۱۲	مثنوی من لگن صفحہ ۶۶	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں اسکا کوئی نسخہ نہیں البتہ سرامین جنگ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ ہے۔
۱۳	قصہ رتن پدم صفحہ ۶۶	سنہ تصنیف اور ملنے کا پتہ غلط درج کیا گیا ہے	صحیح سنہ تصنیف غیر معلوم ہے انڈیا آفس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔
۱۴	روضۃ الشہدا صفحہ ۶۶	سنہ تصنیف غلط ہے اور ملنے کا پتہ درج نہیں	صحیح سنہ تصنیف ۱۱۳۰ھ ہے انڈیا آفس کے علاوہ میرے پاس بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔

۱۵	پنچھی باچھا صفحہ ۶۰	مصنف کا نام اور سنہ تصنیف غلط ہے	وجدی کی تصنیف ہے ۱۱۵۸ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔
۱۶	قانون اسلام صفحہ ۹۴	ملنے کا پتہ غلط ہے	انڈیا آفس میں کوئی کتاب نہیں ہے
۱۷	مراثی مرزا صفحہ ۹۴	ملنے کے پتہ کی صراحت نہیں ہے	اڈنبرا یونیورسٹی کے بیاض میں اس کے مرثیے موجود ہیں
۱۸	سب رس صفحہ ۶۰	ملنے کا پتہ نہیں ہے	کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

یہ ایک مختصر فہرست بطور نمونہ دی گئی ہے ورنہ اور طویل فہرست ہو سکتی ہے۔

(۴) قدیم کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے وہ نہایت عجلت سے مرتب کی گئی ہے جیسا کہ خود مولف صاحب نے لکھا ہے۔

" دو مہینے کی قلیل مدت ملاحظہ ہو اور پھر دو زبان و ادب کے بحر ذخار کی شناوری ...

... اردو ادب کا سرمایہ ایسا کثیر ہے کہ اس کے احصار اور شمار کے لئے دو مہینے تو کیا دو برس کی مدت بھی کم ہے "

یہ خیال بالکل درست ہے کیونکہ زیر بحث فہرست موجودہ قدیم ذخیرے کے ½ حصے کے مساوی قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر اکیڈیمی ایک مکمل فہرست ہی تیار کرے تو بڑا کام ہو گا۔ ہندوستان کے کتب خانوں کے قطع نظر خود یورپ میں اردو کا جس قدر قلمی ذخیرہ ہے اس کی فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے چند مخطوطوں کی فہرست دیجاتی ہے جو زیر بحث فہرست میں نہیں ہیں۔

شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تصنیف	ملنے کا پتہ
۱	قطب مشتری	وجہی	۱۰۱۸ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۲	مصیبت اہل بیت	آسمد	؟	"
۳	پدماوت	غلام علی	۱۰۹۱ھ	"

۴	قصہ حسنی	خواص علی	سنہ ۱۰۹۰ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۵	قصہ بہرام وحسن بانو	امین ودولت	سنہ ۱۰۵۰ھ	برٹش میوزیم
۶	ہشت بہشت	ملک خوشنود	سنہ ۱۰۵۶ھ	"
۷	عشق صادق	ضعیفی	سنہ ۱۱۰۰ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۸	جنگ نامہ حیدر	اشرف	سنہ ۱۱۲۵ھ	برٹش میوزیم
۹	غوث نامہ	ذوقی	سنہ ۱۱۰۹ھ	"
۱۰	دیوان حسینی (مراثی ہاشم علی)	ہاشم علی	سنہ ۱۱۶۹ھ	اڈنبرا یونیورسٹی
۱۱	شوہر نامہ	صابر	سنہ ۱۱۵۶ھ	برٹش میوزیم
۱۲	سوداگر کی بی بی	؟	سنہ ۱۱۶۴ھ	"
۱۳	عقد فاطمہ	مخدوم حسینی	سنہ ۱۱۶۴ھ	انڈیا آفس
۱۴	معجزات رسالت	"	"	"
۱۵	دیوان عاجز	عارف الدین عاجز	"	قومی کتب خانہ پیرس
۱۶	اسلام عمر	عبد اللہ مکنہ	سنہ ۱۱۷۰ھ	کتب خانہ انڈیا آفس
۱۷	روضۃ الصالحین	غلام حسین	سنہ ۱۲۰۸ھ	برٹش میوزیم
۱۸	جنگ بھاؤ مرہٹہ و شاہ درانی	؟	سنہ ۱۲۰۰ھ	انڈیا آفس
۱۹	دیوان چندا	مہ لقا بائی چندا	سنہ ۱۲۱۳ھ	"
۲۰	دیوان شاداں	چندو لعل	سنہ ۱۲۵۰ھ	"

مزید فہرست بخوف طوالت نظر انداز کیجاتی ہے، بہر حال اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث فہرست نامکمل اور ناقص ہے امید ہے کہ اکیڈمی اس پر غور کرے گی۔

رستم پاشا

صفدر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ کمیاں اس کے ارد گرد اڑ رہی تھیں دروازے کے پاس ہی صحن کی طرف اس کی بیوی بھی بظاہر کسی کام میں مصروف تھی۔ اگرچہ صفدر کی آنکھیں کتاب پر تھیں لیکن اس کا دل کہیں اور تھا۔ پریشانی اس کے چہرہ سے صاف عیاں تھی وہ کبھی کبھی بے اختیار ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگ جاتا جیسے کسی چیز کو یاد کر رہا ہو۔ اس کی بیوی صفدر کی ان حرکات کا بغور مطالعہ کر رہی تھی۔ آخر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا "آپ کو کس چیز کی یاد ستا رہی ہے "

"کسی چیز کی نہیں کل عدالت میں جانا ہے "

"ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن آپ کے خلاف بات کونسی ہے "

"یہ مجھے خود معلوم نہیں۔ کل میں نے غلام رسول کو پیٹا تھا شاید یہی قصہ ہو لیکن اس کی مجھے پروا نہیں ہے "

"ہاں یہ تو کچھ نہیں۔ لیکن شاید رستم پاشا والا معاملہ ہو "

اس بات نے صفدر کے دل میں ایک جوش پیدا کر دیا۔ رستم پاشا، رستم پاشا اس کی زبان سے کئی مرتبہ نکلا میرا پیارا گھوڑا۔ میری جان سے عزیز گھوڑا۔ آہ رستم . . .

بغیر کچھ کہے وہ اٹھا۔ دروازہ کھول مکان سے باہر نکل گیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ ہوا میں بھی کسی قدر خنکی آ گئی تھی۔ مکان کے پاس ہی اس کا کھیت اور ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ وہ باغیچے میں بہت دیر تک ٹہلتا رہا۔ بالکل خاموش۔ اس کے چہرہ سے حسرت و افسردگی ٹپک رہی تھی۔ آخر کار وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ اسے آج سے چار برس پیشتر کے واقعات یاد آ گئے۔

صفدر کو وہ دن ابھی یاد تھا کہ جب گاماں نے گاؤں میں آ کر دکان کھولی اور کھانے پینے

کئی دوکانیں شروع کی تھیں۔ اس وقت سے گاؤں کے کسی شخص کو بھی شہر جانیکی ضرورت نہیں۔ ہر ایک گاماں کی دوکان سے چیزیں خریدتا۔ اتنی دور شہر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ گاماں ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتا۔ ہر کسی کو جھک کر سلام کرتا۔ وہ ہر ایک کا نوکر تھا۔ اس نے لوگوں کو قرض دے کر پھانس لیا تھا۔ "تمہیں گیہوں کی ضرورت ہے؟" وہ کہا کرتا "اچھا لے جاؤ دام؟ دام پھر دے دینا۔ کیا جلدی ہے" لوگ اس جال میں آسانی سے پھنس جاتے تھے لیکن ایک سال کے بعد اسکا ہی کمایا [illegible] تھا

ہر ایک آدمی شادی بیاہ کے موقع پر گاماں ہی سے قرض لیتا۔ بیشک وہ اناپ شناپ سود لیتا تھا لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ روپے کی ضرورت کس کو نہیں تھی۔ ہر ایک کو ضرورت تھی اور صفدر کو سب سے زیادہ۔

لیکن تین سال کے بعد کیا ہوا۔ گاماں جو پہلے ہر ایک کا نوکر تھا اب ہر ایک کا آقا بن بیٹھا۔ وہ اب اکڑ کر چلتا۔ لوگ اسے سلام کرتے۔ گاماں سے اب چودھری غلام رسول بھی ہو گیا تھا۔ کسانوں کا غلہ کھیتوں سے ہی اٹھوا کر لے جاتا۔ کئی زمینیں اس کی ہو گئیں۔ مکان اس کے ہاتھ آگئے۔ لیکن قرض تھا کہ کم نہیں ہوتا تھا۔

سب سے زیادہ تکلیف صفدر کو تھی۔ ان دونوں کے مکان اور کھیت ایک دوسرے سے ملے تھے۔ صفدر قرض کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدن سے گوشت نوچا جا رہا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر اس قرض سے نجات مل جائے تو در بدر بھیک مانگنے کو تیار ہوں۔ اس فکر سے رات کو وہ سوتا نہیں تھا۔ اسکا چہرہ ذرا سا نکل آیا تھا۔

اس مصیبت اور ابتلا کے وقت اس کا ایک مددگار تھا — رستم پاشا۔

رستم پاشا کتنا پیارا گھوڑا تھا۔ اس کی کھال سلک کی طرح تھی۔ سانچہ میں ڈھلا ہوا جسم، اس کی لانبی سیاہ دم۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ۔ اس کی آنکھیں غزال کی آنکھوں کو مات کرتی تھیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ اس کی طبیعت کتنی اچھی تھی۔ کتنا فرمانبردار اور مطیع۔ چابک کی ایک ضرب بھی اس کے لئے ذلت تھی۔ کیسی شاہانہ چال سے چلتا تھا۔ شام کو کس طرح وہ پیار اور محبت سے صفدر کے ہاتھ چاٹا کرتا تھا۔

[illegible] گا اس مستقبل میں پہلے کبھی دوڑ تا رہا نہیں تھا۔ تمام لوگ اس بات میں
[illegible] اس مسر[illegible] میں مشکل ہی کہیں ہوگا۔

[illegible] صفدر کو زیادہ تنگ کرنے لگا اور عدالت تک پہنچنے کی دھمکی بھی دی تو اس نے
[illegible] سے نکلا۔ ایک چھوٹی ہلکی سی گاڑی میں جوتا اور کسی اچھے وکیل سے مشورہ لینے کے
لیے روانہ ہوا۔ اس کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس کے ذمہ اتنی بڑی رقم کبھی نہیں ہو سکتی۔
[illegible] ان چیزوں کی حقیقت ہی کیا ہے یقیناً چودھری کے حساب میں غلطی ہے۔

صفدر کو یہ سفر بھی اچھی طرح یاد تھا۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ پھر بھی جا رہا تھا۔ اس کو سخت سردی معلوم ہوتی تھی۔ وہ بار بار اپنے اوپر کمبل ڈالتا۔ لیکن اس کا گھوڑا کتنے وقار کے ساتھ سے چل رہا تھا جیسے اس کو کسی چیز کا احساس ہی نہیں ہے۔ جب وہ میرٹھ سے ایک میل کے فاصلے پر تھا تو اس نے پیچھے قریب ہی ایک اور گاڑی کی آواز سنی۔ یہ گاڑی جلدی ہی اس کے پاس پہنچ گئی اور ایک آدمی نے جس کے لباس سے اس کی شان کا اظہار ہو رہا تھا۔ صفدر کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا اور کہا

"بھئی یہ گھوڑا تمہارا ہے۔ میں نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ اسی لئے تمہارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ یہ تم نے کہاں سے لیا۔ کونسی نسل سے ہے۔ عمر کیا ہوگی"

یہ کہتے ہوئے اجنبی اپنی گاڑی سے اترا اور قریب سے رستم پاشا کو اچھی طرح دیکھے۔ صفدر بہت ہی خوش ہوا اور ادب سے جواب دیا۔

"بہت اچھا گھوڑا ہے" اجنبی نے پھر کہا "پرسوں یہاں چھاؤنی کے پاس گھوڑدوڑ ہے۔ تم ضرور لانا۔ آؤ گے نا! تمہارا فرض ہے۔ میرا نام کپتان ہیرا سنگھ ہے۔ میرا خیال ہے تم اول انعام حاصل کرو گے۔ پہلا انعام ایک ہزار روپے کا ہے۔"

صفدر نے گھوڑدوڑ میں شامل ہونے کا وعدہ کیا۔ اور کپتان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ بات کی بات میں رستم پاشا کپتان کی خواہشمند نظروں سے غائب ہو گیا۔

صفدر نے اپنا گھوڑا گھوڑ دوڑ میں شامل کر دیا۔ کتنے اچھے دن تھے۔ کامیاب دن۔ رستم پاشا اور اس کے مالک کی کتنی عزت تھی۔ صوبہ بھر میں کوئی ایسا اخبار نہیں تھا جس نے رستم پاشا کی تعریف میں کچھ نہ کچھ لکھا ہو۔ دور دراز رستم پاشا کے جیتنے کے تار روانہ کئے گئے اس نے بڑے بڑے اور مشہور گھوڑوں کو سخت شکست دی تھی۔ یہ وقت یاد کر کے اب بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ اس کو وہ دن جب کہ بینڈ باجا بج رہا تھا۔ لوگ جمع تھے طرح طرح کی دلچسپیاں تھیں اچھی طرح سے یاد تھا۔ لیکن دنیا ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ ہر کمال کے لئے زوال ضروری ہے۔ صفدر کے لئے یہ انتہائی عروج و کامرانی کے دن تھے۔

کسی وکیل نے بھی صفدر کی قرض کے متعلق ہمت نہیں بڑھائی۔ کیونکہ اسی دوران میں غلام رسول نے عدالت میں دعوےٰ دائر کر دیا تھا اور اس کے حق میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ صفدر کو اصل اور سود دونوں دینا لازمی تھا نہیں تو جیل خانے کی تاریک کوٹھریاں اس کے انتظار میں تھیں۔ سود اور اصل کئی ہزار ہو گیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جان سے عزیز رستم پاشا کو فروخت کر دیا جائے۔ آخر کار یہ معاملہ بھی طے ہو گیا اور میرٹھ کے ایک مشہور سوداگر نے گھوڑے کو خرید لیا۔ صفدر گاؤں واپس لوٹا۔ لیکن پریشان پاگل۔ غصہ سے اس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔

وہ سیدھا غلام رسول کی دوکان پر گیا۔ اس کو روپئے دئے۔ کاغذات اور رسیدیں لے کر جیب میں ڈالیں لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ اس وقت سے ان دونوں کے درمیان سخت دشمنی ہو گئی

اب صفدر قرض سے آزاد تھا لیکن رستم پاشا کے بغیر یہ آزادی فضول تھی۔ اس کے لبوں سے ہنسی مفقود ہو گئی تھی۔ ہر وقت اداس رہتا۔ کبھی کبھی اخباروں میں رستم پاشا کے متعلق خبریں اس کے زخموں پر نمک کا کام دیتی تھیں "مشہور رستم پاشا سہارنپور کی گھوڑ دوڑ میں اول آیا ہے" یا "فلاں جگہ رستم نے اپنی شہرت کو برقرار رکھا" اس وقت صفدر بالکل پاگل ہو جاتا۔ اس کے ہوش و حواس درست نہ رہتے وہ تنہائی میں روتا تھا۔

آخر ایک روز اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ پھر سے رستم پاشا کو حاصل کر کے رہیگا۔ ان چند مہینوں

میرا بیٹا کا کیا ہوگا ؟ میرے ساتھ قبر تک تو جائیں گے نہیں۔ رستم پاشا کے بغیر زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔ میرا بیٹا نالائق لڑکا میری دولت پر دانت جمائے بیٹھا ہے۔

ایک مہینہ کی لگاتار کوششوں اور دقتوں کے بعد اس کی زمین کے گاہک پیدا ہو گئے۔ اب وہ میرٹھ جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس کو یقین تھا کہ سوداگر جس کے پاس کئی گھوڑے ہیں وہ رستم پاشا کو ضرور دے دیگا۔ اس کے علاوہ وہ بہت نیک اور مہربان ہے۔ جس روز وہ میرٹھ جانے والا تھا اسی صبح کو جب وہ بستر سے اٹھا تھا اس نے ایک آواز سنی۔ اس آواز کو صفدر اچھی طرح جانتا تھا یہ تو اس کے پیارے گھوڑے رستم کی آواز ہے۔ وہ دیوانہ وار باہر نکلا۔ اس کے دشمن کے کھیتوں میں اس کا پیارا گھوڑا اکڑا تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس کے پاس جا پہنچا حیرت سے اس کی آواز بھی نہیں نکلتی تھی۔ وہ بچوں کی طرح اُسے پیار کرنے لگا۔ اس سے لپٹ گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک یہ حالت قائم رہتی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ غلام رسول کی آواز تھی۔ اس نے ڈانٹ کر کہا "یہ گھوڑا میرا ہے۔ آئندہ سے اس کی احتیاط رکھو۔"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو بالوں سے پکڑا اور ایک چابک رسید کر کے اصطبل میں لے گیا۔ رستم پاشا کے بال نوچنا اور اُسے چابک لگانا ؟ آج تک کسی نے نہیں سنا تھا۔

اس وقت سے صفدر کی زندگی بد سے بدتر ہو گئی۔ کھانا پینا حرام ہو گیا۔ صفدر جو کسی زمانے میں طاقت کے لئے مشہور تھا کمزور و ناتوان ہو گیا۔ اب رستم پاشا کسی داموں بھی اس کے ہاتھ نہیں آسکتا تھا۔ دنیا میں لوگ کہتے ہیں کوئی چیز ناممکن نہیں لیکن ایسا ہونا یقیناً ناممکنات سے تھا۔

جون کا مہینہ تھا سخت گرمی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ صفدر نے صرف دل بہلانے کی خاطر کمرہ سے بندوق اٹھائی اور قریب کے جنگل میں شکار کے لئے چلا گیا شام کو تھکا ماندا گھر واپس آیا اور باہر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک غلام رسول کے کھیت میں اس نے رستم پاشا کو کھڑا دیکھا۔ رستم پاشا نے اپنا سر اٹھایا اور ہنہنایا جیسے صفدر کو پکار رہا ہو۔ صفدر بے چین ہو کر نتائج سے بے پروا ہو کر اس کے پاس جا پہنچا۔ گھوڑے نے اپنا سر صفدر کے کاندھوں پہ

رکھدیا۔ صفدر بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے رستم کو پیار کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے کئی جگہ زخموں کے نشان معلوم ہوئے۔ یہ غلام رسول کی چابکوں کا نتیجہ تھے۔ صفدر کو بڑا غصہ آیا اور اس نے بلند آواز سے کہا۔ میرے پیارے دوست میں اس ظالم کے ظلم اور چابکوں سے تمہیں ابھی آزاد کئے دیتا ہوں " بغیر سوچے سمجھے اس نے بندوق اٹھائی اور ایک ہی منٹ کے بعد رستم پاشا اس کی تمنائیں اور آرزوؤں کا مرکز خاک و خون میں لتھڑا زمین پر مردہ پڑا تھا۔ صفدر قاتل کی طرح جنگل میں بھاگ گیا لیکن نصف گھنٹہ کے بعد ہی واپس آکر تمام ماجرا اپنی بیوی سے کہہ ڈالا۔

دوسرے دن جب صفدر عدالت میں جانیوالا تھا اسکی بیوی نے کہا۔ میں نے سنا ہے کہ اس مقدمہ میں اسکا کوئی گواہ نہیں "

"گواہ ہو یا نہو" صفدر نے لاپروائی سے کہا" وہ چاہے مجھے کیسی ہی سزا دیں میں عدالت میں تمام واقعات بیان کر دوں گا "

سوڈان میں مصری قربانیاں

محمد علی پاشا اعظم کے زمانہ سے پہلے مصر میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ جب محمد علی پاشا والی مقرر ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے مصر سے طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیا تو اسکو اپنی پوری توجہ سوڈان کی طرف مبذول کرنے کا موقع ملا۔

اس وقت سوڈان کے مختلف حصوں پر شاہان "سنار" نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے اور سوڈانیوں کے جان و مال کو اپنی جنگجوئی کی خواہش پر قربان کرتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ قبائل ہمج کا اثر وزارت پر بہت تھا جس کے ذریعہ وہ حکومت پر بہت کچھ غلبہ پا چکے تھے

جب محمد علی پاشا کو سلطنت سنار کے ضعف اور اس کی خانہ جنگیوں کی اطلاع ہوئی تو روس نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ سوڈان پر فوج کشی کیجائے یا نہیں اور اگر کیجائے تو اس کا کیا یہی بہترین وقت ہے؟

حقیقت میں سوڈان پر محمد علی پاشا کو حملہ کے لئے آمادہ کرنیوالے حسب ذیل اسباب تھے۔

۱۔ ملک سنار میں سونے کی وہ مشہور کانیں تھیں جن کے شہرے تمام دنیا میں عجیب عجیب حکایات کے ساتھ پہنچے ہوئے تھے۔

۲۔ ملک سنار میں وہ قبائل آباد تھے جو زمانہ فراعنہ سے اس وقت تک اپنی عسکری قابلیت، جنگی لیاقت، مستعدی اور جفاکشی میں مشہور رہے۔ خیال تھا کہ یہ قبائل محمد علی پاشا کی فوج میں شامل ہوں تو وہ دنیا کو آسانی سے فتح کر سکتا ہے

۳۔ جو بادشاہ و امراء مصر سے محمد علی پاشا کے تسلط سے خائف ہو کر فرار ہوئے تھے وہ بھی انہی ممالک میں پناہ گزیں تھے محمد علی پاشا کو خیال تھا کہ اگر وہ اسی طرح چھوڑ دئے گئے تو جب انکو موقع ملے گا اس کے خلاف کارروائی کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔

۴۔ ملک سنار وغیرہ میں محمد علی پاشا کی افواج کے لئے (جو ترکوں اور البانیوں پر زیادہ مشتمل تھی)

معاش کے ذرائع بہت کثرت سے تھے۔ ان لوگوں کا پیشہ ہی جنگ کرنا اور اس کے ذریعہ روزی حاصل کرتے رہنا تھا۔ اگر انکو روکا جاتا تو وہ زیادہ عرصہ تک خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ اور خود ملک میں فتنہ پیدا کر دیتے۔ اور محمد علی پاشا کے لئے مشکلات پیدا ہو جاتیں۔

۵۔ سنار و سوڈان میں مصری پیداوار کے لئے کافی موقع تھا اور ان ممالک کی پیداوار مصری بازاروں میں جا سکتی تھی۔

ان جملہ اسباب پر نظر کر کے محمد علی پاشا اعظم نے ایک لشکر اپنے فرزند اسمٰعیل پاشا کی سرکردگی میں سوڈان کے خلاف ۱۸۲۰ء میں تیار کیا جس میں صرف چار ہزار سپاہی تھے۔ یہ لشکر جون ۱۸۲۰ء میں مصر سے روانہ ہو کر سوڈان میں داخل ہوا۔

یہ لشکر بربر کے بعد دیگرے شہروں پر قبضہ کرتا ہوا جنوب کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ قبائل کے شائخ، امرا اور بادشاہ اطاعت کرتے اور امان حاصل کرتے رہے۔ اسمٰعیل پاشا ان امیر و ملوک و شیوخ کو انکی جگہہ بدستور بحال کرتے رہے اور آگے بڑھتے چلے گئے چنانچہ ممالک سکوت و حسن درم وغیرہ پر اسمٰعیل پاشا کا قبضہ ہو گیا۔

اب اسمٰعیل پاشا ممالک شائقیہ کی طرف بڑھا یہاں تین مختلف بادشاہ حکمراں تھے۔ اسمٰعیل پاشا نے ان کو اطاعت قبول کرنے کے لئے لکھا اور ظاہر کیا کہ محمد علی پاشا میرے والد کی مرضی یہی ہے کہ آپ صاحبان اپنے ہتھیار اور گھوڑے ہمیں دیدیں جنگ چھوڑ دیں اور مقررہ وقت پر محصول اطاعت (جسے جزیہ کہتے ہیں) ادا کرتے رہیں۔ انہوں نے جواب میں یہکہا کہ جزیہ تو ہم بلا جنگ کے بھی ادا کر سکتے ہیں لیکن ہتھیار اور گھوڑے بغیر جنگ کے نہیں دے سکتے۔ اس پر فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔ لشکر شائقیہ میں ایک عورت مہرہ نامی تھی جو ملک کے کسی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ وہ بھی میدان جنگ میں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی فوج کو گرما رہی تھی اور چلا چلا کر ان کو جنگ کی ترغیب دیتی اور کہتی تھی کہ مجھ پر اور اس کی فوج پر دشمن کا کوئی حربہ اثر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہم مقدس چوغہ پہنے ہوئے ہیں

"لوگو۔ حملہ کر دو اور مصریوں کی صفیں توڑ دو۔ بہت جلد انکو شکست ہو جائے گی۔"

یہ جنگ بہت مدت تک ہوتی رہی لیکن آخر میں افواج شائقیہ کو شکست اور اسمٰعیل پاشا کو فتح نصیب ہوئی۔ اب "کورتی" میں اسمٰعیل پاشا نے کچھ روز قیام کیا تاکہ انکی فوج کو آرام ملجائے اور تازہ دم کمک ملنے بھی مصر سے آجائے چنانچہ اس کے آنے کے بعد اسمٰعیل پاشا نے بربری ملکوں پر حملہ شروع کر دیا۔ سلاطین بربر مطیع ہوتے گئے اور امن حاصل کرتے رہے۔ اسمٰعیل پاشا بھی انکو بدستور ان کے ملک پر بحال کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں شاہ نمر" شاہ شندی" اور قبائل شنار زمین، کیاشیں اور حانیہ کے مشائخ بھی تھے۔ ۰ رمئی ۱۸۲۱ء تک اسمٰعیل پاشا خرطوم میں داخل ہو گئے۔ اور خرطوم کی فتح نے اس مہم کو پورا کر دیا۔

اب اسمٰعیل پاشا کا قصد ہوا کہ ملک " سنار" پر بھی قبضہ کرنا چاہئے۔ یہ ملک شاہ " بادی" کے زیر حکومت تھا جو زنگی قبائل کا آدمی تھا اگرچہ اس کی طرف سے حکومت اسکا وزیر " مدلان" نامی کر رہا تھا۔

اسمٰعیل پاشا نے بادشاہ کو اطاعت کے لئے لکھا اس نے جواب میں جو خط لکھا ہے وہ تاریخ کی ایک مشہور اور مستند دستاویز ہے جو حسب ذیل ہے۔ "جن شاہوں کے مقابلے میں تم کامیاب ہو کر مغرور ہو گئے ہو وہ حقیقت میں بادشاہ نہیں بلکہ ہماری رعایا تھے۔ اب تم بادشاہ تک پہنچے ہو۔ تمہاری تواضع عمدہ، جوہر دار ہندی تمواروں سے کیجائیگی۔ ہمارے ملک کو تم ہر طرح سے محفوظ پاؤگے اور ایسا جرار لشکر اس کی حفاظت پر تم کو نظر آئیگا۔ کہ اس سے پہلے تم نے ایسا لشکر کہیں نہ دیکھا ہوگا جن کا معمولی مشغلہ دن رات جنگ ہی کرنا ہے"

چنانچہ لڑائی شروع ہو گئی لیکن حسن اتفاق سے عین حالت جنگ میں وزیر مدلان کے بعض دشمنوں نے وزیر پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا۔ اور عین حالت جنگ میں سنار کی فوج آپس میں پھوٹ پڑجانے سے شکست کھا گئی اسمٰعیل پاشا دار السلطنت سنار میں داخل ہوا بادشاہ بادی اس کے استقبال کے لئے آیا اور اطاعت کی۔ اسمٰعیل پاشا نے اس ملک پر انکی حکومت برقرار رکھی۔ اور اپنا جنگی ہیڈ کوارٹر وہاں قائم کر دیا۔ ملک سنار کی طرف سے اسمٰعیل پاشا کی سلامی میں توپیں سر کی گئیں۔ علماء داعیان

دولت ہسنے بیعت اطاعت کر لی۔

جب ملک سنار کی فتح بھی مکمل ہوگئی تو اسمٰعیل پاشا ملک "فازوغلی" کی فتح کے ارادے سے آگے بڑھا۔ لیکن اس کا بادشاہ اسمٰعیل پاشا سے ملاقات کے لئے آیا اور اس نے اظہار اطاعت بھی کیا اور اس کا عام اعلان اپنے ملک میں کر دیا۔

اسمٰعیل پاشا کو فازوغلی پہنچنے کا بہت شوق تھا کیونکہ اس نے وہاں کے سونے کی کانوں کا حال سنا تھا اور اسکی عجیب عجیب حکایات و قصص وہ سنتا رہتا تھا۔ . . . جب وہ فازوغلی جا رہا تھا تو اُسکا گزر ملک "کامیل" میں ہوا۔ اس کے ہمراہ فرانسیسی قوم کے چند ماہران علم طبقات الارض بھی تھے انہوں نے ایک جگہ زمین کھودی تو ایک عدیم المثال سونے کا ٹکڑا ان کو ملا اور ان لوگوں کو یقین ہوگیا کہ یہاں کثرت سے سونا ہے

اسمٰعیل پاشا فازوغلی کے خیال میں رہا اور سونے کی کانوں کی تلاش اور سونے کی کھدائی میں مصروف تھا ادھر اہل سنار بغاوت پر آمادہ ہوگئے جب بغاوت کی اطلاع اسمٰعیل پاشا کو ہوئی تو بہت تیزی سے واپس آیا اور اس فتنہ کو ٹھنڈا کر دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بالکل فرو نہ ہوا بلکہ دب گیا۔

سنار میں اسکو معلوم ہوا کہ شاہ نمر و شاہ شندی بغاوت کا انتظام کر رہے ہیں چنانچہ یہ خبر پاتے ہی فوراً ان لوگوں کی طرف واپس ہوا اور وہ دسمبر ۱۸۲۲ء میں شندہ پہنچ گیا۔ اور شاہ نمر پر جزیہ مقرر کیا جس کی مقدار ہزار اوقیہ سالانہ سونا ایک ہزار اونٹ، ایک ہزار سانڈنیاں، ایک ہزار گائے۔ ایک ہزار بکریاں، ایک ہزار غلام اور ایک ہزار لونڈیاں تھی۔

اس جزیہ کے سبب بادشاہ نے بظاہر تو اطاعت قبول کر لی لیکن حقیقت میں وہ اسمٰعیل پاشا کا جانی دشمن بن گیا اور درپردہ انتقام کی فکر کرتا رہا — چنانچہ ایک روز ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام شاہ نمر نے اپنے قصر میں کیا۔ اور اسمٰعیل پاشا کو بھی مع اس کی فوج کے مدعو کیا۔ جو کھانا اسمٰعیل پاشا اور اس کی فوج کے لئے تھا اس میں منشی چیزیں ملی ہوئی تھیں۔ یہ جلسہ دعوت بہت دیر تک ہوتا رہا طبلہ کھڑک رہا تھا۔ ناچ ہو رہا تھا اور گانے والوں کی آواز ان غافلوں کو مدہوش بنا رہی تھی یہاں تک کہ جب

نشہ پہلا پورا اثر کر چکا تو یہ سب بے خود اور بیہوش ہو ہو کر گرنے لگے اور گہری نیند میں سو گئے اس وقت شاہ نمر نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا۔ اسمٰعیل پاشا کے حالات بیان کئے اور اس کے شدید مطالبات ظاہر کر کے لوگوں کو اس پر آمادہ کر لیا کہ ان غافلوں کو اسی مدہوشی کے عالم میں قتل کر دیا جائے اور اس پر عمل اس طرح کیا گیا کہ شاہ نمر کے لوگوں نے ان مدہوشوں کے چاروں طرف لکڑیاں جمع کیں اور اس عظیم الشان انبار میں آگ لگا دی . . . . اب لشکر کے بعض بعض لوگوں کو ہوش آیا تو اپنے چاروں طرف آگ ہی آگ نظر آئی۔ اور اس سانحہ کو دیکھتے ہی یقین ہو گیا کہ "ہم سب کی موت یقینی ہے" اور موت کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں۔ یہ لوگ اسمٰعیل پاشا کی محافظت کے لئے دوڑے لیکن ان میں سے کسی کا بھی آگ سے بچ جانا ناممکن ہو چکا تھا۔ جو لوگ اوپر کے درجے میں تھے وہ آگ سے جل کر اور جو نیچے کے درجے میں تھے وہ دھوئیں سے گھٹ کر مر گئے۔

اسمٰعیل پاشا اور اس کی فوج کی موت کی خبر سوڈان اور مصر میں پھیل گئی اور اس خبر کے شہرت پاتے ہی تمام بادشاہ اور شیوخ جو مطیع ہو چکے تھے سب باغی ہو گئے اور جو فتح مصر کو حاصل ہوئی تھی وہ اس سے پھر ایک دفعہ محروم ہو گیا۔

محمد علی پاشا نے ایک اور لشکر اپنے داماد محمد بیگ دفتردار کے زیر قیادت ترتیب دے کر روانہ کیا تھا۔ کردفان کا لشکر جدید اسلحہ اور بندوقوں سے آراستہ تھا لیکن انجام کار یہ تمام معرکے ایک عرصے کی جنگ کے بعد ختم ہوئے جس میں محمد بیگ دفتردار کو فتح نصیب ہوئی۔ اور دارفور کی فوجوں کو کامل شکست ہو گئی۔ اس وقت محمد بیگ دفتردار کو اسمٰعیل پاشا کی موت کی خبر پہنچی چنانچہ وہ فوراً دارفور سے شندی کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر اس نے تمام شہر کو جلا دیا شاہ نمر فرار ہو گیا لیکن دفتردار برابر اس کے تعاقب میں چلا گیا۔ دفتردار جہاں پہنچا شہر و قریہ جلاتا چلا جاتا تھا۔

شاہ نمر کے ہمراہی یکے بعد دیگرے کم ہوتے جا رہے تھے کچھ قتل ہوتے کچھ کمزور ہو کے اور چھوڑ دیے جاتے یہاں تک کہ شاہ نمر نے ارادہ کیا کہ حبشہ چلا جائے لیکن راستہ میں پانی نہ تھا شاہ نمر اور اس کے ہمراہی اب موت کے منہ میں تھے۔ ایک روز شاہ نمر نے اپنے ہمراہی جمع کئے اور سب

سے یہ کہا کہ "پانی بہت کم ہے اور ہم سب کے لئے کافی نہیں ہو سکتا اس لئے ضعیفوں کو پانی چاہئے ہے اور قوی لوگ بلا پانی کے اس وقت تک گزر کریں کہ ہمیں پانی دستیاب ہو سکے" اب اس نے ایک ایک سے سوال کیا کہ آیا وہ ضعیف ہیں پانی چاہتے ہیں یا قوی ہیں انکو پانی کی حاجت نہیں ہے۔ بعض نے پانی مانگا اور ضعف کا اظہار کیا اور بعض نے پانی سے انکار کرنے میں اپنی قوت کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس نے دو قسم دو گروہوں کی قائم کیں ضعیف زیادہ اور قوی کم تھے لیکن اس نے پانی قوی لوگوں میں تقسیم کر دیا اور کہا کہ جو پیاس پر صبر کر سکتا ہو وہ حالت جنگ میں بھی صبر کر سکتا ہے اور ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ یہ غریب و ضعیف لوگ صحرا میں بے یار و مددگار پیاسے ہلاک ہو جانے کے لئے چھوڑ دئے گئے اور بادشاہ اپنے ان قوی لوگوں کے ساتھ حبش چلا گیا۔ حبشہ پہنچ کر بادشاہ وہاں اس وقت تک رہا جبتک کہ قدرتی موت نے اس کا خود فیصلہ نہ کر دیا۔

سوڈان پر دوبارہ مصر کا قبضہ ہو گیا اور باضابطہ سول حکومت شروع ہوئی۔ یہاں کا سب سے اول جو ملکی گورنر ہوا وہ کرنل عثمان بیگ تھا۔ اس کا تقرر [illegible]ء میں ہوا۔ اب رفتہ رفتہ سوڈان کی حالت اصلاح پذیر ہونے لگی اور وہاں کے انتظامی امور بہترین طریقے سے انجام پاتے رہے۔ اس وقت مصر کے ساتھ کوئی شخص یا کوئی حکومت سوڈان میں شریک و سہیم نہ تھی۔ یہ حالت [illegible]ء تک رہی۔

محمد احمد مہدی۔ ایک بزرگ باشندگان "دنقلہ" سے تھے۔ دین داری و تصوف کے آغوش میں انکی پرورش ہوئی رفتہ رفتہ وہ اپنے قرب و جوار میں انہی اوصاف دینداری و تصوف، زہد و اتقا میں مشہور ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مریدوں اور عقیدتمندوں میں دیانت داری، راستبازی تقویٰ اور تصوف کا درس دینا شروع کیا انکے حالات کی اصلاح کی اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ انکے مرید اور معتقد ہو گئے اور جو انکے مرید ہوئے انکی بہت کچھ اخلاقی اصلاح بھی ہو گئی اسکا ایک اثر یہ ہوا کہ خود محمد احمد صاحب کو خیال ہو گیا کہ وہی "مہدی منتظر" ہیں اس خیال کی تقویت نے ان سے مہدیت کا دعویٰ کرا دیا۔

وہ درویشوں کا لباس پہنکر اور اپنے مریدوں کو بھی اسی درویشی لباس میں ملبوس کر کے حجرہ سے باہر

نکلے اور دعوت عام کا اعلان کر دیا۔ انکا عمومی لباس یہ تھا۔ ایک جبہ سفید رنگ، ایک تسبیح، ایک لوٹا ایک مصلیٰ۔ یہی اشیاء انکا کل سامان تھا۔ لوگوں کو علانیہ اور پوشیدہ اس دعوت میں شریک کرتے تھے یہاں تک کہ اب انھوں نے بیرونی دنیا سے بھی خط و کتابت شروع کر دی تھی۔

اس وقت سوڈان کے حکمران یعنی گورنر حکومت مصر کی طرف سے رؤف پاشا تھے۔ انکو بھی مہدی صاحب نے ایک خط لکھا اور انکو ہدایت کی کہ وہ اپنے ایمان کو تازہ کریں ورنہ بشرطِ نافرمانی ان کو ہلاک کر دیا جائیگا۔ اس پر رؤف پاشا نے اپنی فوج کے چند آدمی "مہدی سوڈانی" کی گرفتاری کے لئے بھیجے مہدی صاحب کو معلوم ہوا انھوں نے اپنی جماعت میں جہاد عام کا اعلان کر کے لوگوں کو جنگ کے لئے تیار کر لیا اور انھوں نے ایک جگہ کمین گاہ بنا کر رؤف پاشا کے لوگوں پر حملہ کیا اور انکو ہلاک کر دیا۔

اس واقعہ سے نیز چند اور واقعات سے جو مہدی کی کرامات سے منسوب تھے۔ مہدی کی فوج اور مددگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور مہدی اپنی فوج وغیرہ کو لیکر "جبل قدیر" کی طرف بڑھے۔ حکومت مصر نے متواتر مہدی کی سرکوبی کے لئے فوجیں روانہ کیں چنانچہ مختار پاشا اور راشد بیگ کی مہمیں خاص طور سے مشہور ہیں لیکن برابر حکومت مصر کو ناکامی ہی ہوتی رہی اور ان واقعات سے مہدی کے معاونین، مریدین اور معتقدین کی طاقت روز بروز بڑھتی رہی۔ دور دور سے لوگ آآکر شریک ہوتے رہے

اب مہدی صاحب نے سوڈان کے ممالک کی فتح کا مستقل ارادہ کر لیا اور ایک زبردست فوج لےکر آگے بڑھے ۱۸۸۲ء میں "کردوفان" کو فتح کیا اور "دارفور" میں اپنا جنگی دار السلطنت مقرر کر لیا۔

اس زمانہ میں حکومت مصر عربی پاشا کی جنگوں میں مصروف تھی جب اس کو کامل فرصت اس طرف سے ہوگئی تو اس نے ایک جرار لشکر بسرکردگی ہیکس پاشا مہدی کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا ہیکس پاشا اس فوج کو لےکر کردوفان پر حملے کے لئے آگے بڑھے انھوں نے مقابلہ کے لئے پوری تیاری کر لی تھی یعنی ذخیرہ، باربرداری، توپخانہ، باقاعدہ فوج غرض ہر چیز مکمل تھی لیکن افسوس کہ مقابلہ میں ہیکس پاشا کو شکست فاش ہوئی تمام فوج معہ ہیکس پاشا کے قتل ہوگئی اور تمام بڑے چھوٹے افسر

مارے گئے صرف تین سو سپاہی اور دو کپتان قید ہوئے۔ واپس ہوتا تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوا مصر نے جب اس شکست کی خبر سنی تو ایک تجویز منظور کی کہ تمام افواج سوڈان واپس بلالی جائیں اور سوڈان خالی کر دیا جائے چنانچہ اسکی تعمیل ہوگئی محمد احمد صاحب مہدی کی طاقت بہت زیادہ ہوگئی خرطوم کی طرف انھوں نے پیش قدمی کی اور اسکا محاصرہ کر لیا اس سختی اور دلیری کے ساتھ یہ محاصرہ رہا کہ محصورین کو کسی طرح کوئی امداد نہ مل سکی اور نہ وہ باہر آسکے کھانے کی اشیا ختم ہوتی رہیں اور سپاہی بھوک کی سخت تکلیف برداشت کرتے رہے یہانتک کہ اب بندوق اٹھانے کی بھی طاقت نہیں رہی ایسی حالت میں درویشوں نے حملہ کر کے ۲۶ جولائی ۱۸۸۵ء میں خرطوم فتح کر لیا۔ اور وہاں کے باشندوں کو قتل و غارت کے ذریعہ تباہ کر دیا بیان کیا جاتا ہے تقریباً ۳۵ ہزار آدمی ضائع ہوئے اور جو مال برباد ہوا اس کا کوئی حساب و شمار نہیں۔

جب محمد احمد صاحب مہدی کا بقضاء الٰہی انتقال ہو گیا اور انکے خلیفہ "تعائشی" مقرر ہوئے تو سوڈان پر دوبارہ قبضہ کرنے کی تجویز حکومت مصر نے منظور کی اور انگریزوں سے امداد بھی حاصل کرنا چاہی۔

اس فوج کے سپاہ سالار خوش قسمتی سے مشہور لارڈ کچنر تھے اور انکی قسمت میں قدرت نے کامیابی لکھدی تھی۔

بیشتر حصہ اس فوج کا مصری سپاہیوں پر مشتمل تھا اور غالباً جو گورا فوج تھی وہ بھی مصری حکومت کی تنخواہ دار ملازم تھی خود لارڈ کچنر مصری ملازمت میں تھے۔

یہ فوج برابر سوڈان میں حملہ پر حملہ کرتی اور شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرلی آگے بڑھتی رہی یہانتک کہ یہ خرطوم میں فاتحانہ داخل ہوئی "ام درمان" میں بھی اس فوج کا داخلہ ایک زبردست جنگ کے بعد فاتحانہ ہوا خلیفہ "تعایشی" وہاں سے فرار ہوئے لیکن فوج برابر اُن کے تعاقب میں بڑھتی رہی یہانتک کہ ایک جنگل میں مقابلہ ہوا "تعایشی" نہایت جوانمردی اور شجاعت کے ساتھ لڑے اور قدیم عربی روایات کے مطابق جب میدان جنگ میں کہیں بچت کی صورت نہ نکلی

قتل ہو گئے لیکن فرار ہونا نہ چاہا۔ انکے قتل کا واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔ جب ان کو بالکل یقین ہو گیا کہ اب جنگ بیکار ہے تو وہ اور انکے سب ہمراہی گھوڑوں سے اتر پڑے اور ایک جگہ فرش کر کے میدان جنگ میں بیٹھ گئے۔ ان پر گولیاں برابر چلتی رہیں یہانتک کہ سب کے سب گولیوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

مصری نشان سوڈان پر پھر لہرایا لیکن افسوس اس مرتبہ اس کے پہلو میں یونین جیک (انگریزی علم) بھی تھا اور اس روز سے سوڈان کا نام "سوڈان مصری و انگریزی" ہو گیا۔

شذرات

جناب مجنون گورکھپوری نے ہمارے پاس ایوان اشاعت گورکھپور کا دستورالعمل بھیجا ہے اور اسی کے ساتھ ایک رسالہ بھی جو انھوں نے جرمن فلسفی شوپن ہاوایر کے فلسفے پر لکھا ہے۔ دستورالعمل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گورکھپور کے علم دوست حضرات نے علم و ادب کی اشاعت کے لئے یہ ادارہ قائم کیا ہے جس کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ نکلے گا اور " ادبیات، حکمیات اور نسائیات " پر مفید اور دلچسپ کتابیں شائع کیجائیں گی۔ جو حضرات " ایوان اشاعت " کو پانسو روپیہ یکمشت عطا فرمائیں گے وہ اس کے مربی اور جو سو روپیہ دیں گے وہ سرپرست کہلائیں گے۔ معمولی ارکان سے دس روپیہ سالانہ چندہ لیا جائیگا اور انھیں ایوان کی کل مطبوعات ہدیۃً دیجائیں گی۔

ہم حضرات گورکھپور کو اس نیک ارادے پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انکی یہ تجویز کامیاب ہو اور ان کے ہاتھوں اردو زبان کی ترقی اور توسیع کی مفید خدمت انجام پائے۔

ایوان اشاعت کے ادبی مشیروں کی فہرست کے دیکھنے سے اور اس کی شائع کی ہوئی کتاب کے مطالعے سے یہ امید ہوتی ہے کہ اس کے کارکن حسن ذوق اور دقت نظر سے کام لے کر ایسی کتابیں اُردو داں طبقے کے سامنے پیش کریں گے جو عام معیار سے بلند ہونگی۔ ہم اس مفید تحریک کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور سب علم دوست حضرات سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ایوان اشاعت کے رکن بن جائیں اور اسکو کامیاب بنانے میں جو کچھ مدد کر سکتے ہوں کریں۔

جامعہ ملیہ میں ۲۲ دسمبر سے ۹ جنوری تک جاڑوں کی تعطیل ہوگئی ہے اور اکثر اساتذہ اور طلبہ اپنے اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ ہمارے سال تعلیمی کی ابتدا سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے دہلی میں سیاسی تحریک کا بازار گرم ہے اور اس کے اثر سے تمام تعلیمگاہوں کے کام میں کم و بیش ہرج ہو رہا ہے

[illegible] میں تقریباً کامل سکون کی حالت رہی اور تعلیم کا کام پوری سرگرمی سے جاری رہا۔ جامعہ کے معلمین میں سے دو چار حضرات نے سیاسی جوش سے متاثر ہو کر استعفا دیدیا اور کانگرس [illegible] کی وجہ سے جیل چلے گئے۔ مگر طالب علموں کی تعلیمی حالت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑنے پایا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جامعہ کے کارکن عموماً یہ طے کر چکے ہیں کہ اپنی عمر ملک و ملت کی تعلیمی خدمت میں گذاریں گے اور ہندوستان کی ساری فضا پر سیاست کے بادل چھا جانے کے باوجود یہ ایک گوشہ آفتاب علم کے نور سے منور رہے گا۔ مسلمانوں کی جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ تعلیم انکی زندگی کا ناگزیر جزو بن گئی ہے جس سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہو سکتے۔ سیاست والوں کو [illegible] کر لیجائے مگر تعلیم کے سچے خادم اسکا دامن کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے۔

ماہ گذشتہ جب رسالہ تیار ہو چکا تھا مولانا حمید الدین فراہی کے انتقال پر ملال کی خبر موصول ہوئی۔ مولانائے مرحوم کی ذات اس زمانے میں طالبین قرآن کے لئے ایک عظیم الشان نعمت تھی۔ یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں علوم قرآنی کی امامت انکی ذات پر منتہی تھی۔ وہ حافظ قرآن تھے اور درسی علوم کی تکمیل کے بعد انھوں نے بی۔ اے پاس کیا تھا لیکن اپنے جملہ علوم کا مرکز ہمیشہ قرآن ہی کو رکھا۔ نظام الفرقان نامی ایک تفسیر بھی وہ عربی میں لکھتے تھے جس کے بعض اجزا شائع ہو چکے ہیں۔ تناسب اور ربط آیات انکا خاص مضمون تھا۔

ان کی لیاقت انکی قوت فکر کی طرح نہایت زبردست تھی۔ ذہن وقاد، طبیعت نقاد، فہم مستقیم اور ذوق سلیم رکھتے تھے۔ اور نہایت متشرع، متدین اور متقی۔ دنیاوی حرص و ہوس کی انکو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک مقدمہ میں ثالث مانے گئے تھے جس میں ایک فریق خود انکے والد بزرگوار تھے۔ مگر انھوں نے حق دوسری طرف دیکھ کر پچاس ہزار کی ملکیت اسی فریق کو دیدی اور حق کے مقابلہ میں باپ کا کچھ خیال نہ کیا۔ طبیعت مطمئن تھی۔ ہر وقت خوش اور شاکر رہتے تھے کم سخن تھے مگر قرآنی نکات اور حل آیات و معضلات میں نہایت

خوش تقریر۔ قابلیت ایسی تھی کہ بلاغت و معانی اور فلسفۂ قدیم کے بجائے نئے اصول بلاغت اور نیا علم حکمت انھوں نے تعمیر کیا۔ اللہ تعالیٰ انکے متوسلین اور رفقاء کو توفیق دے کہ اس گنج گرانمایہ کو شائع کرسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس حیثیت سے بھی ہم ان پر نظر ڈالتے ہیں اس دور آخر میں وہ سلف صالح کا بقیہ اور علمائے اسلام کی یادگار تھے۔ حیدرآباد دکن سے دارالعلوم کی پرنسپلی چھوڑکر جہاں وہ ایک ہزار ماہوار تنخواہ پاتے تھے ضلع اعظم گڈھ میں اپنے وطن موضع پھریہا میں آکر سرائے میر کے مدرسہ اصلاح المسلمین میں قرآن کا درس دیتے تھے۔ اس مدرسہ کے وہی ناظم بھی تھے اور انکی نظامت میں مدرسہ نے خوب ترقی بھی کی۔ انکی موجودگی سے وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے دن عید تھا اور رات شب برات۔ افسوس کہ یہ قیمتی وجود چھن گیا اور کوئی اس کا جانشین بھی نظر نہیں آتا۔

جامعہ کے ابتدائی زمانے میں وہ کئی بار اس میں تشریف لائے تھے۔ ادھر ایک عرصے سے چاہتے تھے کہ دہلی میں آکر جامعہ کے طلبہ کو کچھ دنوں قرآن کا درس دیں۔ وہ جامعہ کے اعزازی اساتذہ میں سے تھے۔ اور یہ مدرسہ انکو خصوصیت کے ساتھ محبوب تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

بقائے صحت کی نو ایجاد مشین



زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے بالکل ناآشنا تھے۔ آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں، پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتے ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنس دانوں نے ہر گھر میں اس کو لیجانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلہ سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج۔ گنٹھیا۔ ورم۔ درد۔ پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشہ شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبا کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمہ میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ

زندگی طلسم (وائیولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ دہلی

ساقیِ دہلی ۱۹۳۱ء میں

چار خاص نمبر مستقل خریداروں کی خدمت میں مفت

جنوری میں "سالگرہ نمبر" اپنی پوری پوری رعنائیوں کے ساتھ حلیۂ طبع سے آراستہ ہو
منصۂ شہود پھر جلوہ ریز ہوگا۔

اپریل میں "ظریف نمبر" شائع ہوگا جو اپنے مذاقیہ مضامین کے اعتبار سے کشت زعفران
ہوگا۔ اگر ہنستے ہنستے آپکے پیٹ میں بل نہ پڑجائیں تو ہمارا ذمہ۔

جولائی میں "افسانہ نمبر" اپنی نمایاں خصوصیات کے ساتھ اسی امتیازی شان سے شائع
ہوگا جیسے کہ گزشتہ شائع ہوا تھا۔

اکتوبر میں "دلی نمبر" بصیرت افروز ہوگا جسمیں دہلی کے ارباب فضل وکمال کے منتخب
نمونے نظم ونثر کی صورت میں پیش کئے جائیں گے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ — "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" — یہ چار شاندار
نمبر ہونگے جنکی مجموعی قیمت ۶؍ سے کم نہ ہوگی اگر آپ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو دیر نہ کیجئے آج ہی
بلکہ ابھی اپنا نام مستقل خریداروں میں درج کرائیے۔ انکے علاوہ ہر ماہ ساقی کا معمولی پرچہ (ضخامت ۱۰۰
صفحات) بہترین مضامین نظم ونثر۔ دلکش تصاویر سے پیش کیا جائیگا۔

(منیجر)

The National Muslim University,

Book—Depot

DELHI.

The Spirit of Islam: New and revised edition. A History of the evolution and ideals of Islam with a Life of the Prophet. Two new chapters have been added to this new edition, on the Apostolical Succession and on Mysticism, as well as considerable new matter in the Introduction and in the chapter on "The Rationalistic and Philosophical Spirit of Islam. By the Rt. Hon. Syed Amir Ali, P.C., L.L.D., C.I.E.

Rs. 20

Studies in Persian Literature: An account of the birth of Mohammadan Persia and the Persian Language, and the rise of the Ghazna with a digression on Critics and Persian Literature and Criticism of the poetry of Firdawsi, Manuchehri and Unsuri. By Syed Hadi Hasan B.A.,B.Sc. (Cantab).

Rs. 5

Islamic Culture and National Education: By Dr. Sir P.C. ...y, with a Foreword by A. M. Khwaja, B. A. (Cantab) ...r-at-Law.

As. 8

Loolus and other Poems: Charmingly bound. Printed ...e Jamia Press in Clear type. The Volume makes an appro... ...e gift for those who not only appreciate handsome books ...lesire to read and re-read the books they possess By Ede... ...nson.